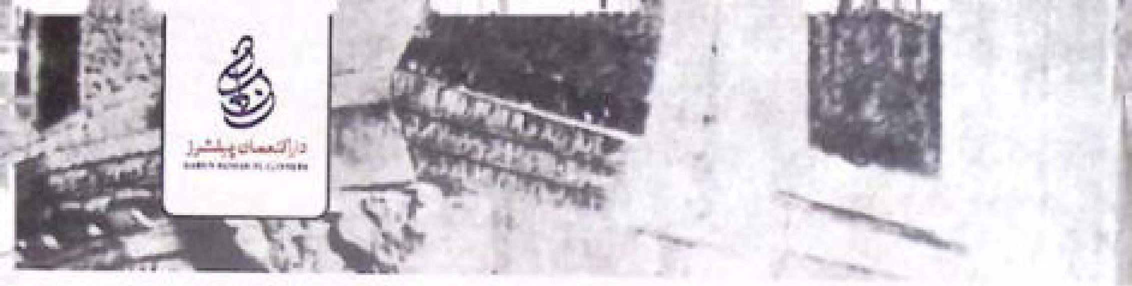

شاعرِ اسلام

اقبال شناسی کا نیا زاویہ

تالیف پروفیسر خیال آفاقی

شاعرِ اسلام

(اقبال شناسی کا نیا زاویہ)

پروفیسر خیال آفاقی

دارالنعمان پبلشرز
DARUN NOMAN PUBLISHERS

جملہ حقوق بحقِ ناشر محفوظ ہیں

کتاب	:	شاعرِ اسلام
موضوع	:	اقبال شناسی
مؤلف	:	پروفیسر خیال آفاقی 0300-2389731
اشاعت	:	۲۰۱۷ء
کمپوزنگ		شیرازی شاعر 0300-2054154
ناشر		دارالنعمان پبلشرز
طابع		محمد مقصود احمد
تعداد		۵۰۰
صفحات	:	۴۸۰
قیمت	:	ــــــ روپے

دست یابی کا پتہ

دارالنعمان پبلشرز، دکان نمبر 4، ہادیہ حلیمہ سنٹر، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار لاہور

فون: 042-37228057 صوتی رابطہ: 92-333-1206301+

برقی پتہ: maqsoodspectrum@gmail.com

کتاب سرائے، الحمد مارکیٹ اُردو بازار لاہور

نعیمیہ بک سٹال، غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور

مکتبہ مسلم کتابوی، دربار مارکیٹ لاہور، ضیاء القرآن، لاہور / کراچی

مکتبہ اعلیٰ حضرت، دربار مارکیٹ لاہور

علامہ اقبالؒ کے خادم خاص علی بخش
کے نام

خیال آفاقی

maablib.org

عرضِ ناشر

""شاعرِ مشرق نہیں تو شاعرِ اسلام ہے" یہ کہنا ہے پروفیسر خیال آفاقی صاحب کا مگر لوگ کہتے ہیں آفاقی صاحب نے آفاقی شاعر کو شاعرِ اسلام کہہ کر محدود کر دیا ہے۔ شاید وہ لوگ اسلام کو آفاقی دین ہی نہیں سمجھتے؟ اس بات کی وضاحت آفاقی صاحب نے اپنی کتاب "شاعرِ اسلام" (اقبال شناسی کا نیا زاویہ) میں کی ہے۔ میرا بیٹا ایک دن مجھ سے کہنے لگا! تب وہ FA کا طالب علم تھا۔ بابا جان سنا ہے ذخیرۂ اقبالیات میں اس وقت تک چار ہزار سے زائد کتب دُنیا کی چالیس سے زیادہ زبانوں میں لکھی جا چکی ہیں اور ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے مگر میرے جیسے طالب علم کو اقبال شناسی کا سفر کہاں سے شروع کرنا چاہیئے۔ اُس وقت میرے پاس اس سوال کا جواب نہیں تھا خوش قسمتی سے پروفیسر خیال آفاقی کی کتابیں "رسولِ اعظم ﷺ" سیرت رسول پر پہلی مکمل حکائی کتاب ہم سب گھر والوں نے باری باری پڑھی تو پروفیسر صاحب کے ایک کامیاب ادیب و سیرت نگار کے قائل ہو گئے اور پھر حمدیہ کلام "اَحد اَحد" پڑھا تو شاعر بھی کمال کے لگے "حد ادب" پڑھی تو پتہ چلا نقاد کیا ہوتا ہے اور "تمنا بر آئی تو" سفر نامہ حجاز پڑھا! "سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف" کے قائل و عامل نظر آئے اور آپ کا ناول "اے دل گر تو چاہے" پڑھا تو پتہ چلا ایسے ادیب ابھی موجود ہیں۔ جو قلم کے تقدس کو سمجھتے ہیں اور اُن کو احساس رہتا ہے کہیں ادب کی آڑ میں ایسا جملہ نہ نکل جائے کہ قبر میں اس کا حساب نہ دے پائیں۔ اور جب "اذانِ اقبال" پڑھی تو آپ شارحِ اقبال اور اقبال شناس ہونا ثابت کر چکے تھے۔ اب آپ ہی بتائیں اتنی ساری خوبیوں کے بعد مجھے پروفیسر صاحب سے پوچھنا چاہیئے تھا کہ نہیں؟ جناب آپ بتائیں اقبال شناسی کا سفر کہاں سے شروع کیا جائے آپ نے اپنی نئی لکھی ہوئی کتاب "شاعرِ اسلام" کا ذکر فرمایا اور ساتھ ہی اُس کا مسودہ بھی بھیج دیا۔ گویا میرے دل کی مراد پوری ہوئی۔

سوچا اسے دار النعمان پبلیشرز سے شائع کر کے نہ صرف اپنے بیٹے کو اُس کے سوال کا جواب دوں بلکہ اپنی قوم کے بیٹوں کو بھی اس میں شریک کروں! اے میری قوم کے نونہالو دیکھو اقبال ہمیں کیا درس دیتے ہیں۔

مقصود احمد

(ڈائریکٹر دار النعمان پبلیشرز)

’’چشم کُشائی‘‘

کئی سال پہلے کی بات ہے، کراچی کے ’’خانۂ فرہنگ ایران‘‘ میں یومِ اقبال کے موقع پر اس خاکسار نے حضرت علامہ کو منظوم خراجِ تحسین پیش کیا تھا، نظم کا ایک مصرع تھا:

’’شاعرِ مشرق نہیں تُو شاعرِ اسلام ہے‘‘

محفل کے اختتام پر ایک ’’علم دوست‘‘ نے فرمایا:

’’آفاقی صاحب! شاعرِ اسلام کہہ کر آپ نے اقبال کو محدود نہیں کر دیا؟...... علامہ تو ایک آفاقی شاعر ہیں۔‘‘

میں نے اُن سے عرض کیا۔ ’’کیا آپ اسلام کو آفاقی دین نہیں سمجھتے؟ اور کیا آپ اس حقیقت سے انکار کی جرأت کر سکتے ہیں کہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پورے عالمِ انسانیت کے محسنِ اعظم ہیں؟‘‘ مجھے اُمید ہے آپ کا جواب اثبات میں ہو گا، یقیناً جب ان دونوں حقیقتوں سے انکار ممکن نہیں تو پھر آپ کو اپنے اعتراض سے رجوع کرنے میں بھی کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے۔ البتہ اس ضمن میں اعتراض کی کوئی گنجائش اگر نکل سکتی ہے تو یہ کہ اقبال کو برِاعظموں میں کیوں بانٹ دیا گیا ہے؟‘‘ جب کہ وہ خود فرماتے ہیں:

’’درویشِ خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی‘‘

ہاں البتہ یہ بجا ہے کہ ایک جگہ علامہ نے خود اپنے بارے میں ’’شاعرِ مشرق‘‘ ہونے کا اشارہ

فرمایا ہے:

"آدابِ جنوں شاعرِ مشرق کو سکھا دو"

تو یہ محض مکانیت کی طرف اشارہ ہے۔ جس سے اُن کا پیدائشی اور جسمانی تعلق ہے، اور اس سے مقصود اہلِ مغرب اور اہلِ مشرق کے درمیان جغرافیائی امتیاز ظاہر کرنا تھا۔ جیسا کہ انہوں نے مغرب کے مشہور شاعر اور ڈراما نویس گوئٹے کے "دیوانِ مغربی" کے جواب میں اپنی تخلیق کا عنوان "پیامِ مشرق" رکھا اور اس کی وجہِ تالیف کیا ہوئی؟ اس کی بھی ایک جھلک ملاحظہ کرتے چلئے۔ علامہ "پیامِ مشرق" کے مقدمے میں فرماتے ہیں۔

اس کا مدعا زیادہ تر اخلاقی، مذہبی اور ملی حقائق کو پیشِ نظر لانا ہے، جس کا تعلق افراد اور اقوام کی باطنی تربیت سے ہے۔ اس سے سو سال پیش تر جرمنی اور مشرق کی موجودہ حالت میں کچھ نہ کچھ مماثلت ضرور ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اقوامِ عالم کا باطنی اضطراب جس کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہم اس لیے نہیں لگا سکتے کہ خود اس اضطراب سے متاثر ہیں جو ایک بہت بڑے روحانی اور تمدنی انقلاب کا پیش خیمہ ہے۔"

آگے جا کر مزید لکھتے ہیں:

"مشرق اور بالخصوص اسلامی مشرق نے صدیوں کی مسلسل نیند کے بعد آنکھ کھولی ہے، مگر اقوامِ مشرق کو یہ محسوس کر لینا چاہیے کہ زندگی اپنے حوالے میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی، جب تک کہ پہلے اُس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو، اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی، جب تک کہ اُس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ فطرت کا یہ اٹل قانون جس کو قرآن نے "**ان اللہ لا یغیر مابقوم حتی یغیروا ما بانفسھم**" سادہ اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے، زندگی کے فردی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے اور میں نے اپنی فارسی تصنیف میں اسی صداقت کو مدِ نظر رکھنے کی کوشش کی ہے۔"

صاف محسوس کیا جا سکتا ہے کہ اقبال مشرق میں رہ کر مغرب کی بات کر رہے ہیں اور مشرق اور مغرب (جرمنی) کے دردِ مشترک کا ذکر فرما رہے ہیں تو اس میں اُن کی فکر صرف مشرق کے آفاق تک محدود نظر نہیں آتی، لہٰذا اُن کے اس اشارے سے کہ "آدابِ جنوں شاعرِ مشرق کو سکھا دو" یہ

تاثر لینا صحیح نہیں کہ اقبال شاعرِ مشرق کی حیثیت سے خود کو کسی ایک براعظم تک محدود رکھنا چاہتے ہیں، بلکہ دراصل جیسا کہ بتایا گیا یہ اندازِ بیان محض اہلِ مغرب سے ممتاز کرنے کے لیے اختیار کیا گیا ہے جو مکانی نسبت کا اظہار ہے، نہ کہ اس سے یہ احتمال پیدا ہوتا ہے کہ اقبال اپنی فکر کو جغرافیائی حدود میں مقید رکھنا چاہتے ہیں۔ حالاں کہ وہ ان جغرافیائی حدود سے بہت آگے جا کر فرما رہے ہیں:

فطرت نے مجھے بخشے ہیں جوہرِ ملکوتی
خاکی ہوں مگر خاک سے رکھتا نہیں پیوند
درویشِ خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی، نہ صفاہاں نہ سمرقند

گو میری سرشت خاکی ہے، لیکن اس مشتِ خاک میں امرِ الٰہی نے جو روح پھونک دی ہے اس نے مجھے خاک اور اُس سے متعلق تمام مادی رشتوں سے بے نیاز کر دیا ہے۔ یعنی وہ مردِ مومن جو اپنے دل میں اپنے خالق کی محبت کا رشتہ اُستوار کر چکا ہو، وہ اس طرح کے مادی اور فانی رشتوں پر کیا یقین رکھ سکتا ہے۔"

چناں چہ اس استدلال کی روشنی میں اُس درویش صفت انسان کو جس کے دل میں خدا کی محبت نے گھر کر لیا ہو، مشرق و مغرب میں کیوں کر محدود کیا جا سکتا ہے۔

بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی، اس ضمن میں آگے چل کر تفصیل سے گفتگو ہوگی، فی الحال اتنا ہے کہ ہم اقبال کو "شاعرِ مشرق" نہیں، "شاعرِ اسلام" سمجھتے ہیں (جیسا کہ وہ ہیں) اور یہ کہ اسلامی حدود کی وسعتوں کو آفاقیت چھو بھی نہیں سکتی۔ یاد رہے، اقبال کے شاعرِ اسلام ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اُن کی تمام تر فکر و نظر کا منبع و سرچشمہ قرآن ہے اور قرآن کا موضوع انسان ہے۔ اور اقبال اپنے پیغام میں انسان ہی کو مخاطب کرتے نظر آتے ہیں۔

کیا یہ حقیقت کسی وضاحت کی محتاج ہے کہ انسان خواہ مشرق کا ہو کہ مغرب کا، کسی بھی رنگ و نسل سے تعلق رکھتا ہو، بہرصورت انسان ہے، خدا کی مخلوق ہے، خدا کا بندہ ہے، البتہ، خدا کی مخلوقات میں الگ حیثیت و امتیاز کا حامل ہے، کیوں کہ وہ زمین پر خدا کا نائب ہے اور اسی نیابت نے اُسے ذمے دار مخلوق بنا دیا ہے۔ لہٰذا جب بھی اُس نے اپنی ذمے داری نبھانے میں کوتاہی برتی

اور اپنے منصب کے خلاف عمل کیا، احکامِ خداوندی بجالانے کے بجائے، اپنی چلانے کی کوشش کی، اپنی عقل اور اپنی طاقت کے نشے میں ڈوب کر خود کو امرِ کل کا حامل و مالک سمجھا تو اُس کو اُس کے تمام کارخانہ عقل سمیت غرقاب کردیا گیا اور وہ بھی عتابِ الٰہی سے نہ بچ سکے جنھوں نے نیابتِ الٰہیہ کے اصولِ منصبی سے روگردانی کی، کیوں کہ یہ عمل بالفعل حاکمِ حقیقی سے غداری اور بغاوت کے مترادف ہے۔ چناں چہ ایسے باغی بھی قدرت کے تازیانہ سے نہ بچ سکے۔ اقبال کی زبان میں یوں کہیے:

کرتی ہے ملوکیت آثارِ جنوں پیدا
اللہ کے نشتر ہیں تیمور ہو کہ چنگیز

اور یہی سرکشی اور خدا فراموشی جب اجتماعی شکل اختیار کرلیتی ہے تو لوگوں کو مہلت دی جاتی ہے، اُن کے لیے ناصحین و مصلحین کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ سرزنش اور زجر و توبیخ سے قبل اُن کی اصلاح اور درستی کے لیے اُن کے رب نے پیغمبر اور رسول بھیجے، تاہم یہ ہادیانِ حق، مخصوص علاقوں اور اپنی اپنی قوموں کی طرف آئے۔ پھر ایسا ہوا کہ پورے عالمِ انسانیت کے لیے رسولِ آخر و اعظم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معبوث فرمایا اور قرآن کی شکل میں اسلام کا ایسا عالم گیر پیغام آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیا گیا جو انسان کے لیے ایک مکمل ضابطۂ حیات کی فطری دستاویز ہے، جو، ابداً باد تک عالمِ انسانیت کے لیے مختص کردی گئی ہے کہ کوئی بھی زمانہ اور کوئی بھی دور ہو، انسان کی داخلی و خارجی فلاح و کامرانی کا ضامن صرف اور صرف یہی دستور یعنی قرآن حکیم ہے۔ اسی کی روشنی میں انسانیت امن و اطمینان کا سانس لے سکتی ہے۔ اسی عالم گیر پیغام کو فکر و فلسفہ کے ذریعہ سے پیش کرنے والا اقبال جس کی فکر کا اصل سرچشمہ ''القرآن'' ہے، کیوں کر صرف مشرق تک محدود رہ سکتا ہے۔ تو اس حوالے سے انھیں شاعرِ اسلام کے بجائے کوئی اور نام دیا ہی نہیں جاسکتا؟ یاد رہے ہماری یہ گفتگو کسی عقیدت اور ''بنیاد پرستی'' کے جذبات کا اظہار نہیں، بلکہ اُس سوال کی غماز ہے کہ کیا اس فلک کے نیچے، زمین پر پائے جانے والے انسانی معاشروں میں انسانی بھلائی کے قوانین و دساتیر میں کوئی ایک بھی ایسا دستور اور آئین ہے جو انسان کو وہ درجہ دیتا ہو جو اسلام کا طرۂ امتیاز ہے، اور تہذیب و تمدن اور پاکیزہ اخلاق کی جو روشن اور خوش نما تصویریں اسلام پیش کرتا ہے کیا اُس کے سوا کہیں اور بھی دیکھی جاسکتی ہیں؟

اِس تمہید کو ہم یہیں تک رکھتے ہیں، اور اُس طرف چلتے ہیں جہاں سے ہم نے گفتگو شروع کی تھی، یعنی وہ علم دوست حضرت جنھوں نے یہ اعتراض کیا تھا کہ ''اقبال کو شاعرِ اسلام کہنے کا مطلب اقبال کی آفاقی حیثیت کو کم کر کے اُنھیں صرف اسلام تک محدود کرنا ہے۔'' سو، اُن کے جواب میں جو کچھ ہم نے اُن کے گوش گزار کیا، نہیں معلوم، وہ اُس سے مطمئن ہوئے یا مصلحتاً خاموش ہو گئے۔ البتہ ہمارے اندر بڑا شور اُٹھتا رہا، اور کافی دنوں تک اِس بات نے ہمیں مضطرب رکھا اور شدت سے احساس ہوتا رہا کہ اقبال کے بہت سے عقیدت مند اور چاہنے والوں میں اِس ادراک کا فقدان ہے کہ اقبال حقیقت میں ہیں کیا؟ تو کم لوگ ہی ایسے ہوں گے جو اپنے ذہنوں میں اقبالؔ کی شخصیت کا واضح خاکہ رکھتے ہوں۔ اِس کی ایک وجہ غالباً یہ ہو سکتی ہے کہ خود بعض اقبالؔ شناس حضرات نے بھی اقبالؔ کی شخصیت کو اِس طرح مختلف گوشوں میں تقسیم کر دیا ہے کہ اقبالؔ کا فکر و فن، فن اور شخصیت، عام قاری کے لیے ''پزل گیم'' بن کر رہ گئے ہیں، گویا اِن حضرات نے اپنی ''ذمے داری'' نبھا کر یہ سمجھ لیا کہ انھوں نے جو کرنا تھا کر لیا، اب یہ اقبالؔ کے پرستاروں کا کام ہے کہ وہ ان ٹکڑوں کو جوڑ کر کس طرح تصویر مکمل کرتے ہیں۔ نتیجتاً ہم دیکھتے ہیں کہ عام پڑھے لکھے حضرات بھی خصوصاً طلباء کی اکثریت اقبالؔ کی شخصیت کے خدوخال واضح طور پر اپنے ذہنوں میں نہیں رکھتی، اور نہ ہی وہ اُن کے پیغام کی اصل روح سے واقف ہے کہ آخر اقبالؔ اپنی قوم بالخصوص نوجوانوں سے کیا تقاضا کرتے ہیں؟ اِس صورتِ حال کو دیکھ کر ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ اقبالیات پر بے تحاشا لکھنے والوں میں سے اکثر نے موٹی موٹی کتابوں کا ایک انبار تو ضرور لگا دیا ہے لیکن اتنی تعداد میں ان کے قاری پیدا نہ کر سکے۔ گو یقیناً یہ بھی بہت بڑا کام ہے جو اُن حضرات نے کیا ہے۔ نہایت محنتِ شاقہ اور عرق ریزی کے ساتھ اقبالؔ کے فکر و فن کو یک جا کر دیا۔ اپنے اپنے طریق پر اُن کی تصریح اور تشریح اور اُن کے پیغام کی تفہیم میں بھی عالمانہ اور فاضلانہ کوششیں کی ہیں، لیکن اُن کا یہ ''بڑا کام'' صرف بڑوں کے لیے مختص ہو کر رہ گیا ہے۔ چناں چہ متعدد جلدوں پر مشتمل ضخیم کتابیں یا تو اقبالؔ کے نام پر قائم کردہ اداروں کے نگار خانوں کی زینت بن کر رہ گئی ہیں، یا کچھ بڑی بڑی لائبریریوں کی الماریوں میں ٹھنسی ہوئی ملتی ہیں جہاں اُن سے زیادہ تر وہ لوگ استفادہ کرتے دیکھے جا سکتے ہیں جو اقبالؔ کے حوالے سے مزید تحقیق، محض اِس بنا پر کر رہے

ہوتے ہیں کہ وہ پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری لے کر "ڈاکٹر" کہلانے کا شوق پورا کرسکیں، یوں بھی سرکاری ملازم پیشہ افراد کو اِس میں دو پیسے کا فائدہ ہے کہ اُن کو الاؤنس کے طور پر کچھ رقم حاصل ہوجاتی ہے، رہا اِس کوشش کا کوئی اخلاقی اور روحانی فائدہ، تو خود اُن کو نہیں ملتا، دوسروں تک کیا پہنچ سکتا ہے۔ گویا اُمتِ عامہ کے درد رکھنے والے اقبالؔ کو ادب کے بعض "چوہدریوں" نے یرغمال بناکر "وی آئی پی کلچر" کا حصہ بنادیا ہے۔ اِس کی ایک اور مثال اقبالؔ پر ہونے والے ملکی اور عالمی مذاکرے اور سیمینار ہیں جو پانچ ستاروں والے ہوٹلوں کے "ٹھنڈے اور میٹھے" ہالوں میں منعقد کیے جاتے ہیں، جہاں مغربی لباس میں ملبوس لارڈز صاحبان جیسے حلیہ کے چند دانش ور، ہوم ورک کی طرح پہلے سے تیار کردہ "پیپرز" پڑھ کر سناتے ہیں اور وہاں بیٹھے ہوئے اسی قبیل کے سامعین اُن کی ستراطی و بقراطی گفتگو کو سمجھے بغیر پُرزور تالیاں بجابجا کر اُن کی "دانش وری" میں اوراضافہ کرتے رہتے ہیں۔ تو اِس صورتِ حال میں ایک عام پڑھے لکھے نوجوان کو کہاں یہ موقع مل سکتا ہے کہ وہ اپنے "قومی شاعر" اور "پاکستان کا خواب" دیکھنے والے اقبالؔ کو اِن دو ناموں سے زیادہ جان سکے۔ لگتا یوں ہے جیسے ادب کے لال بُجھکڑوں نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ اقبالؔ کو عام لوگوں تک نہ پہنچنے دیا جائے بلکہ ان سے دور رکھا جائے یا ان حضرات نے یہ سمجھ لیا ہے کہ عام لوگوں کا واسطہ ہی کیا ہے اقبالؔ سے؟ اقبالؔ جس بلند فکر و دانش کے انسان ہیں، بھلا یہ اسکول اور کالجوں میں نصابی کتب پڑھنے والے کیا سمجھیں کہ یہ فلسفۂ خودی کیا ہے؟ بے خودی کیا ہے؟ اقبالؔ کا نظریۂ حسن و عشق کیا ہے؟ حیات و کائنات کے بارے میں اقبالؔ کیا نظریہ رکھتے ہیں؟ اور الٰہیات سے متعلق کیا خیالات ہیں اُن کے؟ خدا اور انسان کے بارے میں کیا کہتے اور کیا سمجھاتے ہیں؟ بھلا یہ بستہ بردار دو لفظوں کے پڑھا کو ان سربستہ رازوں اور اقبالؔ کو کیا سمجھیں گے، اقبالؔ کے فکر و فلسفہ کو تو ہمارے جیسے باریک بیں، عالمی شہرت یافتہ دانش وری فہم کرسکتے ہیں، سو یہ کام ہم کررہے ہیں، اسے ہم تک ہی رہنا چاہیے، ہم ماہرینِ اقبالیات، دوسرے ماہرینِ اقبالیات کے لیے نہ صرف کتابیں لکھتے ہیں بلکہ ملکی اور غیر ملکی طور پر ہونے والے عالمی سیمناروں میں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ کر اقبالؔ شناسی اور اقبالؔ فہمی پر "تبادلۂ خیالات" بھی کرتے رہتے ہیں۔ تو اب اِس سے زیادہ اقبالؔ اور اقبالؔ کے مخاطبین کی کیا خدمت ہوسکتی ہے؟"

رہے اربابِ اختیار تو اُنھوں نے یومِ اقبال کی چھٹی منسوخ کر کے اقبال کی روح کو خوش کر دیا ہے۔ البتہ ''اقبال ڈے'' پر ''قومی شاعر'' کی لحد کو پھولوں کے گھیرے سے نوازنے کی رسمی کارروائی برقرار رکھی ہے۔ حالاں کہ اِن قومی راہ نماؤں اور اقبال کے شارحین کا اصل اور اوّلین کام یہ ہونا چاہیے تھا کہ وہ اقبال کو اُن کے شاہینوں سے دور رکھنے کی بجائے، اقبال کے پیغام کو اُن نوجوانوں تک لے جاتے جنھیں اقبال اپنا محبوب کہتے رہے ہیں:

محبت مجھے اُن جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

لیکن ایسا ہوا نہیں، اور اگر کچھ ہوا بھی تو یہ کہ ایک تعلیمی ادارے میں ثانوی اور گریجویشن کی سطح تک ایک مضمون ''اقبالیات'' بھی رکھ دیا گیا ہے، جو بلاشبہ ایک اہم اقدام اور مفید کام ہے۔ تاہم اقبال کے پیغام کو عام کرنے کی جو ضرورت ہے اور وقت کا جو تقاضا ہے، وہ پورا نہیں ہوتا۔ بلکہ ناکافی اور نہ ہونے کے برابر ہے، کیوں کہ اِک ولولۂ تازہ جو اقبال خود اپنی زندگی میں، اپنی آنکھوں سے، اپنی قوم کے جوانوں میں کسی حد تک دیکھ چکے تھے، جس کے لیے اُنھوں نے خود مسرت انگیز لہجہ میں فرمایا تھا:

اک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو
لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند

وہ اب بالکل ہی دیکھنے کو نہیں ملتا۔ خدا محفوظ رکھے بدگمانی سے، لیکن ''ماہرینِ اقبالیات'' کے اعمال دیکھ کر تو گمان یہی ہوتا ہے۔ ورنہ ممکن نہ تھا کہ ہم اِس اظہارِ جرأت اور بدگمانی کے اتنے قریب ہو کر سوچنے پر مجبور ہو جاتے کہ کہیں یہ دانستہ اقدام تو نہیں کہ اقبال کو ایوانِ بالا تک ہی محدود و محصور رکھا جائے، کیوں کہ ممکن ہے کچھ لوگ اِس بات سے خوف زدہ ہوں کہ اگر فکرِ اقبال کو ''ایوانِ زیریں'' تک جانے دیا گیا تو اِس سے اقبال شناسوں کی تعداد میں اضافہ ہونے کا احتمال ہے اور فی الواقع اگر ایسا ہو گیا تو اِس طرح اُن حضرات کی اقبالیات پر اجارہ داری ختم ہو سکتی ہے، لہٰذا بادی النظر میں تو یہی لگتا ہے کہ کوئی خفیہ طاقت ہے جو نہیں چاہتی کہ اقبال اپنے شاہینوں تک پہنچ سکے اور ملت کے نوجوانوں کو جس طرح دین و ایمان اور اپنی تاریخ سے نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں کے

ذریعہ دور رکھنے کی باقاعدہ مہم جاری ہے، اُن کی کوشش ہے کہ اِسی طرح اقبالؔ فہمی کے معاملہ میں بھی اُنہیں ''لبرل'' رکھا جائے، بلکہ اُن کے لیے صرف یہ دو کلمات ہی کافی ہیں جو وہ از اوّل جماعت تا اعلیٰ درجات رٹتے رہتے ہیں کہ ''اقبالؔ ہمارے قومی شاعر ہیں، اقبالؔ نے ہی پاکستان بنانے کا خواب دیکھا تھا۔'' لیکن وہ خواب کیا تھا جو اُنہوں نے دیکھا تھا اور اُن کی قومی شاعری کیا ہے؟ یہ صیغۂ راز میں رہے تو اچھا ہے۔ یہ دو باتیں جو اقبالؔ سے منسوب کر کے طلبا کو طوطے کی طرح رٹا دی گئی ہیں، بالکل اسی طرح ہیں جیسا کہ اُردو کے لیے کہتے آ رہے ہیں کہ ہماری قومی زبان ہے لیکن اس قومی زبان کے ساتھ قیامِ پاکستان کے بعد سے لے کر اب تک کیا سلوک کیا جاتا رہا ہے؟ اس کا گزشتہ ستر سال کی تاریخ بہ خوبی اور تفصیلی جواب دے سکتی ہے اور پھر زبان تو بعد کی چیز ہے، اوّلیت نظریے کی ہوا کرتی ہے، ہماری زبانیں یہ کہتے اور قلم یہ لکھتے نہیں تھکتے کہ پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے، اسلام کے نام پر یہ ملک وجود میں آیا تھا۔ لیکن اُردو کی طرح اسلام کا نفاذ بھی آج تک شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا اور نہ ہی اس قوم کے مغربی غلام یہ جرم کبھی کر سکتے ہیں۔

ہم ہر ممکن بدگمانی سے بچنا چاہتے ہیں، ممکن ہے، اقبالؔ کا معاملہ اِن دو مثالوں سے مختلف ہو، اور اقبالؔ کے حوالے سے جس صورتِ حال کا ہم نے ذکر کیا ہے، ہو سکتا ہے، وہ ہماری غلط فہمی کا نتیجہ ہو، لیکن اِن آنکھوں کو کہاں لے جائیں؟ اِن سے کیا کہیں کہ جو کچھ آئے دن تم دیکھتی رہتی ہو، وہ غلط ہے؟ فریبِ نظر ہے؟ غلط فہمی ہے؟ اور اِن تجربات کا کیا کریں، جن سے ہم کئی بار گزر چکے ہیں، اِن میں تازہ تجربہ یہ ہے کہ دو سال قبل اِس خاکسار نے نوجوان طبقہ کے لیے اقبالؔ کے اُردو کلام کی مختلف عنوانات دے کر، آسان زبان اور سہل انداز میں تشریح کی تھی جو 'ازانِ اقبالؔ'' کے نام سے شائع ہوئی، کچھ علمی حلقوں کی طرف سے کتاب کو خاصی پذیرائی ملی، خصوصاً طلبہ کے ایک طبقہ نے خاصا پسندیدگی کا اظہار کیا، تاہم یہ سب کچھ محدود پیمانہ پر ہوا۔ وہ بھی اگر نجی ٹی وی چینل ''میٹرو ون نیوز'' نے کتاب کی پروجیکشن میں تعاون نہ کیا ہوتا تو شاید یہ نتائج بھی حاصل نہ ہو سکتے۔ اِس تعاون کے لیے پروگرام کے پروڈیوسر جناب شمیم جاوید اور میٹرو ون نیوز کے سربراہ عامر شیخ مسعود کا شکریہ ادا کرنا ہم پر لازم ہو جاتا ہے۔ لیکن خود اقبالؔ کے نام پر قائم کردہ ادارے نے نظر اُٹھا کر بھی دیکھنا گوارا نہ کیا۔ بڑی کرم فرمائی یہ کی کہ ہمارے رابطہ کرنے پر کچھ جلدیں یاد

نہیں کتنی، یقیناً پانچ سات سے زیادہ نہیں تھیں، بھیجنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ سو، وہ بھی معلوم ہوا، اُن کے دفتر میں جانے کس نے وصول کیں جس کا سراغ نہ مل سکا اور اس کا خمیازہ ہم نے برداشت کیا اور کتابیں دوبارہ کوریئر کے ذریعہ ارسال کرنا پڑیں، جو خیر سے اُنھیں مل گئیں اور اس سرمۂ مفت نظر کی اطلاع بھی ہمارے مسلسل رابطے کے بعد مل سکی۔ اِسی دوران معلوم ہوا، ادارہ مذکورہ اقبالؔ پر شائع ہونے والی کتابوں کو انعامات سے نوازتا ہے، اس سال بھی اس روایت کو دہرایا جائے گا۔ لیکن ظاہر ہے، ہماری یہ کوشش جو عام قارئین خصوصاً نوجوانوں کے لیے تھی، کون سا دانش وروں کے لیے تھی کہ اُسے وقعت دی جاتی، معلوم ہوا، اُس کے مقابل پیاز کے چھلکے اُتارنے والے کسی ماہرِ اقبالیات کی کتاب پر مہرِ پسندیدگی ثبت کر دی گئی۔

معذرت خواہ ہوں کہ اِن باتوں کے اظہار کا یہ موقع مناسبت نہیں رکھتا لیکن کیا کیجیے کہ، دل میں کچھ درد سوا ہونے لگا تھا، جس نے اس تلخ نوائی پر مجبور کر دیا۔

تو آیئے اپنے اصل موضوع کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یعنی گفتگو ہو رہی تھی کہ اقبالؔ کو شاعرِ اسلام کہنے پر ایک صاحب اس وجہ سے چیں بہ جبیں ہو گئے تھے کہ اس طرح اقبالؔ آفاقیت کی وسعت سے نکل کر صرف اسلام میں محدود ہو کر رہ جاتے ہیں۔ تو ہم نے اُن کے اعتراض سے یہی اندازہ لگایا کہ یہ "ماڈریٹ" قسم کے دانش ور اسلام کی حقانیت سے تو انکار نہیں کر سکتے لیکن اسلام کی آفاقیت کی اُن کو یقیناً ہوا بھی نہیں لگی ہے۔ ورنہ ہرگز یہ بات نہ کہتے۔ نہیں معلوم ہماری توضیح نے اُنھیں مطمئن کیا کہ نہیں، البتہ کچھ وہ جز بز ہوئے اور کچھ ہم خاموش ہو گئے کیوں کہ اپنی رجعت پسندی کے سبب ہم اُن ترقی پسندوں سے زیادہ اختلاط نہیں رکھتے، اس لیے کہ وقت اُن کی ترقی سے زیادہ قیمتی ہے۔ بات آئی گئی ہو گئی، لیکن ایک بات نے ضرور ہمارے دل میں گھر کر لیا کہ جب اقبالؔ کی تمام فکر ہی اسلامی ہے تو کیوں نہ اِسی کو عنوان دے کر ایک کتاب تالیف کی جائے اور سیدھے سادے انداز میں اقبالؔ کی شخصیت اور اُن کے پیغام کو عام اہلِ ذوق سے متعارف کرانے کی کوشش کی جائے۔ گو ہمارے سامنے ہماری کتاب "اذانِ اقبالؔ" کی مثال اِس نتیجے کے ساتھ موجود تھی کہ وسائل نہ ہونے کے سبب وہ عام نہ ہو سکی۔ نہ ہی کسی اداریے نے اِس سلسلے میں ہمارے ساتھ کوئی تعاون کیا، تاہم ارادے کا دیا جلتا رہا، بجھنے نہیں دیا، لیکن طوالت بڑھتی

گئی اور اس کے ساتھ ہی خلش بھی کہ دیگر موضوعات پر تو کاغذ کالے کر رہا ہوں لیکن مرشدی اقبالؔ کے حوالے سے جو ارادہ باندھا تھا، اُس کو لکھنے کے لیے پتا مار کر کیوں نہیں بیٹھ پا رہا اور یہ حقیقت سامنے آئی کہ تمنا عین فطرت ہے لیکن اپنی تکمیل پر اختیار نہیں رکھتی۔ اُستاذی محترم فدا خالدی کا یہ شعر بھی اپنی بازگشت سناتا رہا:

خدا جب تک نہ چاہے آدمی سے کچھ نہیں ہوتا
مجھے معلوم ہے میری خوشی سے کچھ نہیں ہوتا

اسی دوران ایک اور بندۂ خدا مست کی بات یاد آئی:

کیوں سمجھتا ہے کہ انساں کا کہا ہوتا نہیں
اپنی منزل پر پہنچ کر دیکھ کیا ہوتا نہیں

لیکن یہ ''صاحبِ منزل'' لوگوں کی باتیں ہیں، میرا ایسا شکستہ پا، تھکا ماندہ مسافر تو منزل کی گرد کو بھی نہیں چھو سکتا۔ میں کس طرح ارادوں کو اپنا پابند بنا سکتا ہوں، ہاں اتنا کیا کہ جب بھی قلم اُٹھایا اپنے رب سے ہمیشہ شرحِ صدر کا طلب گار ہوا۔ اب بھی اسی سے رجوع کیا ہے، رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي، وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّن لِّسَانِي يَفْقَهُوا قَوْلِي ۔ اور اس کے ساتھ ہی وقت میں برکت کی دعا کی اور وما توفیقی الا باللہ کہہ کر قلم سنبھالا اور اللہ کا نام لے کر اس دیرینہ ارادے کی تکمیل کے لیے بیٹھ گیا۔ یوں الحمدللہ وبفضلہٖ تعالیٰ اقبالؔ کی یادیں پھر تازہ ہونے جا رہی ہیں۔ تاہم اس کام کے لیے خاکسار نے اپنے توشہ خانہ میں کتب کا جائزہ لیا تو تسلی بخش نہ پایا، پھر یہ کہ ان کتب کی سیر و سیاحت کے لیے اور منزلوں کی نشان دہی کے لیے بھی خاصا وقت درکار تھا، لہٰذا چند کا انتخاب کیا، کیوں کہ حیاتِ اقبالؔ کے بیان میں تکرار پائی جاتی ہے سو، اس سلسلے میں میرے لیے جس طبع شدہ مواد نے آسانی پیدا کی اور یہ کام میرے لیے سہل ہو سکا، وہ پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور کے شعبۂ اقبالؔ کی طرف سے شائع کردہ ''دائرۂ معارفِ اقبالؔ'' ہے جو ایک لائقِ تحسین کام ہے، بہت اچھا کام کیا گیا ہے، اور میں نے اس بہترین کام سے خوشہ چینی کی ہے تو اس کا شکریہ ادا کرنا بھی میرے لیے ضروری ہو جاتا ہے اور میرے حرفِ تشکر کے وہ حضرات بھی حق دار ہیں جن کی کتب بینی سے مجھے کئی جگہ فائدہ ہوا ہے،

اِن میں دو اہم شخصیات کی تالیفات جناب محمد رفیع الدین کی "حکمتِ اقبالؔ" اور جناب ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کی، "علامہ اقبالؔ شخصیت اور فکروفن" ہے۔ دعا گو ہوں، محمد رفیع الدین کے درجات بلند ہوں اور رفیع الدین ہاشمی صاحب صحتِ ایمانی و جسمانی کے ساتھ تادیر جہانِ اقبالؔ کی سیر و سیاحت میں گزاریں۔

خیال آفاقی

maablib.org

اس سے قبل کہ ہم اپنے قارئین کو اقبالؔ سے بہ حیثیت شاعرِ اسلام متعارف کرائیں بہتر خیال کرتے ہیں کہ اُن کے سامنے اقبالؔ کا مختصر سوانحی خاکہ پیش کر دیا جائے، حالاں کہ اقبالؔ کے بارے میں ایسا کچھ لکھنا کوئی نئی بات نہیں، خاصی کتابیں تحریر کی جاچکی ہیں، ایک اندازے کے مطابق اُن کی تعداد کوئی پچاس ہے، اُن میں تمیں اُردو اور دیگر غیر ملکی زبانوں میں لکھی گئی ہیں۔ لیکن ہم اِس جگہ جذبات میں جانے کی بجائے اختصاراً اقبالؔ کے خاندانی پس منظر اور اُن کے تعلیمی سفر کو بیان کریں گے اور یہ ضرورت ہمیں اس لیے پیش آرہی ہے کہ اقبالؔ کے پیغام اور اِس میں موجود اسلامی روح کو محسوس کرنے اور سمجھنے سے قبل، یہ جان سکیں کہ اقبالؔ کی شخصیت نے کس ماحول اور فضا میں تشکیل پائی اور اِس طرح اقبالؔ پسندوں کو آپ کے تشخص اور کلام کو فہم کرنے میں آسانی ہوسکے۔ خاندانی پس منظر بیان کرنے کا ہمارا دوسرا مقصد یہ بھی ہے کہ وہ نوجوان جو زندگی میں کچھ کرنا چاہتے ہیں لیکن اپنے گھر اور خاندان کی ناآسودگی کو دیکھ کر کچھ کر نہیں پاتے اور مستقبل سے مایوس ہوکر ہمت ہار بیٹھتے ہیں، اُمنگیں مرجاتی ہیں، خواب چکنا چور ہوجاتے ہیں اور ملک و ملت کو مستقبل کے اپنے اِن معماروں اور اِس افرادی قوت سے محروم ہونا پڑتا ہے جو کسی قوم کا قیمتی سرمایہ ہوا کرتا ہے، ہم اقبالؔ کے خاندانی پس منظر سے اِسی لیے اُنہیں آگاہی دلانا چاہتے ہیں کہ دیکھو اقبالؔ جس نے اپنی فکر و شخصیت کے ذریعہ تمام براعظموں، خصوصاً عالمِ اسلام میں ایک متاثر کن انقلاب پیدا کر کے پوری صدی کو اپنے نام کرلیا، وہ کسی بڑے رئیس اور جاگیردار خاندان کا فرد نہیں تھا، اُن لوگوں میں سے نہیں تھا جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا

ہوتے ہیں، بلکہ یاد رکھنے کی بات ہے، قدرت کا یہ دستور رہا ہے کہ بڑے لوگ اکثر چھوٹے گھرانوں میں ہی پیدا ہوتے ہیں، اور یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بڑے گھرانوں کے چھوٹے لوگوں نے خود کو کتنا ہی قد آور بنانے کی کوششیں کیں لیکن بونے کے بونے ہی رہے، دنیا کو اُن کے ہونے کا پتا چلا اور نہ اُن کے نہ ہونے کا کوئی علم ہو سکا، بلکہ بڑے بڑے صاحبانِ تاج و تخت اور شیش محلوں کے مکین بھی جب خاک نشین ہوئے تو پھر وہاں خاک ہی اُڑتے دیکھی گئی۔ وقت کو ایسی ایسی حسرت انگیز بازگشت سننے کو ملیں جو تاریخ کا عبرت ناک حصہ بن گئی ہیں:

بر مزارِ ما غریباں نے چراغے نے گُلے
نے پرِ پروانہ سوزد نے صدائے بُلبلے

جب کہ چھوٹے گھروں کے بڑے لوگوں کی آخری آرام گاہوں کے سرہانے آج بھی زبانِ حال سے صدا دے رہے ہیں:

گنج بخشِ فیضِ عالم مظہرِ نورِ خدا
ناقصاں را پیرِ کامل کاملاں را رہنما

اور جس فقیرِ روزگار کا تذکرہ ہمارے زیرِ لب ہے، اُسے دیکھیے، وہ کس بلند حوصلگی اور سرخ روئی کے ساتھ اپنے جذبۂ خودی کا اظہار کر رہا ہے:

زیارت گاہِ اہلِ عزم و ہمت ہے لحد میری
کہ خاکِ راہ کو میں نے بتایا رازِ الوندی

تو آیئے اب ذرا اس رازدارِ درونِ خانہ سے ملنے کے لیے رختِ سفر باندھتے ہیں اور اِسی فقیرِ روزگار کے لفظوں کو دہراتے ہیں:

''لوٹ پیچھے کی طرف گردشِ ایام تُو''

یہ گردشِ ایام ہمیں ایک سو اُنتالیس (۱۳۹) سال پیچھے لے آئی ہے اور ہم اس وقت اُس خطے کی سیر کر رہے ہیں جو پنجاب کہلاتا ہے، جس کی زمین زرعی پیداوار کے اعتبار سے برصغیر میں اپنی مثال آپ سمجھی جاتی ہے، یہ الگ بات کہ اِس سونا اُگلتی زمین نے سونے جیسے افراد کم ہی پیدا کیے ہیں، لیکن قدرت کو جانے اپنے کس پیارے کی ادا بھا گئی کہ اُس نے اِس کشتِ ویراں سے

ایک ایسا گلِ خوش رنگ پیدا کیا جس نے نہ صرف اس خطے بلکہ تمام برصغیر کو مہکا کر رکھ دیا، اور بعد میں تو یہ خوشبو ایسی پھیلی کہ لاہور سے بخارا و سمر قند اور پھر ایک دن دیارِ شرق سے نکل کر مغرب کے مے خانوں تک جا پہنچی۔ تو ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہ پھول جس جگہ کھلا ہے، وہ پنجاب کا قدیم شہر سیال کوٹ ہے جو بابِ کشمیر کہلاتا ہے، یہاں کے ایک سادہ سے گھرانے کا سرپرست شیخ نور محمد ہے، ان کا خاندان کشمیر سے نقل مکانی کر کے یہاں آباد ہوا ہے، شیخ نور محمد کے آباء و اجداد کشمیری برہمن تھے اور برہمن ہندومت کے لوگوں میں سب سے اونچی جاتی کے لوگ خیال کیے جاتے ہیں، جب کہ اسلام کی نظر میں کافر، برہمن ہوں کہ چمار، دونوں برابر ہیں، کیوں کہ کفر کی غلاظت میں دونوں ہی برابر کے شریک ہیں، تو یہ بھی کیا خوب ہے کہ صدیوں پہلے "اونچی جاتی" کے ان افراد کو بھول کر بھی یہ خیال نہ آیا ہوگا کہ انہی کی نسل میں سے ایک فرد، اَن گنت خداؤں کے جھگڑے سے نکل کر ایک خدائے حقیقی کے آگے سرنگوں ہو جائے گا اور اُس کے دینِ برحق کو اپنی حرزِ جاں بنالے گا اور اس نومسلم بابا لول نامی شخص کے بھی وہم و گمان میں یہ بات نہ ہوگی کہ اُن کی نسل میں ایک ایسا سپوت بھی جنم لے سکتا ہے جو نابغۂ روزگار شخصیت کا مالک ہوگا اور اُس کے حوالے سے اُن کا خاندان بھی ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

سلسلہ نسب:

کشمیر سے ہجرت کر کے سیال کوٹ آنے والے اقبالؔ کے بزرگوں میں شیخ جمال الدین کا نام لیا جاتا ہے، اُن کے ایک بیٹے شیخ محمد رفیق ہیں جن کے فرزند شیخ نور محمد وہ خوش نصیب انسان ثابت ہوئے جن کے ہاں وہ ستارہ طلوع ہوا جو محمد اقبالؔ کے نام سے لاکھوں دلوں کو جگمگا گیا۔

اقبالؔ کے بزرگوں کے احوال کی مزید تفصیل یہ ہے کہ کشمیری برہموں سے تعلق رکھنے والے بابا لول جو، بتوں کی اسیری سے آزاد ہو کر، خدائے واحد کی غلامی کا طوق پہن چکے تھے۔ جانے کن اسباب کی بنیاد پر سیر و سیاحت کو نکل گئے اور نہ جانے کتنی اجنبی زمینوں کی جہاں گشتی کرتے ہوئے سرزمینِ حرم جا پہنچے اور حج بیت اللہ سے سرفراز ہوئے۔ پھر نہ معلوم کیا حالات پیش آئے کہ وطن کی یاد نے ستایا، یا خونی رشتے یاد آ گئے، یا کوئی اور وجہ بنی کہ بارہ سال کے بعد

وطنِ مالوف کی طرف لوٹ آئے، تاہم واپس آنے پر وہ پہلے ایسے بابالول نہیں تھے، ایک تو اُن کے نام کے ساتھ حج کا لاحقہ لگ چکا تھا اور وہ بابالول حج پکارے جانے لگے تھے، دوسرے اب اُن کے پاس نہ صرف زمینی بلکہ روحانی سفر کے تجربات بھی تھے لہٰذا اپنے اِن روحانی تجربات کو مزید جلا دینے کے لیے وہ ایک صوفی بزرگ بابا نصر الدین کے ہاتھ پر بیعت کر کے اُن کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے اور اپنے زیادہ تر اوقات مرشد کی صحبت میں گزارنے لگے اور آخر اپنی سانسیں پوری کر کے، اپنے دادا پیر شیخ العالم شیخ نور الدین ولی کی درگاہ کے احاطہ میں ابدی نیند جا سوئے۔

مرحوم بابالول حج کی چند پشتوں کے بعد اُن کی اولاد میں شیخ اکبر کی شخصیت میں بھی یہی روحانی آثار محسوس کیے گئے، بلکہ سیاحت کا شوق بھی اُنھیں جیسے وراثت میں ملا تھا۔ لیکن اُن کی زندگی کا اہم واقعہ یہ ہے کہ وہ جس روحانی شخصیت کے ہاتھ پر بیعت ہوئے اُنھوں نے اپنے اِس نیک طینت مرید کو اپنی فرزندی میں بھی لے لیا۔ اِس طرح اکبر کے نصیب جاگے کہ ایک سید زادی اُن کے نکاح میں آ گئیں۔ مزید اُنھیں یہ سعادت بھی ملی کہ مرشد کے بعد اُن کے جانشین ہوئے۔ اِن باتوں سے اقبالؔ کی خصوصیات میں یہ بات بھی شامل ہے کہ وہ پیروں کی اولاد میں سے ہیں۔

شیخ اکبر کو بھی اپنے بزرگ بابالول حج کی طرح سیر و سیاحت کے شوق نے اُکسایا اور وہ کشمیر کے لالہ زاروں سے نکل کر پنجاب اور اِس کے گرد و نواح میں جانے کہاں کہاں گھومتے پھرے اور آخر سیالکوٹ میں آ کر ٹھہر گئے۔ ممکن ہے یہاں عارضی طور پر رہے ہوں، کیوں کہ کچھ روایات یہ بتاتی ہیں کہ اُن کی پشت میں شیخ جمال الدین پہلے شخص ہیں جو سیالکوٹ کے ایک قصبہ میں آ کر مقیم ہوئے۔ اُن کی اولاد میں چار بیٹے تھے جو معاشی ضروریات کے سبب آس پاس کے دوسرے علاقوں میں جا رہے۔ اُن میں ایک محمد رفیق نے جو بہت خوب صورت شخصیت کے مالک تھے، سیالکوٹ میں محلہ کھٹیاں میں رہائش اختیار کی اور یہاں پارچہ جات کی دکان کر لی۔ اِس طرح معاش و سکونت یک جا ہو گئیں۔ شیخ رفیق کی اولاد میں ایک بیٹے عبداللہ ریاست حیدرآباد دکن چلے گئے اور وہاں اپنے آبائی پیشے زراعت سے متعلق ہو گئے، دوسرے بیٹے غلام محمد نے پنجاب کے قصبہ زوپڑ میں معاشی ضرورت کے تحت سکونت اختیار کر لی۔ شیخ محمد رفیق ایک بار اپنے اِسی فرزند

غلام محمد کے پاس گئے ہوئے تھے کہ بیمار ہوئے اور کچھ روز اسی حالت میں رہ کر انتقال کر گئے۔

اقبالؔ کے بزرگوں کی کشمیر سے ہجرت کا سبب کیا تھا، ممکن ہے اُس وقت کشمیر کے غاصب اور ظالم حکمرانوں کا ظلم و جبر ہو، یا وہاں کے موسمی حالات و قدرتی آفات ہو سکتے ہیں، لیکن گمان غالب یہ ہے کہ سکھا شاہی کے دورِ جبر میں اِن حضرات نے نقلِ مکانی کی تو اس میں قدرتی آفات کو دخل نہیں ہو سکتا کیوں کہ آدمی جہاں رہتا بستا ہے، وہاں کے سرد و گرم حالات کا وہ عادی و خوگر ہو چکا ہوتا ہے۔ چناں چہ جس وقت کا یہ ذکر ہو رہا ہے کہ اقبالؔ کے اِن بزرگوں نے اپنے آبائی علاقے کو چھوڑ کر پنجاب کی طرف کوچ کیا، یہ انیس ویں صدی کا تیسرا عشرہ تھا۔ یہی وہ زمانہ ہے کہ کشمیر پر سکھ مسلط تھے اور یہ ۱۸۱۹ء سے ۱۸۴۶ء تک کا ۲۷ رسالہ دور کشمیر کی تاریخ کا بدترین دور تھا۔ اس دوران سکھوں نے کشمیری عوام پر ظلم و جبر کی وہ تاریخ رقم کی جو آج بھی ایک سیاہ باب کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایک انگریز سیاح ولیم مور کرافٹ، اِس دورِ سیاہ ناک کا نقشہ اپنی کتاب میں اِس طرح پیش کرتا ہے۔

کشمیر لہو لہو:

”سکھ کشمیریوں کو انسان نہیں، جانور سمجھتے ہیں، اگر کوئی سکھ کشمیری کو قتل کر دیتا ہے تو اُسے قانوناً سولہ روپے سے بیس روپے تک جرمانہ ادا کرنا پڑتا ہے، اِس میں مقتول کے خاندان کو اگر وہ ہندو ہوتا ہے تو چار روپے ملتے ہیں، اور اگر مقتول مسلمان ہوتا ہے تو اُسے فقط دو روپے دیے جاتے ہیں۔“

اسی زمانے کے ایک اور سیاح، بیرن شون برگ کا بیان ہے: ”گائے کے ذبیحہ کی سزا موت ہے۔ اگر کوئی مسلمان گائے ذبح کرتے پکڑا جاتا ہے تو اُسے سری نگر کی گلیوں میں گھسیٹا جاتا ہے اور پھر پھانسی پر لٹکا دیا جاتا ہے یا زندہ جلا دیا جاتا ہے۔“

اِن روح فرسا واقعات کا راوی کوئی مسلمان نہیں بلکہ دیارِ اغیار کے لوگ ہیں جو چشم دید گواہ کے طور پر ”آنکھوں دیکھا حال“ بیان کر رہے ہیں، لہٰذا کشمیر کے اِس پس منظر کو پیشِ نظر رکھ کر اگر غور کریں تو صاف پتا چلتا ہے کہ مسلمان اپنی اِس جنت نظیر وادی سے نکلنے اور اِدھر اُدھر بھٹکنے پر

کیوں مجبور ہوئے ہوں گے بلکہ کچھ شواہد ایسے بھی ملے ہیں کہ کشمیر سے نقل مکانی کرنے والوں میں مسلمان ہی نہیں ہندو بھی بڑی تعداد میں شامل تھے جو پنجاب کے مختلف علاقوں میں آ کر آباد ہو گئے۔

بیانیہ مغالطے:

عموماً اُن خاندانوں میں جو کسی ایک مخصوص پیشہ سے متعلق چلے آ رہے ہوتے ہیں اور اُن میں لکھنے پڑھنے کا بھی کوئی خاص رواج نہ ہو تو اُن کی زندگی ایک ہی ڈگر پر چلتی نظر آتی ہے، اور خاندانی اور نجی حالات ایک دو پیڑھی کے بعد معدوم نہیں تو موہوم ضرور ہو جاتے ہیں، اور کچھ باتیں سینہ بہ سینہ چلی بھی آتی ہیں تو اُن میں سند اور صداقت کا تلاش کرنا مشکل ہو جاتا ہے، یا پھر وہ باتیں آپس میں اتنی گڈمڈ ہو جاتی ہیں کہ ایک روایت دوسری روایت سے متصادم لگتی ہے۔ مثلاً اقبالؔ کے اُن بزرگوں کے ذکر میں، ایک جگہ یہ لکھا گیا ہے کہ شیخ محمد رفیق کے ایک بیٹے ریاست حیدرآباد دکن چلے گئے اور دوسرے نے قصبہ روپڑ میں قیام کر لیا، جہاں شیخ رفیق نے وفات پائی۔ جب کہ ایک اور روایت میں یہ کہا گیا ہے کہ شیخ محمد رفیق کے ہاں، یکے بعد دیگرے دس بیٹے پیدا ہوئے، مگر سوئے اتفاق اُن میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچا، ۱۸۳۷ء میں گیارہواں بیٹا تولد ہوا جس کا نام نور محمد رکھا گیا۔ اِس ضمن * ، کہا جاتا ہے کہ معاشرے میں عموی توہم پرستی، جہالت (ناخواندگی)، ضعیف الاعتقادی ؛ ادور دورہ تھا۔ گھرانے کی زیادہ تر مستورات بھی ٹونے ٹوٹکے اور تعویذ گنڈوں پر یقین رکھتی تھیں، ، ی سوجھا تو ناک چھید کر اِس میں ایک چھوٹی سی نتھ ڈال دی گئی تا کہ موت کا فرشتہ اُسے لڑکی سمجھ کر ں ، ے۔ اِس ٹوٹکے کا بھلا کیا اثر ہوتا، زندگی اور موت تو قادرِ مطلق کے ہاتھ میں ہے۔ اِس کا فیہ ا تھا کہ گیارہواں بیٹا زندہ رہے گا۔ طویل عمر پائے گا، اور اُس کی نسل سے محمد اقبالؔ پیدا ہو گا جو نہ صر ۔ ہ ت اسلامیہ بلکہ پورے عالمِ انسانیت کو اقبال مندی کا راستہ دکھائے گا۔ ہاں اِس نتھ کی وجہ۔ ، شیخ : ر محمد کا نام "شیخ نتھو" ضرور پڑ گیا۔

بہر حال، ہم نے اس کشمیری مہ : جر خاندان کا نسبی پہلو سے جائزہ لیا ہے، اور اب اگر اِس اعتبار سے دیکھتے ہیں کہ اُن کی سماجی ، یثیت کیا تھی تو نظر آئے گا کہ شیخ نور محمد عرف نتھو کے بزرگ

زراعت کے پیشے سے منسلک رہے تھے، جب کہ بعد میں وقت کے ساتھ ساتھ اور معاشی ضروریات نے اُنہیں مختلف کام اور دھندوں میں بانٹ دیا۔ جیسا کہ اقبالؔ کے دادا شیخ محمد رفیق کے بارے میں معلوم ہوا کہ اُنہوں نے سیال کوٹ میں آ کر پارچہ جات کی دکان کھول لی تھی اور اُن کے ایک بھائی عبداللہ ریاست حیدرآباد دکن چلے گئے تھے جہاں اپنے آبائی پیشہ زراعت سے وابستہ ہو گئے۔

اب وجد:

شیخ رفیق نے اپنے فرزند، نور محمد کو شروع سے ہی جب ان میں کچھ سوجھ بوجھ آ گئی تو اپنے کام میں شامل کر لیا اور وہ کاروبار میں باپ کا ہاتھ بٹانے لگے، پھر سنِ بلوغت کو پہنچے تو باپ نے یہ دیکھ کر کہ بیٹا کمانے کھانے کے لائق ہو گیا ہے، اُس کی شادی سمریال ضلع سیال کوٹ کے ایک کشمیری گھرانے میں کر دی اور اُنہیں الگ سے لوئی اور دھسوں کا کاروبار کرا دیا، جو دراصل اُن کے اپنے کاروبار بزازی سے ہی جُڑا ہوا تھا۔ پھر جب وہ بوڑھے ہو گئے تو کُل کاروبار نور محمد نے سنبھال لیا۔ لیکن یاد رہے یہ کوئی بہت بڑی تجارت نہیں تھی، بس واجبی سا کاروبار تھا۔ والد کے انتقال کے بعد، نور محمد نے ہمت نہیں ہاری، بلکہ اپنے اِس چھوٹے سے کاروبار کو وسعت دینے کی کوشش کی، بزاز خانے میں برقعوں کی ٹوپیاں تیار کرنا شروع کر دیں۔ اِس کے ساتھ ہی درزی خانہ کھول لیا اور کپڑوں کی سلائی کا کام بھی شامل کر لیا۔ اِس کے لیے اُنہوں نے سلائی مشین بھی منگوائی، بلکہ کہا جاتا ہے، سیال کوٹ میں سب سے پہلے سلائی مشین منگوانے والے یہی شیخ نور محمد تھے۔ اِس طرح شیخ رفیق مرحوم کی چھوڑی ہوئی دکان کو اُن کے فرزند نے ایک چھوٹے موٹے کارخانے کی شکل دے دی۔

والد بزرگوار:

شیخ نور محمد نے معاشی طور پر خود کو کسی حد تک مستحکم کر لیا تھا اور بہت آرام سے بسر ہو رہی تھی۔ تاہم اِن سب باتوں کے باوجود یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اُن کا شمار شہر کے صاحبِ حیثیت لوگوں میں ہوتا تھا۔ لیکن شیخ نور محمد کو اُن کے دوست احباب، خاندان اور برادری میں جو عزت و مقام حاصل تھا، وہ کہیں اُس سے کئی گنا زیادہ تھا، اور اِس عزت و احترام کا سبب اُن کی شخصیت کے وہ اوصاف

تھے جو، اُن میں نمایاں نظر آتے تھے۔ وہ ناخواندہ تھے، صرف قرآن کریم ناظرہ پڑھ رکھا تھا، مگر اپنی خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے پڑھے لکھوں سے زیادہ پڑھے لکھے سمجھے جاتے تھے، اور عین شباب کے عالم میں بھی اُن کا بزرگوں کی طرح احترام کیا جانے لگا تھا اور لوگ اُنہیں ''میاں جی'' کہہ کر مخاطب کرتے اور سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ بنیادی طور پر وہ صوفی مشرب تھے، اسی وجہ سے اُن کے اندر خوش اخلاقی، خدا ترسی اور انکسار حد درجہ رچ بس گیا تھا۔ سلیقہ مندی اور رکھ رکھاؤ نے الگ اُن کی شخصیت کو نکھار دیا تھا۔

ان خوبیوں کے ساتھ، اللہ نے اُنہیں ایک اور نعمت سے نوازا، پہلی اولادِ نرینہ عطا فرمائی، غالباً اِسی نسبت سے اُنہوں نے بیٹے کا نام عطا محمد رکھا۔ شیخ نور محمد کیوں کہ خود مکتب کی تعلیم سے رہ گئے تھے، شاید یہی وجہ تھی کہ اُنہوں نے بیٹے کو جیسے ہی اُس نے ہوش سنبھالا، پڑھنے بٹھا دیا، اور اُن کی تعلیم پر خصوصی توجہ دینا شروع کی، اور بیٹے کا ذہنی رجحان دیکھ کر اُنہیں ٹیکنیکل تعلیم دلوانے کے لیے ''رُڑکی'' شہر میں واقع انجینئرنگ کالج میں داخلہ دلوا دیا، جہاں سے اُنہوں نے ڈپلوما حاصل کیا اور انجینئر بن کر مستقبل میں خاصی اطمینان بخش زندگی گزاری۔ شیخ عطا محمد کی تعریف میں جو خصوصی اور قابلِ ذکر بات ہے، وہ اپنے چھوٹے بھائی اقبالؔ کی حصولِ تعلیم میں مالی معاونت ہے۔ لاہور اور یورپ میں اقبالؔ کی تعلیم کے زیادہ تر اخراجات یہی اُٹھاتے رہے۔

اَن پڑھ فلسفی:

اگر شیخ نور محمد کی شخصیت کے پرہیز گارانہ پہلو پر مزید گفتگو کرنا چاہیں تو اس کی گنجائش موجود ہے، شیخ صاحب نہایت متقی اور پرہیز گار انسان تھے، پنج وقتہ نمازوں کے علاوہ نوافل، تہجد اور دیگر ذکر و اذکار اُن کے معمولات میں شامل تھے، خصوصاً کلامِ پاک کی تلاوت بہت ہی ذوق و شوق سے کرتے، یہی نہیں بلکہ، اللہ سے تعلقات کے ساتھ ساتھ اُس کے بندوں کی خدمت میں بھی انہیں خصوصی دل چسپی تھی وہ عملاً اُن کے کام آتے، کتابی علم نہ ہونے کے باوجود، دین و ایمان اور خصوصاً تصوف کے اہم موضوعات میں خاصی دل چسپی لیتے اور اس کے لیے اکثر اوقات اہلِ علم و فضل حضرات کی صحبت میں گزارتے اور کسبِ فیض کرتے۔ اِن صاحبانِ علم و فضل کی محفلوں میں

پابندی سے جانے کے علاوہ خود اُن کے کاروبار کی جگہ اور گھر میں بھی اس طرح کی مجلسیں گرم رہتیں۔ ان باذوق حضرات کی صحبتوں نے اُن کی باتوں کو عالمانہ و فاضلانہ بنا دیا تھا۔ ایسی ایسی نکتہ آفریں گفتگو کرتے کہ سننے والے حیرت میں رہ جاتے، یہی وجہ ہے کہ لوگوں نے انہیں ''اَن پڑھ فلسفی'' کہنا شروع کر دیا تھا۔

ان کی خدا ترسی اور پرہیز گاری کا اندزہ اس واقعے سے لگایئے کہ جب انہوں نے عملی زندگی کا آغاز اس طرح کیا کہ ڈپٹی وزیرِ اعلیٰ کے ہاں ملازمت اختیار کر لی، لیکن جلد ہی اسے ترک کر کے الگ ہو گئے۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ ملازمت کی آمدن کا کچھ حصہ ایسا بھی تھا جو کسبِ حلال کے اسلامی تصور پر پورا نہیں اُترتا تھا بلکہ شعور کی پختگی کے بعد جب وہ تصوف اور روحانیت کی طرف راغب ہوئے تو ان بہت سی باتوں کو اُن کے دل نے قبول نہیں کیا جو شریعت سے تجاوز کرتی تھیں اور صوفیا کے مسلک میں در آئی تھیں۔ تاہم وہ تصوف بہ قیدِ شرع کے پابند تھے، اور روحانیت اُن کے دل و دماغ میں رچ بس گئی تھی۔ اُن کے اس روحانی ذوق اور پاکیزہ فکری کی ایک جھلک اُن کے اس خواب سے عیاں ہے جس کی تعبیر اقبالؔ کی صورت میں اُن کے سامنے آئی۔ اس خواب کا تذکرہ اس لیے ضروری ہے کہ اس کی تعبیر ہی تو ہمارا موضوع ہے۔

خوابِ عجیب:

شیخ نور محمد چالیس سال کی عمر کو پہنچ چکے تھے کہ ایک رات انہوں نے خواب دیکھا، وہ ایک وسیع میدان میں موجود ہیں، جہاں کافی لوگ جمع ہیں۔ یہ لوگ فضا میں اُڑتے ہوئے ایک خوب صورت پرندے کو جو کبوتر کی طرح کا ہے، پکڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہر ایک کی کوشش ہے کہ وہ پرندہ اُس کے ہاتھ لگ جائے، لیکن پرندہ ہے کہ کبھی نیچے آتا ہے اور کبھی پرواز کرتا ہوا آسمان کی طرف چلا جاتا ہے، کچھ دیر تک یہ سلسلہ جاری رہتا ہے کہ یک بارگی وہ خوب صورت پرندہ پرواز کرتا ہوا نیچے آتا ہے اور اُن کی جھولی میں آن گرتا ہے۔

تعبیرِ اقبال مند:

اس عجیب و غریب خواب کی تعبیر اس طرح دیکھنے میں آئی کہ کچھ روز کے بعد ہی یعنی

۱۸۷۷ء کے گیارہویں مہینے کا نواں دن تھا کہ شیخ نور محمد کو بیٹے کی پیدائش کا مژدہ سننے کو ملا۔ چناں چہ انہوں نے مذکورہ خواب کی صداقت کو پیشِ نظر رکھ کر کہ یہ اقبال مندی کی علامت ہے، نومولود کا نام اقبالؔ تجویز کیا۔

خانۂ نیک نام:

شیخ نور محمد جو پہلے ہی روحانی دنیا کے مسافر تھے، اپنے خواب اور خواب کی تعبیر کو بیٹے کی صورت میں دیکھ کر اپنے من میں ڈوب گئے۔ گو اقبالؔ سے پہلے بھی وہ صاحبِ اولاد تھے، بیٹے کی شکل میں اولادِ نرینہ بھی اللہ نے دے رکھی تھی، لیکن اُن کا وجدان انہیں اِس دوسرے بیٹے کی طرف خصوصی توجہ دینے پر زور دینے لگا۔ اُنہیں محسوس ہوا جیسے اُن کے اندر کی آنکھ، اِس نئے مہمان میں کچھ اور ہی دیکھ رہی ہے۔

یاد رہے شیخ نور محمد کی اِن روحانی دلچسپیوں اور شخصی اوصاف کے تذکرے سے یہ تاثر نہیں لینا چاہیے کہ ہم اُنہیں کوئی ولی اور صوفی بنا کر پیش کرنا چاہتے ہیں، نہیں بلکہ اُن کی شخصیت کے ان پہلوؤں کے بیان کا مقصد ایک دین دار مسلمان کی مثال پیش کرنا ہے کہ ایک مسلمان کس طرح اپنی زندگی کو اِس اعتدال کے ساتھ گزار سکتا ہے کہ وہ کسبِ معاش بھی کر رہا ہے، اولاد کو صحیح تعلیم و تربیت بھی دے رہا ہے، اور پاکیزہ اعمال کو اپنا کر تزکیۂ نفس اور اپنی روحانی بالیدگی کا سامان بھی کرتا رہتا ہے۔ تو یقیناً شیخ نور محمد جو ایک سعادت مند بیٹا بھی ہے، اچھا شوہر بھی اور اچھا باپ بھی ہے اور یہ سب اِس لیے ہے کہ وہ ایک بہتر مسلمان اور دین و ایمان سے لگاؤ رکھنے والا شخص ہے جو دین و دنیا، دونوں کو ساتھ لے کر چل رہا ہے۔ ویسے بھی یہ وقت ایسا تھا کہ مسلمان گھرانوں میں کسی قدر اسلامی ماحول زندہ تھا اور اخلاقی قدریں عام تھیں، دین و عقیدے سے محبت، نیک چلنی، خدا ترسی و خدا خوفی، صبر، سادگی اور شرم و حیا، اور اللہ و رسول کا چرچا، تقریباً ہر مسلمان گھر میں پایا جاتا تھا، شیخ نور محمد کے گھر کی بھی یہی فضا تھی، اُن کی اہلیہ امام بی بی کو بھی شوہر کی طرح لکھنا پڑھنا نہیں آتا تھا، لیکن اُس وقت کی عام خواتین کی طرح ناظرہ قرآن پڑھی ہوئی تھیں اور نہ صرف خود پابندی سے صبح کا آغاز تلاوتِ قرآن سے کرتیں بلکہ دن کے حصے میں آس پڑوس کی بچیوں کو بھی

قرآن سکھاتیں اور انہیں نیک چلنی کا سبق دیتیں۔ بہت ہی خدا ترس اور نیک بی بی تھیں، دل میں اوروں کا درد رکھتیں، اکثر کسی نادار اور بے سہارا بچی کو دیکھتیں تو اُسے اپنی سرپرستی میں لے لیتیں اور اُس کی ہر ممکن مدد کرتیں، یہاں تک کہ اُن کے رشتے ناتے اور شادی بیاہ کرانے میں بھی دل کھول کر حصہ لیتی رہتی تھیں۔

رسم بسم اللہ:

یہ ماحول تھا اُس گھرانے کا جہاں اقبال نے آنکھیں کھولیں۔ لہٰذا جیسے ہی وہ زمانہ شیر خواری سے آگے بڑھے اور اس سن وسال میں قدم رکھا، کہ جب بچے کو حرف شناسی کرائی جاتی ہے تو رسمِ بسم اللہ کا اہتمام کیا گیا، اس وقت بھی اور اب بھی اِس نورانی اور روحانی رسم کی ادائی کے لیے ہمارے ہاں بچے کی جو عمر مقرر کی گئی ہے وہ چار سال، چار ماہ اور چار دن ہے۔ چناں چہ اقبال کے لیے بھی اِس تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ اِس طرح اُس تعلیم وتربیت کا آغاز ہو گیا جو دستور کے مطابق گھر سے بچے کے لیے شروع کی جاتی ہے، یعنی ماں کی گود بچے کی پہلی درس گاہ ہوتی ہے اور پورے گھر کا ماحول ہی بچے کی تربیت اور اُس کی ذہنی نشوونما کے لیے مؤثر ہوتا ہے۔ تو ہم جس دور کی بات کر رہے ہیں، اُس وقت کسی نرسری اور کنڈر گارڈن کا کوئی وجود نہیں تھا، تعلیم کا آغاز گھر سے ہی کیا جاتا تھا۔ لیکن شیخ نور محمد اپنے اِس اقبال مند بیٹے کی تعلیم وتربیت میں بہت آگے کی سوچ رہے تھے۔ چناں چہ اُنہوں نے گھر کے قریب ہی شوالے والی مسجد میں آپ کو بٹھا دیا جس کے مہتمم مولوی غلام حسن صاحب تھے۔

مشنری اسکولوں کی بدخواہی:

ہندوستان بھر میں انگریز حکمرانوں کی سرپرستی میں عیسائی مشنری اسکول کا جال پھیلا ہوا تھا جن کا اصل مقصد مقامی آبادی کو اُن کے آبائی مذہب سے منحرف کر کے تثلیث پرست بنانا تھا، اور اُس کا پہلا ہدف مسلمان تھے، کیوں کہ مسلمانوں کو وہ اپنا سب سے بڑا حریف سمجھتے تھے، وہ جانتے تھے کہ مسلمانوں سے اقتدار چھین کر ہی اُنہوں نے ہندوستان پر قبضہ کیا ہے لہٰذا اس بات کا اُنہیں اچھی طرح علم تھا کہ مسلمان اُن کے محکوم ضرور ہو گئے ہیں لیکن دل سے اُن کے اقتدار کو تسلیم نہیں

کرتے۔ ہاں یہ حقیقت تھی کہ مسلمانوں نے اقتدار کھودینے کے باوجود، انگریزوں کی حکمرانی کو ایک دن کے لیے بھی دل سے تسلیم نہیں کیا۔ جب کہ غلامی تو انسانی فطرت کو قبول ہی نہیں ہے۔ لہٰذا انگریزی تعلیم خصوصاً انگریزی زبان پڑھنے لکھنے سے مسلمانوں کو سخت پرہیز تھا۔ اس کا سبب صرف یہی نہ تھا کہ انگریز غاصبوں کی طرف سے اُن کے دل میں نفرت بیٹھی ہوئی تھی، بلکہ اُن کے اور بھی خدشات تھے، جیسا کہ کہا گیا، عیسائی مشنری کے عزائم یہ نہیں تھے کہ تعلیم کو عام کیا جائے، بلکہ وہ اس نام نہاد جدید تعلیم کے پردے میں مسلمان بچوں کے خام ذہنوں میں شروع ہی سے اپنے دین و مذہب اور تہذیب وثقافت سے دور بلکہ باغی کر دینا چاہتے تھے۔ چناں چہ اُن کی اس مکروہ سازش کو ناکام بنانے اور اُن کی اس بدنیتی کا مقابلہ کرنے میں دینی مدارس کا اہم کردار تھا، یہ ادارے بہت بڑے پیمانے پر نہ سہی، گھروں اور مسجدوں میں قائم تھے اور مسلمان، اپنے بچوں کو شروع میں ہی ان سے وابستہ کر دیا کرتے تھے تاکہ بعد میں اگر انہیں انگریزی نام نہاد جدید تعلیم سے واسطہ پڑے بھی تو نئی نسل اس کے منفی اثرات ومضمرات سے محفوظ رہ سکے۔ یقیناً شیخ نور محمد بھی مشنری اسکولوں کے متعلق یہی خیال رکھتے ہوں گے، اور اقبالؔ سے متعلق اُنہوں نے سوچا بھی نہ ہوگا کہ وہ اپنے بیٹے کو تعلیم کے لیے ایسی جگہ بھیجیں گے جہاں ایک سازش اور باقاعدہ منصوبہ بندی کے ذریعہ علم کے نام پر جہل اور خدمت کے نام پر عصبیت کو عام کیا جاتا ہے، یہ باتیں اس جگہ ہم اس لیے ذکر کے قابل سمجھتے ہیں کہ اقبالؔ جس تعلیمی سفر پر قدم رکھ رہے ہیں معلوم ہو جانا چاہیے، وہ اُس وقت کن خدشات اور مضمرات سے بھرا ہوا تھا، اور یہ کہ اقبالؔ کے بزرگوار اُس وقت کے تعلیمی ماحول کو دیکھتے ہوئے اقبال کو اس منافقانہ تعلیمی ماحول میں نہ بھیجتے تو انیس ویں صدی کے مسلمان جہلِ خرد کے ہاتھوں میں کھلونا بنے رہتے، نہ خودی کو پہچانتے، نہ جذبۂ حریت سے واقف ہوتے، اور نہ ہی آج ہم اس عظیم فلسفی ومفکر کا تذکرہ کر رہے ہوتے، لیکن انسانی عقل، قدرت کی حکمتوں کا اندزہ نہیں لگا سکتی اور نہ ہی اُس کی شیرازہ بندی کا ادراک کر سکتی ہے۔

قدرت کی حنابندی:

اب دیکھیے شیخ نور محمد جیسا راسخ العقیدہ شخص کس طرح اپنے مؤقف سے ہٹ کر بیٹے کو

انگریزوں کی اِسی مشنری اسکول میں بھیجنے کو تیار ہو جاتا ہے اور کس طرح قدرت اقبالؔ کو فرعون کی گود میں موسیٰ کی طرح پرورش کراتی ہے۔ ہندوستان کے دیگر علاقوں کی طرح سیال کوٹ میں بھی اسکاچ مشنری اسکول کا قیام عمل میں آ چکا تھا، جب کہ دینی مدارس یہاں پہلے ہی اپنا فریضہ ادا کر رہے تھے۔ خصوصاً اِس طرح کے چار مراکز قائم تھے۔ دو مدرسوں میں دینیات اور عربی زبان کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اِن درس گاہوں کے سرپرست مولوی حسن اور مولوی مزمل تھے۔ ایک مولوی سید میر حسن کی نجی درس گاہ تھی جس میں عربی اور فارسی زبانوں کی تدریس کی جاتی تھی۔ اقبالؔ کو جیسا کہ پہلے بتایا، مولوی غلام حسن کے مدرسہ میں بٹھایا گیا جو شوالے والی مسجد میں قائم تھا۔ اقبالؔ یہاں کوئی ڈیڑھ سال تک قرآن کریم اور عربی زبان کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ اِس جگہ ایک واقعہ یہ ہوا کہ ایک روز مولانا سید میر حسن صاحب اِس درس گاہ میں آئے ہوئے تھے کہ معائنہ کے دوران یکا یک اُن کی نگاہ ایک بچے پر پڑی جو اپنے دیگر ہم مکتب کے درمیان پھولوں میں گلاب کی طرح الگ ہی نظر آ رہا تھا، خوب صورت رنگ روپ کے بچے کی آنکھوں سے ذہانت و متانت روشنی کی طرح پھوٹ رہی تھی۔ سید صاحب نے مدرسہ کے مہتمم مولوی غلام حسن سے دریافت کیا۔ ''یہ بچہ کون ہے، کس کا ہے؟''

''شیخ نور محمد ٹوپیوں والے کا بیٹا ہے، اقبالؔ نام ہے۔'' غلام حسن صاحب نے بتایا اور میر حسن صاحب واپسی پر سیدھے شیخ صاحب کے پاس اُن کی دکان پر گئے اور اُنہیں مشورہ دیا کہ ماشاءاللہ آپ کا بیٹا بہت ذہین و فطین ہے۔ اُسے محض دینی تعلیم تک ہی محدود نہ رکھیے بلکہ ضروری ہے کہ اُسے جدید عصری تعلیم بھی دلائی جائے۔

استادِ اوّل:

شیخ نور محمد کچھ دن تذبذب میں رہے کیوں کہ دیگر مسلمانوں کی طرح وہ بھی جدید تعلیم کے مخالف تھے اور اُسے اسلامی قدروں کے منافی سمجھتے تھے، لیکن سید صاحب سے بھی اُن کی عقیدت تھی، لہٰذا اُن کے اصرار پر سوچنے لگے۔ یقیناً مولوی صاحب کو اقبالؔ کے اندر کوئی غیر معمولی بات نظر آئی ہے جب ہی تو یہ مشورہ دے رہے ہیں۔ لہٰذا اُن کے مشورے پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا اور

اقبالؔ کو اُن کی سرپرستی میں دے دیا۔ چناں چہ سید صاحب نے اقبال کو اپنے مکتب میں جو گھر سے بہت ہی قریب کوچۂ میر حسام الدین میں واقع تھا، اُردو، فارسی اور عربی ادب پڑھانا شروع کر دیا۔ میر حسن صاحب اپنے اس شاگرد کی ذہانت کو پہچان چکے تھے اور اس کی متانت سے بے حد متاثر تھے، لہٰذا اس پر اپنی خصوصی توجہ مرکوز کر دی۔ میر حسن اس سلسلے میں بجا طور پر اس فخر کے مستحق ہیں کہ اُن کے تلامذہ میں مستقبل کا ایک عظیم معلمِ قوم شامل ہو گیا تھا اور اقبالؔ اس سلسلے میں خوش نصیب ہیں کہ اُنہیں ایک لائق و فائق اور صاحبِ نظر اُستاد میسر آ گئے۔

اسکاچ مشن اسکول میں داخلہ:

اقبالؔ کوئی ڈیڑھ سال تک میر حسن کی شاگردی اور سرپرستی میں حصولِ علم کرتے اور اُستاد صاحب کے کردار سے گفتار سے مستفید ہوتے رہے۔ اس عرصہ میں سید میر حسن کا اسکاچ مشن اسکول سیالکوٹ میں عربی و فارسی کے اُستاد کی حیثیت سے تقرر ہو گیا تو اُنہوں نے اپنے اس عزیز شاگرد سے اس طرح رشتہ برقرار رکھا کہ شیخ نور محمد کو جو پہلے ہی راضی کر چکے تھے، اُن کے ایما سے اقبالؔ کو اپنے ہی اسکول میں جماعت اوّل میں داخلہ دلوا دیا۔ تو جیسا ہم نے کہا، قدرت اپنا کارِ صف بندی جاری رکھتی ہے، جسے دیکھ کر عقل انگشت بہ دنداں رہتی ہے۔ یہ سن ۱۸۸۴ء کی بات ہے جب کہ اقبالؔ کی عمر آٹھ سال تھی۔ اُس وقت پرائمری کی سطح پر اُردو کے علاوہ فارسی زبان لازمی مضمون تھا اور مڈل جماعت میں عربی اختیاری (آپشنل) حیثیت رکھتی تھی۔ اُس زمانے کے یوں تو اکثر اساتذہ ہی اپنے کارِ منصبی کو نہایت دیانت داری سے ادا کرتے تھے، لیکن میر حسن ایسے صاحبِ فضیلت اُستاد اُس وقت بھی ایک مثالی حیثیت کی حامل شخصیت تھے، علم کی تدریس اُن کے نزدیک عبادت کا درجہ رکھتی تھی، روز و شب اِس روشنی کو عام کرنے میں کوشاں رہتے۔ اسکول کے بعد گھر میں بھی درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا ہوا تھا۔ جہاں اِن اوقات میں وہ اپنے عزیز ترین شاگرد کو خصوصی طور پر اور نہایت فراخ دلانہ انداز میں تعلیم و تربیت سے نوازتے رہتے تھے۔

اقبالؔ کا تعلیمی تسلسل اِس طرح آگے بڑھتا رہا کہ پہلی جماعت سے مڈل تک کے تمام مرحلے طے ہو گئے۔ یعنی ۱۸۸۵ء میں اسکول کا جو سفر شروع ہوا تھا، وہ ۱۸۹۱ء میں پرائمری سے

مڈل تک آن پہنچا۔

یاد رہے اُس وقت اصولِ نصاب یہ تھا کہ پرائمری اوّل دو سال، اور پرائمری دوم تین سال پر مشتمل ہوا کرتا، اور مڈل کا پہلا امتحان پنجاب یونیورسٹی کے تحت لیا جاتا تھا۔ اقبالؔ کو مڈل کے امتحان میں یہ تخصیص ملی کہ وہ عربی کے مضمون میں اوّل حیثیت حاصل کر کے وظیفہ کے حق دار ٹھہرے۔

میٹرک پاس نوشہ:

اُن دنوں سیال کوٹ میں کوئی امتحانی مرکز نہیں تھا، اس وجہ سے اقبالؔ نے میٹرک کا امتحان گجرات سینٹر سے دیا اور اتفاق سے گجرات ہی میں اُنہیں میٹرک کے نتیجے کی خبر عین اُس وقت موصول ہوئی جب وہ دولھے والا سہرا باندھے گھوڑے پر سوار تھے۔ جی ہاں، یہ عجیب اتفاق ہے۔ دراصل اقبالؔ کے بزرگوں نے شروعِ شباب ہی میں اُن کا رشتہ گجرات کے ایک صاحبِ حیثیت کشمیری گھرانے میں طے کر دیا تھا۔ اُس وقت اُن کی عمر ۱۶ سال اور دلہن کی عمر ۱۹ سال تھی۔ اقبالؔ کی اہلیہ کریم بی بی کے والد ڈاکٹر عطا محمد اپنے وقت کے قابل سرجن سمجھے جاتے تھے۔ کریم بی بی اُن کی بڑی صاحب زادی تھیں۔ اُن سے اقبالؔ کے ہاں دو اولادیں ہوئیں، ایک معراج بیگم جو ۱۸۹۶ء میں خنازیر کے مرض میں رہ کر انتقال کر گئی پھر ۱۸۹۸ء میں ایک بیٹا ہوا۔ آفتاب اقبال جو ۱۹۷۹ء میں انتقال کر گئے۔ یہ باتیں درمیان میں آ گئیں جن کا ذکر ضروری تھا۔ ورنہ اس وقت ہم اقبالؔ کے تعلیمی سفر کا تذکرہ کر رہے ہیں، تو جیسا کہ آپ کو بتایا، اقبالؔ کو میٹرک میں کام یابی کی اطلاع عین اُن کی بارات کے دوران دی گئی۔ اس میں یہ خوش خبری بھی شامل تھی کہ وہ فرسٹ ڈویژن میں کام یاب ہوئے ہیں اور عربی میں اوّل پوزیشن آئی ہے۔ جس کے صلہ میں اُنہیں تمغہ اور وظیفہ سے نوازا گیا۔ اس کے بعد ۵ رمئی ۱۸۹۳ء کو اسکاچ مشن کالج سیال کوٹ میں داخلہ لیا اور کالج کی زندگی شروع ہوئی مگر اس طرح کہ وہ شادی شدہ تھے۔

غیر نصابی سرگرمیاں:

اس سے قبل کہ ہم اقبالؔ کے تعلیمی سفر میں اُن کے ساتھ آگے بڑھیں، اُن کی غیر نصابی

سرگرمیوں پر بھی ایک نظر ڈال لیتے ہیں کہ اقبالؔ کی علم پسند طبیعت میں دیگر مذاقِ لطیفہ کا کتنا عمل دخل ہے۔ تو ہم دیکھ سکتے ہیں کہ حصولِ تعلیم کے دوران، اقبالؔ محض کتاب کے کیڑے بن کر نہیں رہ گئے، بلکہ کئی صحت مند تفریحات میں بھی سرگرم نظر آتے ہیں، ان غیر نصابی سرگرمیوں کی فہرست میں جو نمایاں چیزیں ہیں، وہ کبوتر پروری کا شوق، اکھاڑے میں جا کر ورزش اور تن سازی کی مشق اور شعر و شاعری سے لگاؤ شامل ہے، ورزش اور کبوتر بازی کے مشاغل میں اُن کے بچپن کے دوست جو اُستاد و مربی سید میر حسن کے صاحب زادے محمد تقی اور لالو نامی ایک پہلوان بھی شریک رہتے ہیں۔ طبیعت میں موزونیت اور آواز میں موسیقیت شروع سے ہی تھی، البذا مولانا میر حسن کی صحبت نے اُنہیں شعر گوئی کی طرف بھی مائل کر دیا۔ کیوں کہ میر حسن بہت اعلیٰ ذوقِ شعر رکھتے تھے، اُردو، فارسی اور پنجابی کے متعدد اشعار اُنہیں ازبر تھے اور اپنے شاگرد کے سامنے موقع بہ موقع اظہار کرنے میں کوئی تکلف نہیں کرتے تھے، جس نے اقبال کے اندر شعری ذوق کی لو بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا اور اقبال باقاعدہ شعر کہنے لگے۔ اصلاحِ سخن کے لیے اپنے وقت کے مسلم الثبوت اُستاد داغؔ دہلوی سے رابطہ کیا جو زیادہ عرصہ نہ چلا، کیوں کہ کچھ روز کے بعد ہی داغؔ صاحب نے سمجھ لیا کہ شاگرد کو اصلاح کی چنداں ضرورت نہیں، یہ نوجوان کافی سوچ سمجھ کر شعر کہتا ہے اور فنی لحاظ سے بھی ایسی کوئی خاص کم زوری نظر نہیں آتی جس کی درستگی کی جائے۔ چناں چہ اقبالؔ نے نہایت اعتماد کے ساتھ اپنا کلام ادبی رسائل کو بھیجنا شروع کر دیا۔ ۱۸۹۲ء میں ماہنامہ ''زبان'' دہلی نومبر کے شمارے میں پہلی غزل شائع ہوئی اور ۱۸۹۳ء کو بھی اِسی رسالے میں دوسری غزل شائع ہوئی، یوں کسی حد تک وہ شاعروں کی فہرست میں آنے لگے۔

شعری سفر:

اِدھر سیال کوٹ میں ہونے والے اُردو پنجابی مشاعروں میں بھی شرکت شروع کر دی، کیونکہ موسیقی سے بھی خاصی دل چسپی تھی اور آواز بھی سُریلی تھی چناں چہ سیال کوٹ میں ہونے والے اُردو اور پنجابی مشاعروں میں جاتے اور نہایت ہی دل کش ترنم سے غزل پڑھتے اور سننے والوں سے خوب داد وصول کرتے۔ دراصل اُس دور میں تفریحِ طبع کے یہی گنے چنے ذرائع

تھے، مشاعرہ تو ایک مدت سے برصغیر میں روایت بنا ہوا تھا، تاہم شاعری کا معیار اپنی قدیم روایت سے ذرہ برابر آگے نہیں بڑھا تھا۔ اس وقت تک کوئی ترقی یافتہ شاعری سننے میں آئی تھی تو وہ غالب کی تھی، لیکن غالب کے بعد بھی کسی نے اُن کا تتبع نہیں کیا، یا کسی نے کوشش کی بھی ہو گی تو بھاری پتھر چوم کر رکھ دیا ہو گا۔ لیکن ہم نے جو اندازہ لگایا ہے، وہ یہ کہ مشاعرے فکری شاعری کے متحمل ہی نہیں ہو سکتے۔ وہاں تو پھڑ کتے تھر کتے ہوئے مضامین کی ضرورت ہوتی ہے کہ اِدھر شاعر کے منہ سے شعر ادا ہوا، اور اُدھر سامعین کے منہ سے واہ واہ کا فوارہ پھوٹ نکلا، خصوصاً جس دور کی ہم بات کر رہے ہیں مشاعروں کا حال یہی تھا، مضامین ظاہر ہے، وہی فرسودہ، جنہیں وہ تر و تازہ سمجھتے تھے، یعنی محبوب، وہ بھی عورت اور وہ بھی کوئی باپردہ نہیں، شمعِ محفل، ''شمعِ محفل'' تو ہم کہہ رہے ہیں، شاعروں کے نزدیک تو یہ ایک ایسا آلہ ہے جسے وہ جیسا چاہیں اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرنے کا حق رکھتے تھے، (اور اب بھی شاید یہی حال ہے) اس کے سراپا کا سرِ محفل اظہار، ایک ایک انگ اور عضو کی تصویریں سرِ عام پیش کرنا، عشق و معاشقے اور ہجر و وصال کے وہ قصے جو کبھی وقوع پذیر نہیں ہوئے، مگر شاعر ہے کہ اس خیالی دنیا میں رہ کر نہ صرف خود لذتِ جنس سے تسکین پا رہا ہے، بلکہ اپنے سامعین کو بھی اس لطف میں شامل کر کے ثوابِ دارین حاصل کرتا ہے، تو اس صورتِ حال میں اقبالؔ کی شاعری سے متعلق کیا تصور کیا جا سکتا ہے؟ یہی نا کہ اُنہیں بھی اس مضحکہ خیز، بلکہ شرم ناک روایت کو اپنا کر مشاعروں کے بازارِ جنس میں آنا پڑا ہو گا۔ لیکن نہیں، جیسا کہ بعد میں علم ہوا، اقبالؔ کا اندازِ سخن گو کہ اپنے وقت کے اعتبار سے روایتی تھا، تاہم اس وقت بھی اس بازاریت سے گریزاں نظر آتا ہے۔ مثلاً ۱۸۹۳ء میں رسالے ''زبان'' دہلی میں شائع ہونے والی غزل کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

کیا مزا بلبل کو آیا شیوۂ بیداد کا
ڈھونڈتی پھرتی ہے اُڑ اُڑ کر جو گھر صیاد کا

☆

جان دے کر تمھیں جینے کی دعا دیتے ہیں
پھر بھی کہتے ہو کہ عاشق ہمیں کیا دیتے ہیں

یوں بھی اگر ہم غور کریں کہ اقبالؔ اوائل عمری ہی میں جب ایک الگ طبیعت اور جدا مزاج رکھتے تھے، جس کو سید میر حسن ایسی صاحب بصیرت شخصیت نے پانچ چھ سال کی عمر ہی میں پہچان لیا تھا تو یقیناً جب کہ وہ سِن بلوغت کو پہنچ چکے تھے، اور باقاعدہ شعر کہنے لگے تھے تو کیا اُن کے اشعار میں بھی اُن کے شعورِ خاص کی جھلک نہ ہوگی؟ یقیناً اُن کے خیالات میں جو وہ شعر میں ڈھالتے ہوں گے، اُس ماحول اور تعلیم و تربیت کا رنگ ضرور جھلکتا ہوگا جو اُنہیں گھر، مدرسوں اور اساتذہ سے ملی تھی۔

قرآن فہمی:

اس جگہ اُن کی اٹھارہ سالہ تربیت کا جزیاتی اور تفصیلی جائزہ تو ممکن نہیں، تاہم صرف ایک واقعہ ضرور بیان کریں گے جس سے اقبالؔ کی فکری نشو و نما اور شخصیت سازی کے بنیادی عنصر کا بہ خوبی علم ہوسکتا ہے۔

مدرسہ اور اسکول کا دور تھا، اقبالؔ نمازِ فجر ادا کرنے کے بعد، بزرگوں کی ہدایت اور معمول کے مطابق گھر میں قرآن کریم کی تلاوت کرتے تھے۔ والد صاحب مسجد سے واپس آتے تو بیٹے کو قرآن خوانی میں مصروف دیکھ کر خوش ہوتے اور اپنے کمرے میں چلے جاتے۔ لیکن کچھ دنوں سے اقبالؔ نے محسوس کیا کہ اباجی کی آنکھوں میں کوئی سوال ہے کہ وہ اُنہیں دیکھتے ہیں، کچھ کہنا چاہتے ہیں لیکن کہتے نہیں ہیں۔ آخر ایک روز اِسی طرح معمول کے مطابق اقبالؔ تلاوت کر رہے تھے کہ والد صاحب حسبِ معمول مسجد سے آکر گھر میں داخل ہوئے۔ بیٹے کو تلاوت میں مصروف دیکھا لیکن اپنے کمرے میں جانے کی بجائے اُس کے پاس ہی بیٹھ گئے۔ اقبالؔ نے تلاوت موقوف کر دی اور شیخ صاحب کئی لمحے تک بیٹے کو غور سے دیکھتے رہے، پھر پوچھا۔

"تم کیا پڑھ رہے ہو؟"

ظاہر ہے، اقبالؔ کے لیے یہ سوال تعجب خیز تھا۔ سوچنے لگے۔ اباجی دیکھ رہے ہیں کہ میرے ہاتھوں میں قرآن ہے اور میں تلاوت کر رہا ہوں، پھر بھی پوچھ رہے ہیں، میں کیا پڑھ رہا ہوں؟ بہر حال نہایت ادب سے جواب دیا۔

''ابا جی! قرآن مجید پڑھ رہا ہوں۔''

والد صاحب نے نہایت اطمینان مگر فہمائش کے انداز میں پوچھا۔

''جو کچھ تم پڑھتے ہو، وہ سمجھتے بھی ہو؟''

''جی، بس تھوڑا بہت سمجھ لیتا ہوں۔''

بیٹے کا جواب سن کر شیخ صاحب کچھ بولے بغیر اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے، اور اقبالؔ سوچ میں پڑ گئے کہ ابا جی کے سوال کا کیا مقصد ہے؟

بعد میں ایک موقع پر انہوں نے اس واقعے کو اس طرح بیان کیا۔ ''اس بات کو کئی روز گزر گئے، غالباً چھٹا دن تھا اور میں حسبِ معمول تلاوت کر رہا تھا کہ والد صاحب آئے اور جب میں تلاوت سے فارغ ہو چکا تو مجھے بلایا اور اپنے پاس بٹھا کر بہت نرم لہجے میں فرمانے لگے۔

'' بیٹے! قرآن مجید کو وہ سمجھ سکتا ہے جس پر اُس کا نزول ہو۔ تو جب تک تم یہ نہیں سمجھتے کہ قرآن مجید تمہارے قلب پر اُتر رہا ہے جیسے کہ رسول اللہ کے قلبِ اقدس پر نازل ہوا تھا، تو تلاوت کا مزہ نہیں، اور نہ ہی تم قرآن مجید کو پوری طرح سمجھ سکتے ہو، البتہ اگر تم تلاوت اِس طرح کرو جیسے یہ تم پر نازل ہو رہا ہے یعنی اللہ خود تم سے ہم کلام ہے تو یہ تمہاری رگ و پے میں سرایت کر جائے گا۔''

اس اہم ترین حکیمانہ نکتہ کو ذہن میں بسا کر ہی اقبالؔ نے اپنے شعور کی معراج پر پہنچ کر کہا:

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

یعنی جب تک قرآن سے تیرا روحانی تعلق نہ ہو، اور تجھے اِس بات کا ادراک نہ ہو کہ یہ اللہ کا کلام ہے اور تلاوتِ قرآن کے وقت تیرا یہ تصور پختہ نہ ہو کہ میں اللہ سے ہم کلام ہوں تو رازی اور صاحبِ کشاف جیسے اہلِ فلسفہ بھی تجھے قرآن کی آگاہی نہیں کرا سکتے۔

چناں چہ اقبالؔ کی روح میں یہ بات ایسی سمائی کہ زندگی بھر اس پر عامل رہے اور حقیقت یہ ہے کہ اُن کے تمام غور و فکر اور کلام کا ماخذ و حاصل یہی قرآن ہے، گویا اُن کی نثر ہو کہ شاعری، ان میں جو فکر و فلسفہ پایا جاتا ہے، وہ اسی کتابِ الٰہی کا پرتو ہے۔

کالج کی زندگی:

لیکن اس جگہ مناسب یہ ہے کہ ابھی اقبالؔ کے فکر و فلسفہ کی بات کرنے کی بجائے تسلسل کو برقرار رکھتے ہوئے، تعلیمی سفر کو آگے بڑھایا جائے۔

تو ہم دیکھ رہے ہیں کہ بائیس سالہ اقبالؔ انٹر پاس کر چکے ہیں، اور اب مزید تعلیم کے لیے لاہور جانے کی ضرورت پیش آ رہی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ۱۸۹۰ء کو اسکاچ مشن کالج سیال کوٹ میں انتہائی درجہ یہی انٹر تھا۔ چناں چہ گورنمنٹ لاہور میں داخلہ لیا گیا۔ ظاہر ہے یہاں رہائش کا مسئلہ پیدا ہوتا تھا۔ لہٰذا فوری طور پر تو اپنے ایک دوست گلاب دین کے مکان پر قیام کیا۔ پھر جلد ہی کالج کے کوارڈینگل ہاسٹل کمرہ نمبر ایک میں منتقل ہو گئے اور پھر کالج کا چار سالہ دورانیہ اسی کمرے میں گزارا۔

بی اے میں اُن کے مضامین، انگریزی، عربی اور فلسفہ تھے۔ انگریزی اور فلسفہ کی تدریس تو اسی کالج میں ہوتی تھی لیکن عربی کی تعلیم اورینٹل کالج میں دی جاتی تھی، یہ کالج اُس وقت، گورنمنٹ کالج لاہور کے نوتعمیر حصے میں قائم تھا۔ انگریزی پروفیسر ڈبلیو بیل (W BELL) اور بی جی ڈیلنجر (DALLINGER) پڑھاتے تھے جو کالج کے پرنسپل بھی تھے اور فلسفہ کی تعلیم پروفیسر جی بی یوشر (USHER) اور اسسٹنٹ پروفیسر لالہ جیارام کے ذمے تھی۔ اِدھر اورینٹل کالج میں عربی کے اُستاد مولوی محمد دین تھے۔

کالج میں طلباء کی تعداد دو سو سے ڈھائی سو تک ہوتی تھی۔ اقبالؔ یوں تو ان سب میں خوب گھل مل گئے تھے، تاہم اُن کے بہت قریب ہم جماعتوں میں فضل حسین، مرزا جلال الدین اور میر غلام بھیک نیرنگ زیادہ نمایاں تھے۔

شعر و سخن کی بزم آرائی:

تعلیمی سلسلہ جاری تھا کہ لاہور کی غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی آپ نے حصہ لینا شروع کر دیا۔ کئی ادبی محفلوں اور سماجی انجمنوں سے بھی روابط ہو گئے اور جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، اقبالؔ نے سیال کوٹ میں کالج کی پڑھائی کے دوران ہی شعر و شاعری شروع کر دی تھی، چناں چہ

یہاں لاہور میں بھی وہ حصولِ تعلیم کے دوران شعر و سخن کی محفلوں میں جانے لگے۔ خصوصاً اندرونی بھاٹی دروازے میں واقع بازار حکیماں میں حکیم شجاع الدین کے گھر پر جو محفلِ مشاعرہ منعقد ہوتی تھی، اُس میں شرکت کی۔ ایک اور صاحبِ ذوق حکیم امین الدین بیرسٹر کے ہاں منعقدہ مشاعرے میں بھی شریک ہوئے اور سامعین و حاضرین سے خوب داد پائی۔ یہ ۳۰ رنومبر ۱۸۹۶ء کی بات ہے۔ ہر چند کہ اقبالؔ نے اپنی ابتدائی شاعری کی بنیاد بھی روایتی شاعری پر رکھی تھی تاہم یہ ممکن نہ تھا کہ شیخ نور محمد کے گھر کا پروردہ اور مولانا سید میر حسن ایسے صاحبِ کردار عالم، فاضل اُستاد کا شاگرد و تربیت یافتہ، لغو و بے معنی شاعری میں ملوث ہو کر رہ جاتا۔ لہٰذا بہت جلد ہی اُنہیں اِس مشغلہ کی لایعنیت کا احساس ہو گیا اور اِس رائج الوقت شاعری سے اپنی فکر کو آلودہ ہونے سے بچا لیا۔ مشاعروں میں جانا ترک کر دیا اور اپنی شاعری کو قوم اور وطن کی محبت میں ڈھال دیا۔ اِس کا ثبوت اُنہوں نے لاہور میں قائم انجمن کشمیری مسلمانان کے ایک جلسہ میں اِس طرح دیا کہ اپنی نظم ''فلاحِ قوم'' نہایت پُرسوز اور درد بھرے انداز میں پیش کی۔

گو یہ طالب علمی کا دور ہے، لیکن اُن کے اِس غیر روایتی شاعرانہ انداز سے واضح ہو رہا ہے کہ وہ عام نوجوان نہیں، اُس نے ابھی سے نصابی کتب اور اپنی ذات سے نکل کر اپنے ملک و ملت کا مطالعہ و مشاہدہ شروع کر دیا ہے۔ اُن کی سوچ، قوم کی فلاح و بہبود سے وابستہ ہو کر رہ گئی ہے، وہ اپنے دل میں دردمند دل رکھتے ہیں، اور دردِ ملت اُمڈ اُمڈ کر باہر آنا چاہتا ہے، اِس درد کو وہ اشعار میں ڈھال کر قوم کے گوش گزار کرنا چاہتے ہیں۔ روایتی مشاعرے اُن کے خیالات کے متحمل نہیں ہو سکتے، کچھ مشاعروں میں گئے بھی تھے تو وہ اندرونِ خانہ تھے، جنہیں شعری نشست کہہ سکتے ہیں، پھر وہاں اُن جذبات کی گنجائش کہاں تھی جو اقبالؔ کے ہونٹوں پر مچل مچل کر آرہے تھے، اِس لحاظ سے ابھی تک اُنہیں کسی بڑے اور عوامی جلسے اور سماجی محفلوں میں شعر سنانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ ایسا پہلی بار اِس وقت ہوا جب ۱۹۰۰ء میں اُنہوں نے انجمن حمایت الاسلام کے سالانہ جلسہ میں ''نالۂ یتیم'' کے عنوان سے درد سے معمور نظم پیش کی۔ ہم اُن کی کسی عوامی اجتماع میں پہلی بار آمد کا حال تفصیل سے بیان کرنا چاہیں گے، لیکن بتاتے چلیں کہ عربی میں اوّل آنے پر، پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے اُنہیں خان بہادر ایف جلال الدین میڈل عطا کیا گیا ہے۔ چناں چہ وہ بی اے کا

مرحلہ طے کرنے کے بعد، اسی کالج میں ماسٹر ڈگری کے لیے داخلہ لیتے ہیں اور مضمون فلسفہ منتخب کرتے ہیں۔

اقبالؔ اس سلسلے میں بھی بہت اقبال مند واقع ہوئے کہ انھیں شروع سے ہی بہت لائق و فائق اساتذہ ملے جو، اُن پر خصوصی توجہ دیتے آئے۔ اس سلسلے میں حسنِ اتفاق دیکھیے کہ ادھر اقبالؔ نے ایم اے میں داخلہ لیا اور اُدھر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ایک قابل انگریز پروفیسر مسٹر تھامس آرنلڈ سبک دوش ہو کر فلسفہ پڑھانے کے لیے لاہور میں گورنمنٹ کالج سے منسلک ہوتے ہیں۔ موصوف مستشرق کی حیثیت سے اس وقت خاصے مشہور ہو چکے تھے۔

آرنلڈ ٹامس واکر، لندن کے ایک قصبہ میں پیدا ہوئے، یہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ پھر بلند درجہ تعلیم کے لیے لندن میں کیمرج یونیورسٹی میں داخل ہوئے۔ چوتھے سال میں تاریخِ اسلام کا خصوصی مطالعہ کیا اور اُنھی دنوں ایک انعامی مقابلے کے لیے اسلام پر ایک تحقیقی مضمون لکھا اور پھر یہاں ہندوستان آ کر محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ میں بہ حیثیت پروفیسر فلسفہ مقرر ہو گئے اور دس سال کا عرصہ گزارا۔ اس مدت میں وہ اپنی اسلام دوستی کی وجہ سے طلباء اور کالج کے ساتھیوں میں نہایت معتبر شخصیت سمجھے جانے لگے۔ موصوف مسلم ثقافت کے دل دادہ تھے۔ یہاں تک کہ لباس و وضع قطع بھی انھوں نے مسلمانوں کی سی اختیار کر لی تھی۔ اُن کے حلقۂ احباب میں کئی مسلم اہلِ علم و دانش شامل تھے، خصوصاً مشہور مورخ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مؤلف شبلی نعمانی تو اُن کے علم اور شخصیت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اُن سے فرانسیسی سیکھنی شروع کر دی اور خود اُنھیں عربی میں مدد دیا کرتے تھے۔ یہاں لاہور آ کر بھی موصوف نے علمی زندگی میں بھرپور حصہ لیا اور علی گڑھ کی طرح یہاں بھی بہت جلد طلباء، اساتذہ اور دیگر یہاں کی علمی و سماجی شخصیات میں پسندیدہ نظروں سے دیکھے جانے لگے۔ اقبالؔ بھی اُن سے خاصے متاثر ہوئے اور اس طرح جہاں اقبالؔ کو اُستاد کی شکل میں ایسی صاحبِ علم و فضل شخصیت میسر آئی، وہیں آرنلڈ صاحب کے لیے بھی قابلِ فخر بات ہے کہ اُن کے شاگردوں کی فہرست میں مستقبل کا ایک ایسا روشن ستارہ نام شامل ہو گیا جس نے نہ صرف اپنی ملت کے مقدر کو چمکایا بلکہ خود اپنے اس استاد کے خطّے کی دانش کو جلا بخشی۔

دورانِ تعلیم، اُستاد و شاگرد دونوں نے ایک دوسرے کی شخصی خوبیوں اور ذہنی و فکری صلاحیتوں کو بھانپ لیا، اور بہت جلد اُن کے درمیان قربت اور موانست کا رشتہ قائم ہو گیا۔

نا آسودہ عائلی زندگی:

ضروری ہے کہ اس جگہ ضمناً، اقبالؔ کی عائلی زندگی سے متعلق بھی تذکرہ کرتے چلیں۔ جیسا کہ قارئین کے علم میں آ چکا ہوگا کہ اقبالؔ کی عمر سولہ سال تھی کہ اُن کی شادی، گجرات کے ایک متمول گھرانے میں کر دی گئی، اُن کی اہلیہ کریم بی بی سے اُن کے ہاں پہلے ۱۸۹۶ء میں بیٹی (معراج بیگم) پیدا ہوئی جو بارہ سال کی عمر میں خنازیر کے مرض کی وجہ سے انتقال کر گئیں اور اب اسی سال یعنی ۱۸۹۸ء میں جب کہ وہ ایم اے کے طالب علم ہیں، بیٹے کی ولادت ہوتی ہے جو آفتاب اقبال کے نام سے قانون داں مشہور ہوئے۔

مزید تعلیمی سفر:

اسی سال اقبالؔ نے اپنی تعلیم میں یہ اضافہ کیا کہ لاء کالج لاہور میں داخلہ لے لیا لیکن سالِ رواں ۱۸۹۸ء کے دسمبر میں امتحان دیا تو اصولِ قانون یعنی فقہ کے پرچہ میں کام یاب نہ ہو سکے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہوئی کہ زیادہ تر وقت اُن کا فلسفہ کے امتحان کی تیاریوں میں گزر رہا تھا۔

اقبالؔ، خراماں خراماں نہیں، بلکہ تیز گامی اور تسلسل کے ساتھ رائج الوقت حصولِ تعلیم کا سفر طے کر رہے ہیں۔ مارچ ۱۸۹۹ء میں ایم اے فلسفہ کا نتیجہ آیا ہے، اقبالؔ تیسرے درجے میں کام یاب ہوئے، درجہ سوم میں آنے کی وجہ یہ بتائی گئی کہ پرچوں کی جانچ پڑتال میں نہایت سختی برتی گئی تھی۔ تاہم درجہ سوم کے باوجود آپ کو تخصیص یہ ملی کہ یونیورسٹی بھر میں صرف ایک وہی تھے جو کام یاب ہوئے، باقی سب اُمیدوار پاس بھی نہ ہو سکے۔ یوں اس کام یابی پر اُنھیں خان بہادر شیخ نانک بخش میڈل سے نوازا گیا۔

نئی سکونت:

اسی سال اُنھوں نے اندرون بھاٹی دروازہ کے کوچہ جلوٹیاں میں کرائے پر مکان لیا اور

وہاں منتقل ہو گئے۔ کیوں کہ ماسٹر ڈگری کی تکمیل کے بعد یونیورسٹی کے ہاسٹل میں نہیں رہ سکتے تھے۔

عملی زندگی:

اب حیاتِ اقبال کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے، طالب علمی کے ماحول سے نکل کر عملی زندگی میں قدم رکھتے ہیں، یعنی ایم اے سے فارغ ہو کر ۱۳ رمئی کو اورینٹل کالج میں، میکلورڈ عربک ریڈر، یعنی ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے اُن کا تقرر عمل میں آتا ہے۔ یہاں نصاب کی عربی کتب کی طباعت کی نگرانی کے ساتھ ساتھ، عربی انگریزی کتب کا اُردو میں ترجمہ کرنا اور درس و تدریس دینا اُن کے فرائض میں شامل تھا۔ اس منصب کی تنخواہ ماہانہ بہتر (۷۲) روپے چودہ (۱۴) آنے قرار پائی۔ یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ یہ ملازمت با آسانی ملنے میں اُن کے اُستاد پروفیسر تھامس آرنلڈ صاحب کی کوششوں کا دخل تھا۔ گزشتہ ماہ اپریل میں ہی وہ اورینٹل کالج کے قائم مقام پرنسپل بن کر آئے تھے اور اپنے صواب دیدی اختیار استعمال کرتے ہوئے اُنھوں نے شاگردِ عزیز کو اس منصب کے لیے اہل قرار دیا۔ اُن کے اس فیصلے سے دو طرفہ فائدہ ہوا۔ ایک یہ کہ اقبال کی معاش کا ذریعہ بن گیا، دوسرا یہ کہ اُن کی نگرانی میں اس شعبہ میں نمایاں بہتری اور ترقی دیکھنے میں آئی۔

اقبال چوں کہ گھر گرہستی والے ہو چکے تھے، اس لیے اہل و عیال کی ذمے داری بھی اُن کے پیشِ نظر تھی۔ لہٰذا حصولِ معاش کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے، استاد پروفیسر آرنلڈ کی معاونت سے انہیں اورینٹل کالج میں ملازمت مل چکی تھی۔ یہ بھی یاد رہے کہ اس جگہ یعنی میکلوڈ عربک ریڈر میں اُن کا تقرر ایم اے فلسفہ کی بنیاد پر نہیں بلکہ ایف اے اور بی اے میں عربی کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کرنے کو وجہ بنا کر کیا گیا تھا۔ دراصل آرنلڈ صاحب کچھ دنوں کے لیے اورینٹل کالج کے قائم مقام پرنسپل بن کر آئے تھے تو یہ اُن کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ اسی دوران یعنی ۱۸۹۹ء میں ڈاکٹر اسٹریٹن اورینٹل کالج کے پرنسپل بن کر آ گئے اور پروفیسر ٹامس آرنلڈ ڈین آف فیکلٹی ہو گئے۔ ڈاکٹر اسٹریٹن سنسکرت کے پروفیسر تھے۔ اقبال کو اُن کی شخصیت نے خاصا متاثر کیا اور پروفیسر آرنلڈ کی طرح اسٹریٹن صاحب سے بھی اُن کے تعلقات نہایت خوش گوار ہو گئے۔

میکلوڈ عربک ریڈر کے منصب پر فائز رہنے کی مدت ۱۳ ر مئی ۱۸۹۹ء سے ۳۱ ر مارچ ۱۹۰۴ء ہے۔ تاہم اس عرصہ میں وقفہ وقفہ سے گورنمنٹ کالج میں بھی اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے عارضی اسامی پر کام کرتے رہے۔ اس اسامی پر اپنے فرائض انجام دینے کے دوران تحقیق کا کام بھی جاری رکھا اور پہلا تحقیقی مقالہ مکمل کیا، جس کا عنوان تھا "توحیدِ مطلق اور انسانِ کامل کے بارے میں الجیلی کا نظریہ"، نیز علمِ اقتصادیات پر ایک اہم کتاب لکھی۔ اس سے اقبالؔ کی علمی شخصیت کے کثیر الجہت پہلو نمایاں ہوئے۔ یعنی ایک طرف وہ ایک لائق و باصلاحیت طالبِ علم ثابت ہو چکے تھے تو دوسری طرف ایک قابل اُستاد کی حیثیت سے سامنے آئے اور فلسفہ میں دل چسپی اُن کو مستقبل کے فلسفی اور مفکر ہونے کا پتا دے رہی تھی اور تحقیق کے کام سے اُن کے اندر جستجو کا جذبہ کارفرما نظر آنے لگا۔ علم الاقتصادیات پر اُردو میں کتاب نے اُن کی شخصیت کا ایک الگ ہی رخ دکھایا۔

قارئین نے محسوس کر لیا ہوگا کہ تعلیم کے ساتھ ساتھ اقبالؔ کے شاعرانہ ذوق میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور اس بات کا بھی احساس ہو گیا ہوگا کہ اُنھوں نے قومی معاملات اور ملک کی مجموعی صورتِ حال پر گہرے ناقدانہ انداز میں سوچنا شروع کر دیا تھا۔ تاہم اپنے خیالات اور جذبات کے اظہار کے لیے جو وہ اشعار کی شکل میں ڈھال رہے تھے۔ کوئی جگہ نہیں پا رہے تھے، آخر لاہور میں مسلمانوں کی ایک اہم اور فعال تنظیم، انجمن حمایت الاسلام کی سرگرمیوں سے متاثر ہو کر اُس کی رکنیت اختیار کر لی۔

یہ ۱۹۰۰ء کا دوسرا مہینہ ہے کہ انجمن حمایت الاسلام کا سالانہ جلسہ منعقد ہوتا ہے اور اقبالؔ کو اس کے ذریعہ سے پہلی بار یہ موقع مل جاتا ہے کہ وہ کسی عوامی تقریب میں بہ حیثیت شاعر شریک ہو کر اپنے خیالات کا اظہار کرنے جا رہے ہیں۔ کیوں کہ یہ اقبالؔ کی شخصیت کے اظہار کا بھی نمایاں اور یادگار موقع ہے، اس لیے ہم اسے ذرا تفصیل سے بلکہ بزبان شریف المجاہد تمثیل کے انداز میں بیان کریں گے۔

انجمن حمایت الاسلام، پنجاب میں مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہے، گیارھواں سالانہ جلسہ کا انعقاد کیا گیا ہے، پنڈال برقی قمقموں سے جگمگا رہا ہے، اس رات عجیب اتفاق یہ ہے کہ

آسمان پر بدرِ کامل اپنا روشن چہرہ لیے موجود ہے۔ ابھی تقریب کا آغاز نہیں ہوا کہ شرکاء بڑی تعداد میں جلسہ گاہ آنا شروع ہو گئے ہیں۔ حاضرین میں امیر و غریب، اَن پڑھ اور پڑھے لکھے بھی شامل ہیں۔ کچھ نے مغربی لباس کوٹ پتلون پہن رکھا ہے اور کچھ شیروانی اور پائجامہ زیب تن کیے ہوئے ہیں۔ لیکن اکثریت ایسے افراد کی ہے جو پنجاب کا روایتی لباس پہنے ہوئے ہیں۔ اِن لوگوں کی یہاں آمد کا مقصد یہ ہے کہ وہ ہندوستان میں اسلام کا مستقبل جاننا چاہتے ہیں کہ کیا ہے؟

جلسے کا آغاز مسلمانوں کی روایت کے مطابق تلاوتِ قرآن کریم سے ہوتا ہے۔ پھر نعت بہ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیش کی جاتی ہے، اور پھر صدرِ جلسہ مولانا نذیر احمد انجمن کی کارکردگی کی سالانہ رپورٹ پڑھ کر سناتے ہیں۔ خصوصی طور پر انجمن کی تعلیمی خدمات سے سامعین کو آگاہ کرتے ہیں۔ جلسے میں بڑا نظم و ضبط ہے، بہت غور اور دل چسپی سے صدرِ جلسہ کی تقریر سنی اور اختتام پر تالیاں بجا کر انجمن کی کارکردگی کو سراہا گیا۔ اِس کے بعد دوسرے اراکینِ انجمن نے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور کئی افراد نے قومی انداز کی نظمیں بھی سنائیں۔ اِس تمام کارروائی کا مقصد لوگوں میں انجمن کی افادیت سے آگاہ کرنا اور انجمن سے اُن کا تعاون درکار ہے کہ وہ دامے، درمے، سخنے، انجمن سے معاونت کریں تاکہ انجمن اپنے مقاصد کی تکمیل کا سفر جاری رکھ سکے۔

تقریب کو کئی گھنٹے گزر چکے ہیں کہ صدرِ جلسہ ایک نئے نام کا اعلان کرتے ہیں۔ حاضرین میں سے تالیوں کی آواز آتی ہے لیکن وہ جوش نہیں جو سابقہ مقررین کے لیے دیکھا گیا تھا۔ ظاہر ہے، حاضرین کے لیے یہ ایک غیر مانوس نام ہے۔ وہ ایک اَن دیکھے اور اجنبی کا کیوں کر پُر زور استقبال کر سکتے ہیں۔ البتہ نو وارد اکیس بائیس سالہ نوجوان کی دل کش شخصیت پر اُن کی نظریں ٹھہر کر رہ جاتی ہیں۔ شلوار اور شیروانی میں ملبوس اور سر پر ترکی ٹوپی پہنے سرخ و سفید رنگ اور خوب صورت نقش و نگار کے نوجوان کی بھوری آنکھوں میں گہری سنجیدگی نمایاں ہے، اور چہرے پر عمر سے زیادہ غور و فکر کا رنگ پھیلا ہوا ہے۔ ”حاضرین کرام ایک نظم پیشِ خدمت ہے۔ عنوان ہے ”نالۂ یتیم“۔ نوجوان نے حاضرین کو مخاطب کر کے کہا اور سحر انگیز اور پُر ترنم انداز میں نظم سنانا شروع کی۔ جلسہ کے افراد میں کچھ دیر کے لیے جو ہلچل سی پیدا ہو گئی تھی، اب انہوں نے سکوت کی شکل اختیار کر لی۔ اِس لیے کہ رات کے سناٹے میں نوجوان کی آواز اور اشعار کی معنویت نے فضا میں ایک

عجیب سی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ نظم کا ایک ایک شعر سامعین کے دلوں میں اُتر کر انھیں گرم جوش بنا رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے "نالۂ یتیم" خود اُن کے اپنے دلوں کی ترجمانی کر رہا ہے۔ دراصل نظم کا عنوان ہی اِس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ ہندوستان میں مسلم قوم کی حیثیت اِس وقت ایک یتیم کی طرح ہے۔ کوئی اِس کا ولی وارث ہے اور نہ پُرسانِ حال ہے، مسلمان خود کو بے آسرا محسوس کرتے ہیں، بس یہی وہ احساس ہے جو سامعین کے دلوں میں اِس نظم نے پیدا کر دیا ہے اور اب اُن کی آنکھیں بھر آئی ہیں اور کئی تو جذبات پر قابو نہیں پا رہے اور ہاتھوں میں چہرہ چھپائے اپنی قومی حالتِ زار پر زار و قطار رونے لگے ہیں۔

نوجوان کی آواز رُک گئی۔ نظم کا اختتام ہو گیا، لیکن کئی لمحے فضا پر سکوت طاری رہا۔ سامعین کو نظم نے اِس قدر متاثر کیا ہے کہ وہ متاثر کرنے والے نوجوان شاعر کو داد دینا بھی بھول گئے ہیں، پھر یکا یک جیسے اُنھیں یاد آتا ہے اور ابھی نوجوان اپنی جگہ سے نہیں ہٹا کہ پُرجوش تالیوں کی زوردار آوازوں نے ماحول کو پُرشور کر دیا، جب کہ نوجوان جس گہری سنجیدگی کو لیے آیا تھا، اِسی سنجیدگی میں ڈوبا ہوا خاموشی سے واپس ہو گیا اور جب تک وہ اپنی نشست پر بیٹھ نہیں گیا، تالیوں کی گونج ختم نہیں ہوئی۔

صدرِ جلسہ مولانا نذیر احمد نے جو خود بھی بہت اچھے شاعر ہیں، اپنی اختتامی تقریر میں نوجوان کی نظم کو زبردست خراجِ تحسین پیش کیا۔ کہا کہ "میں نے انیسؔ و دبیرؔ کے متعدد مرثیے سن رکھے ہیں لیکن نالۂ یتیم کی طرح دل کو لہو کر دینے والی نظم اِس سے قبل سننے کو نہیں ملی۔"

پھر جادو اور سر چڑھ کر بولا۔ [redacted] کے اختتام پر لوگ نظم لینے کی فرمائش کرنے لگے۔ انتظامیہ نے نظم کی مطبوعہ نقلیں چار روپے فی کاپی کے حساب سے لوگوں کو دیں اور دیکھتے ہی دیکھتے کوئی تین سو کاپیاں فروخت ہو گئیں اور یوں شعر و ادب کے اُفق پر شیخ محمد اقبالؔ کے نام سے ایک نیا شاعر اُبھرا جس نے آگے چل کر ایک زمانے کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ خصوصاً ملتِ اسلامیہ کے دلوں کی دھڑکن بن گیا جس کا نام آج بھی لوحِ وقت پر شاعرِ اسلام کے نام سے جگمگا رہا ہے۔

اِس ایک واقعہ سے واضح طور پر یہ بات سامنے آ جاتی ہے کہ اقبالؔ کا اندازِ سخن محض روایتی نہیں۔ اُن کے دل میں ملت کا جو درد پیدا ہو چلا ہے، اُسے وہ شاعری کے ذریعہ عام کرنا چاہتے

ہیں اور یہ بھی تصریحاً معلوم ہو گیا کہ نوجوان محمد اقبال تعلیمی سفر طے کرتے ہوئے اپنی فکر و نظر کو بھی اپنے ہم سفر کیے ہوئے ہے۔ غور و فکر کی عادت پہلے ہی والد صاحب کی اِس ہدایت سے پیدا ہو چکی تھی جو اُنہوں نے قرآن کریم کو غور و انہماک کے ساتھ تلاوت کرنے کو کہا تھا۔ اب کتابی تعلیم خصوصاً فلسفہ کے مضمون نے اُن کی فکر کو اور مہمیز لگا دی۔ تاہم اُن کی فکر کا منبع قرآن اور محور و مرکز ملک و ملت تھا۔

اقبالیات کا چرچا:

خوشبو از خود پھیلتی ہے، اسے کسی تعارف کی ضرورت نہیں ہوتی، تاہم کسی نہ کسی عطار کی دکان اس کے پھیلنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ انجمن حمایت الاسلام کے بعد اقبال کے گل وصف کو شیخ عبدالقادر کا ماہنامہ 'مخزن' میسر آیا۔

شیخ عبدالقادر اور محمد اقبال کی دوستی کی روداد یہ ہے کہ چند سال پہلے ہی اُن کی ملاقات ہوئی تھی، پھر آہستہ آہستہ روابط بڑھے اور پھر تعلقات گہری دوستی و رفاقت میں بدل گئے۔ شیخ عبدالقادر ادیب و ادب نواز شخص تھے، صحافت سے بھی متعلق تھے۔ ذاتی طور پر بھی اُنہوں نے ۱۹۰۱ء میں اپنا ایک ادبی جریدہ "مخزن" کا اجرا کیا اور اقبال سے اِس نوزائیدہ رسالہ میں قلمی تعاون کی درخواست کی۔ اقبال نے اولاً اُن کے لیے ایک نظم "ہمالہ" لکھی جس کی انفرادیت نے شیخ عبدالقادر کو چونکا دیا، یہ لب و لہجہ، عام اور فرسودہ شاعری سے بالکل مختلف تھا، چناں چہ مدیر مخزن نے نظم ہمالہ کو بہت ہی اہتمام سے شایع کیا اور اسی اہتمام اور ذوق و شوق کے ساتھ قارئین نے اسے پسند کیا۔ تاہم نظم کی مقبولیت سے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ "مخزن" نے اقبال کو یا اقبال نے مخزن کو دونوں میں سے کس نے باذوق حضرات سے اتنی جلدی متعارف اور مقبول کرانے میں اپنا کردار ادا کیا۔ ہم چاہیں گے، اِس موضوعاتی نظم کے صرف دو بند ایک ابتدائی اور دوسرا آخری یہاں نقل کر دیے جائیں تاکہ اندازہ ہو سکے کہ شروع میں ہی اقبال کا مشاہدہ، مطالعہ اور شاعرانہ زورِ بیان کس درجہ پر نظر آتا ہے:

اے ہمالہ! اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں!
چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں
تو جواں ہے گردشِ شام و سحر کے درمیاں
ایک جلوہ تھا، کلیمِ طورِ سینا کے لیے
تو تجلی ہے سراپا چشمِ بینا کے لیے

''کلیمِ طورِ سینا'' اور ''چشمِ بینا'' کی تراکیب اقبالؔ کے مزاج اور مستقبل کے کلام میں پیدا ہونے والی فضا کی جھلکیاں پیش کر رہی ہیں۔

اقبالؔ کو اپنے گرد و پیش کے مصنوعی ماحول سے کبھی کوئی دل چسپی نہیں رہی، بلکہ اُسے وہ ہمیشہ ناپسندیدہ نظروں سے دیکھتے رہے جیسا کہ دورِ جدید کی نمائش کاری سے بے زاری کا اظہار عین شباب کے عالم میں اِس نظم کے ذریعہ کر رہے ہیں جب کہ اِس وقت اُن کی عمر کے دوسرے نوجوان اپنی تہذیب اور اپنی اقدار کو چھوڑ چھوڑ کر مغرب کی پیدا کردہ بے رُوح اور بے جان لیلیٰ تہذیب کے دیوانے ہوئے جا رہے تھے۔ ''ہمالہ'' کا یہ آخری بند اُن کی اِسی تصویرِ حاضر سے تنفر اور نام نہاد ترقی پسندوں کے بہ قول اُن کی ''رجعت پسندی'' کا واضح ثبوت ہے، کہتے ہیں:

اے ہمالہ! داستاں اُس وقت کی کوئی سنا
مسکنِ آبائے انساں جب بنا دامن ترا
کچھ بتا اُس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا
داغ جس پہ غازۂ رنگِ تکلف کا نہ تھا
ہاں دکھا دے اے تصور! پھر وہ صبح و شام تُو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تُو

قارئینِ مخزن کی طرف سے زبردست پذیرائی نے مدیرِ جریدہ شیخ عبدالقادر کو مجبور کر دیا کہ وہ اقبالؔ سے مزید تخلیقات کا مطالبہ کریں۔ چناں چہ اقبالؔ کی شاعری اور نثری تخلیقات تسلسل و تواتر کے ساتھ مخزن کی زینت بننے لگیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اُن کی ادبی شہرت برصغیر کے تمام ادبی

حلقوں میں عام ہو گئی۔ گویا یہ پیش خیمہ تھا اُس آنے والے وقت کا جب اقبالؔ کو خود اعتراف کرنا پڑا:

اک ولولہ تازہ دیا میں نے دلوں کو
لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند

یاد رہے اقبالؔ کی جس ادبی حیثیت کا ذکر ہو رہا ہے اور اُن کے نثری اور شعری شہ پاروں کے جو حوالے دیے جا رہے ہیں، اُن میں اِس بات کو دخل نہیں کہ اقبالؔ کی شاعری اور نثر اُس وقت کے دیگر روایتی غزل گو شعراء اور فرسودہ داستان طراز نثر نگاروں میں کوئی خوش کن اضافہ تھی، نہیں، بلکہ اقبالؔ سے پہلے، خود جنوبی ایشیائی ادب بھی اِس لب و لہجے سے پہلی بار آشنا ہو رہا تھا۔

بلاشبہ اقبال نے شاعری کی ابتدا اس روایتی شعر گوئی سے کی جو غزل کی فرسودگی سے مملو تھی۔ اور جو زمانے کے ساتھ ایک قدم بھی چل کر نہیں آئی تھی، اسے ہوش ہی نہیں تھا کہ وقت اس کے بچپن اور شباب کے دور سے گزر کر بہت آگے آ چکا ہے، زندگی کے بہت سے رنگ بدل چکے ہیں، سیاسی، سماجی تبدیلی اور ثقافتی انداز تیزی سے بدل رہے ہیں، نیا زمانہ نئے تقاضے کر رہا ہے، لیکن ہند کے شاعر و صورت گروں کے اعصاب پر اب بھی عورت سوار تھی، وہ آج بھی ریختی اور ریختہ کی فضولیات میں پڑے ہوئے تھے۔

جیسا کہ اس مردِ قلندر زمانہ شناس نے کہا

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ! بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

تو یہ کس قدر خوشگوار حیرت کا مقام ہے کہ اقبال اسی آلودگی سے محفوظ رہا، انہوں نے آنکھیں بند کر کے اس بے ہودہ روایت کی تقلید کرنے کی بجائے کھلی آنکھوں سے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا تو چونک گئے۔ سجدۂ سہو ادا کیا اور نہ صرف شاعروں کی فضولیات سے تائب ہو گئے بلکہ شاعری کی اس روایت کو بہ یک قلم منسوخ کر دیا۔

اس کی ایک جھلک ہم پہلے ہی دیکھ ہی چکے ہیں۔ اس حوالے سے اقبالؔ نے ''نالۂ یتیم'' ایسی نظم لکھ کر واضح کر دیا کہ وہ دیگر پڑھے لکھے بابوؤں کی طرح محض مسٹر کہلانے اور اپنی ذات کی

پروجیکشن کرنے والے نوجوانوں میں سے نہیں بلکہ مغربی تعلیم اُن کی ابتدائی بنیادوں پر اثرانداز ہونے میں ناکام ہو چکی ہے۔ ثابت ہو چکا ہے کہ اقبال قرآن کے پروردہ ہیں۔ وہ تعلیم اور تہذیب کو الگ الگ سمجھتے ہیں۔ اُنھوں نے انگریزی تعلیم ضرور حاصل کی ہے، بلکہ مزید اعلیٰ تعلیم کے لیے وہ امریکن یونیورسٹیوں میں داخلہ لینے کے بارے میں سوچ رہے ہیں لیکن اپنے ملک وملت، تہذیب اور ثقافت سے وابستگی اُستوار کیے ہوئے ہیں، ملت کی زبوں حالی کا درد الگ اپنے دل میں رکھا ہے، جس کا انھوں نے نالۂ یتیم کے پردے میں رہ کر اظہار کیا اور اِس طرح ابھی سے وقت نے اُن کا نام "قومی شاعر" کی حیثیت سے آنے والی تاریخ میں درج کر دیا۔ لیکن

ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

اس جگہ بہت ضروری ہے کہ ہم ایک ایسے شخص کا ذکر کریں جو کیا یک اقبال کا رفیق بنا اور پورے بتیس سال ان کی خدمت میں گزار دیے، یہ اقبال کا خادم خاص علی بخش ہے جس نے اپنے "آقا" سے وفاداری کی ایک مثال قائم کر دی۔ وہ پڑھا لکھا نہیں تھا، پنجاب کے گاؤں کا رہنے والا تھا، لیکن یہ خوش نصیب اور انسان اسلام کے ایک عظیم فلسفی کی خدمت میں آ کر ان کے ظاہر و باطن سے آشنا ہو گیا اور آخر دم تک ان کی رفاقت میں رہ کر تاریخ میں اپنا نام لکھا گیا کہ حکیم امت، شاعر اسلام، مفکر اسلام علامہ سر ڈاکٹر محمد اقبال کا تذکرہ ہو اور علی بخش کو نظر انداز کر دیا جائے یہ ممکن ہی نہیں ہو سکتا۔

شیخ محمد اقبال کالج ہاسٹل چھوڑ کر بھاٹی دروازہ میں رہائش پذیر ہو چکے تھے اور اورینٹل کالج میں ملازم تھے کہ اسلامیہ کالج کے پرنسپل مولوی حاکم علی صاحب کا ایک تیرہ چودہ سالہ لڑکا کسی کام سے اقبال کے یہاں آیا، ان کی بات چیت اور طور طریقے دیکھ کر اقبال اس پر ریجھ گئے۔ ان دنوں انہیں ایک ملازم کی سخت ضرورت تھی۔ اسے اپنے یہاں آنے کی دعوت دی، لیکن علی بخش نے ہاں ناں کچھ نہیں کہا۔ ظاہر ہے وہ پہلے ہی ملازم تھا، اس اثنا میں موسم گرما کی چھٹیاں ہو گئیں اور علی بخش کالج کھلنے تک اپنے گاؤں چلا گیا۔ ادھر اقبال سیالکوٹ سے ایک ملازم لے آئے، لیکن وہ بددیانت نکلا، تب انہوں نے چھٹیاں ختم ہونے پر کالج سے علی بخش کو بلوا بھیجا اور ایک بار پھر اسے

اپنے یہاں آنے کی دعوت دی تو اس نے اپنی جگہ مولوی صاحب کے یہاں اپنے بڑے بھائی کو رکھوا دیا اور خود اقبال کے پاس آ گیا اور ایسا آیا کہ پھر پلٹ کر نہ گیا اور ساری جوانی مسلمانوں کے محسن کی خدمت کرتے گزار دی، اس اعتبار سے ہم علی بخش کو بھی اپنا محسن کہتے ہیں۔ ضلع ہوشیار پور کے قصبہ اٹل گڑھ کا یہ سیدھا سادہ، نیک دل، نیک طبع نہایت ادب و آداب برتنے والا ان پڑھ مگر نہایت عقل مند، محنتی اور اپنے فرائض کو نہایت مستعدی کے ساتھ انجام دینے والا وفا کا پیکر کہ اقبال کا شاہین تو کوئی اور ہے مگر ہم علی بخش کو بھی عقاب سے کم نہیں سمجھتے۔

اس نے اقبال کی خدمت میں آتے ہی ان کی نجی ضروریات کو کسی گھڑ خاتون کی طرح اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اقبال کی ''رہائش گاہ'' کا سارا بکھراپن دور ہو گیا۔ اقبال کو کھانا پینا، حقہ پانی ہر چیز وقت پر اور سلیقے سے ملنے لگی۔ علی بخش گویا ایک طرف اقبال کے گھر کا مہتمم، دوسری طرف خود ان کا جیسے منیجر بن گیا، اس طرح اقبال کو ایک آسودگی میسر آ گئی۔

اقبال کو شروع سے ہی غیر ضروری حرکات وسکنات سے پرہیز تھا، زیادہ تر خانہ نشینی میں ہی عافیت محسوس کرتے۔ اقبال کوئی غیر مرئی مخلوق نہیں، گوشت پوست کے انسان تھے۔ علم کی لگن اور مصروفیات اپنی جگہ تاہم خانگی زندگی کی بگڑی صورت حال انہیں اندر سے پریشان رکھتی تھی۔ اہلیہ کریم بی بی عمر میں ان سے کئی سال بڑی ہونے کے باوجود مزاج میں کوسوں دور تھیں۔ دو اولاد ہو چکی تھی لیکن فریقین کے درمیان یکجائی نہ ہو سکی، کریم بی بی زیادہ تر بچوں سمیت اکثر اپنے میکے میں ہی گزارتی تھیں، اقبال کی زندگی کا یہ رخ نہایت مایوس کن اور ان کے بھرپور دورِ شباب میں محرومی کی فضا لئے ہوئے تھا۔ ظاہر ہے اقبال ایسے حساس آدمی کے لیے قدرت کی طرف سے بخشی ہوئی شاعرانہ صفت ہی ذہنی آسودگی کا سبب بن سکتی تھی یا پھر باذوق دوستوں کی محفل میں جی بہل سکتا تھا۔ فارغ اوقات میں کچھ دوست احباب آ جاتے اور ایک ایسی بزم سج جاتی جس میں کچھ زندہ دلی کا مظاہرہ دیکھنے کو مل جاتا۔ لیکن اس شگفتہ، علمی اور کسی قدر سیاسی گفتگو کے دوران مجلس کا مرکزی ''ایجنڈا'' شعر و سخن ہوتا۔ علی بخش ایسا وفادار خدمت گزار اس وقت تک دستیاب ہو چکا تھا جو مہمان شرکائے محفل کے لیے چائے وغیرہ اور میزبان کے لیے حقہ تیار کرتا اور یوں ایک طرف چائے کا دور چلتا اور دوسری طرف اقبال حقے کے ہلکے ہلکے کش لیتے جاتے اور اپنے تازہ کلام اور

شگفتہ شگفتہ باتوں سے یارانِ محفل کو نوازتے جاتے، اس طرح اقبال کے اندر کا سناٹا کچھ دیر کے لیے دور ہو جاتا، لیکن اندر بہر حال ایک مستقل خلا تھا جو ان سے کچھ اور ہی تقاضا کرتا، فطرت، ذوقِ جمالیات کی تسکین کے لیے شاعر کو اندر سے باہر آنے پر انگیخت کرتی۔ منصف مزاج اقبال فطرت کی اس فرمائش" کو نظر انداز نہیں کر سکے۔ اس لیے کبھی کبھی عقل کی پاسبانی کو سلام کر کے دل کی تنہائی کو سنبھالے باہر نکل جاتے۔ کبھی کنارِ راوی، اور کبھی کسی دوسری کھلی جگہ پر آثارِ فطرت کا مشاہدہ کرتے اور جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے، اقبال کے مزاج میں موسیقیت کو بھی دخل تھا، بلکہ اس وقت کا یہ شوق اقبال کے اعصاب کو شدت سے اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھا۔

غالباً آپ کی اسی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر کچھ دوست آپ کو ایک مغنیہ کی بزم میں لے گئے جو بازارِ عیش و طرب میں قیام رکھتی تھی۔

اقبال کی شخصیت اپنے تعمیری مراحل میں بھی اتنی کمزور اور بودی نہ تھی کہ پتوں کی ہوائے فرمائش انہیں اُڑا لے جاتی، بلکہ خود اقبال کا شوق اس میں شامل رہا ہو گا کہ ان کے قدم اس طرف اُٹھ گئے۔ کیونکہ اس دور کے اقبال کو ہم نہ ملا، نہ صوفی، نہ زاہد اور نہ پارسا اور نہ رند کوئی بھی ایک نام نہیں دے سکتے۔ اگر کچھ کہہ سکتے ہیں تو یہ کہ وہ ایک نوجوان تھے تربیت یافتہ، باشعور، نوجوانی کے مثبت تقاضوں اور منفی اثرات سے واقف، اور بھی اگر قریب ہو کر اس نوجوان کو دیکھا جا سکتا ہے تو اس کے قریب ترین ناظرین اسے ایک باایمان، باشعور اور بااصول انسان کہنے میں کوئی تامل نہیں کر سکتے۔ اس کے باوجود نوجوان اقبال کی حسِ لطافت شاعرانہ تھی، ذوقِ جمالیات ساحرانہ تھا، لیکن فکر عالمانہ اور خیالات مومنانہ تھے، اور یہ نوجوان ان صفات کا حامل ہی نہیں عامل بھی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ معاشرے کی گہما گہمی میں آنکھیں کھلی رکھنے کے باوجود، اس میں موجود اچھائیاں اور برائیاں، سب اس کے مشاہدے کی زد میں تھیں۔ باریک بین نظریں خوب و ناخوب کی جائزہ کار اور حسن و قبیح کی ریزہ کار تھیں، گرد و پیش کی ممنوعہ اور غیر ممنوعہ ہر چیز پر نظر تھی۔ نگاہِ شوق کو آزادی تھی، لیکن دل و دماغ کو خبردار کر رکھا تھا کہ آزادی کی بھی کچھ پابندیاں ہوتی ہیں، صحبتِ صالح اور صحبتِ طالح میں فرق ہوتا ہے، اس کے نتائج بھی الگ الگ ہوتے ہیں۔ ہر دیکھنے والی چیز برتنے کی نہیں ہوتی، خیر و شر آدمی کے ساتھ ساتھ لگے ہوئے ہیں، چنانچہ اقبال مختلف سرگرمیوں

میں حصہ لینے میں تکلف نہیں احتیاط سے کام لیتے تھے، مبادہ کردار کی چادر پر کوئی داغ دھبا لگ جائے۔

اس تمہید کی سماعت سے قارئین کو اس لیے زحمت دی ہے کہ ہم ایک بار پھر اس تفہیم کا اعادہ کرسکیں کہ ہمارا ممدوح کوئی فرشتہ نہیں، انسان ہے اور جیسا کہ ابھی ہم نے کہا کہ اقبال کی جوانی ایک ایسی آزادی تھی جو پابند بھی تھی۔ مثلاً ہم نے دیکھا کہ کبوتر بازی کا بھی شوق پال رکھا تھا، اکھاڑے میں جا کر کسرت اور تن سازی کا شعبہ بھی اپنایا ہوا تھا، شعر گوئی کی طرف بھی طبیعت مائل تھی اور موسیقی سے بھی رغبت تھی، خود بھی خوش الحان تھے۔ ایک موقع پر تو ساز و آواز کے شوق نے اس قدر مغلوب ہوئے کہ ستار نوازی کا انتخاب کیا اور اس فن کو سیکھنے کے لیے باقاعدہ کسی ستار نواز استاد سے رابطہ کیا۔ یہ سب مشاغل سیالکوٹ میں عمر کے شروع دور کے تھے، اب آزاد اور زندہ دلوں کے بالغ شہر لاہور میں سانس لے رہے ہیں اور جیسا کہ ابھی ذکر ہوا ساز و آزاز کا شوق یا اپنے اندر کا وہ اضطراب جو خانگی زندگی کا پیدا کردہ ہے، انہیں بازار عیش تک لے گیا۔ امیر نامی ایک مغنیہ اپنے خاندان سمیت ''بازاریت'' کے مروجہ اصول سے رشتہ توڑ کر، ایک شریف اور مہذب زندگی کو اپنا چکی تھی، البتہ ساز و آواز کو گلے لگائے ہوئے تھی، لیکن رہائش اسی ماحول میں رکھنے پر مجبور تھی، اس کی وجہ ہمارے معاشرے کا یک المیہ یہ بھی ہے کہ اس بازار میں داد عیش لینے اور شب باشی کرنے کے باوجود شرفا کی نیک نامی اور اعلیٰ خاندانی شوق میں کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن وہاں کا کوئی گناہگار ان کے پاس آکر رہنا چاہے تو نہ آباد ہو سکتا ہے اور نہ ہی ہزار توبہ کے بعد گو خدا نے اسے معاف کر دیا ہو، تب بھی شریف نہیں کہلا سکتا۔ کیونکہ شرافت اس مخصوص اعلیٰ نسل کے لوگوں کو الاٹ ہو چکی ہے، چنانچہ یہی حال ''امیر'' اور اس کے خاندان کا تھا، وہ اس ماحول سے جہاں شرفا کی اولاد آداب مجلس سیکھنے جاتی رہی تھی، تائب ہو کر وہیں رہنے پر مجبور تھی۔ امیر نے اسی بازار کے ایک گوشہ میں محفل سجا رکھی تھی، ظاہر ہے بھوک تو شریف و بدمعاش، نیک و بد دونوں ہی کو لگتی ہے۔ چنانچہ امیر بیگم کا گلا اس کے پیٹ کو ایندھن فراہم کرنے کا کام انجام دے رہا تھا۔ اقبال دوستوں کے ساتھ اس بزم رباب میں آنکلے اور پہلی ہی ملاقات میں امیر کی شخصیت نے انہیں اپنا امیر کر لیا۔ معلوم ہوا یہ مطربہ جسے طوائف بھی کہہ سکتے ہیں، نام ہی کی نہیں، اپنی صفات میں بھی امیر

ہے۔ایسی فصیح و بلیغ اُردو میں گفتگو اس سے قبل کسی خاتون کی زبان سے اقبال نے نہیں سنی تھی۔امیر نہ صرف مشہور اساتذہ کے اُردو، فارسی کلام سے واقفیت رکھتی تھی بلکہ خود بھی شعر گوئی کے فن سے آشنا تھی۔معلوم ہوا اس کے گھرانے کی کئی اور خواتین بھی حسن و جمال کے ساتھ اُردو، فارسی ادب کے ذوق کی حامل ہیں۔امیر کی شخصیت گونا گوں اوصاف کا مرقع تھی۔انداز گفتگو، نشست و برخاست اور تہذیب و شائستگی نے نوجوان اقبال کے دل کو ایسا چھوا کہ جب وہ اپنے برادر کلاں شیخ عطا محمد کے ایک سنگین معاملہ کے حل کے لیے بلوچستان گئے تو وہاں بھی اُسے نہیں بھولے۔

دردِ برادر:

قوم کے غمخوار اقبال کو ایک اور ذاتی غم کا سامنا ہوا۔بڑے بھائی شیخ عطا محمد جو ملٹری ورکس ڈپارٹمنٹ میں ملازم تھے اور مختلف چھاؤنیوں میں ان کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا، اس وقت ۱۹۰۱ء میں کوئٹہ میں سب ڈویژنل افسر تھے کہ اس محکمہ کے ایک افسر نے شیخ صاحب سے ذاتی مخالفت کی بنا پر انہیں ایک سنگین مقدمہ میں ملوث کرادیا۔یعنی ان کے خلاف دفعہ تین سو دو قتل کا جھوٹا مقدمہ بنوادیا۔اقبال کو بھائی کی گرفتاری اور مصیبت کا علم ہوا تو بے قرار ہو گئے سب سے پہلے انہوں نے بذریعہ خط اس تمام معاملے سے وائس رائے ہند لارڈ کرزن کو مطلع کیا اور پھر علی بخش کو ساتھ لے کر کوئٹہ کے لیے روانہ ہو گئے بلوچستان کا یہ سفر بہت ہی دشوار گزار تھا، کچھ مسافت اونٹوں اور گھوڑوں پر بھی کی اور ایک موقع تو ایسا بھی آیا کہ ۲۷ میل تک مسلسل گھوڑے کی پشت پر بیٹھے سفر کرنا پڑا۔یہ جسمانی مشکلات اور پریشانی اپنی جگہ، جو ذہنی طور پر اس وقت کوفت اٹھانی پڑ رہی تھی اس کا اندازہ لگانا آسان نہیں۔

بہر حال، بھائی کے لیے یہ مشکلات و پریشانی رنگ لائی، لارڈ کرزن نے از سر نو تحقیقات کا حکم دیا اور جھوٹا مقدمہ بنانے والے افسر کا تبادلہ کر دیا گیا اور اس طرح شیخ عطا محمد صاحب باعزت طور پر رہا کر دیئے گئے۔اقبال نے خدا کا شکر ادا کیا، تاہم اس سلسلے میں جو وقت اور پریشانی اٹھانی پڑی اس کا ذکر بھی کیا تو کس طرح، ملاحظہ ہو، اپنے دوست سید تقی شاہ کو لکھتے ہیں۔"آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ مجھے کس قدر تکلیف ہوئی ہوگی، لیکن جو تکلیف محبت کی وجہ سے پیدا ہوئی ہو، وہ

لذیذ ہو جاتی ہے۔"

اقبال کے خادم خاص علی بخش کا بیان ہے کہ "شاید اسی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کو قانون کی طرف توجہ ہوئی اور آپ نے بیرسٹری کے لیے ولایت جانے کا ارادہ کیا۔"

ممکن ہے یہی وجہ ہو، تاہم لگتا ہے قانون کی طرف آپ کا رجحان پہلے بھی تھا، لیکن ہو سکتا ہے کہ بھائی کی وجہ سے ارادہ زیادہ پختہ ہو گیا ہو۔

اضطراب امیر:

اور وہاں نہایت دشوار اور وقت طلب سفر کرتے ہوئے فورٹ سنڈیمن (ژوب) پہنچے تو حیرت ناک طور پر انہیں امیر کا خیال آنے لگا اس وقت اپنے بے تکلف دوست سید تقی شاہ کو اپنے مکتوب میں دیگر باتوں کے علاوہ یہ بھی لکھا "امیر کہاں ہے؟ خدا کے لیے وہاں ضرور جایا کریں مجھے اضطراب ہے خدا جانے اس میں کیا راز ہے، جتنا دور ہو رہا ہوں اتنا ہی قریب ہو رہا ہوں۔"

اب غور طلب بات یہ ہے کہ جس راز کو نوجوان اقبال خود نہ سمجھ سکا جو آگے چل کر محرم راز درون میخانہ" ہوا تو مجھے یا کسی اور کو پسِ پردہ تاک جھانک کی کیا ضرورت ہے۔ البتہ اقبال کے اس جملے سے کہ "خدا کے لیے وہاں ضرور جایا کریں۔" یہ بات بخوبی عیاں ہے کہ یہ جگہ کوئی ایسا کوٹھا نہیں تھا جو اس بازار کی کسبیوں اور معروف معنی میں طوائفوں کے لیے مخصوص ہو کر رہ گیا ہے۔ جہاں کسی کو ایسے ہی خالی ہاتھ اور جب منہ اٹھا چلے جانا آسان نہیں ہوتا۔ بلکہ امیر کا یہ کوٹھا نہیں، کوٹھی ہو گی جہاں وہ پورے سماجی اصول و قوانین کے ساتھ رہائش پذیر تھی اور جہاں دن کی روشنی میں بھی اس کے ہاں احباب آ جا سکتے ہوں گے۔ ورنہ اقبال ایسا شخص اپنے ایک سیدزادہ دوست کو "کوٹھے" پر جانے کی اس طرح ترغیب نہ دیتا کہ "خدا کے واسطے وہاں ضرور جایا کریں۔"

بہر حال، ہمارا اس وقت یہ موضوع نہیں! حالانکہ اس طرح کے واقعہ سے اقبال کا کردار اور زیادہ روشن اور بلند ہو کر سامنے آتا ہے کہ آتشِ حسن ہو یا شعلہ آتش سیال دونوں کو حاضر پا کر بھی اقبال نے خود کو غیر حاضر" سمجھا۔ بلکہ ایک تذکرہ نگار ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی کے بقول:

رمز مخفی:

"بزم طرب ہو یا محفل سمع، اقبال کے سحر انگیزی کے معمول میں فرق نہ آتا، نماز فجر کے بعد اس ذوق وشوق اور لحن وترتیل کے ساتھ قرآن مجید کی تلاوت بھی کرتے جیسا کہ خود اقبال اپنی نظم زہد ورندی" میں غالباً اپنے لیے ہی کہتے ہیں:

گانا ہے جو شب کو تو سحر کو ہے تلاوت
اس رمز کے اب تک نہ کھلے ہم پہ معانی

شفقت ومحبت کا سائبان:

یہ قصہ تو محض بر سبیل تذکرہ آ گیا، ورنہ اقبال کی صحیح تفریح تو وہ تھی جب وہ تعطیلات کے دنوں میں سیالکوٹ جا کر والدین، بہن بھائی اور دوسرے احباب اور بچپن کے یار دوستوں کے ساتھ گزرتے۔ افراد خاندان کے درمیان ان کی خوشی اس وقت اور زیادہ دوبالا ہو جاتی جب بڑے بھائی بھی رخصت لے کر یہاں آئے ہوئے ہوتے۔ اپنی چھٹیوں کے دوران بیگم اقبال کریم بی بی دونوں بچوں، آفتاب اقبال اور معراج تبسم کو لیے گجرات سے سیالکوٹ آ جاتیں۔ اقبال کی دو چھوٹی بہنیں کریم بی اور زینب بی تو گھر میں ہی تھیں۔ یہ رونقیں اس وقت اور بھی بڑھ جاتیں جب دونوں بڑی بہنیں فاطمہ بی اور طالع بی اپنے اپنے بچوں کے لیے میکے آ جاتیں، شیخ نور محمد گھر کے سربراہ اپنی بیگم کے ساتھ جب ان کے درمیان بیٹھتے تو جیسے میلہ سا لگ جاتا۔ اقبال حسب مراتب فرداً فرداً سب سے ہنستے بولتے اور اس وقت ان کی باتیں سادہ اور خالص گھریلو ہوتیں، آج کا شاعر اور کل کا فلسفی صحبت مادر میں طفل سادہ دکھائی دیتا تھا۔

☆......☆......☆

قومی زندگی کا ادراک:

شیخ عطا محمد ان دنوں ایبٹ آباد میں تعینات تھے۔ اقبال ان کے پاس گئے اور اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان جانا چاہتے ہیں۔ یہاں اس بات کو تازہ کرتے چلیں کہ انجمن حمایت الاسلام کے جلسوں میں پڑھی جاتے والی نظموں اور ماہنامہ مخزن" میں تواتر سے شائع ہونے والے کلام اور مختلف اہم قومی اور اسلامی موضوعات پر شائع ہونے والے فکر انگیز مضامین نے اقبال کو پڑھے لکھے طبقہ اور عام لوگوں میں بھی ہندوستان کے دور دراز علاقہ تک معروف کر دیا تھا۔ چنانچہ ایبٹ آباد میں آپ کے آنے کی خبر پا کر کچھ باذوق حضرات جو آپ سے غائبانہ طور پر واقف ہو چکے تھے، ملنے کے لیے آئے اور ملاقات کے دوران ان احباب نے اس خواہش کا بھی اظہار کیا کہ ایک مضمون آپ "قومی زندگی" پر بھی رقم فرمائیں۔"

آپ نے ان کی تجویز کو سراہا اور بعد میں وعدے کے مطابق اس عنوان پر ایک بھرپور مضمون قلمبند کیا جو مخزن میں شائع ہوا، ۲۴ صفحات پر مشتمل مضمون کے متن کی خاص باتیں یہ تھیں کہ......

"بزور شمشیر اور باہمی معرکہ آرائیوں کے ذریعہ قوموں کی قسمت کا فیصلہ از کار رفتہ ہو چکا ہے اب مسابقت کا فیصلہ دماغ، تہذیب، تمدن اور علمی فتوحات کی بنیاد پر ہوگا۔"

حالات کی اس تبدیلی کے پیش نظر آپ نے مزید لکھا۔ "اس تغیر کے لحاظ سے اقوام ہندوستان خصوصاً مسلمانوں کی موجودہ حالت کا جائزہ لینا ضروری ہے۔"

اس ضمن میں دنیا کی بہت سی قوموں کے حالات و آثار کی مثالیں پیش کرنے کے بعد برصغیر

کی صورت حال، خصوصاً ہندوستان کے مسلمانوں کی پستی و زبوں حالی کا ذکر کرتے ہیں اور مسلم تاریخ کے پس منظر کے حوالے سے کہتے ہیں:

"سب سے پہلے نبی عرب نے انسان کو فطری آزادی کی تعلیم دی اس تمدنی انقلاب کی بنیاد رکھی جس کے نتائج کو اس وقت تمام دنیا محسوس کر رہی ہے۔ مگر ہندوستان کی حالت زار کو دیکھیں تو ایک مایوس کر دینے والا نظارہ سامنے آتا ہے خاص طور پر مسلمانوں کی حالت اور بھی مخدوش ہے، افلاس، وقت کے تقاضوں سے غافل رہنا تو نمود و نمائش، فضول خرچیاں، دماغ شاہجہانی آمدنیاں قلیل، اس صورت میں جب تک قوم اپنی حالت پر غور نہ کرے خدا بھی اس کی حالت نہیں بدلے گا۔

دراصل یہ مقالہ نہیں اقبال کے زمانے کی متحرک تصویر ہے، اس حقیقت نما مضمون میں اقبال، مرض کے ساتھ علاج بھی بتاتے ہیں۔ کہتے ہیں۔

"قومی ترقی کے لیے فرد کی ذاتی اصلاح ناگریز ہے۔"

اس حکیمانہ مضمون کے اندر قومی زندگی کو صحت منداور کامیاب و کامران بنانے کے لیے آپ نے جن باتوں پر زور دیا وہ تمدن کے اندر اصلاح، تعلیم کو عام کرنا، عورتوں کے حقوق کی پاسداری اور صنعت و تجارت کو فروغ دینا شامل تھا۔ یہ فکر انگیز مقالہ ۲۷ سالہ اقبال کی ذات کو ایک ایسے مصلح قوم کے طور پر پیش کر رہا تھا جو اپنے اندر وہ تمام صلاحیتیں رکھتا ہے جو ایک مفکر کے لیے ضروری ہوتی ہیں، یعنی وسعت مطالعہ، عمرانی بصیرت، حب الوطنی، اور اس سے زیادہ یہ کہ مقالہ نگار اپنے سینے میں ایک درمند دل لیے ہوئے تھا۔

مشاہدۂ قدرت:

مذکورہ مقالہ کیونکہ ایبٹ آباد کا حوالہ رکھتا ہے تو کیوں نہ ہم اس نظم کا بھی تذکرہ کرتے چلیں جو اقبال نے یہاں "سربن" پہاڑ کے بالمقابل واقع میونسپل باغ میں بیٹھ کر لکھی تھی جس کا عنوان تھا "ابر" اقبال کو قدرت نے قوت مشاہدہ کے ساتھ قوت بیان بھی عطا کی ہے، مناظر قدرت ان کی دلچسپی کا سب سے بڑا سامان ہیں، لیکن وہ چشم حیوان کی طرح نہیں دیکھتے اور نہ ہی کیمرے کی

آنکھ کی طرح محض کسی کو دیکھ کر اپنے اندر اسے نقش کر لیتے ہیں بلکہ وہ قدرت کی ان تصویروں کو ماتھے کی آنکھ سے دیکھتے اور "دل و دماغ" سے ان پر گہرے انداز میں غور کرتے اور انہیں ان کی جزئیات سمیت لفظوں کے سانچے میں ڈھال دیتے ہیں، گویا اس طرح ان حسین نقوش کے بنانے والے کی تعریف سرائی کرتے ہیں۔ "ابر" نظم کو دیکھئے۔ کہتے ہیں:

اٹھی پھر آج وہ پورب سے کالی کالی گھٹا
سیاہ پوش ہوا پھر پہاڑ سربن کا

مشرق کی طرف اٹھنے والی کالی گھٹا سربن پہاڑ پر اس طرح چھا گئی ہے گویا پہاڑ نے سیاہ لباس پہن لیا ہو:

نہاں ہوا جو رخ مہر زیر دامن ابر
ہوائے سرد بھی آئی سوار توسن ابر

ایک طرف ابر کے دامن میں سورج نے منہ چھپا لیا ہے، دوسری طرف ابر کے گھوڑے پر سوار ٹھنڈی ہوا آن پہنچی ہے:

گرج کا شور نہیں ہے خموش ہے یہ گھٹا
عجیب میکدہ بے خروش ہے یہ گھٹا

اس گھٹا میں ایسا کوئی شور نہیں جیسا کہ برسات کے موسم میں بادلوں کے گرجنے سے پیدا ہوتا ہے بلکہ یہ ایک ایسے میکدہ کی صورت ہے جہاں ہاؤ ہو کا کوئی شور رو ہنگامہ سنائی نہیں دیتا:

چمن میں حکم نشاط مدام لائی ہے
قبائے گل میں گہر ٹانکنے کو آئی ہے

دیکھنے کو یہ گھٹا سیاہ فام ہے لیکن یہ چمن کے لیے ایک مسرت انگیز پیغام لے کر آئی ہے اور یہ کہ یہ پھولوں کے لباس پر موتی جڑنے والی ہے:

جو پھول مہر کی گرمی سے سو چلے تھے اٹھے
زمیں کی گود میں جو پڑ کے سو رہے تھے اٹھے

سورج کی تپش کی وجہ سے جو پھول مرجھانے لگے تھے وہ پھر سے کھلنے لگے ہیں، اور وہ جو زیر

زمین تھے اب وہ بھی پھوٹ نکلے ہیں:

ہوا کے زور سے ابھرا ، بڑھا ، اڑا بادل
اٹھی وہ اور گھٹا ، لو برس پڑا بادل

اقبال جیسے رواں تبصرہ کر رہے ہیں۔ کہتے ہیں۔ ہوا میں تیزی آگئی ہے جس نے بادل کے گویا پر لگا دیے ہیں اس نے تیزی سے اڑنا اور آگے بڑھنا شروع کر دیا ہے، وہ دیکھو ایک زوردار گھٹا اٹھنے لگی اور یہ لو بادل نے برسنا شروع کر دیا:

عجیب خیمہ ہے کہسار کے نہالوں کا
یہیں قیام ہوا وادی میں پھرنے والوں کا

اقبال یکا یک اس منظر میں جان منظر کا تذکرہ کرتے ہیں، کہتے ہیں: ان پہاڑی لوگوں کا بھی یہ عجیب ٹھکانہ ہے، یہ بس یہاں سیر و سیاحت کے لیے آئے تھے۔ لیکن پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔

لگتا ہے اقبال نے اس نظم کے ذریعہ ایبٹ آباد اور اس کے ان احباب کو سپاس تشکر پیش کیا ہے جو اپنے ہاں ان کی موجودگی پا کر ان سے ملنے آئے اور جنہوں نے انہیں قومی زندگی پر مقالہ لکھنے کا مشورہ دیا۔ اس سے اس بات کی بھی پرزور تائید ہوتی ہے کہ اقبال کے پڑھنے والوں نے سمجھ لیا تھا کہ یہ ابھرتا ہوا مفکر شدت سے اپنی قوم کے متعلق سوچ رہا ہے اور یہ بھی کہ اس کے پاس صرف سوچ یعنی دماغ ہی نہیں، دل اور زبان بھی ہے اقبال نظم و نثر کے ذریعہ ایک طرف قوم کی پستی و زبوں حالی کی داستان بیان کر رہے ہیں، دوسری طرف قوم کو حیات نو کا پیغام دے رہے ہیں، انہیں خواب غفلت سے جگا رہے ہیں۔

☆......☆......☆

maablib.org

ازدواجی ناآسودگی:

اقبالؔ میکلوڈ عربک ریڈر کے منصب سے سبک دوش ہو گئے لیکن گورنمنٹ کالج، لاہور میں اُن کا اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے تقرر مستقل کر دیا گیا۔ ایم اے کرنے اور ہاسٹل چھوڑنے کے بعد سے وہ جون ۱۹۰۳ء تک اندرون بھاٹی دروازے بازار حکیماں میں رہائش پذیر رہے۔ اس دوران موسمِ گرما کی تعطیلات کے ایام سیال کوٹ جا کر والدین اور اہل و عیال کے ساتھ گزارتے رہے۔ اندازہ ہے کہ یہی وہ عرصہ ہے جب اہلیہ کریم بی بی کے ساتھ اُن کے تعلقات دگرگوں ہوئے، مزاجوں کے فرق نے دونوں کے درمیان جو ایک سرد جنگ کی سی کیفیت پیدا کر رکھی تھی، واضح طور پر سامنے آ گئے۔

ازدواجی ناآسودگی آدمی کو بکھیر کر رکھ دیتی ہے۔ زندگی بے ڈھب ہو جاتی ہے لیکن اقبالؔ کو یہ معاملات اقبالؔ بننے سے نہ روک سکے۔ اِن حالات کو اُنہوں نے زندگی کا حصہ سمجھ کر قبول کر لیا اور اندر کے انسان کو سمجھا دیا کہ یہ عمرانی زندگی کے معمولات ہیں، اِن کے زیرِ اثر آ کر زندگی کے اعلیٰ مقاصد کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ چناں چہ کوئی کمزوری دکھائے بغیر اپنے اِس سفر کو جاری رکھا، جو وہ اپنی اوائل عمری سے شروع کر چکے تھے۔ آگہی کی طلب اور رائج الوقت تعلیم کے حصول کی کوشش کے ساتھ ساتھ اُنہوں نے اپنے اندر شوقِ آگاہی میں کوئی کمی نہیں آنے دی۔

نالۂ فراق:

پروفیسر ڈاکٹر ٹامس آرنلڈ گورنمنٹ کالج سے سبک دوش ہو گئے۔ ۲۶ فروری ۱۹۰۴ء کو وطن روانہ ہونے سے قبل مختلف حلقوں کی طرف سے اُن کے اعزاز میں تقریبات کا انعقاد کیا گیا۔ ایک الوداعی تقریب میں اقبالؔ نے اپنے اُستاد کے لیے "نالۂ فراق" کے عنوان سے نظم پڑھی۔ جس میں نہایت جذباتی انداز میں اُنھیں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ یوں، نالۂ یتیم کے بعد نالۂ فراق یہ دوسری نظم ہے جو شارحینِ اقبالؔ کو "گریۂ اقبالؔ" کے عنوان سے ایک منفرد موضوع فراہم کرتی ہیں۔ پروفیسر آرنلڈ کی علمیت و قابلیت کا اعتراف اور بہ شکستہ دل اُنھیں الوداع کہا۔ بلکہ اپنے اِس لائق و فائق اُستاد اور دیرینہ رفیق سے آئندہ ملاقات کا شوق اور عزم بھی ظاہر کیا گیا:

کھول دے گا دشتِ وحشت عقدۂ تقدیر کو
توڑ کر پہنچوں گا میں پنجاب کی زنجیر کو

یہی سال ہے کہ اقبالؔ کے ایک قریبی دوست اور مزاج آشنا شیخ عبدالقادر قانون کی اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان روانہ ہوتے ہیں اور اقبالؔ کے شوقِ سفر کو مہمیز لگ جاتی ہے۔

ایک ضروری وضاحت:

یہاں ایک بات واضح کرتے چلیں کہ نثر و نظم کے ساتھ اقبالؔ غزل بھی کہہ رہے تھے، مگر اُن کے ہاں کسی خیالی محبوب کا تصورِ سراپا اُس کے لب و رخسار اور لایعنی ہجر و وصال کے قصے نہیں تھے۔ اقبالؔ کا محبوب ہی اور تھا اور وہ محبوب اُس کا مسلک تھا یا پھر اُس کی ملت ہی اس کی محبوب تھی اور اُن کے ہاں اگر گل و بلبل کے فسانے ہیں بھی تو وہ اصطلاحاً کسی اور ہی طرف اشارہ کرتے دکھائی دیتے ہیں، صاف نظر آتا ہے کہ اقبالؔ شعر کے پردے میں رہ کر ذات و کائنات کے رازو رموز سے اپنے مخاطبین کو آگاہ کرنا چاہتے ہیں۔ اِن اشارات کے ذریعہ وہ استعماری قوتوں کی عیاری و دجل کو بھی بے نقاب کرنے کی کوشش میں ہیں۔ اُن کا شاعرانہ فن نہ صرف برصغیر، بلکہ پورے ایشیا کو خوابِ غفلت سے جگانے کے لیے بے چین ہے، اُنھیں احساس دلانے کا عزم کر رہے ہیں کہ ایک دن آئے گا جب وہ اُنھیں کہیں گے " اُٹھو! اور اپنے گلے سے طوقِ غلامی

اُتار پھینکو۔" خصوصاً مسلمان اُن کے اوّلین مخاطب ہوں گے۔ وہ اُنہیں پُر زور آواز میں پکار کے خبردار کریں گے کہ "اب اگر نہ اُٹھے تو اس خطے سے تمہارا وجود ہی ختم ہو جائے گا۔"

یہ وہ عزائم ہیں اقبالؔ کے جنہیں وہ انجمن حمایت الاسلام کے جلسوں اور دیگر سماجی انجمنوں کے اجتماعات میں اپنی نظموں کے ذریعہ ظاہر کر چکے تھے اور لوگ اُن کے لب و لہجے کو پہچاننے لگے تھے کہ یہ جواں سال شاعر اپنے دل میں قومی فلاح و بہبود کا درد لیے ہوئے ہے، جریدہ "مخزن" نے انہیں بہ حیثیت شاعر ادبی حلقوں میں خصوصیت کے ساتھ متعارف کرا دیا تھا۔ اُن کے پڑھنے والے انہیں روایتی شاعروں سے واضح طور پر الگ اور منفرد محسوس کر چکے تھے۔ کیوں کہ عام ذہنوں میں شاعر کا تصور اب تک یہی رہا تھا کہ اُن کے اعصاب پر عورت سوار ہے، اُن کے اشعار سے عام طور پر جنسیت کی بدبو پھوٹتی محسوس ہوتی ہے۔ یہ گروہ، ابلیسی جمالیات کو اپنے دماغوں میں بسائے ہوئے، اور اس گناہ بے لذت سے خود کو تو آلودہ رکھتا ہی ہے، اپنے سامعین کا بھی وقت برباد کرتا اور اخلاق بگاڑنے کا سبب بنتا ہے جب کہ اقبالؔ کی شاعری میں ایک اور ہی رنگ آہنگ اور دوسرا ہی خوش کن لہجہ نظر آیا ہے، لوگ صاف محسوس کر رہے ہیں کہ یہ روایتی شاعر نہیں اس کے ہاں بے مقصدیت، لایعنیت اور فرسودہ خیالی کا شائبہ تک نہیں۔ اِس نے تو لفظوں کے معنی ہی بدل دیے ہیں، اور آگے جا کر تو انہیں یہ کہنا پڑا:

یہ شاعری نہیں صورِ اسرافیل ہے، جو مُردوں کو زندہ کرنے والی پکار ہے، حیات نو بخشنے والی آواز ہے، انہیں ہوش دلا رہی ہے، جیسے کہہ رہی ہو:

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہو گا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

یہ کیسا شاعر ہے کہ گل و بلبل اور لب و رخسار کے افسانے سنانے کی بجائے، قوم کے بکھیڑوں میں پڑ گیا ہے! اسے خبردار کرنے اُٹھ کھڑا ہوا ہے، پکار پکار کر کہہ رہا ہے:

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

ذرا دیکھ اِس کو جو کچھ ہو رہا ہے، ہونے والا ہے
دھرا کیا ہے بھلا عہدِ کہن کی داستانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو!
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

اور ہندوستان والوں نے چونک کر اس پکارنے والے کی طرف دیکھا، جن کے دل میں زندگی کی کوئی رمق باقی تھی اس آواز پر کان دھرے کہنے لگے۔ "یہ درویش کون ہے جس کی صدا دل میں اُتری جارہی ہے، نیرنگیِ زمانہ سے آگاہ کر رہی ہے، عجب درویش ہے یہ جو دنیا کے بدلتے ہوئے حالات کی خبر دے رہا ہے، اس کی آواز میں بڑی مضبوطی اور توانائی پائی جاتی ہے۔ اس کی گونج دلوں کو چھوتی ہوئی اور روح سے ٹکراتی محسوس ہوتی ہے۔" اور پھر آنے والے وقت نے دیکھا کہ یہی بازگشت اونچے ایوانوں تک جا پہنچی۔ لیکن یہ سب بعد کے مناظر ہیں، ابھی تو ابتدا ہوئی ہے، ابھی تو موضوعاتی اور چند قومی نظمیں کہہ کر یہ نیا شاعر خود کو آزما رہا ہے، ابھی تو اس کی خودی فاش نہیں ہوئی، ابھی تو وہ خود ہی طالبِ علم ہے، تو جوانی کی حدوں سے آگے نہیں بڑھا ہے، ابھی تو علم کی طلب اسے مغرب کی طرف اُکسا رہی ہے۔ لیکن وہ ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتا ہے، مادی وسائل کی کمی سوال بن کر اُس کی راہ میں حائل ہو رہی ہے۔ سات سمندر پار کا سفر کوئی سان نہیں، خاصا مہنگا سودا ہے، مگر درویش صفت اقبالؔ بلند حوصلہ ہے، ہر شے کے نتیجہ کو خدا پر چھوڑنے کا قائل ہے، اسے یقین ہے کہ ارادہ نیک اور جذبہ صادق ہو تو قدرت آپ ہی آپ حنا بندی سے نوازدیتی ہے۔ ملازمت کے دوران کچھ رقم پس انداز کر رکھی تھی، جو انگلستان کے سفر کے لیے ناکافی تھی، تو اس مرحلے پر برادرِ معظم شیخ عطا محمد ہمیشہ کی طرح معاون ثابت ہوئے، جنہوں نے مالی معاونت کر کے مشکل آسان کر دی۔

سوئے انگلستان:

اقبالؔ نے ۱۹۰۵ء میں اپنے دیرینہ ارادہ کی تکمیل کے لیے رختِ سفر باندھ لیا۔ ہم چاہیں گے کہ مستقبل کے اِس عظیم فلسفی، شاعرِ اسلام، مفکرِ اسلام اور حکیم الامت کے اِس اہم مرحلے پر

سے سرسری طور پر نہ گزرا جائے، بلکہ ہندوستان سے انگلستان تک کے دوران سفر خود اقبالؔ کے اپنے احساسات و جذبات کیا تھے؟ اس روداد کو بھی اپنی معلومات کا حصہ بنالیا جائے، تاکہ اُن کی شخصیت سازی میں مرحلہ وار پیدا ہونے والے خدوخال ہمارے سامنے نمایاں ہوتے جائیں او ہمیں اس مردِ مومن اور دانائے راز کے فکری اور نظریاتی سفر سے آگاہی حاصل ہو سکے۔

انگلستان جانے کے لیے پہلے بمبئی پہنچنا ہوتا تھا، لہٰذا اقبالؔ لاہور سے بمبئی جانے کے لیے براستہ دلی روانہ ہوئے۔ دہلی میں کئی احباب سے ملاقات کی اور مشہور صوفی بزرگ خواجہ نظام الدینؒ کی درگاہ پر حاضری دی، اور اس موقعے پر ایک نظم "التجائے مسافر" کے عنوان سے لکھی۔

یہ اقدام خود اس بات کی دلیل ہے کہ اقبالؔ کی روح میں کس قدر پاکیزگی اور شعر سازی کے فن میں کتنی توانائی، تنوع اور اعتماد ہے۔ یہ نوجوان اہلِ دل، اہلِ نظر کے آثار سے کتنا گہرا جذباتی لگاؤ رکھتا ہے، ملاحظہ کریں۔ اس وقت سرزمین ہند کے ایک مردِ فقیر سے جو ہند کے باسیوں میں خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے نام سے عقیدتاً یاد کیا جاتا ہے، کس طرح اظہارِ عقیدت کر رہا ہے۔ اس مسافر کا ایک ایک لفظ اس کی "روحانیت پسندی" کا غماز ہے۔ عرض گزار ہے۔

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو وہ نام ہے تیرا
بڑی جناب تری، فیضِ عام ہے تیرا
ستارے عشق کے تیری کشش سے ہیں قائم
نظامِ مہر کی صورت، نظام ہے تیرا
نہاں ہے تیری محبت میں رنگِ محبوبی
بڑی ہی شان، بڑا احترام ہے تیرا

☆

چمن کو چھوڑ کر نکلا ہوں مثلِ نکہتِ گل
ہوا ہے صبر کا منظور امتحاں مجھ کو
چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے
شرابِ علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو

اب اور دیکھیے، اقبالؔ اعلیٰ تعلیم کی غرض سے یورپ جارہے ہیں، اُن کی عمر کا نوجوان عام طور پر ایسے وقت میں لندن اور پیرس کے پرستان کا تصور لیے رہتا ہے، جب کہ یہ جوان ہی اور ہے، یہ کچھ اور ہی ارادے باندھ رہا ہے، ولیِ کامل کے وسیلے سے کیا چیز طلب کر رہا ہے، دولت؟ شہرت؟ اعلیٰ منصب یا پُر آسائش زندگی؟ ! نہیں، جس چیز کی طلب ہے، وہ اقبالؔ ایسے ہی قلندر کا حاصل ہو سکتی ہے جو مال و دولتِ دنیا اور ہر رشتہ و پیوند سے بالاتر سوچ کا حامل تھے، یہی سبب ہے کہ وہ کچھ اور نہیں آہِ رسا کا طالب ہے:

دلوں کو چاک کرے مثلِ شانہ جس کا اثر
تری جناب سے ایسی ملے فغاں مجھ کو

اگر خدا نے مجھے شعر گوئی کا ہنر بخشا ہے تو میری شاعری میں ایسا اثر پیدا کر دے کہ جو پتھر دل کو موم کی طرح پگھلا کر رکھ دے۔

اقبالؔ ایسے وقت میں کہ جب وہ وطن، اہلِ وطن اور اپنے عزیز و اقارب، اساتذہ، دوستوں اور احباب سے بہت دور جا رہے ہیں اور جدائی کا یہ عرصہ دنوں اور مہینوں پر مشتمل نہیں بلکہ سالوں پر محیط ہے تو اُن کی یادوں کو ابھی سے ہی حرزِ جاں بنا رہے ہیں، ''التجائے مسافر'' میں اُن کے لیے کلماتِ خیر و سپاس پیش کرنا نہیں بھول رہے۔ سب سے اوّل جیسا کہ ہونا چاہیے تھا، ماں باپ کے لیے آرزومندی کا اظہار کرتے ہیں:

پھر آ رکھوں قدم مادر و پدر پہ جبیں
کیا جنھوں نے محبت کا رازداں مجھ کو

کیا سعادت مندی ہے وہ جس دیار کی طرف جا رہے ہیں، جانتے ہیں کہ اُس کی آب و ہوا اِس قدر مسموم ہے کہ انسانی اوصاف کو موت کی نیند سلا دیتی ہے، اخلاق و مروّت مر کے رہ جاتے ہیں، اکثر ولایت پلٹ افراد کو دیکھا گیا ہے کہ وہ اپنی خودی کو چھوڑ کر خود کو لے آتے ہیں، لیکن کوٹ پتلون میں ملبوس آنے والا سراپا، ویسا نہیں رہتا جیسا یہاں سے گیا تھا، روح سے خالی، بس ایک تودۂ خاک بن کر رہ جاتا ہے، اُسے نہ اپنا دین و عقیدہ یاد رہتا ہے اور نہ یہاں کی قدریں یاد رہتی ہیں، بزرگوں کے ساتھ ادب و آداب سے پیش آنا اور والدین کے ساتھ محبت اور احترام کا رویہ

سب فراموش کر چکا ہوتا ہے۔ اقبالؔ اس المیے سے باخبر ہیں، تاہم اُن کے لیے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ انھیں خود پر اعتماد نہیں اور وہ اس بات سے خوف زدہ ہیں کہ کہیں وہ خود بھی وہاں جا کر اسی رنگ ڈھنگ میں نہ ڈھل جائیں؟ نہیں بلکہ وہ اپنے حوالے سے قوم کے دوسرے جوانوں کو یہ سبق دے رہے ہیں کہ تم کہیں بھی جاؤ، کوئی بھی علم حاصل کرو، کسی بھی تہذیب کا تمھیں سامنا کرنا پڑے، لیکن اپنی مٹی سے جڑے رہنا، اپنی قدروں کو نہ بھولنا، واپس آ کر بھی اپنے بزرگوں کی قدم بوسی کو ترک نہ کرنا، اپنی جبینوں کو ماں باپ کے قدموں میں رکھنا نہ بھولنا، کیوں کہ انھی کی شفقت اور مامتا نے تمھیں پیار اور محبت سے آشنا کیا ہے، ورنہ اگر وہ تمہارے پیدا ہوتے ہی تم سے آنکھیں پھیر لیتے! پیار اور محبت سے پرورش اور تربیت نہ کرتے تو اس راز سے کیوں کر واقف ہو سکتے تھے کہ یہ محبت ہی تو ہے جو فاتحِ عالم ہے کہ دلوں کو اسی چیز سے جیتا جا سکتا ہے؟ ہاں یہ اُنھی کی مہربانی ہے کہ کامیابی اور کامرانیوں سے گزر رہے ہو، ورنہ ایک ہاری ہوئی اور شکست خوردہ زندگی گزار رہے ہوتے۔

اقبالؔ کو جس طرح والدین کا خیال ہے، اسی طرح اپنے اساتذہ، خصوصاً اپنی شخصیت کی تعمیر میں پہلا پتھر رکھنے والے اُستاد سید میر حسن کے احسان کو بھی فراموش نہیں کر سکتے، کہتے ہیں:

وہ شمعِ بارگہِ خاندانِ مرتضوی
رہے گا مثلِ حرم جس کا آستاں مجھ کو

وہ خاندانِ مرتضوی کا چشم و چراغ جس کا آستانۂ علم میرے لیے مثالِ حرم، قابلِ احترام رہے گا، کیوں کہ جس کی پُر خلوص کوششوں نے مجھے آج اس قابل بنا دیا ہے:

نفَس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی
بنایا جس کی مروّت نے نکتہ داں مجھ کو

یہ انھی کی مشفقانہ کوششوں کا ثمر ہے۔ اُسی ہستی نے میری حصولِ علم کی کلی کو شگفتگی بخشی ہے کہ ابتدائی تعلیم سے لے کر آج اعلیٰ تعلیم کے لیے رختِ سفر باندھنے تک اگر میں کسی لائق ہوں تو وہ یہی مخزنِ علم شخصیت ہے جو میری ممدوح ہے جس کی خصوصی توجہ اور نظرِ عنایت نے مجھے حقیقت آشنا بنا دیا ہے:

دعا یہ کر کہ خداوندِ آسمان و زمیں
کرے پھر اُس کی زیارت سے شادماں مجھ کو

"اے اللہ کے ولی، آپ دعا فرمائیے۔ میں پھر اپنے اُس محسن کی زیارت
سے شادماں ہوسکوں۔"

اب اقبال اپنی اِس التجا میں ایک ایسی شخصیت کو شامل کرتے ہیں جو کہنے کو بھائی ہے، لیکن باپ کا سا درجہ رکھتا ہے، اِس لیے کہ اُس نے اُن کے ساتھ برادرانہ نہیں بلکہ پدرانہ محبت وشفقت کا رویہ رکھا ہے:

وہ میرا یوسفِ ثانی، وہ شمعِ محفلِ عشق
ہوئی ہے جس کی اُخوت قرارِ جاں مجھ کو

جس طرح یوسفِ صادق نے اپنے بھائیوں کے ساتھ کمالِ محبت وعنایت کا سلوک کیا، اُسی طرح میرا بھی ایک یوسف ہے، یوسفِ ثانی جس نے مجھ سے ایسی ہی محبت جتائی ہے۔ لگتا ہے وہ محفلِ عشق کا روشن چراغ ہے:

جلا کے جس کی محبت نے دفترِ من و تو
ہوائے عشق میں پالا، کیا جواں مجھ کو

جس نے اپنے اور مجھ میں کوئی فرق کیے بغیر ایک جان دو قالب بن کر مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز جان رکھا اور میری تعلیم اور پرورش کے دوران میرے آرام وآسائش میں کسی چیز کی کمی نہیں آنے دی:

ریاضِ دہر میں مانندِ گل رہے خنداں
کہ ہے عزیز تر از جاں وہ جانِ جاں مجھ کو

"میری دعا ہے وہ اِس گلستانِ دنیا میں پھول کی طرح ہنستا بستا رہے
کیوں کہ میں اُسے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔"

اللہ والے کی چوکھٹ پر حاضری سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اقبال ایک نہایت اہم اور حساس معاملے کے خدشات سے پناہ مانگتے ہیں۔ قلم کی کاٹ، زبان کی طرح ہوتی ہے، اگر صاحبِ قلم

احتیاط نہ کرے اور اپنی تحریر و تقریر میں اعتدال نہ برت سکے تو جانے کن کن کے احساسات کو مجروح اور دلوں کو زخمی کرتا چلا جاتا ہے۔ اقبالؔ اِس بات کا شدید احساس اور ادراک رکھتے ہیں اور اپنے اندر پرورش پانے والے اِس جذبے سے بہ خوبی واقف ہیں جو اُنہوں نے مستقبل کے لیے سنبھال کا رکھا ہوا ہے کہ ایک دن آئے گا وہ اِس جذبے کے ذریعہ ایک طرف ایشیا، خصوصاً برصغیر کی خواب گاہوں کو جھنجوڑ کر رکھ دینے کا عزم اور دوسری طرف مغرب کے صنم خانوں کو برہم کرنے کا دم خم رکھتے ہیں، لیکن چاہتے یہ ہیں کہ اِس عمل میں اُن کا قلم حد سے نہ گزر جائے، اعتدال قائم رہے۔ اِس لیے کہ اُن کا مقصد کسی کو مردود و مفسوخ کرنا نہیں بلکہ وہ اپنے اندر عامۃ الناس کی اصلاح کا جذبہ لیے ہوئے ہیں اور اِس کے لیے اپنے قلم کو ذریعہ بنانا چاہتے ہیں۔ لہٰذا یہ مسافر جو مغرب کی طرف رختِ سفر باندھ رہا ہے، اپنے احساس کو ایک اللہ والے کی بزمِ خاموشی میں بہ صورت التجا پیش کر رہا ہے:

مری زبان و قلم سے کسی کا دل نہ دکھے
کسی سے شکوہ نہ ہو زیرِ آسماں مجھ کو

اقبال آخر میں اِس آرزو کے ساتھ اپنے اِس التجائی دورانیہ کا اختتام کرتے ہیں کہ:

شگفتہ ہو کے کلی دل کی پھول ہو جائے
یہ التجائے مسافر قبول ہو جائے

☆......☆......☆

صوفی کے آستانے سے نکلے تو رند کی طرف چل دیے، مرزا غالب جو عشق میں رسوا ہو کر غرقِ دریا ہونے کی آرزو رکھتے تھے، تاکہ:

"نہ کہیں جنازہ اُٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا"

لیکن افسوس اُن کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی، بلکہ جنازہ بھی اُٹھا اور مزار بھی بنا، چناں چہ اقبالؔ اِس بلبلِ ہندوستاں سے ملنے اُس کے مزار پر گئے اور یہ سوچ کر فاتحہ پڑھی کہ ہر چند تو بادہ خوار ہے، لیکن ہم پھر بھی تجھے ولی سمجھتے ہیں، اِس لیے کہ بادہ خوار اسد اللہ خاں تو اپنے خالق کے پاس پہنچ چکا، اب خالق جانے اور اُس کا بندہ۔ البتہ ہمیں غالب سے غرض ہے جو اپنے کلام کی شکل میں

مسائلِ تصوف چھوڑ گیا ہے، لہٰذا اسی ارمغانِ سخن کا شکریہ ادا کرنے .آج کا شاعر لاہور سے چل کر دلی پہنچا ہے اور نجم الدولہ، دبیر الملک کی آخری آرام گاہ پر حاضر ہے۔

اقبالؔ کو تاریخ سے گہری دل چسپی رہی، ماضی کے مزارات کا مشاہدہ کرنا اُن کا پُرشوق مشغلہ رہا، لہٰذا اسی دورے میں وہ مغل بادشاہوں ہمایوں اور داراشکوہ کے مقابر پر بھی گئے اور یہ حساب کیے بغیر کہ زمین کی تہہ میں سونے والے اِن تاج داروں نے اپنے اپنے دور میں کیا اچھا کیا اور کیا اچھا نہیں کیا، اُن کے حق میں دعائے مغفرت کی، اِس یقین کے ساتھ کہ اچھے برے اعمال کی جانچ پڑتال کا حق خالق کو ہے اور وہ کل قیامت میں ہوگی، آج یومِ حساب نہیں، اور نہ ہی آج کا میزان، وہ میزان ہے جو کل میدانِ حشر میں قائم ہوگا، آج کا دھرم کانٹا تو صرف سونا ہی تول سکتا ہے، انسان کا وزن نہیں کرسکتا اور نہ ہی انسانیت کا بوجھ اُٹھا سکتا ہے، بلکہ یہ تو کسی عمل کے کھوٹے کھرے کو پرکھنے سے بھی قاصر ہے، تو کسی کے اعمال کا کیوں کر فیصلہ کرسکتا ہے۔

☆......☆......☆

اقبالؔ، پنجاب ہی نہیں پورے ہندوستان کی زنجیر توڑ کر سوئے فرنگ جانے کو تیار ہیں لیکن ہم چاہیں گے کہ انگلستان روانگی سے پہلے 1900 تک، اُن کی شاعری کا ایک سرسری سا جائزہ لے لیا جائے۔ ملک وملت سے متعلق اُن کی سوچ اور فکر کا کچھ اندازہ کیا جاسکے کہ اُس وقت اُن کی شاعری میں کیا احساسات وجذبات کارفرما تھے۔

تو مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی ابتدائی شاعرانہ کوششوں میں ''سرسید کی تحریک کے کچھ اثرات بھی محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ نیز اُن نظموں کے بین السطور حب الوطنی، وطن اور اہلِ وطن کی فلاح و بہبود کا خیال، مذہبی فرقہ بندی کی مذمت، باہمی، نااتفاقی اور آپس کے خلفشار کا تذکرہ متعصب اور تنگ نظر ملاؤں پر اظہارِ افسوس بلکہ کڑی تنقید، امراء کے طبقہ کی بے حسی اور اُن کے اندر دردمندی کے فقدان کا شکوہ، دیگر اقوام کے ساتھ فراخ دلی اور رواداری سے پیش آنے کا درس اور بالخصوص عشقِ رسول کا جذبہ اُس وقت کی نظموں میں محسوس کیا جاسکتا ہے۔ مزید برآں اُن کے مضامین سے یہ بھی مترشح ہے کہ نہایت گہری غور وفکر، آرزو وجستجو، مستقبل کے ایک بڑے فلسفی شاعر کی خبر دے رہی ہے۔ ''گلِ رنگین'' کا یہ مصرع: اُن کے اندرونی کرب کا آئینہ دار ہے،''

زخمی شمشیرِ ذوقِ جستجو رہتا ہوں میں'' یعنی ذوقِ جستجو کی شمشیر مجھے زخمی کرتی رہتی ہے، مطلب یہ ہے کہ ذات و کائنات اور موت و حیات کے اسرار و رموز کو جاننے کی جستجو مجھے بے چین رکھتی ہے۔

ایک اور نظم ''شمع و پروانہ'' کا یہ شعر بھی اُن کے فلسفیانہ ذہن کی گواہی دیتا محسوس ہوتا ہے:

پروانہ اور ذوقِ تماشائے روشنی
کیڑا ذرا سا اور تمنائے روشنی

اسی طرح نظم ''کنارِ راوی'' میں سینۂ دریا پر تیرتی کشتی کا منظر پیش کیا گیا ہے، اُس کی روانی، اُس کا پیشِ نظر رہنا اور پھر نظر سے اوجھل ہو جانا، اور اُس کی مماثلت سے حیات و موت کے سفر کو اُجاگر کرنا، خالص فلسفیانہ مضامین ہیں۔

''ابرِ کوہسار'' موضوعی نظم ہے جس میں اقبالؔ ابر کو ایک اُمید کے طور پر محسوس کرانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ جس طرح ابر برس کر دشت و جبل کو سیراب کر دیتا ہے۔ ویرانہ کو پُر رونق بنا دیتا ہے۔ اسی طرح آئینۂ شب؛ انسان کے اندر ویرانی کو دور کر کے اُسے سبزہ زار میں تبدیل کر دیتا ہے۔

بچوں کے لیے تمثیلی نظموں کے ساتھ ساتھ مقبولِ عام دعائیہ نظم ''لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری۔'' ایک بہتر انسانی زندگی گزارنے کا مکمل لائحۂ عمل رکھتی ہے۔ بچوں کی دیگر نظموں میں بھی نہایت اخلاقی اور اصلاحی مضامین پائے جاتے ہیں۔ ''عقل و دل'' میں اقبالؔ نے دونوں کے درمیان مکالمہ کرا کے عقل کے مقابلہ میں دل کو فاتح قرار دیا ہے۔ دل کا فاتحانہ شعر ملاحظہ کیجیے:

کس بلندی پہ ہے مقام مرا
عرش ربِّ جلیل کا ہوں میں

''شمع'' اپنی زبان، بیان اور اپنے مضمون کے اعتبار سے اُس وقت کی اعلیٰ ترین نظم ہے۔ پوری نظم میں فکر و خیال کی بلندی اور معنویت سمو کر کمال درجہ کی حکیمانہ اور فلسفیانہ حقیقتیں بیان کر گئے ہیں۔ خصوصاً ملک و ملت کے حالِ دگرگوں اور غلامی کے شدید احساس نے لگتا ہے انہیں تڑپا کر رکھ دیا ہے۔ گویا ہندوستان کے کروڑوں افراد کی طرح وہ بھی اس غلام آباد کو اپنا وطن اور غیر کی حکومت کو ''اپنی حکومت'' تسلیم کیے کاروبارِ زندگی میں مصروف تھے، لیکن جیسے جیسے شعور جاگا، علم و

آ گہی نے فکر و خیال کو روشنی بخشی، تو جیسے خوابِ غفلت سے جاگ پڑے، ہوش آنے پر دیکھا کہ وہ ایک غلام قوم کے فرد ہیں، قید و بند میں زندگی گزار رہے ہیں، چناں چہ ایک طائرِ اسیر کی طرح پھڑ پھڑا اٹھے۔ کہتے ہیں:

وہ دن گئے کہ قید سے میں آشنا نہ تھا
زیبِ درخت طور مرا آشیانہ تھا
قیدی ہوں اور قفس کو چمن جانتا ہوں میں
غربت کے غم کدے کو وطن جانتا ہوں میں
یادِ وطن فسردگیِ بے سبب بنی
شوقِ نظر کبھی، کبھی ذوقِ طلب بنی

نظم "ایک آرزو" کا مطالعہ بادی النظر میں یوں لگتا ہے، گویا شاعر شورشِ روز و شب اور اپنے گرد و پیش کے ناگفتہ بہ حالات سے نالاں اور بے زار ہے اور اس سے فرار چاہتا ہے، کسی گوشۂ عافیت کا متلاشی ہے، لیکن فی الاصل اقبالؔ کی فکر و نظر سوئے غارِ حرا ہے، وہ سنتِ رسولِ آخر و اعظم ؐ کو اپناتے ہوئے ایک گوشۂ اعتکاف کے خواہش مند ہیں جہاں بیٹھ کر وہ اپنی قوم کی اصلاح کے لیے منصوبہ سازی کر سکیں۔ نظم کا آخری بند، اُن کے اِس عزمِ مصمم اور زندہ تمنا کی بھرپور غمازی کرتا نظر آتا ہے:

پھولوں کو آئے جس دم شبنم وضو کرانے
رونا مرا وضو ہو، نالہ مری دعا ہو
اِس خاموشی میں جائیں اتنے بلند نالے
تاروں کے قافلے کو میری صدا درا ہو
ہر درد مند دل کو رونا مرا رلا دے
بے ہوش جو پڑے ہیں شاید انھیں جگا دے

قومی دردمندی کی یہ ابتدا ہے جس میں اقبالؔ قوم کو خوابِ غفلت سے جگانے کی دل میں ایسی تڑپ رکھتے ہیں جو اِس بات کی دلیل ہے کہ وہ اپنے کیریئر کو بنانے کے ساتھ ساتھ مستقبل

میں قوم کی تقدیر کو صیقل کرنے کا بھی ذہنی پروگرام بنائے ہوئے ہیں۔

''زاہد اور رندی'' ایک ایسی بیانیہ نظم ہے جس کے مضمون سے ''فرقۂ ملامتیہ'' کا مسلک جھلکتا ہے، جس میں اقبالؔ اپنے ایک ناقد مولوی کے حوالے سے اپنی ''میتنہ رندی'' کا برملا اظہار کرتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً جیسا کہ پہلے تذکرہ ہو چکا ہے، اقبالؔ اپنے معاشرے کے جسدِ بیمار کا ہر رخ اور ہر زاویے سے معائنہ کرنے کا نظریہ رکھتے ہیں، حتیٰ کہ اُن کی جرأتِ رندانہ انھیں بازارِ عیش تک لے جاتی ہے، تاہم اُن کی یہ ''سیاحت'' انھیں منزلِ مقصود سے روگرداں نہ کر سکی، جیسا کہ مذکورہ نظم میں وہ اپنی طبیعت کے تضاد کا کھلے عام اعتراف کر رہے ہیں:

گانا ہے جو شب کو تو سحر کو ہے تلاوت
اس رمز کے اب تک نہ کھلے مجھ پہ معانی

نظم کے آخری اشعار میں اقبالؔ نے اپنے ناقد کا گویا منہ بند کر دیا ہے:

میں بھی نہیں ہوں اپنی حقیقت کا شناسا
گہرا ہے مرے بحرِ خیالات کا پانی
مجھ کو بھی تمنا ہے کہ اقبال کو دیکھوں
کی اُس کی جدائی میں بہت اشک فشانی
اقبالؔ بھی اقبالؔ سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اِس میں تمسخر نہیں، واللہ نہیں ہے

''ہمالہ'' جس کا پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے، وہی نظم ہے جس نے اقبالؔ کو نہ صرف عام قارئین میں متعارف کرایا بلکہ اپنے لب و لہجہ کی انفرادیت کی وجہ سے وہ ادبی حلقوں کو متاثر کرتے نظر آئے۔

اسی ابتدائی سفر میں اُن کی ایک نظم ''گلِ رنگین'' ہے۔ جس میں اقبالؔ ایک خوب صورت پھول کو مخاطب کر کے اِس حقیقت کا اظہار کر رہے ہیں کہ دنیا میں کوئی کتنا ہی حسین و جمیل ہو، کتنی ہی رنگینیاں وہ اپنے اندر رکھتا ہو، دنیا کی ظاہری زینت اور شان و شوکت کا باعث ہو لیکن اگر اُس کے اندر حرکت نہیں، دل زندہ نہیں، سوز و سازِ زندگی نہیں، آرزو و جستجو کی گرمی اور جوش نہیں رکھتا تو وہ

محض نظر کو خوش کرنے کا سامان تو ہو سکتا ہے، آسودگی دل اِس سے حاصل نہیں کی جا سکتی۔ اِس تمثیل میں اقبالؔ اب خود کو ایک صاحبِ دل کی حیثیت سے پیش کرتے ہوئے اِس آرزوئے زندہ کا اظہار کرتے ہیں، جو زندگی میں حرکتِ نبض کی رفتار کا پتا دیتی ہے۔ کہتے ہیں:

اِس چمن میں ، میں سراپا سوز و سازِ آرزو
اور تیری زندگانی بے گدازِ آرزو

تو صرف دیکھنے ہی دیکھنے کا ہے، تیری خاموشی و بے آوازی تجھے میری طرح زندوں میں نہیں سمجھتی۔

اقبالؔ کے ذہن میں یقیناً اِس وقت "گلِ رنگیں" کے پردے میں ہند کے وہ سرکردہ حضرات ہیں جو اپنے منصب اور حیثیت کے اعتبار سے تو بڑے نام رکھتے ہیں لیکن اُن کے اندر نہ قومی درد ہے، نہ ملی حمیت ہے، خود بھی اعتراف کرتے ہیں کہ خود میں بھی ابھی تک مثلِ گل ہوں، جو صرف مہکنا جانتا ہے، تتلی کی طرح چہکنا اُسے نہیں آتا:

میری صورت تو بھی اک برگِ ریاضِ طور ہے
میں چمن سے دور ہوں، تو بھی چمن سے دور ہے

جس طرح پھول کو اُس کی شاخ سے توڑ کر چمن سے دور کر دیا گیا ہے، میں بھی اپنے مرکز سے ہٹ چکا ہوں، اپنی تاریخ اور نظریہ کو فراموش کر چکا ہوں، لیکن مجھ میں اور تجھ میں جو فرق ہے وہ یہ ہے کہ تو اپنی شاخ سے ٹوٹ کر اور اپنے چمن سے چھوٹ کر بھی مطمئن ہے، خاموش ہے، صرف اپنے رنگ و بو میں مست ہے، لیکن مجھے میرے "وطن" کی دوری بے چین اور مضطرب رکھتی ہے، ہر لمحہ اِس جستجو میں رہتا ہوں کہ میں کون ہوں؟ کیا ہوں اور میرا وطن کون سا ہے اور اِس وطن سے دوری (تاریخ سے فراموشی) کا سبب کیا ہے؟

مطمئن ہے تو، پریشاں مثلِ بو رہتا ہوں میں
زخمیِ شمشیرِ ذوقِ جستجو رہتا ہوں میں

نظم "صدائے درد" میں لگتا ہے اقبالؔ اپنی اِس سوزِ دلی کا اظہار کر رہے ہیں۔ وہ اپنے وطن اور قوم کے لیے اپنے سینے میں درد رکھتے ہیں۔ نہایت کرب کے عالم میں کہتے ہیں:

جل رہا ہوں، کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے
ہاں ڈبو دے اے محیطِ آبِ گنگا تو مجھے

''آفتاب'' اقبالؔ کی طبع زاد نظم نہیں۔ غیر ملکی شاعر گاییؔ کا ترجمہ ہے۔ شاعر سورج سے مخاطب ہے کہ تو اس جہان کی روحِ رواں ہے، تیرے دم سے وجود و عدم کا پتا چلتا ہے، تسلیم کہ دنیا کی ہر چیز تیری حرارت سے جی رہی ہے، لیکن:

وہ آفتاب جس سے زمانے میں نور ہے
دل ہے، خرد ہے، روحِ رواں ہے، شعور ہے

یعنی بہ ظاہر تو یہی لگتا ہے کہ اس جہانِ رنگ و بو کی چمک دمک اور اس میں موجود ہر چیز کی حیات سورج کے دم سے ہے، لیکن دراصل کائنات کا نور اس کی زیبائش عقل و شعور کی وجہ سے ہے کہ اگر یہ نہ ہو تو یہ دنیا خورشیدِ عالم تاب کے باوجود اندھیر اور تاریک ہے۔ لہٰذا اقبالؔ آفتاب کو مخاطب کر کے دراصل عقل و شعور کی اہمیت کو واضح کر رہے ہیں:

اے آفتاب ہم کو ضیائے شعور دے
چشمِ خرد کو اپنی تجلی سے نور دے

''عہدِ طفلی'' میں اقبالؔ انسانی نفسیات کے اُس عنصر سے بحث کرتے ہیں جو اُس کے اندر جستجو کے عنوان سے موج زن ہے۔ یعنی شروع سے ہی آدمی اپنے گرد و پیش کی چیزوں کو سوالیہ نظروں سے دیکھتا ہے اور سوچ بدلنے لگتا ہے تو زبان سے ''یہ کیا ہے؟ وہ کیا ہے؟'' سوال کر کے اپنے اس فطری جذبہ کا اظہار کرتا ہے، جس کو قدرت نے اُس کے اندر جذبۂ جستجو بنا کر رکھ دیا ہے:

آنکھ وقفِ دید تھی، لب مائلِ گفتار تھا
دل نہ تھا میرا سراپا ذوقِ استفسار تھا

مرزا غالب نے ہندوستان کے سب تعلیم یافتہ طبقے کو متاثر کیا تھا، وہ سلسلۂ شاعری میں پہلے جدید اور فلسفیانہ لب و لہجہ کے شاعر تھے، اقبالؔ بھی غالب سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ نہایت خوب صورت اور اخلاص کے انداز میں مرزا غالب کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ ''غالب کا ہے اندازِ بیاں اور'' کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

زندگی مضمر ہے تیری شوخیِ تحریر میں
تابِ گویائی سے جنبش ہے لبِ تصویر میں

مختلف پہلوؤں سے شاعرانہ اوصاف و کمالات کا ذکر کرنے کے بعد غالب کے حوالے سے ہندوستان میں مسلمانوں کے زوال اور مسلم عظمتِ رفتہ کو یاد کر کے آہ بھرنے لگتے ہیں، کہتے ہیں:

آہ تو اُجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے
گلشنِ ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

جس طرح جرمنی کے شہر ویمر میں ایک باکمال شاعر جو غالب کا ہم عصر تھا، آسودۂ خاک ہے، اسی طرح ایک اُجڑے دیار دلی میں غالب ایسا نابغۂ روزگار شاعر خاک اوڑھے سو رہا ہے۔ اقبالؔ کہتے ہیں، دہلی اہلِ علم و ہنر کا مرکز رہا ہے لیکن:

دفن تجھ میں کوئی فخرِ روزگار ایسا بھی ہے؟
تجھ میں پنہاں کوئی موتی آبدار ایسا بھی ہے؟

اسی دور کی نظم "شاعر" کو خالی از ذکر نہیں رکھا جا سکتا۔ یہ دراصل شاعروں، بالخصوص باحیثیت شاعر، اقبالؔ خود اپنے لیے شاعرانہ حیثیت وضع کر رہے ہیں:

قوم گویا جسم ہے، افراد ہیں اعضائے قوم
منزلِ صنعت کے رہ پیما ہیں دست و پائے قوم
محفلِ نظمِ حکومت، چہرۂ زیبائے قوم
شاعرِ رنگیں نوا ہے دیدۂ بینائے قوم

کہتے ہیں، قوم اگر جسم ہے تو افراد اُس کے اعضا کی طرح ہیں، یعنی اعضا اگر صحت مند، مضبوط و توانا اور فعال ہوں گے تو ہی جسم صحت مند ہو سکتا ہے، اور ہاتھ پاؤں اگر چلتے ہیں تو ہی وہ منزل کی طرف گام زن ہو کر اپنے جسم یعنی قوم کی راہ نمائی کر سکتے ہیں۔

زندہ قوم کا روشن چہرہ ہی کاروبارِ حکومت کے نظم و ضبط کی محفل کو سجانے کا باعث ہوتا ہے، اسی طرح شاعر بھی اپنی نوائے شاعرانہ سے قوم کی آنکھیں کھول سکتا ہے۔ اس لیے کہ آنکھ ہی اندھیرے اجالے اور اچھے برے کی تمیز کرتی ہے:

مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

اقبالؔ کی نظر میں، نظر کی کیا اہمیت ہے، اس نکتے کو آگے جا کر انہوں نے ایک وجدانی انداز میں بیان کیا ہے:

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج، نظر کے سوا کچھ اور نہیں

اسی دورانیہ میں کچھ اور نظمیں بھی تخلیق ہوئیں جو یقیناً سب ہی اپنی اپنی جگہ اہم ہیں، لیکن ان سب کو تفصیل کے ساتھ یہاں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً "دل" کی اہمیت کو نہایت گہرے اور حقیقت آمیز فلسفے کی زبان میں بیان کیا گیا ہے۔

مختلف زاویوں سے دل کا قصیدہ پڑھتے ہوئے اقبالؔ اس منزل پر پہنچ کر کہتے ہیں:

عرش کا ہے کبھی کعبہ کا ہے دھوکا اس پہ
کس کی منزل ہے الٰہی مرا کاشانۂ دل
اس کو رہتا ہے جنوں اور مجھے سودا اپنا
دل کسی اور کا دیوانہ، میں دیوانۂ دل

اقبالؔ، دل کو غالبؔ کی طرح نادان نہیں بلکہ اپنا محبوب سمجھتے ہیں، کہتے ہیں، دل اپنے جنوں میں مبتلا ہے، اور میں اس کا دیوانہ بنا ہوا ہوں۔ کس قدر باریک نکتہ تراشا ہے کہ دل نے جس کو پسند کیا ہے، میں اُس کی پسند اور اُس کے عشق پر فریفتہ ہوں، مجھے اس کے عمل اور ذوقِ پسندیدگی نے اپنا دیوانہ بنا لیا ہے۔

نظم: "موجِ دریا" میں نہایت نادر خیال پیش کیے گئے ہیں، موج کی تڑپ کا سبب خود موج بیان کرتی ہے کہ وہ تنگیٔ دریا سے شاکی ہے، اس کا شوقِ روانی بہت وسعت کا متقاضی ہے۔ موج، دریا میں گویا خود کو قید اور محبوس محسوس کرتی ہے۔ اقبالؔ اُس کی اس فریاد اور کرب کو خود اسی کی زبانی اس طرح سناتے ہیں:

میں اُچھلتی ہوں کبھی جذبِ مہِ کامل سے

جوش میں سر کو پٹکتی ہوں کبھی ساحل سے

پورے چاند کے دنوں میں میرے اندر مدوجزر پیدا ہوتا ہے، تو میں پُر جوش ہو کر ساحل پر سرکوبی کرنے لگتی ہوں۔

ہوں وہ رہرو کہ محبت ہے مجھے منزل سے
کیوں تڑپتی ہوں یہ پوچھے کوئی میرے دل سے

دراصل میں وہ راہی نہیں جو راستوں کی دل نوازی میں کھو جاتے ہیں، بلکہ میری دل چسپی اور محبوبیت کا مرکز، منزل ہے، یہی وجہ ہے کہ ساحل پر پہنچ کر بھی میری تڑپ میں کمی نہیں آتی، اس لیے کہ وہ میری منزل نہیں ہے۔ میرے تڑپنے اور مچلنے کا سبب کیا ہے یہ میرے دل سے پوچھ کہ وہی اس بھید اور راز سے واقف ہے۔ دراصل میری تڑپ کا سبب یہ ہے کہ:

زحمتِ تنگیٔ دریا سے گریزاں ہوں میں
وسعتِ بحر کی فرقت میں پریشاں ہوں میں

دریا کی تنگ دامنی کے سبب مجھے یہ زحمت اُٹھانی پڑ رہی ہے، اس کی محدودیت نے میرے شوقِ رہ نوردی کو گویا قید کر رکھا ہے جب کہ میں بحر کی وسعتوں پر رواں دواں ہونا چاہتی ہوں کہ وسعتِ بحر اسی جدائی نے مجھے پریشان کر رکھا ہے۔

اسی فہرست میں ایک نظم جو مغربی شاعر "ایمرسن" کے کسی خیال سے اخذ کردہ ہے، "رخصت اے بزمِ جہاں" بہت اثر انگیز نظم ہے، اس کی اصل معنویت کا تعارف نظم کے پہلے ہی شعر سے ہو جاتا ہے۔

رخصت اے بزمِ جہاں سوئے وطن جاتا ہوں میں
آہ اس آباد ویرانے میں گھبراتا ہوں میں

لگتا ہے شاعر کا دنیا سے جی اُٹھ گیا ہے، اور وہ "اجنبی" دیس کی سیر و سیاحت سے اُکتا گیا ہے اور اب اپنے اصل وطن کی طرف لوٹتے ہوئے اس عارضی سیرگاہ کو الوداع کہہ رہا ہے۔ شروع تا آخر نظم اپنے مختلف رخ اور بیان سے دنیا کے سربستہ رازوں پر سے پردہ ہٹانے کی

کوشش کرتی ہے، لیکن آخری شعر میں شاعر کو تھک ہار کر کہنا پڑتا ہے کہ جس راز کو میں جاننے کی کوشش کرتا ہوں، اُسے پانے سے اور سمجھنے سے میرا علم قاصر رہا ہے۔ دراصل اِس راز کو حیرت کدۂ علم میں تلاش کرنا عبث ہے، اس کو سمجھنا ہے تو اپنے اندر قوتِ مشاہدہ پیدا کرو تو پھر ایک پھول کی پتی ہی سمجھنے کے لیے کافی ہوگی:

علم کے حیرت کدے میں ہے کہاں اِس کی نمود
گُل کی پتی میں نظر آتا ہے رازِ ہست و بود

یعنی جب پھول کھلا تھا وہ ''ہست'' کا اظہار یہ تھا اور اب مرجھا گیا ہے تو یہ ''بود'' کی حقیقت کو ظاہر کر رہا ہے۔

اقبالؔ کی یہ منظومات جو ہمارے زیرِ تذکرہ ہیں، اُس زمانے سے تعلق رکھتی ہیں جب اقبالؔ بھرپور جوان تھے۔ اِس عمر میں انسان جوانی کی ترنگوں میں کھویا ہوا، ہوا میں اُڑتا پھرتا ہے، اور شاعر تو محبوب کے حسن و شباب اور ہجر و وصال کی نغمہ آرائی کر رہا ہوتا ہے لیکن یہ جواں مرد، فکرو فلسفہ کی خشک رو، غیر رومانی فضا میں پرواز کرتا نظر آتا ہے۔ اِسی سلسلے کی ایک کڑی ''طفلِ شیرخوار'' ہے۔ اِس نظم میں ایک ایسے مشاہدے کو تمثیل بنایا گیا ہے جو روزمرہ ہماری معاشرتی زندگی میں پایا جاتا ہے۔ اقبالؔ کہتے ہیں:

میں نے چاقو تجھ سے چھینا ہے تو چلاّتا ہے تُو
مہرباں ہوں میں، مجھے نامہرباں سمجھا ہے تُو

شیرخوار بچہ چاقو کو کھلونا سمجھ کر اُٹھا لیتا ہے۔ اقبالؔ جلدی اُس کی طرف لپکتے ہیں۔ اُن کے ہاتھ سے چاقو لینا چاہتے ہیں، لیکن بچہ اُن کی مہربانی پر ممنون ہونے کی بجائے رونا اور چلانا شروع کر دیتا ہے۔ وہ مہربان کو نامہربان سمجھ رہا ہے اس لیے کہ وہ اُس کے ہاتھ سے اُس کی ''پسندیدہ'' چیز چھین لینا چاہتا ہے۔ اقبالؔ اُسے سمجھاتے ہیں:

پھر پڑا روئے گا اے نوواردِ اقلیمِ غم
چبھ نہ جائے دیکھنا باریک ہے نوکِ قلم

اِس کے بعد وہ اُسے بہلانے کی خاطر مختلف چیزیں کھلونے اُس کے آگے ڈالتے ہیں،

کہتے ہیں۔ ''تو اِس نقصان دہ چیز کے بدلے اِن بے ضرر چیزوں سے کھیل اور جی بہلا۔''

اُس کی نفسیات کے مزید رنگ اُس کے سامنے پیش کرتے ہیں، کہتے ہیں:

زندگانی ہے تری آزاد قید امتیاز
تیری آنکھوں پر ہویدا ہے مگر قدرت کا راز

اے بچے تیری زندگی ابھی اِس قید سے آزاد ہے کہ تو اچھے برے میں تمیز کر سکے۔ تاہم تیری آنکھوں پر رازِ قدرت عیاں ہے، یعنی قدرت نے تیری فطرت کے اندر وہ عنصر رکھ دیا ہے جو کسی نہ کسی چیز سے بہلتا اور خوش ہو جاتا ہے۔ مثلاً:

جب کسی شے پر بگڑ کر مجھ سے، چلاّتا ہے تُو
کیا تماشا ہے ردی کاغذ سے مَن جاتا ہے تُو

اِس کے بعد اقبالؔ اِس تمثیل کے اہم موڑ پر آ کر وہ اعلیٰ فکر و خیال کے گوہرِ آب دار اپنے سامعین کے سامنے رکھتے ہیں جن کی خاطر اُنہوں نے ''طفلِ شیر خوار'' کو محض تمہید کے بہ طور پیش کیا تھا:

آہ! اِس عادت میں ہم آہنگ ہوں میں بھی ترا
تو بھی تلوّن آشنا، میں بھی تلوّن آشنا

یعنی جس طرح تو ایک معمولی اور ''ردی کاغذ'' جیسی چیز سے بہل جاتا ہے، تو میں بھی کچھ تیری عادت سے الگ نہیں ہوں، تو شیر خوار ہے، میں جوان ہوں لیکن میری عادت بھی تیری طرح ''بچگانہ'' ہے۔ ''جو تلوّن مزاجی تیرے اندر ہے، وہی میرے اندر ہے:

عارضی لذت کا شیدائی ہوں، چلاّتا ہوں میں
جلد آ جاتا ہے غصہ، جلد مَن جاتا ہوں میں
میری آنکھوں کو لبھا لیتا ہے حسنِ ظاہری
کم نہیں کچھ تیری نادانی سے نادانی میری

یعنی میری آنکھیں بھی حسنِ ظاہری پر مرکوز ہو جاتی ہیں گویا جس طرح بچہ ہو کر تو نادان ہے، میں جوان ہو کر نا سمجھ ہوں۔

تیری صورت، گاہ گریاں، گاہ خنداں میں بھی ہوں

دیکھنے کو نوجواں ہوں، طفلِ ناداں میں بھی ہوں

حاصلِ مفہوم نظم کا یہ ہے کہ اقبالؔ خود کو فرض کر کے مسلم نوجوانوں کی اس سطحی ذہنیت اور غیر سنجیدہ طبیعت پر ٹوک رہے ہیں کہ یہ نوجوان ہر چمک دار چیز کو سونا سمجھ بیٹھتے ہیں اور ظاہری رنگ روپ کو دیکھ کر اُس کی طرف کھنچنے لگتے ہیں، مطلب یہ کہ مغرب کی چکا چوند کرنے والی تہذیب کی طرف راغب ہوتے جا رہے ہیں تو دراصل یہ اُن کی بچگانہ حرکت ہے، یہ طفلِ شیر خوار کی طرح نادان ہیں، مگر وہ تو بچہ کہہ کر چھوٹ سکتا ہے، لیکن جوانوں کو سنجیدگی سے سوچنے اور دانائی سے کام لے کر زندگی میں فیصلے کرنے کی ضرورت ہے۔

''تصویرِ درد'' خالص سیاسی رنگ لیے ہوئے ہے، یعنی اقبالؔ نے اپنے دور کی وہ تمام فضا اس کے اندر سمودی ہے جو اس پورے برصغیر میں طاری تھی، فرنگی راج کا آمرانہ انداز، اور ہندوستانی عوام کی بے بسی اور بے آوازی کہ وہ اوّل تو اپنے سلب کردہ حقوق کی بازیابی کے لیے زبان کھولتے ہی نہیں اور اگر کچھ کہنا بھی چاہتے ہیں تو حکومتِ وقت کے نزدیک وہ مطالبۂ حق، گستاخی اور بغاوت کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ دیکھیے اقبالؔ کیا نہایت معنی خیز اور اثر انگیز استعارات کے ذریعے فرنگی راج پر تنقید کرنے میں پُر جوش نظر آ رہے ہیں:

یہ دستورِ زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

اس کے ساتھ ہی اقبالؔ اپنے اندازِ سخن کی مقبولیت کا تذکرہ کرتے ہیں کہ کس طرح اُن کی وہ آواز جو نثر و نظم کی صورت اہلِ وطن تک پہنچ رہی ہے، آہستہ آہستہ اپنا اثر دکھانے لگی ہے۔ کہتے ہیں:

اُٹھائے کچھ ورق لالے نے، کچھ نرگس نے، کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری
اُڑا لی قمریوں نے، طوطیوں نے، عندلیبوں نے
چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرزِ فغاں میری

آج بہت سے اہلِ سخن بھی میری طرز میں شعر کہنے کی کوشش کر رہے ہیں، یعنی کل تک جو مجھ سے گریزاں تھے، اب میرے ہم نوا بنتے نظر آ رہے ہیں، یعنی میرے ہم خیال بن رہے ہیں۔

اقبالؔ ایک مقام پر پہنچ کر بات بالکل صاف کر دیتے ہیں کہ یہ جو کچھ میں اپنے اشعار کے ذریعے گریہ کناں ہوں تو یہ رونا دراصل میرا اپنا ذاتی نہیں بلکہ پورے ملک و قوم کی داستانِ حسرت ہے۔

مرا رونا نہیں، رونا ہے یہ سارے گلستاں کا
وہ گل ہوں میں، خزاں ہر گل کی ہے گویا خزاں میری

قوم کے سامنے مختلف انداز سے موجودہ صورتِ حال اور خود اُن کے دگرگوں حالات کا نقشہ پیش کرنے کے بعد کھل کر اُنہیں خبردار کرتے ہیں:

وطن کی فکر کر ناداں، مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو!
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں

اس کے بعد اقبالؔ نہایت جذباتی ہو جاتے ہیں اور جوشِ جنوں میں مسلسل کہتے چلے جاتے ہیں۔ گویا مدت سے وہ باوجود اپنا ''نظریہ برائے قوم'' واضح طور پر بیان نہیں کر سکتے تھے مگر اب لگتا ہے جیسے پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا ہے، مصلحت کے سارے بندھن توڑ ڈالے ہیں۔ وہ اب سرکاری ملازم نہیں۔ فرنگی کے نوکر چاکر نہیں، وہ مردِ مومن ہیں، حق بات کہنے سے اب اُنہیں کوئی مصلحت نہیں روک سکتی:

ہویدا آج اپنے زخمِ پنہاں کر کے چھوڑوں گا
لہو رو رو کے محفل کو گلستاں کر کے چھوڑوں گا
جلانا ہے مجھے ہر شمعِ دل کو سوزِ پنہاں سے
تری تاریک راتوں میں چراغاں کر کے چھوڑوں گا

گویا اقبالؔ نے اب طے کر لیا ہے کہ وہ ہر مصلحت سے بے نیاز ہو کر اس غلام آباد کے باسیوں کو خوابِ غفلت سے جگا کر رہیں گے اور یہ قوم کس طرح ایک زندہ قوم بن سکتی ہے اور ولایتی غاصبوں کی غلامی سے کس طرح نجات پا سکتی ہے، وہ اس نسخے کو نہایت تفصیل کے ساتھ قوم کے سامنے رکھتے ہیں جس میں کئی بنیادی نکات یہ ہیں: نااتفاقی، عصبیت، فرقہ بازی اور ایک

دوسرے کے ساتھ محاذ آرائی کا خاتمہ کر کے آپس میں پیار محبت اور باہمی احترام کا جذبہ پیدا کرتا ہوگا۔

یہ طویل نظم، اپنے مقصد، زبان اور بیان کے اعتبار سے عمدہ ترین اور اُردو ادبیات میں ایک نمائندہ حیثیت رکھتی ہے۔

اقبالؔ عشقِ رسول سے سرشار ہیں، اپنے نبی محترم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے محبت مسلمان کی گھٹی میں پڑی ہوتی ہے، مسلمان کا ایمان مکمل ہی نہیں ہوتا ہے جب تک کہ وہ اپنے دل میں عشقِ رسول کی حرارت محسوس نہ کرنے لگے۔ اقبالؔ تو اس دل کے بھی عاشق ہیں جنِ دل میں عشقِ نبی مرسل دیکھتے ہیں۔ وہ جب نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دورِ ہمایوں کا تصور کرتے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے عاشقوں کو ستاروں کی طرح ایک انجمن کی صورت میں پاتے ہیں، لیکن ایک شخصیت اقبالؔ کو ایسی پسند آئی ہے جو اُن کی روح میں سما کر رہ گئی ہے، یعنی "بلالؓ" ۔ قربان جایئے اس عاشق باللہ اور عاشقِ رسول کے، سیدنا بلالؓ یوں تو ہر کلمہ گو کے لیے احترام کے اعلیٰ درجہ پر ہیں، لیکن اقبالؔ اس عاشقِ رسول کو اپنے دل کی دھڑکنوں میں بسائے ہوئے ہیں۔ تو اقبال شاعری کریں اور بلالؓ کی جناب میں منظوم نذرانہ عقیدت پیش نہ کریں، یہ کیوں کر ممکن ہے۔ لیکن اللہ اللہ، کس انداز سے اُن کے حضور گل ہائے عقیدت پیش کرتے ہیں، یہ انداز ہی نرالا ہے، نظم "بلالؓ" میں پہلے راو اسلام میں اُن پر ہونے والے کافروں کے جبر و ستم کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ کس طرح سخت سے سخت ظلم سہتے جاتے ہیں اور نعرۂ احد زبان پر جاری رکھے ہوئے ہیں اور جو رشتہ اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے اُستوار کیا ہے، اُسے آنچ بھی نہیں آنے دیتے، اقبال کہتے ہیں:

وہ آستاں نہ چھٹا تجھ سے ایک دم کے لیے
کسی کے شوق میں تو نے مزے ستم کے لیے

آخر میں اقبالؔ عشقِ بلالیؓ کا خوب صورت ترین نقشہ کھینچ کر رکھ دیتے ہیں۔

ادائے دید سراپا نیاز تھی تیری
کسیؐ کو دیکھتے رہنا نماز تھی تیری
اذاں ازل سے ترے عشق کا ترانہ بنی
نماز اُسؐ کے نظارے کا اک بہانہ بنی

خوشا وہ وقت کہ یثرب مقام تھا اُس کا
خوشا وہ دور کہ دیدار عام تھا اُس کا

نظم "سرگزشتِ آدم" میں ابنِ آدم کی سرشت کو فلسفیانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اور خیر و شر کے ساتھ ساتھ اُس کی عقلی و علمی فتوحات، ایجادات و اختراعات کا ذکر کرتے ہوئے اقبالؔ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اس تمام گہما گہمی اور حیرت انگیز اختراعی کامیابیوں کے باوجود آدمی زندگی کے راز کو نہ پاسکا، ہاں البتہ ظاہر بین آنکھ نے کائنات کی تنوعات اور اُس کی نیرنگیوں کا بھرپور مشاہدہ کرنے کے بعد جب اپنے اندر جھانک کر دیکھا تب معلوم ہوا کہ رازِ ہستی کیا ہے:

ہوئی جو چشمِ مظاہر پرست وا آخر
تو پایا خانۂ دل میں اُسے مکیں میں نے

اسی نتیجے کو آگے جا کر ایک موقعے پر اپنے مخاطب سے کہتے ہیں:

"اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی"

اب ہم مذکورہ دور کی ایک اُس نظم کا ذکر کرتے ہیں جو "ترانۂ ہندی" کا عنوان رکھتی ہے۔ جس کے بارے میں سطحی ذہن کے لوگ اکثر بے دلیل اعتراض کرتے رہتے ہیں کہ اقبالؔ نے تو ہندوستان کو اپنا وطن قرار دیا تھا اور اُس کی شان میں قصیدہ "لکھ مارا" تھا۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی، یہ گلستاں ہمارا

یقیناً اقبالؔ نے ایسا ہی کہا تھا اور وہ اس سے مکر نہیں گئے تھے، بلکہ دھڑلے کے ساتھ اُسے اپنے اوّلین شعری مجموعہ "بانگِ درا" میں شامل بھی کیا۔ گو بعد میں "ترانۂ ملی بھی" لکھا جو، اُن کے فکری ارتقا، فکری تغیرات اور ہندوستان کے بدلتے ہوئے حالات اور تجربات کی روشنی میں تحریر کیا گیا، تاہم جو پہلے ترانۂ ہندی کے عنوان سے لکھا، وہ بھی ایسا کوئی مجرمانہ اور قابلِ گرفت فعل نہیں تھا کہ جس پر اعتراض کیا جا سکے:

ہم اس جگہ اس بحث میں پڑنے کی بجائے اس نظم کے چند شعر یہاں درج کرتے ہیں جو اس بات کے شاہد ہیں کہ ترانۂ ہندی لکھتے وقت بھی اقبالؔ کی فکر خالص مسلمان تھی اور اپنی قومی

انفرادیت کا اُنھیں پورے شعور کے ساتھ ادراک تھا جیسا کہ وہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں:

اے آبِ رُودِ گنگا وہ دن ہیں یاد تجھ کو
اُترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

اپنے ملی وجود کا برملا اظہار کر رہے ہیں:

یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا

اُس دور کی فہرست میں ایک نظم ''جگنو'' بھی نہایت ہی خوب صورت شعری فن پارہ ہے، جگنو کی طرح روشن اور دل کش ہے۔ اس نظم میں مختلف چیزوں کا تقابل کرنے کے بعد، اقبال کی فلسفیانہ فکر، جگنو اور پروانے کا موازنہ اور قدرت کی صناعی کا ایک دل کش منظر پیش کرتی ہے:

پروانہ اک پتنگا، جگنو بھی اک پتنگا
وہ روشنی کا طالب، یہ روشنی سراپا

کہنے کو جگنو اور پروانہ دونوں اُڑنے والے کیڑے ہیں لیکن دونوں کی پرواز کا مقصد مختلف ہے ایک روشنی کی طلب میں سرگرداں رہتا ہے اور دوسرا خود سراپا نور ہے یعنی اگر انسان اپنی خودی کو پہچان لے اور خود سے آگاہ ہو جائے تو اُس پر یہ راز عیاں ہو گا کہ جس روشنی (انسانی ترقی، بلندی، سکون و راحت اور کامیابی و کامرانی) کی تلاش میں تو اس جہانِ رنگ و بو میں مارا مارا پھر رہا ہے وہ دنیا خود تیرے اندر خوابیدہ ہے۔ اسے جگا اور اپنی ہستی کو جگمگا!

نظموں کے اِسی تسلسل میں ''صبح کا ستارہ'' اپنے اندر عجیب کیفیت رکھتا ہے۔ بادی النظر میں رات کی انجمن کے آخری رکن کا ذکر ہو رہا ہے جو نجم السحر یا صبح کا ستارہ کہلاتا ہے جسے زہرہ بھی کہتے ہیں اور جو صبح کے آخری حصے تک اپنا وجود قائم رکھتا ہے، لیکن اقبال نے اُس کے عنوان سے ایک عجیب منظر باندھا ہے۔ ستارہ اپنی بد قسمتی کا شکوہ کر رہا ہے کہ میرے لیے تو تاروں کی اِس بستی سے زمین کی پستی زیادہ بہتر ہے۔ اِس لیے کہ آسمان میرا ایسا وطن ہے جسے عدم آباد کہنا زیادہ مناسب ہے، اور نمودِ صبح جو اپنے دامن کو پارہ پارہ کیے نمودار ہوتی ہے، وہ دامنِ صد چاک اصل

میں میرے لیے کفن کی طرح ہے، میرے نصیب میں روز مرنا اور جینا لکھ دیا گیا ہے، موت کا ساقی مجھے ہر روز جامِ فنا پلا دیتا ہے لیکن یہ خدمت و پذیرائی، عزت افزائی اور بلند مقامی کی کوئی حیثیت نہیں، ذرا دیر کی چمک ہے جو مجھے بخشی گئی ہے، اس سے تو ہمیشہ کی تاریکی زیادہ بہتر ہے۔ کاش! میرے اختیار میں ہوتا تو میں ہر گز ستارہ بننا قبول نہ کرتا، بلکہ دریا کی گہرائی میں پڑا ہوا کوئی موتی بننا گوارا کر لیتا، اور اگر وہاں بھی موج کشی کی وجہ سے دل گھبراتا تو دریا کو بھی خیر باد کہہ کر کسی کے گلے کی زینت بن جاتا، کیوں کہ حسن کا زیور بن کر جگمگانے اور کسی ملکہ کے تاج کی زینت بننے کا مزاہی کچھ اور ہے، جیسے کہ ایک سنگ پارے کی قسمت رنگ لائی تھی کہ اُس نے پیغمبر خدا حضرت سلیمانؑ کے ہاتھ کی انگوٹھی میں نگینہ بن کر عزت پائی۔''

اس کے بعد اقبالؔ گریز کرتے ہوئے اپنے بیان کا رخ دوسری طرف پھیر دیتے ہیں۔ کہتے ہیں۔ لیکن یہ چیزیں جن کا ذکر ہو رہا ہے۔ اُن کا انجام شکستگی سے ہم کنار ہوتا ہے۔ یعنی قیمتی ترین موتی بھی آخر ٹوٹ جاتے ہیں۔ فنا ہو جاتے ہیں، ہاں اگر کوئی زندگی ایسی ہے جو لافانی اور لازوال ہے تو وہ ہے جو خود موت کو اچھی طرح پہچانتی اور اُس سے واقف ہو، یعنی اُس کی حقیقت سے آگاہی رکھتی ہو کہ وہ زندگی کیا ہے جس سے موت تقاضا کرتی ہے؟''

نجمِ سحر بیان کر رہا ہے کہ اگر دنیا کی زینت بن کر بھی انجام یہ ہونا ہے تو کیا اس سے بہتر یہ نہیں کہ میں قطرۂ شبنم بن کر کسی پھول پر برس جاؤں! یا کسی کی مانگ میں بھرے ہوئے افشاں کے ستاروں میں شامل ہو جاؤں، یا پھر کسی مظلوم کی آہِ شرربار بن جاؤں، یا آنسو بن کر کسی کی پلک پر لرزنے لگوں، یا کیوں نہ اُس بیوی کی آنکھوں سے ٹپک پڑوں جس کا شوہر جنگی لباس میں ملبوس ہو کر سپاہیانہ شان سے اپنے وطن کے دفاع کے لیے میدانِ جنگ کی طرف روانہ ہو رہا ہے اور وہ اُس سے جدا ہونے پر مجبور ہو، اور جس کی آنکھوں میں یاس و اُمید، یعنی شکست و فتح کا کوئی رنگ واضح نہ ہو کہ نہ معلوم اُس کا سپاہی شوہر فاتحانہ اور غازیانہ شان سے واپس ہوگا کہ وطن کی راہ میں شہید ہو جائے گا۔ لیکن زبان سے کچھ نہ کہہ رہی ہو، بلکہ اُس کی خاموشی میں وہ سب کچھ چھپا ہو جو اس وقت اگر وہ کچھ کہتی بھی تو اتنا کچھ نہ کہہ سکتی تھی، اور اُس کے صبر و ضبط کی طاقت کا سبب اُس کے شوہر کی رضامندی بن رہی ہو، اور اُس کی آنکھوں میں بسی ہوئی حیا اُسے طاقتِ گویائی بخش

دے۔مگر اِس طرح کہ رخصت کا یہ خزاں رنگ لمحہ اُس کے رخسار کو گلِ نار بنا دے، اور غم و فراق اُس کے حسن کی کشش میں اور اضافہ کر دے۔ پھر وہ لاکھ صبر و ضبط سے کام لے لیکن میں ٹپک کر رہوں، یعنی اُس کی آنسو بھری آنکھ کے ساغر سے چھلک پڑوں اور پھر:

خاک میں مل کے حیات ابدی پا جاؤں
عشق کا سوز زمانے کو دکھاتا جاؤں

خاک میں مل کر حیاتِ جاوداں پا جاؤں اور سوزِ عشق کیا ہے، یہ زمانے کو دکھا دوں۔ یعنی دنیا میرے جذبۂ عشق سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

یہ بلند فکر اور ندرتِ خیالی اقبالؔ کو ابھی سے حاصل ہے کہ وہ ابھی ابھی جوانی کے رہوار پر سوار ہوئے ہیں، ابھی تو پاؤں رکاب پر رکھا ہی ہے، ایک باکمال شاعر اور مفکر کے طور پر دنیا ان سے نئی نئی متعارف ہوئی ہے۔

اقبالؔ دینِ اسلام کے ہیرو ہیں، اِس دین کے جو امنِ عالم کا داعی ہے، اقبالؔ کے مزاج میں امن وصلح جوئی رچی بسی ہوئی ہے۔ ''ہندوستانی بچوں کا گیت'' ان کی اسی مفاہمانہ سوچ کا عکاس ہے، وہ ہندوستان میں دیگر اقوام کے ساتھ بغیر کسی عصبیت، جیو اور جینے دو کے اصول پر رہنا پسند کرتے ہیں، ہندوستان کو یہاں کے باسی ہونے کے ناتے اپنا وطن خیال کرتے ہیں، لہٰذا مذکورہ نظم میں وہ اِسی وطن دوستی اور انسان دوستی کا نعرہ بلند کر رہے ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ نظم کا عنوان ''ہندوستانی بچوں کا گیت'' تجویز کیا ہے، جبکہ ہندوستان کی تعریف مسلم فاتحین کے حوالے سے کر رہے ہیں کہ کس طرح خواجہ معین چشتیؒ نے سرزمینِ ہند پر آ کر دینِ حق یعنی اسلام کی تبلیغ کی، جس سے متاثر ہو کر سکھوں کے مذہبی رہنما گرونانک نے جو بت پرستوں سے الگ ہوئے تھے، اپنے پیروکاروں کو وحدت کا درس دیا، تاتاریوں نے بھی اِدھر کا رخ کیا، اُنہی تاتاریوں کی یلغار کی وجہ سے مسلمانوں کو ریگستانِ عرب چھوڑ کر یہاں ہندوستان میں آنا پڑا۔ یہ وہ خطہ ہے جہاں علم و ہنر کو وہ فروغ ہوا جس نے دنیا کو فیض پہنچایا اور جس کو دیکھ کر علم و دانش کے امام یونانی بھی حیران رہ گئے۔ زمینِ ہند کی مٹی میں سونے کی کیفیت ہے، ترک یعنی مغل (جو منگول کہلاتے تھے اور خواہشِ زر کے لیے دنیا میں مارے مارے پھرتے تھے، لیکن) یہاں آ کر زر و جواہر سے لد گئے۔ اہلِ

فارس بھی یہاں آ کر جگمگا اُٹھے۔"

اقبالؔ اِن حوالوں کے درمیان ایک حدیثِ مبارکہ کا حوالہ دیتے ہیں، روایت ہے کہ حضور نبیِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک موقع پر فرمایا کہ "مجھے ہند کی طرف سے ٹھنڈی ہوا محسوس ہوتی ہے۔" یعنی ایک روز یہ وحدت کا چمن بنے گا۔

نظم میں ٹیپ کا بند، اقبالؔ نے بار بار اس مصرع کو دہرایا ہے کہ "میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے۔" تو اُس وقت وطن کا تصور اُن کے ہاں وہی روایتی تھا کہ آدمی جہاں رہتا بستا ہے، وہیں کا متوطن بھی کہلاتا ہے لیکن بعد میں اقبالؔ کے نظریات میں تبدیلی پیدا ہوئی اور اُنھوں نے اسلام کے تصورِ وطن کے زیرِ اثر اِس حقیقت کو نہ صرف خود تسلیم کیا کہ قوم وطن سے نہیں مذہب سے بنتی ہے اور انسان فی الارض خلیفہ، یعنی زمین پر اللہ کا نائب ہے اور مسلمان اِس منصب کا زیادہ حق دار ہے تو وہ کسی ایک خطہ تک محدود نہیں، بلکہ پوری زمین اُس کے تصرف میں دی گئی ہے اور اِسی اعتبار سے کُل زمین اُس کا وطن ہے۔ جیسا کہ اقبالؔ نے بعد میں کہا:

"مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا"

اقبالؔ جس خطے میں مقیم ہیں، وہاں وہ امن اور شانتی کے خواہاں ہیں لیکن امن و امان کی صورتِ حال کی بہتری کا مدار خود وہاں کے رہنے والوں پر ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے عصبیت و غیریت کی بجائے اپنائیت و یک جہتی کا اظہار کرتے ہوں، ایک دوسرے کے ساتھ عزت و احترام سے پیش آتے ہوں، آپس میں پیار اور محبت کی فضا ہو، اقبال خصوصاً ہندوستان میں ہندو مسلم اتحاد کی شدید ضرورت محسوس کرتے تھے، کیوں کہ انگریز نے شروع سے ہی Devide and Rule تقسیم کرو اور حکومت کرو، کی شرانگیز پالیسی پر عمل کیا تھا، چناں چہ ہندوستان میں بیش تر فرقہ وارانہ فسادات کو انگریز انتظامیہ خوب خوب ہوا دیتی اور تنازعات کو طول دے کر اپنی حکومت کی عمر بڑھاتی رہتی تھی، اقبالؔ انگریز کی رگ رگ سے واقف ہو چکے تھے، اِس لیے جب بھی اُنھیں موقع ملتا، وہ اپنی شاعری کے ذریعہ فریقین کو فرقہ واریت سے بچنے اور آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ امن اور شانتی سے رہنے کا درس دیتے۔ "شوالہ" بھی اُن کی ایسی ہی نظم ہے۔ اِس میں وہ ایک فریق کے نمائندے برہمن سے مخاطب ہوتے ہیں:

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے

یعنی تیرا یہ نظریہ کہ تو خود کو برتر اور دوسروں کو کم تر سمجھتا ہے، فرسودہ ہو چکا ہے، بلکہ ناکام ہو چکا ہے، اس نے انسانوں کو نفرت کے سوا کچھ نہیں دیا، مطلب یہ ہے کہ اب اس اونچ نیچ کے فرق کو ختم کر کے سب انسانوں کے ساتھ برابری اور محبت سے پیش آنے کی ضرورت پر عمل کر۔

دوسری طرف اقبالؔ دوسرے فریق کے ترجمان واعظ کو مخاطب کرتے ہوئے اُسے بھی تنبیہ کرتے ہیں:

اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے

مطلب یہ نہیں کہ واعظ کو خدا نے کہا ہے کہ وہ دوسرے مذاہب کے لوگوں سے منافرت کا رویہ اختیار کرے، بلکہ واعظ اپنے اندازِ تخاطب اور اپنے مضمونِ خطابات سے یہ ظاہر کرتا ہے گویا اِس جارحانہ رویے کی خدا نے اُسے اجازت دی ہے کہ وہ فرقہ وارانہ باتوں کو ہوا دے کر خلقِ خدا کو آپس میں لڑواتا پھرے۔

اقبالؔ کہتے ہیں کہ میں نے اُن دونوں گروہوں کے اُن نمائندہ حضرات کی باتوں سے توبہ کر لی ہے:

تنگ آ کے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا، چھوڑے ترے فسانے

ممکن ہے اس جگہ سمجھنے میں کسی کو یہ مغالطہ ہو سکتا ہے کہ اقبالؔ کفر کے ساتھ ساتھ اسلام سے بھی دست بردار ہو رہے ہیں، اور دیر و حرم چھوڑنے کا اعلان کر رہے ہیں بلکہ ان کا مطلب یہ ہے کہ برہمن تو مذہبی منافرت کو ہوا دیتا ہی آیا ہے، واعظ بھی اس سے کم نہیں، وہ بھی اپنے جوشِ خطابت کے جوہر دکھاتے ہوئے اعتدال سے ہٹ جاتا ہے اور ایسی باتیں کر بیٹھتا ہے جس سے فرقہ واریت کو ہوا ملتی ہے، چناں چہ اقبالؔ ان دونوں عاقبت نااندیشوں کے طرزِ عمل سے دامن کش ہو کر وطن کو صرف وطن کی حیثیت سے دیکھ رہے ہیں، بلکہ وطن کی تکریم میں اس قدر آگے

بڑھ جاتے ہیں کہ اُس کے ذرّے ذرّے کو دیوتا کی طرح مقدس خیال کرتے ہیں:

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

اور مزید کہتے ہیں کہ آ، ہم اپنے درمیان سے غیریت کے پردے ہٹا دیں اور ایک دوسرے سے دور دور رہنے والوں کو ایک بار پہلے کی طرح قریب کر دیں، جیسا کہ وہ مسلم دور میں ایک دوسرے کے ساتھ پیار محبت اور امن و امان کے ساتھ رہتے رہے تھے:

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اُٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں، نقشِ دوئی مٹا دیں
سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی
آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں

کچھ اور نصیحت و پند کرنے کے بعد اقبال نظم کے آخری شعر میں وہ نسخہ بیان کرتے ہیں جس سے مختلف الخیال لوگ بھی ایک ساتھ بے ضرر انداز میں رہ سکتے ہیں اور وہ ہے پریت، محبت جو انسانوں کو ایک رشتے میں جوڑ دیتی ہے۔ کہتے ہیں:

شکتی بھی، شانتی بھی، بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

طاقت اور عافیت دراصل بھگتوں (ہندوؤں کے روحانی لوگ) کی تعلیم سے ملتی ہے۔ اقبال کا اشارہ خود اپنے "بھگتوں" یعنی صوفیا اور اولیا کی طرف بھی ہے کہ اس حلقے کے لوگوں میں کوئی نفرت اور دوئی نہیں پائی جاتی۔ یہ سب انسانوں کو اپنا سمجھتے ہیں، سب سے پیار کرتے ہیں اور اُنھی کے پیار بھرے بول انسان کو طاقت بھی بخشتے ہیں اور عافیت بھی اور زمین پر (ہندوستان میں) بسنے والے لوگوں کی نجات بھی انھی اللہ والوں کی تعلیمات میں پوشیدہ ہے۔

اقبال نے جب شاعری شروع کی تو انداز وہی روایتی تھا۔ یعنی جس وقت اقبال نے آنکھ کھولی تو وہ انحطاط کا دور تھا یعنی انگریزوں سے مار کھانے اور اُن کی غلامی کا پٹا اپنے گلے میں ڈالنے کے بعد بھی اہالیانِ ہند نے ہوش کے ناخن نہیں لیے تھے۔ بلکہ غیرت بھی نیلام کر دی تھی،

اس شکست خوردہ اور قعرِ مذلت میں گری ہوئی قوم کے نام نہاد شرفاء اور روٗسا مشغلوں کے نام پر جو گل کھلا رہے تھے، اُس کی روداد اس قدر باعثِ شرم ہے کہ بیان سے باہر ہے، تاہم اُن کے کالے کرتوت اور شرم ناک کارنامے کاغذوں میں محفوظ ہیں، چناں چہ شاعری کے شعبہ میں بھی اُن کی شرم وحیا نے اپنے عدم وجود کا اعلان کر دیا تھا۔ انتہائی لغو، لایعنی اور شرم وحیا سے عاری مضامین باندھے جا رہے تھے۔ یہ سلسلہ ابھی تازہ تھا کہ اقبالؔ کی آنکھوں نے بھی یہ مناظر دیکھے اور کانوں نے یہ حیا سوز نغمے سنے، اُن کے اندر خود بھی شاعری انگڑائی لینے لگی تھی اور اُستادِ محترم سید میر حسن کی صحبت نے جو شعر فہمی کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے، اقبالؔ کو شعر گوئی میں اور زیادہ سرگرم کر دیا، اور شعر موزوں کرنے لگے، ظاہر ہے اس وقت ان کا شعری سرمایہ روایتی یعنی سکۂ رائج الوقت کی نقل میں ڈھل رہا تھا، تاہم کچھ انفرادیت اس وقت بھی ان کی شاعری میں محسوس ہوتی تھی۔ خصوصاً سوقیانہ اور ارذل خیالات سے اس وقت بھی ان کے شعر آلودہ نہیں ملتے۔ یہ روایت کی پابندی ہی تھی کہ اقبالؔ نے اصلاحِ سخن کے لیے رسماً ایک اُستاد کی ضرورت بھی محسوس کی اور اُس وقت کے سب سے زیادہ معروف و مستند اُستادِ سخن مرزا داغؔ دہلوی سے رابطہ کیا، جن کا پورے ہندوستان میں طوطی بول رہا تھا، اقبالؔ نے اُن کے پاس اپنی غزلیات اصلاح کے لیے بھیجنی شروع کیں۔ لیکن جلد ہی داغؔ نے انہیں "فارغ التحصیل" قرار دے دیا کہ اس نوجواں شاعر کو اصلاح کی ایسی چنداں ضرورت نہیں، سوچ سمجھ کر شعر کہتا ہے اور فنی لحاظ سے بھی ایسا کوئی نقص وعیب نظر نہیں آتا۔"

اس کے باوجود اقبالؔ کے دل میں نہ صرف بہ حیثیت اُستاد، بلکہ ایک اعلیٰ غزل گو شاعر کی حیثیت سے بھی داغؔ سے متعلق ادب واحترام جگہ بنا چکا تھا، یہی وجہ ہے کہ داغؔ کا انتقال ہوا تو اقبالؔ نے شعر کے ذریعہ بھرپور اور نہایت جذباتی انداز میں اُن کا مرثیہ لکھا۔ داغؔ کو شاہ جہاں آباد (دہلی) کا آخری شاعر قرار دیتے ہوئے اُن کی زبان دانی، شوخ طرزِ بیانی اور قدرت الکلامی کی تعریف کرتے ہوئے وہ اس منزل پر پہنچے کہ تحسین کو عروج پر پہنچا دیا:

لکھی جائیں گی کتابِ دل کی تفسیریں بہت
ہوں گی اے خوابِ جوانی تیری تعبیریں بہت
ہو بہو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون

اُٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پہ تیر کون
اشک کے دانے زمینِ شعر میں بوتا ہوں میں
تو بھی رو اے خاکِ دلی، داغ کو روتا ہوں میں

اس دور کی فہرست میں ایک اور نظم "ایک پرندہ اور جگنو" بھی ہے۔ یہ نظم بھی جگنو کا سا سماں پیش کرتی ہے۔ اس میں ایک پرندے اور جگنو کا آپس میں مکالمہ کرایا گیا ہے۔ پرندے کی خوبی اور اُس کا وصف یہ ہے کہ قدرت نے اُسے خوش آواز بنایا ہے اور جگنو کو روشنی اور چمک سے نوازا ہے۔ ہم یہاں اُس نظم کی نثر اور تشریح کیا کریں، براہ راست پڑھنے میں جو لطف اور مزہ ہے، وہ اِس طرح اُس کی تاویلات کرنے میں نہیں آتا۔

اقبالؔ کا ذوقِ مشاہدہ خود اپنی جگہ نہایت قابلِ تعریف اور پُر لطف ہے، اکثر دو مختلف چیزوں کا تقابل کرا کے اُن میں سے ایسے ایسے حکیمانہ نکات تراشتے اور فلسفیانہ مضامین بیان کرتے ہیں کہ ذہن خوش گوار حیرت میں گھر جاتا اور دل عجیب سا مزا لوٹنے لگتا ہے، مثلاً یہ نظم "بچہ اور شمع" اُن کے مشاہدے کی ایک ایسی ہی دل کش تصویر ہے۔ وہ ایک بچے کو دیکھتے ہیں کہ شمع کی لو پر شوق سے نظریں جمائے ہوئے ہے۔ اس کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔ اے پروانے کی سی خُو، رکھنے والے میں یہ دیکھ کر حیران ہوتا ہوں کہ تو دیر دیر تک شمع کے شعلے کو دل چسپی سے دیکھتا رہتا ہے۔ بلکہ میری آغوش میں بیٹھے بیٹھے تیرے اندر یہ بے چینی سی کیا پیدا ہو جاتی ہے، لگتا ہے جیسے آگے بڑھ کر روشنی سے بغل گیر ہونا چاہتا ہے، تیرا ننھا سا دل اِس نظارے کو دیکھ کر حیران ہو رہا ہے تو لگتا ہے شاید تو نے اس چیز کو پہلے بھی کہیں دیکھ رکھا ہے۔ حالاں کہ شمع کی حیثیت ایک شعلہ کی سی ہے جب کہ تو خود روشنی ہے۔ لیکن افسوس! اس بزمِ ہستی میں شمع کے نام سے یہ شعلہ بے نقاب ہو کر منظرِ عام پر آچکا ہے اور تو در پردہ ہے، نہیں معلوم کہ قدرت نے اُس کو کیوں عریاں کر دیا ہے، اور تجھ کو تیرہ و تاریک خاک کے فانوس میں کیوں چھپا دیا ہے؟ تیرا نورِ علم و آگہی کے پردے میں چھپ کر رہ گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ حقیقت شناس آنکھ کے لیے حجابِ آگہی غبار کی طرح ہے کہ آنکھ میں دھول پڑ جائے تو نظر کام نہیں کرتی حالاں کہ نظر آنکھ کے اندر موجود ہوتی ہے۔

اب دیکھیے بات ایک بچے کی اِس طفلانہ حرکت سے شروع کی گئی تھی کہ وہ شعلۂ شمع کو

گھڑیوں نہایت دل چسپی سے تکتا رہتا ہے بلکہ اُسے ہاتھ میں لینے کے لیے اُس کی طرف لپکتا ہے، لیکن اقبالؔ اس واقعے کو کائنات کے اعلیٰ مشاہدے تک لے آئے ہیں۔ کہتے ہیں:

محفلِ قدرت ہے اک دریائے بے پایانِ حسن
آنکھ گر دیکھے تو ہر قطرے میں ہے طوفانِ حسن

یعنی یہ بزمِ کائنات، حسن کے ایک ایسے بے پایاں دریا کی طرح ہے کہ اگر دیکھنے والی آنکھ ہو تو اُسے ہر قطرے میں حسن کا ایک طوفان نظر آئے گا۔"

اس کے بعد اقبالؔ اُن مختلف گوشوں کی تصویریں پیش کرتے ہیں جہاں حسن کی جلوہ گری پائی جاتی ہے۔ کہتے ہیں: پہاڑوں کی ہیبت ناک خاموشی میں بھی ایک حسن پوشیدہ ہے، سورج کی روشنی کو رات جب اپنے دامن کائنات کو چھپا لیتی ہے تو اس ادا میں بھی ایک حسن محسوس ہوتا ہے، اور جب صبح ہوتی ہے اور آسمان آئینہ پوش ہوتا ہے اور جب شام سنولاتی ہے اور شفق اپنے پھول بکھیرتی ہے بلکہ کسی عظیم الشان تہذیب کے معدوم ہوتے آثار میں اور ایک بچے کی بولی میں جو ابھی گفتار سے ناواقف ہے مگر بولنے کی کوشش کرتا ہے، گلستان کے مکین پرندوں کے ایک ساتھ چہچہانے میں اور وہ چھوٹے چھوٹے پرندے جو اپنا گھونسلہ بنا رہے ہوتے ہیں ان میں اور کہسار کے کسی گوشے سے پھوٹتے ہوئے چشمے اور آزادی کے ساتھ بہتے ہوئے دریا، اِن سب چیزوں میں حسن کی رنگینیاں موجود ہیں، مختصر یہ کہ شہر ہو، صحرا ہو، ویرانہ ہو کہ آبادی کوئی بھی جگہ حسن سے خالی نہیں ہے۔"

اقبالؔ اس طویل فہرست کو بیان کرنے کے بعد یکایک اپنے بیان کا رخ بدلتے ہیں اور کہتے ہیں:

روح کو لیکن کسی گم گشتہ شے کی ہے ہوس
ورنہ اِس صحرا میں کیوں نالاں ہے یہ مثلِ جرس

اس کے باوجود کہ کائنات کے گوشے گوشے میں حسن بکھرا ہوا ہے لیکن روح کسی اور ہی کھوئی ہوئی چیز کی تلاش اور آرزو میں ہے۔ اگر ایسا نہیں تو اس صحرا (دنیا) میں مثلِ جرس کارواں کیوں نالہ کش ہے، یعنی دنیا میں یہ ہنگامے کیوں برپا ہیں؟

حسن کے اِس عام جلوے میں بھی یہ بیتاب ہے
زندگی اِس کی مثالِ ماہیِ بے آب ہے

اِسی (روح) کو حسن کے اِس قدر عام جلووں کے درمیان بھی اِس طرح بے قراری اور بے چینی ہے جیسے مچھلی پانی کے باہر تڑپتی اور بے تاب رہتی ہے۔"

اگر ہم اِس جگہ غور کریں تو محسوس ہوتا ہے کہ اقبالؔ اِس اہم نکتے کو بیان کر رہے ہیں کہ روح، انسان کے جسدِ خاکی میں اَمرِ الٰہی ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ دنیا اور اِس کائنات میں جو خواہ کتنی ہی حسین ہو، غیر مطمئن رہتی ہے، کیوں کہ اُسے اصل حسن کی تلاش ہے، اور وہ حسن، حسنِ ازل ہے، جس کا ذرہ پرتو ہے، لہٰذا جس طرح ہر چیز اپنی اصل اور مرکز کی طرف لوٹتی ہے۔ روح بھی اپنے اصل مرجع کی طرف جانے کے شوق میں بے چین اور بے قرار رہتی ہے۔"

صوفیوں کا بھی یہی مسلک ہے کہ وہ نورِ ازل کو دیکھنے اور ذاتِ باری کے جلووں کی دید میں مجاہدے کرتے اور سلوک کی منزلیں طے کرتے جاتے ہیں لیکن اُن کی بے قرار روح کو اُسی وقت قرار ملتا ہے جب اُنھیں معرفتِ حق حاصل ہو جاتی ہے۔

اس دور کی فہرست میں ایک نظم "کنارِ راوی" بھی ہے، جس کی تفہیم ہم پہلے بھی کر چکے ہیں، یہاں اِس کا مرکزی خیال بیان کرتے ہیں، منظر یہ ہے کہ اقبالؔ دریائے راوی کے کنارے کھڑے ہیں، نظریں دریا کی سطح پر رواں ایک کشتی کو دیکھ رہی ہیں، جو آہستہ آہستہ ایسے زاویے پر مڑتی ہے جہاں نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے، اقبالؔ منظر کے اِسی موڑ کو فلسفیانہ انداز میں ایک نیا نکتۂ عروج بخشتے ہیں۔ کہتے ہیں: جس طرح یہ کشتی ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی، لیکن اِس کا وجود ابھی ہے اور اِس کی روانی میں بھی کوئی فرق نہیں پڑا ہے، اِسی طرح انسان بھی موت کے بعد بہ ظاہر دنیا کے منظر سے ہٹ جاتا ہے لیکن اس کی زندگی کا تسلسل جاری رہتا ہے۔ اس کا عرصۂ حیات ختم نہیں ہوتا، کہتے ہیں:

سبک روی میں ہے مثلِ نگاہ یہ کشتی
نکل کے حلقۂ حدِ نظر سے دور گئی
جہازِ زندگیِ آدمی رواں ہے یونہی

ابد کے بحر میں پیدا یونہی نہاں ہے یونہی
شکست سے یہ کبھی آشنا نہیں ہوتا
نظر سے چھپتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا

دورِ مذکور کی آخری نظم ''التجائے مسافر'' ہے جس کا مطالعہ ہم اوراقِ گزشتہ میں کر چکے ہیں۔ ہماری کوشش ہے کہ ہم اپنے قارئین کو زیادہ انتظار نہ کرائیں، کیوں کہ انہیں ہم نے اُس جگہ ٹھہرادیا تھا جہاں اقبالؔ انگلستان جانے کے لیے بمبئی کی بندرگاہ پر لنگر انداز جہاز میں سوار ہو چکے تھے، لیکن اُس وقت تک کے کلامِ اقبالؔ کا جائزہ اِس لیے بہت ضروری تھا کہ ہم یہ جان سکیں کہ اقبالؔ شروع سے ہی ایک روایتی نہیں بلکہ مقصدی اور خصوصاً قومی شاعری کے خالق کی حیثیت سے نمایاں ہونا شروع ہو چکے تھے۔

پیامِ عشق:

اس نظم میں اقبالؔ گویا اپنے مسلکِ خاص کو عام کرنے کی کوشش بھی کر رہے ہیں۔ مسلکِ خاص سے ہماری مراد ''عشق'' ہے جو اقبال کی فکر کا جزوِ اعظم ہے اور یہی عشق ہے جو آپ کی ذات میں روحِ رواں ہے۔ اقبالؔ عشق کی زبانی اس مردِ جرأت آزما سے مخاطب ہیں جو دردِ دل کی آرزو رکھتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں کام کا بننا چاہتا ہے تو کہتے ہیں کہ ''میں ناز ہوں تو نیاز ہو جا'' یعنی تو خود کو میرے سپرد کر دے اور یوں جان لے کہ میں دل کا غزنوی ہوں کہ اس میں رکھے ہوئے خواہشات کے ہزاروں بتوں کو میں نے مسمار کر دیے ہیں۔ تو اب مجھے بھی چاہیے کہ ایاز کی طرح میرے زیرِ دست ہو جاو۔

آگے چل کر کہتے ہیں کہ زمانہ کچھ سے کچھ ہو چکا ہے، اب وہ دَور نہیں کہ صحرا نوردیوں کے بعد سعیِ مقصد ہاتھ آتا تھا۔ اب تجھے اِدھر اُدھر بھٹکنے کی ضرورت نہیں۔ اس بزمِ جہاں (دنیا) میں شمع کی طرح فروزاں ہو کر محفل کو گرمانے کا کام انجام دینا ہی ہے۔

اس نظم میں ایک نہایت اہم بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

یہ ہند کے فرقہ ساز اقبالؔ آزری کر رہے ہیں گویا
بچا کے دامن بتوں سے اپنا غبارِ راہِ حجاز ہو جا

اے اقبال! دیارِ ہند میں دین ومذہب کے نام پر الگ الگ فرقے اور گروہ بنا دیے ہیں۔ گویا یہ اہلِ علم دیں دوسرے لفظوں میں کارِ آزری انجام دے رہے ہیں یعنی فرقوں کے نام پر الگ الگ بت گھڑ رہے ہیں۔ تو تجھے ان فرقوں میں پڑنے اور ان کی باتوں میں آنے کی ضرورت نہیں بلکہ اس بُرائی سے دامن کش ہو کر خود کو اس راستے پر ڈال دے جو راہِ مستقیم ہے اور وہ راستہ نبی آخر صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے، اس میں کسی فرقہ اور گروہ بندی کی کوئی گنجائش نہیں۔

شاعر کے اُس حصے کے ساتھ ناانصافی ہوگی جس کو غزل کہتے ہیں اور روایت پرست اُس کو شاعری کی جان خیال کرتے ہیں۔ لہٰذا یہ مناسب نہیں کہ ہم اس دور کی غزلیاتِ اقبالؔ کو بالکل ہی نظر انداز کر دیں۔ تاہم اختصار کو ضرور اختیار کریں گے۔ ایک دو شعر کی سماعت کرتے چلتے ہیں۔

ایک غزل کا مطلع ہے:

گلزارِ ہست و بود نہ بیگانہ وار دیکھ
ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ

یعنی اس جہانِ رنگ وبو میں پھیلی ہوئی بے شمار چیزیں جو پیدا ہوتی ہیں اور ختم ہو جاتی ہیں، یہ نہیں کہ انہیں یک سر نظر انداز کر دیا جائے اور اگر انہیں دیکھیں بھی تو اس طرح گویا یہ بیگانی اور غیر ہیں، نہیں بلکہ یہ محفل انسان کے لیے ہی سجائی گئی ہے تو پھر اس کی رنگینیوں اور تنوعات سے صرفِ نظر کرنا درست نہیں، اور نہ ہی انہیں بے دلی اور غیر دل چسپی سے دیکھنا مناسب ہے، بلکہ یہ سب نشانیاں قدرت کی ہیں جن پر غور وفکر کرنا اور انہیں بار بار دیکھنا ضروری ہے کہ ذکر سے فکر ومشاہدہ بہتر ہے۔

ایک اور غزل کا مطلع ملاحظہ کیجیے:

نہ آتے، ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی

اقبالؔ نے غزل میں ایک عجیب سا مضمون پیدا کیا ہے، کہتے ہیں، ہمارا مطالبہ تو یہ ہے کہ

آپ فقط آنے کا وعدہ ہی کر لیتے، ہمارے لیے یہی غنیمت تھا۔

اس غزل میں فکرِ فلسفہ ملاحظہ ہو جیسا کہ شروع سے ہی اقبالؔ شہید جستجو نظر آتے ہیں:

کوئی اب تک نہ یہ سمجھا کہ انساں
کہاں جاتا ہے، آتا ہے کہاں سے

غزل میں اس طرح مضمون کی آمیزش، واضح اس بات کی نشان دہی کر رہی ہے کہ اقبالؔ مفکر بننے کے لیے پر تول رہے ہیں۔ وہ شب بیداری اور سحر گاہی کی لذت سے شروع سے ہی آشنا ہیں، کہتے ہیں:

رلاتی ہے مجھے راتوں کو خاموشی ستاروں کی
نرالا عشق ہے میرا، نرالے میرے نالے ہیں

یہ غزل جس کا مطلع ہے:

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی

شروع تا آخر عارفانہ رنگ لیے ہوئے ہے۔ دیدۂ دل کو بیدار کرنے کی مشق تو نوجوانی سے ہی کرتے نظر آ رہے ہیں۔ جیسا کہ بعد میں کہا:

آنکھ کا نور، دل کا نور نہیں

اقبالؔ زندہ دلی کے قائل ہیں، خاموشی، پژمردگی، یاس اور قنوطیت اور مردہ دلی اقبالؔ کی طبیعت کے بالکل خلاف ہیں۔ وہ بزمِ ہاؤ ہو کو زندگی کی علامت جانتے ہیں، کہتے ہیں محبت میں خاموش رہنا، موت کو قبول کرنا ہے، دلِ زندہ کو اظہارِ محبت میں تکلف نہیں کرنا چاہیے:

چمن زارِ محبت میں خموشی موت ہے بلبل
یہاں کی زندگی پابندئ رسمِ فغاں تک ہے

قارئین کرام: بہت کوشش کر رہا ہوں کہ اختصار سے کام لوں، لیکن شوق اور دلچسپی کا تقاضا ہے کہ غزلیات میں سے ایک دو موتی ضرور آپ کے سامنے پیش کرتا چلوں۔ ملاحظہ کیجیے، سہلِ ممتنع میں کیا خوب مضمون باندھا ہے کہ حسن و عشق کے مابین مراتب کا جو فرق ہے وہ دو ٹوک

انداز میں بیان ہو گیا ہے:

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

یاد رکھیے مذکورہ شعر میں عشقِ مجازی کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔ خالص عشقِ حقیقی بلکہ صوفیوں کی ترجمانی کر رہا ہے، جلوۂ حسنِ ازلی کے طالب کو بندے اور خدا کے درمیان فرق کا اچھی طرح ادراک ہے، وہ بہ خوبی اِس بات سے واقف ہے کہ کہاں آپ اور کہاں میں لیکن شوق کے ہاتھوں اُس کی سادگی اُسے یہ کہنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ میں عشق کے انتہائی درجے پر پہنچنے کی خواہش رکھتا ہوں، لیکن فوراً ہی اُسے احساس ہو جاتا ہے کہ یہ کوئی معمولی اور آسان کام نہیں، اس راہ میں تو کھال بھی کھنچوانی پڑتی ہے، دار پر بھی چڑھنا پڑتا ہے، آگ میں بھی کودنا پڑتا ہے، پتھر بھی کھانے پڑتے ہیں، اور جانے کن کن آزمائشوں سے گزرنا ہوتا ہے۔

ہم شروع سے کہتے آ رہے ہیں کہ سوزِ دل اور عشقِ الٰہی اقبالؔ کی گھٹی میں پڑا ہے:

سخن میں سوزِ الٰہی کہاں سے آتا ہے
یہ چیز وہ ہے کہ پتھر کو بھی گداز کرے

کہتے ہیں اگر سوزِ الٰہی سخن (شاعری) میں شامل ہو جائے تو پھر سننے والے اگر پتھر دل بھی ہیں تو موم کی طرح نرم پڑ جاتے ہیں۔

اقبالؔ عشقِ رسول سے سرشار ہیں، اُن کا تصور انہیں ہمیشہ زمینِ حجاز کی سیر کراتا رہتا ہے، اور یہ اُس وقت کی کیفیت ہے جب اقبالؔ اپنی پوری فکری اور شعوری توانائیوں کے ساتھ جوان ہیں، لیکن جب اور جیسا بھی موقع ملتا ہے، نغمۂ مجازی گانے سے نہیں رہتے:

ہوا ہو ایسی کہ، ہندوستاں سے اے اقبالؔ
اُڑا کے مجھ کو غبارِ رہِ حجاز کرے

ہوا (خواہش) ایسی میسر آئے جو مجھے ہندوستان سے اُڑا کر زمینِ حجاز کے راستے کی گرد بنا دے۔ یعنی مری نوا کو حجازی لے عطا کر دے۔

جیسا کہ پہلے کئی بار تذکرہ ہو چکا ہے اقبالؔ کا ذوقِ جستجو دیدنی ہے، گو، وہ ابھی خودی کی

معرفت حاصل نہیں کر سکے ہیں، لیکن خودی کی تلاش ابھی سے جاری ہے۔ تاہم فیصلہ نہیں کر پارہے کہ میری اصل کیا ہے:

ڈھونڈتا پھرتا ہوں اے اقبالؔ اپنے آپ کو
آپ ہی گویا مسافر، آپ ہی منزل ہوں میں

اقبالؔ اپنی ذات میں قلندرانہ صفت رکھتے ہیں، بے نیازی اُن کے مزاج کا حصہ ہے۔ لیکن اُن کی قلندری میں بھی ایک طرح کا تنوع ہے، ملاحظہ ہو:

مجنوں نے شہر چھوڑا، تو صحرا بھی چھوڑ دے
نظارے کی ہوس ہو تو لیلیٰ بھی چھوڑ دے

عشق کو روایتاً اپنانا کوئی انوکھی بات نہیں، انفرادیت یہ ہے کہ اگر قیس نے عشق میں مجنوں بن کر شہر کو خیر باد کہہ دیا، اور صحرا کی طرف نکل گیا تھا تو تجھے چاہیے کہ تو اُس سے بھی آگے نکل جا، صحرا سے بھی گزر کر اور آگے بڑھ جا، یعنی عشقِ مجنوں کو بھی پیچھے چھوڑ دے اور اگر تو محبوب کے نظارے کی خواہش رکھتا ہے تو اپنے مشاہدے اور دید کو لیلیٰ تک محدود نہ رکھ بلکہ لیلیٰ کی صورت بھی بھول جا، ہر ماسوا کو فراموش کر دے۔ تب کہیں تجھے معرفتِ حق نصیب ہوگی۔

اس کے باوجود کہ اقبالؔ کا گھرانا اُس وقت جب اُنہوں نے آنکھ کھولی تھی، نہ مولویوں کا تھا نہ صوفیوں کا، تاہم والدہ کی خدا پرستی اور والد کی علم دوستی اور روحانیت و تصوف کی طرف اُن کے میلان نے اقبالؔ کو بھی روحانیت کا خوگر بنا دیا تھا۔ فقیروں، درویشیوں اور صوفیوں کی روح پرور شخصیات سے وہ کم عمری میں ہی متاثر ہو چکے تھے اور ذہن و دل پر کس قدر اُن کا اثر تھا، اس کا اندازہ اس سے لگایے کہ غزل کہہ رہے ہیں لیکن غزل کے تمام لوازمات، محبوب سے شکوے، شکایات، ہجر و وصال کے قصے اور حسن و عشق کے باہمی تعلقات و معاملات کی داستانوں کی بجائے، اپنی دل پسند اور ذہن نشیں شخصیتوں کو موضوع بنا رہے ہیں، کہتے ہیں:

جلا سکتی ہے شمعِ کشتہ کو موجِ نفس ان کی
الٰہی کیا چھپا ہوتا ہے اہلِ دل کے سینوں میں

اے خدا، "یہ اہلِ دل" اپنے سینوں میں کیا ایسا سوزِ سحر کار رکھتے ہیں کہ ان کی ایک پھونک

سے بجھے ہوئے چراغ دوبارہ جل اُٹھتے ہیں۔ یعنی یہ اہلِ دل اپنی روحانی تعلیم سے مردہ دلوں کو زندہ کرنے کا وصف رکھتے ہیں:

تمنا دردِ دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

مردِ فقیر کی شان بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر دردِ دل کی طلب ہے، یعنی اپنے دل کو کامیاب بنانا چاہتا ہے تو اِن گدڑی پوش فقیروں کی صحبت اختیار کر، اور ان کی خدمت بجالا کیوں کہ دردِ دل جیسی اَن مول چیز فقیر کی گدڑی میں ہی مل سکتی ہے، بادشاہوں کے خزانے اِس سے خالی ہیں۔

مختصر یہ کہ خواہ وہ "ہمالہ" ہو، "بچہ اور شمع" ہو، "طفلِ شیر خوار"، "کنارِ راوی"، یا شروع کی دیگر نظمیں ہوں، اپنے استعارات وتشبیہات کے حوالے سے نہایت فکر انگیز اور معنی خیز ہیں جن میں اُن مسائل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو اقبالؔ نے اپنے گرد وپیش کے مشاہدے اور مطالعے سے اخذ کیے ہیں۔ بلکہ اُس دور کی کئی نظمیں تو ایسی ہیں جن میں کوئی معنوی ابہام ہی نہیں، بلکہ اُن کے اندر کا اقبالؔ کھل کر سامنے آتا دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً "تصویرِ درد" جو دراصل ایک ایسا آئینہ ہے جو اہلِ ہندوستان کے سامنے رکھا گیا ہے، بلا تخصیص ہندو مسلم سب کو ہوش دلایا گیا ہے کہ اگر تم نے آپس کے بیر کو ختم کرکے اور متحد ہوکر موجودہ حالات کا مقابلہ نہ کیا، اور آنے والے مصائب کے لیے پیش بندی نہ کی تو تمہارا اِس خطہ سے نام ونشان تک مٹ جائے گا:

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو!
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

بہ ظاہر تو یہی لگتا ہے کہ اقبالؔ جو، اُس وقت تک ہندو مسلم اتحاد کے نقیب وحامی سمجھے جاتے تھے، وہ کُل ہندوستاں والوں سے مخاطب ہیں، یعنی یہاں بسنے والی تمام قوموں کو مخاطب کر رہے ہیں، لیکن ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ اُس وقت بھی اقبالؔ کو اِس حقیقت کا احساس تھا کہ ہندو نے سقوط

ہندوستان کے وقت شروع میں ہی غاصب حکمرانوں سے ہاتھ ملا کر اور اُنھیں اپنی وفاداری کا یقین دلا کر خود کو محفوظ کر لیا تھا جب کہ مسلمان انگریز کے نشانے پر تھے، تو اقبالؔ نے ''وطن کی فکر کر ناداں'' کہہ کر بہ ظاہر تو دونوں قوموں کو مخاطب کیا ہے، لیکن در اصل اُن کے لاشعور میں مسلم قوم کی وحدت اور اُس کے الگ وجود کا احساس اُس وقت بھی موجود تھا، اور ''تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں'' یہ کہتے وقت اُن کا تخاطب خصوصی طور پر اپنی ملت سے ہی رہا ہوگا۔ بالواسطہ طریق پر اسی کو خبردار کر رہے ہیں۔ ہمارے اِس خیال کی یقینی گواہ انجمن حمایت الاسلام اور لاہور کی دیگر مسلم سماجی انجمنوں میں پڑھی جانے والی نظمیں ہیں جو خالص ملی ہمدردی اور قومی جذبے سے مغلوب ہو کر لکھی گئی ہیں۔

یاد ہوگا کہ انجمن حمایت الاسلام کے سالانہ جلسہ میں اقبالؔ نے جو طویل نظم ''نالہ یتیم'' پڑھی تھی اور صدرِ جلسہ ڈپٹی نذیر احمد نے نظم سے متاثر ہو کر شاعر کو اِن لفظوں میں خراجِ تحسین پیش کیا تھا۔ ''میں نے اِن کانوں سے انیسؔ اور دبیرؔ کے مرثیے سنے مگر جس پائے کی نظم آج سننے میں آئی اور جو اثر اِس نے میرے دل پر کیا، وہ اِس سے پہلے کہیں نہ ہوا تھا۔''

تو گویا یہ واقعہ ہے جہاں سے اقبالؔ کی شہرت کا مینار روشن ہونا شروع ہوا، اور پھر دیگر کئی سماجی اجتماعات میں اور خصوصاً انجمن کے دیگر سالانہ جلسوں میں پڑھی جانے والی نظموں نے اقبالؔ کو پورے ملک میں مشہور کر دیا۔ یعنی ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۴ء تک کی بیش تر نظمیں اپنی نوعیت کے اعتبار سے نہایت منفرد اور نیا لب ولہجہ لیے ہوئے ہیں اور اُن کے اندر جو مضامین پیش کیے گئے ہیں وہ خالص قومی درد سے بھرپور ہیں۔ عنوانات ہی اُن کا تعارف کراتے نظر آتے ہیں۔

''یتیم کا خطاب ہلالِ عید سے۔''، ''اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب سے۔'' ابرِ گہر بار، یعنی فریادِ اُمت اور ''تصویرِ درد'' وغیرہ۔

اِس جگہ یہ بات بھی قارئین کے گوش گذار کرنا خالی از دل چسپی نہیں کہ اقبالؔ کیوں کہ خوش الحان تھے۔ تاہم شروع شروع میں آپ نے تحت اللفظ میں کلام پیش کیا لیکن جیسے ہی عوام کو آپ کی خوش الحانی کا علم ہوا، اُن کی طرف سے فرمائش نہیں بلکہ مطالبہ شروع ہو گیا کہ ترنم سے کلام

سنائیں۔ چناں چہ آپ کی پُر سوز آواز اور دل گداز ترنم نے سماں باندھ دیا۔ ہزاروں کی تعداد میں سامعین جھوم جھوم گئے۔ بلکہ کلامِ اقبالؔ کے مطبوعہ نسخے ہاتھوں ہاتھ فروخت ہونے لگے۔

☆......☆......☆

اب ہم پھر اُسی مقام پر چلتے ہیں جہاں لندن روانگی کے وقت اقبالؔ کو راستے میں چھوڑا تھا۔ اقبالؔ دہلی سے چلے اور بمبئی پہنچے، وہ اِس شہر میں پہلی بار آئے تھے، یہاں کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر ایک خوش گوار حیرت سی کرنے لگے۔ اِس کا اظہار اُنہوں نے اپنے ایک مکتوب میں اس طرح کیا:

''میں بمبئی، یعنی بابِ لندن کی کیفیت دیکھ کر حیران ہوں، عجب شہر ہے، بازاروں میں گاڑیوں کی آمد اِس قدر ہے کہ پیدل چلنا محال ہو جاتا ہے، اس شہر کی تعلیمی حالت عام طور پر نہایت عمدہ معلوم ہوتی ہے، ہمارے ہوٹل کا حجام، ہندوستان کی تاریخ کے بڑے بڑے واقعات جانتا تھا۔''

آخر کار وہ گھڑی آ گئی کہ اقبالؔ اپنی زندگی کے پہلے غیر ملکی اور پہلے بحری سفر پر روانہ ہو رہے ہیں۔ یہ ۱۹۰۵ء کا ماہِ ستمبر ہے کہ بمبئی بندرگاہ سے بحری جہاز نے لنگر اُٹھایا اور انگلستان جانے کے لیے سفر شروع کر دیا۔ اقبالؔ کے لیے یہ ایک خوش گوار تجربہ ہے، ایک طرف جہاز کا فرانسیسی عملہ اپنی خوش اخلاقی اور اپنے حُسنِ انتظام سے متاثر کر رہا ہے، دوسری طرف جہاز پر سے باہر پھیلے ہوئے قدرتی مناظر اُن کے ذوقِ جمالیات کو ایک گوناں راحت بخش رہے ہیں۔ دور تک پھیلا ہوا سمندر اُس کی ٹھاٹھیں مارتی نیلگوں موجیں، طلوعِ آفتاب کا اُمید افزا حسن اور غروبِ آفتاب کا حسرت آمیز نظارہ، اِن سب نے مل کر اقبالؔ کو جیسے سورۂ رحمٰن کا مفسر بنا دیا ہے۔

اب یہ ستمبر کی ۱۲ر تاریخ ہے کہ اُن کا سفینہ بحرِ عرب کے ساحل سے ہم آغوش ہو رہا ہے۔ اعلان ہوا ہے کہ یہ عدن کی بندرگاہ ہے، جس کے اُس پار وہ دشتِ مقدس ہے، جس کے ذرّوں پر ستارے بھی رشک کرتے ہیں۔ یہ ہند کا مسافر سراپا نیاز بن جاتا ہے۔ اور تصور میں صحرائے عرب کو لا کر اس سے مخاطب ہوتا ہے:

''اے عرب کی مقدس سرزمین! تجھ کو مبارک ہو، تو ایک پتھر تھی جس کو دنیا کے معماروں نے رد کر دیا تھا، مگر ایک یتیم بچے نے خدا جانے تجھ پر کیا

فسوں پڑھ دیا کہ موجودہ دنیا کے تہذیب و تمدن کی بنیاد تجھ پر رکھی گئی
۔تیرے ریگستانوں نے ہزاروں مقدس نقشِ قدم دیکھے ہیں اور تیری
کھجوروں کے سائے نے ہزاروں ولیوں اور مسلمانوں کو تمازتِ آفتاب
سے محفوظ رکھا ہے۔ کاش! میرے گناہ گار جسم کی خاک تیری ریت کے
ذرّوں میں مل کر تیرے بیابانوں میں اُڑتی پھرے اور یہی آوارگی میری
زندگی کے تاریک دنوں کا کفارہ ہو۔ کاش! میں تیرے صحراؤں میں لُٹ
جاؤں، اور دنیا کے تمام سامانوں سے آزاد ہو کر تیری تیز دھوپ میں چلتا
ہوا، اور پاؤں کے آبلوں کی پروا نہ کرتا ہوا، اُس متبرک سرزمین میں
جا پہنچوں جہاں کی گلیوں میں حضرت بلالؓ کی عاشقانہ آواز گونج اُٹھی
تھی۔"

ملاحظہ کیا، یہ ہے اقبال، نوجوان اقبال، لندن کا مسافر، لیکن فکر کا قبلہ سوئے حجاز ہے۔ تو پھر کیا وجہ ہے کہ اس مردِ مومن کو شاعرِ اسلام نہ کہا جائے۔

☆☆

maablib.org

یہ ۲۴؍ ستمبر ہے کہ اقبالؔ گریٹ برٹین (عظیم برطانیہ) کے دارالحکومت لندن میں قدم رکھتے ہیں، شیخ عبدالقادر استقبال کو موجود ہیں۔ وہ غالباً پہلی بار اقبالؔ کو مغربی لباس میں دیکھ رہے ہیں تاہم پہچاننے میں دیر نہیں کرتے اور دوڑ کر بغل گیر ہو جاتے ہیں۔

ہر آدمی نئی جگہ پہنچ کر کچھ پریشان ضرور ہوتا ہے، ممکن ہے اقبالؔ کو بھی لندن کے طلسماتی ماحول نے کسی قدر حیرت سے دوچار کیا ہوگا، اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی قدر اس سادہ مزاج، اور خالص ''لاہوری'' بے تکلفی کے خوگر کو اس مصنوعی ماحول نے حیران بھی کیا ہو، تاہم شیخ عبدالقادر ایسے دیرینہ دوست کی رفاقت و موجودگی ان فطری اثرات کو زائل کرنے اور اجنبی جگہ پر پیدا ہونے والے مختلف مسائل پر قابو پانے میں بہت زیادہ مددگار ثابت ہوئی، کیوں کہ وہ پہلے سے آئے ہوئے تھے اور یہاں کے پیش آمدہ حالات کو سمجھ چکے تھے۔

دوسرا مرحلہ تعلیمی معاملات کا تھا، جو یہاں آنے کا اصل مقصد تھا، اس سلسلے میں اقبالؔ کے سابقہ اُستاد پروفیسر آرنلڈ صاحب نے اُن کی راہ نمائی کی۔ وہ پہلے ہی سب کچھ طے کر چکے تھے کہ کیا کرنا ہے۔ اس طرح لندن میں دو، یا تین روز رہ کر اقبالؔ کیمرج چلے گئے اور یکم اکتوبر کو ایڈوانس اسٹڈی میں داخلہ لے لیا گیا۔ تعلیم کا یہ مرحلہ دراصل اُن طلباء کے لیے ہوتا تھا جو پہلے ہی کسی یونیورسٹی سے بی اے یا ایم اے کی سند لے چکے ہوں۔ لہٰذا قواعد کے مطابق یہاں اُنہیں پہلے بی اے کرنا تھا، گویا مشرق کا ماسٹر، یہاں مغرب میں بی اے سے بھی پیچھے تھا۔

اقبالؔ یہاں اپنے ہم مکتب مرزا جلال الدین اور ادبی رفیق عبدالقادر کی طرح قانون کی تعلیم حاصل کرنے آئے تھے، لیکن اس دوران اُنہوں نے ایڈوانس اسٹڈی میں داخلہ لے کر تحقیقی کام شروع کر دیا۔ چناں چہ اس سلسلے میں اُنہوں نے مسٹر میک ٹیگرٹ کی نگرانی میں جو تحقیقی مقالہ

تحریر کرنا شروع کیا اُس کا عنوان تھا: ''ایران میں مابعد الطبیعات کا ارتقا''، لیکن چوں کہ کیمبرج میں اس ڈگری کا انتظام نہ تھا، اِس وجہ سے تحقیقی مقالے کی رجسٹریشن کے لیے اقبالؔ کو جرمنی کے شہر میونخ جانا پڑا۔ جہاں کچھ مسائل اور بھی پیش آئے جو نگران پروفیسر مسٹر میک ٹیگرٹ کی خصوصی دل چسپی اور سفارش پر حل ہو سکے۔ خصوصاً جو دو رعایتیں اقبال کو دی گئیں وہ یہ کہ یونیورسٹی میں دو سے تین سال تک کی اقامت سے اُنھیں مستثنیٰ قرار دیا گیا اور دوسری یہ کہ مقالہ لاطینی یا جرمن زبان کی بجائے انگریزی میں پیش کرنے کی خصوصی اجازت مل گئی۔ (حالاں کہ جرمن ہر زندہ قوم کی طرح اپنی زبان کو اولیت دیتے ہیں) البتہ مقالے سے متعلق زبانی امتحان جرمن میں ہی برقرار رکھا گیا۔ اس طرح ۶۰ جرمن مارک بہ طور فیس کی ادائی کے ساتھ رجسٹریشن کا عمل مکمل ہو گیا۔

اِن معاملات کے طے پا جانے کے بعد، اقبالؔ واپس لندن آئے اور قانون کی تعلیم کے مشہور ادارے لنکنز ان یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا کیوں کہ انگلستان آنے کا اُن کا اصل مقصد بیرسٹری کی ڈگری ہی لینا تھا۔

تعلیم کا یہ سفر اس طرح آگے بڑھنے لگا کہ اقبالؔ کیمبرج یونیورسٹی میں تحقیقی کام کے ساتھ ساتھ لندن آکر لنکنز ان میں قانون سے متعلق لیکچروں میں بھی شرکت کرتے۔ یہاں شیخ عبدالقادر پہلے ہی داخلہ لے چکے تھے۔ چناں چہ دونوں رفیق ان لیکچروں میں ساتھ ہوتے اور مشغلۂ کام و دہن سے بھی ایک ساتھ لطف اندوز ہوتے۔

مقالے کے نگراں پروفیسر مسٹر میک ٹیگرٹ کے ساتھ اقبالؔ کے تعلقات نہایت خوش گوار اور دوستانہ ہو گئے، کیوں نہ ہوں کہ قدرت نے اقبالؔ کے خوب صورت پیکر میں ایک شیریں زباں اور خوش بیان شخصیت کی شمع روشن کر رکھی ہے، جس سے ایک بار رابطہ ہوتا ہے وہ پروانہ بن کر رہ جاتا ہے۔ مسٹر میک ٹیگرٹ بھی اُنھی میں سے تھے۔ اُن سے اقبالؔ کے تعلقات کی کیفیت کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ اقبالؔ نے اُن کے انتقال پر جو تاثرات تحریر کیے، اُن میں لکھا:

> ''میری ملاقات تقریباً روز اُن کے کمرے میں ہوتی تھی، اور مسائل اور افکار پر تبادلۂ خیال ہوتا تھا۔ ہماری گفتگو اکثر وجود باری تعالیٰ کے مسئلے پر آجاتی تھی، میک ٹیگرٹ کی پُرزور منطق مجھے خاموش تو کرا دیتی تھی، لیکن وہ مجھے قائل کرنے میں کبھی کام یاب نہ ہو سکے۔''

ظاہر ہے یہ ممکن ہی نہ تھا، اقبالؔ کی فکری بنیادوں میں تو اُس کتاب حق کی تعلیمات شامل

تھیں جس کے متعلق بلند آہنگ انداز میں فرمادیا گیا ہے۔ ''ذالک الکتاب لاریب فیہ'' یقیناً یہ وہ کتاب ہے جس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ لہٰذا کلامِ خالق کا سامع اقبالؔ، کسی انسانی فکرو فلسفہ کی موشگافیوں سے کیوں کر متاثر ہونے والا تھا۔ یہی سبب ہے کہ ایک ایسا موقع آیا جب انہیں بہ زعمِ خود اور بہ صد افتخار یہ کہنا پڑا:

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

انہی دنوں آپ مشیر حسین قدوائی اور شیخ عبدالقادر کے ہمراہ ترکی کے شہر قسطنطنیہ گئے اور وہاں کئی مسلم اکابرین سے ملاقاتیں کیں۔

اقبالؔ کے یورپ میں قیام کو ذرا ایک دوسرے رخ سے دیکھنے کی بھی ضرورت ہے۔ ایک اٹھائیس سالہ خوب رو نوجوان کے سامنے لندن کی تمام رنگینیاں اپنی تمام حشر سامانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ تہذیبِ یورپ کی ایک ایک ادا اپنے ناظرین کو دعوتِ ہم آغوشی دے رہی ہے، لیکن اس زہد شکن ماحول میں بھی اقبالؔ ایک سچے مردِ مومن کی طرح اپنے پروں پر پانی نہیں پڑنے دیتا، زلفِ زلیخا دراز ہے لیکن یوسف صدیق کے کردار سے وابستہ، مشرق کا شہزادہ، حلقۂ دامِ فریبِ حسن میں نہیں آتا، بلکہ یہ درویش اپنی دنیا ہی الگ بنائے ہوئے ہے، ''کردار میں، گفتار میں، اللہ کی برہان'' نظر آرہا ہے، سات سمندر پار آکر بھی اُس کے قول وعمل میں کوئی فرق نہیں آسکا ہے، سحر خیزی وشب زندہ داری معمولات کا حصہ بنی ہوئی ہیں، اپنی اس ثابت قدمی اور استقامت کا اُنہیں خود بھی اعتراف ہے جو انہوں نے یورپ سے واپسی پر اِن الفاظ میں دہرایا:

زمستانی ہوا میں گرچہ تھی تلوار کی تیزی
نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آدابِ سحر خیزی

یہ نہیں کہ اقبالؔ نے گرد وپیش سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں، نہیں بلکہ وہ کھلے ذہن ودل کے ساتھ یورپ کے نگارخانے کی ایک ایک تصویر کا مشاہدہ کر رہے ہیں لیکن محسوس کرتے ہیں کہ گورے سینوں میں تاریکیوں کے سوا کچھ نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ بعد میں وہ کہے بغیر نہیں رہے:

میں نے اے اقبالؔ یورپ میں اُسے ڈھونڈا بہت
بات جو ہندوستاں کے ماہ سیماؤں میں تھی

☆☆

تعلیم کا دورانیہ جاری ہے۔ اقبالؔ، اِدھر کیمبرج میں تحقیق سے متعلق کام میں مصروف رہتے ہیں۔ اُدھر لندن جا کر لنکنز ان یونیورسٹی میں قانونی لیکچروں کی سماعت کرتے ہیں، اس دوران لندن میں قیام شیخ عبدالقادر کے یہاں ہوتا ہے۔ اسی اثنا میں شیخ صاحب نے اُنھیں ایک انگریز خاتون مس بیک کے ہاں لے جا کر اُس سے ملوایا۔ مس بیک کو اپنے نووارد مہمان اور نئے دوست شیخ محمد اقبال سے مل کر دلی خوشی ہوئی بلکہ ان کی عالمانہ اور فلسفیانہ گفتگو سے بے حد متاثر نظر آئیں، اور یوں اقبالؔ جب بھی کیمرج سے لندن آتے، شیخ عبدالقادر کے ساتھ اُن کی محفل میں ضرور شریک ہوتے۔

اِس دوران اقبالؔ نے ہندوستان سے آئی ہوئی ایک طالبہ عطیہ فیضی کی بڑی تعریف سنی کہ وہ بہت زیادہ علم دوست اور بہت اوصاف پسند خاتون ہیں۔ ظاہر ہے یہ غائبانہ تعارف عبدالقادر نے ہی کرایا ہوگا، اقبالؔ نے جب مسلسل اِس باذوق ہندوستانی دوشیزہ کی تعریف سنی تو اُن سے ملنے کا اشتیاق ہوا، چناں چہ ایک بار کیمرج سے لندن روانگی سے قبل مس بیک کو اپنے آنے اور موصوفہ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ مس بیک کے لیے یہ اُن کے مذاق کی چیز تھی، فوراً عطیہ صاحبہ کو اطلاع دی گئی ''آؤ تا کہ اپنے ہم وطن ایک نہایت باذوق طباع اور ذہین وفطین فلسفیانہ ذہن رکھنے والے طالب علم سے مل سکو، کیوں کہ وہ خاص طور پر تم ہی سے ملنے کیمرج سے آرہے ہیں۔''

عطیہ کے لیے یہ کسی قدر اچنبھے کی بات تھی کیوں کہ یہ نام اُن کے لیے اجنبی تھا۔ وہ یوں تو مس بیک کی انجمن میں اکثر شریک ہوتی تھی، لیکن مس بیک نے اس سے قبل اسے کبھی مدعو نہیں کیا تھا۔

اکثر و بیش تر ہندوستانی طلباء انہی خاتون مس بیک کے ہاں قیام کرتے ہیں۔ مس بیک علی گڑھ کالج کے ہر دل عزیز پرنسپل مسٹر تھیوڈور کی بہن ہیں، بھائی کی طرح یہ بھی ہندوستانی طلباء سے مشفقانہ رویہ رکھتی ہیں۔ طلباء کے علاوہ اساتذہ اور باذوق افراد بھی اکثر و بیش تر یہاں جمع ہوتے اور تبادلۂ خیالات کرتے رہتے ہیں۔

شیخ محمد اقبال کا تعارف اِس دل نواز خاتون عطیہ فیضی سے کرایا گیا۔ یہ ہندوستان کی ایک چھوٹی سی ریاست جنجیرہ کے حکمران خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ اُس زمانے میں حصولِ تعلیم کے لیے کسی خاتون کا دور دراز بیرونِ ملک سفر اور لندن ایسی جگہ آ کر قیام کرنا، کسی قدر ایک انوکھی اور غیر معمولی بات تھی، کیوں کہ اُس وقت خود انگلستان میں مرد و زن کی برابری کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، یہاں تک کہ عورتیں ووٹ دینے کے حق سے محروم تھیں۔

عطیہ فیضی متمول گھرانے اور شاہانہ پس منظر کے ساتھ ساتھ دولتِ حسن سے بھی مالا مال تھیں، اِس پر مستزاد یہ کہ ذہانت و فطانت میں بھی طاق، لیکن اقبالؔ ایسے قلندر کے آگے پہلی ہی ملاقات میں اپنی تمام خوبیوں کو لے کر سرنگوں ہو گئیں۔ پھر ملاقاتیں بڑھیں اور یہ روابط قربت اور دوستی میں بدل گئے اور عطیہ بیگم کے عمل سے لگا جیسے اُس نے اقبالؔ کو ایک مرشد کی طرح قبول کر لیا ہے۔

جیسا کہ کہا گیا، مس بیک کی بیٹھک میں طلباء کے علاوہ اساتذہ اور ریسرچ اسکالر بھی آتے اور آپس میں مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے تھے۔ علمی بحث و مباحثے ہوتے، اور درمیان میں ماحول کی ''خشک سالی'' کو دور کرنے کی غرض سے خوش مذاقی اور بذلہ سنجی کی پھوار پڑنے لگتی۔ دراصل اِن محفلوں میں علم و آگہی کے متوالوں کو ایک دوسرے کے قریب آنے اور سمجھنے کا موقع ملتا تھا، عطیہ اور اقبالؔ نے بھی یہیں ایک دوسرے کو سمجھنا شروع کیا اور بعد میں یہ ملاقاتیں مستقل دوستی میں بدل گئیں اور تا حیات بہ ذریعہ خطوط دونوں نے ایک دوسرے سے روابط قائم رکھے۔ ظاہر ہے اِن کے تعلقات کی فضا خالص علمی، ادبی و فکری تھی۔ عطیہ بہت ہی ادب نواز اور بہت اعلیٰ ذوق اور لطیف طبیعت کی خاتون تھیں، اقبالؔ کی مفکرانہ و عالمانہ شخصیت اُن کے دل میں بیٹھ کر رہ گئی، اور جیسا کہ دیکھا گیا، وہ عمر بھر اقبالؔ کا ایک مرشد و مربی کی طرح احترام کرتی رہیں۔ ممکن ہے ''اِس عقیدت'' میں ''محبت'' کا فطری جذبہ بھی پوشیدہ ہو، تاہم شادی سے پہلے اور شادی کے بعد بھی

اقبال کے لیے عطیہ کے جذبات سدا بہار رہے۔

مس بیک کے ہاں یہ میل ملاقاتیں، بڑی نتیجہ خیز ہوتی تھیں، علم و آگہی کے طالب اپنے افکار و خیالات کا آپس میں تبادلہ کرتے اور ایک دوسرے کی علمی و فکری صلاحیتوں اور قابلیتوں سے مستفید ہوتے، خصوصاً اس انجمن میں اقبال ماہتاب کی طرح جگمگاتے دکھائی دینے لگے۔ جب کسی اہم موضوع پر بحث چھڑ جاتی تو آخری رائے کے لیے اقبال سے رجوع کیا جاتا اور سننے والے اُن کے فلسفیانہ تبصروں سے اپنے علمی خزانے میں اضافہ محسوس کرتے۔ تاہم یہ ملاقاتیں اور نشستیں زیادہ طویل نہ ہوتیں، کیوں کہ تقریباً سب ہی کو اپنے تعلیمی نصاب سے متعلق ہوم ورک کرنا ہوتا تھا، خصوصاً اقبال اپنی تعلیم پر پورے انہماک کے ساتھ توجہ دیے ہوئے تھے۔ اُن کے نزدیک حصولِ تعلیم عبادت کا درجہ رکھتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ دیارِ فرنگ کے خیرہ کن روز و شب پر بھی نظر ڈالتے، لیکن خود کو اس طلسمات میں کھو جانے سے بچائے رکھتے کہ آنے والا وقت انہیں خود جانِ محفل بنانے جا رہا تھا۔

جون ۱۹۰۷ء کو انہوں نے اپنا تحقیقی مقالہ مکمل کیا اور جرمنی جا کر متعلقہ یونیورسٹی میں جمع کرا دیا۔ اسی دوران موسمِ گرما کی تعطیلات شروع ہو گئیں، اور وہ کیمرج سے لندن آ گئے۔ لیکن یہاں انہیں اپنے ایک رفیق شیخ عبدالقادر کو وطن کے لیے الوداع کہنا پڑا، کیوں کہ وہ اپنی بار ایٹ لا کی تعلیم مکمل کر کے ڈگری لے چکے تھے۔

قارئین کے ذہن میں اقبال کے اُستاد پروفیسر آرنلڈ کا خیال ضرور آتا ہوگا، کیوں کہ اب تک وہ ہمارے تذکرے میں کم ہی آئے ہیں۔ تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ اقبال یہاں اُن کے وطن میں ہوں اور اُن سے الگ تھلگ رہیں۔ نہیں بلکہ باقاعدہ اُن سے رابطہ رکھا اور گاہے بگاہے ملاقاتیں ہوتی رہیں اور آرنلڈ صاحب تعلیم کے سلسلے میں اپنے شاگرد کو اپنے قیمتی مشوروں سے نوازتے رہے۔

☆☆

maqbib.org

یہ اسی سال کا تیسرا ہفتہ ہے کہ اقبال انگلستان سے ایک بار پھر جرمنی گئے اور وہاں سے میونخ سے کچھ ہی فاصلے پر واقع یونیورسٹی ٹاؤن "ہائڈل برگ" میں قیام پذیر ہوئے۔ یہاں آنے کا مقصد جرمن زبان سیکھنا تھا، جیسا کہ بیان کیا گیا کہ مقالے کے زبانی امتحان کے لیے جرمن زبان کا آنا لازمی تھا۔ چناں چہ تین مہینے اس زبان دانی اور جرمن ادب کے حصول میں صرف ہوئے، لیکن یہ نوے دن کی مدت اپنے اندر ایک نہایت ہی دل چسپ، پُر لطف یا یوں کہیے ایک پُر کیف رومان پرور داستان رکھتی ہے۔ جس کا ذکر اس جگہ ایسا ہی ضروری ہے جیسا کہ جرمنی کی اُس درس گاہ میں حصولِ تعلیم کے لیے جرمن زبان کا آنا لازمی تھا۔

یہ جگہ، ہائڈل برگ یونیورسٹی ٹاؤن کہلاتی ہے۔ جرمنی کے مرکزی شہر میونخ سے منسلک ہے۔ نہایت پُر سکون اور خوب صورت جگہ ہے، بالخصوص یہ انسٹی ٹیوٹ جس میں جرمن زبان سکھائی جاتی ہے اور ہوسٹل پنشن شیرر Pension Scherer یعنی اقامت گاہ شیرر دریائے نیکر کے کنارے واقع ہے۔ اس پرائیویٹ اسکول اور ہاسٹل کو ایک ستر سالہ فراہیرن نامی جرمن خاتون چلا رہی ہیں۔ غیر ملکی طلباء اکثر زبان سیکھنے آتے ہیں، اقبال بھی اسی جگہ پنشن شیرر میں آکے ٹھہرے ہیں، جرمن زبان میں کتنا مزا ہے یہ تو بعد کی بات ہے، پہلے تو یہ ہوا کہ اقبال کو یہاں کے قدرتی ماحول نے اپنے سحر میں لے لیا۔ کہنہ عمر فراہیرن نے اپنے علاوہ ٹیوشن سینٹر میں دیگر دو اُستانیوں کو بھی ملازم رکھا ہوا ہے، ان میں سے ایک ایما ویگے ناست کا تعلق ہائلبرون سے ہے، قبال کا براہِ راست واسطہ اسی نوجوان اُستانی سے ہوا ہے۔ ایما اپنی عمر سے زیادہ سنجیدہ اور ذہین

ہے۔ اُس کی ایک بڑی بہن صوفی وگیے ناست اور بھائی کارل بھی ہے، لیکن یہ اپنے ماں باپ کی سب سے زیادہ سمجھ بوجھ والی اولاد ہے، بلکہ اسے اپنے خاندان کا دماغ سمجھا جاتا ہے۔ اُس نے یہیں ہائیڈل برگ سے ہی تعلیم حاصل کی ہے اور اب خود دوسروں کو تعلیم دے رہی ہے۔

اب دیکھئے کیا مزا ہے کہ دریا کے کنارے واقع اِس درس گاہ میں اُستانی کے فرائض انجام دینے والی ایما وگیے ناست جیسی سیاہ بالوں اور نیلی آنکھوں والی دل کش خدوخال کی پُر شباب صاحبِ عقل اُستانی جو اپنے شاگرد سے دو سال چھوٹی ہے، شعروادب کا بھی اعلیٰ ذوق رکھتی ہے، گردوپیش کا ماحول بھی ذوقِ جمالیات کے لیے خاصی آسودگی و راحت بخشنے والا ہے۔

دریا کے کنارے قائم شیرر ہاسٹل کی عمارت روز و شب اپنا عکس پانی میں دیکھتی رہتی ہے، طرح طرح کے خوب صورت درخت جیسے ہاتھ باندھے اُس کے سامنے کھڑے نظر آتے ہیں، صاف و شفاف شیشے جیسے پانی پر پھیلی ہوئی چھوٹی بڑی کشتیاں اور دوسرے کنارے کے پس منظر میں نظر آنے والی سبزہ پوش پہاڑیاں اور انہی کے دامن میں صدیوں پرانے حویلی نما مکانات اور قدیم قلعوں کے کھنڈر کی پُر اسراریت کو زائل کرتی ہوئی سر پر تانبے کے چمک دار کلس سجائے، تثلیث پرستوں کی عبادت گاہیں۔ یہ سب آثار مل کر کیا ماحول پیدا کرتے ہیں، یہ تو وہی محسوس کرسکتا ہے جو انسان ہوگا۔ خاک کا تودہ تو فقط دیکھنے والوں کی آنکھوں میں بھی دھول جھونک سکتا ہے۔ یقیناً اقبالؔ کو ہائیڈل برگ کی اس سحر انگیز فضا نے اپنی گرفت میں ضرور لیا ہوگا، لیکن حالتِ نماز میں بندہ اپنے خالق کے روبرو ہوتا ہے، وہ نہ گردوپیش دیکھتا ہے اور نہ اس کے ماسوا اس کے دل میں کوئی خیال لاتا ہے، محمد اقبالؔ بھی حصولِ تعلیم کے معاملے میں جیسے حالتِ نماز میں ہیں۔ انہیں یہاں آنے کا اپنا مقصد یاد ہے، اپنے اور ایما کے درمیان رشتے کا بھی اُنہیں احساس ہے، لہٰذا اس رومان پرور فضا کو اُنہوں نے اپنے کردار سے اِس قدر پاکیزہ بنا دیا ہے کہ ایما کے لیے خود بھی وہ ایک تقدس مآب ہستی بن گئے ہیں۔

ایما اقبالؔ کو جرمن زبان کی مشق کراتی ہے اور اقبالؔ زبان کے ساتھ ساتھ ہی اُس سے جرمن ادبی شخصیات، خصوصاً مشاہیر شعرا، ''ہائنے'' اور ''گوئٹے'' وغیرہ سے متعلق کلام سنتے اور سمجھتے ہیں، اور یوں یہ دو ہمہ گیر ادبی کیفیت اُستاد و شاگرد کی ایک ایسی داستان رقم کر رہی ہے، جس کی مثال درس و

تدریس کی تاریخ میں شاید نہ مل سکے۔

اِس رومان پرور ماحول میں بھی اِس کے باوجود کہ اقبالؔ کی زندگی صنفِ لطیف کی خود سپرد رفاقت سے محروم ہے، وہ اپنے مقصد سے کام رکھے ہوئے ہیں۔ اس تشنہ لب کے سامنے چشمۂ آبِ حیات خود زمزمہ خواں ہے۔ اقبالؔ کی اِس بلند کرداری کا ثبوت اُن کے وہ خطوط ہیں جو انہوں نے اس جنتِ ارضی سے واپسی پر اپنی اس ''بے زبان'' اُستانی کو لکھے کہ اس کی زبان، دل کی بات اِس لیے کھل کر نہ کہہ سکی کہ اقبالؔ اُس کی نظر میں کسی اور ہی جہان کی مخلوق تھے۔ ہم اُس مکتوب کی تحریر سے بعد میں نظر یاب ہوں گے، کیوں کہ اس کے لیے ہمیں کئی عشرے آگے جانے کا انتظار کرنا پڑے گا، جب کہ ابھی ہم یہیں ہائڈل برگ کی کیف آور فضا سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

اگست کی ۲۰ تاریخ ہے کہ اقبالؔ کی ایک اور پرستار، اپنی شاہانہ شخصیت کے ساتھ آ کر اس حسین منظر کا حصہ بن جاتی ہے۔ یہ عطیہ فیضی ہیں جو اپنے بھائی اور دیگر کئی ہندوستانی طلبہ کو لیے یہاں وارد ہوئی ہیں۔ ان کے آنے کا اصل محرک کیا ہے، یہ تو صیغۂ راز میں ہے، البتہ راوی جو کچھ کہتا ہے وہ یہ ہے کہ انہیں پروفیسر ٹامس آرنلڈ نے باصرار بھیجا ہے اور ایک بازگشت یہ بھی ہے کہ خود اقبالؔ نے ہی انہیں اِس خلد کی سیر کو مدعو کیا ہے۔ وجہ کچھ بھی ہو، بہر حال یہ قافلۂ رنگ و بو کوئی دو ہفتے سے یہاں سیر و تفریح کرتا اور یہاں کے قدرتی مناظر کی خوب صورت تصویریں دل و نظر میں اُتارتا رہتا ہے۔

تصور کیجیے ایما اور عطیہ جب پہلی بار مل رہی ہوں گی تو اقبالؔ کی شاعرانہ رگ ضرور پھڑکی ہوگی، حسنِ مشرق اور حسنِ مغرب کو آمنے سامنے دیکھ کر جانے کس کے حق میں فیصلہ دیا ہوگا، یا یہ سمجھ کر آنکھیں بند کر لی ہوں گی کہ شمع کو شمع کے سامنے رکھ کر فیصلہ مشکل ہو جاتا ہے کہ کون زیادہ روشن ہے اور کس کی روشنی نظر کو خیرہ کر دینے والی ہے۔ ہمارا خیال ہے یہ محض ہمارے افسانہ طراز ذہن کی موشگافی ہو سکتی ہے، ورنہ اقبالؔ کی نگاہِ بلند اِن مناظر اور تقابل سے پرے ہے، تاہم اُن کی فکر راہبانہ نہیں، وہ محفل ساز بھی ہیں اور محفل کی آواز بھی۔

عطیہ طلباء کے جس جلوس کو لے آئی ہیں، بہ قول ان کے، طلبہ کے لیے بہت سے تفریحی مشاغل اور کلاسیکل موسیقی سے لے کر دوسرے ہلکے پھلکے فنی مظاہرے شامل ہیں۔ اقبالؔ بھی اُن

کی تمام سرگرمیوں میں شامل رہتے ہیں، بلکہ جب یہ سب لوگ یک جا ہوتے ہیں اور محفل بے تکلف ہونے لگتی ہے تو اقبالؔ کی عالمانہ گفتگو اپنا طرز بدل کر ظریفانہ رنگ اختیار کر لیتی ہے، حاضر جوابی اور بزلہ سنجی کا اعلیٰ معیار دیکھنے میں آتا ہے۔

کوئی دو ہفتے یہ ہنگامے رہے اور عطیہ صاحبہ اپنے نورتن کو لے کر واپس ہو گئیں۔

اب پھر اقبالؔ ہیں، ایما ہے اور ہائڈل برگ کی رومان پرور فضا ہے، یقیناً اقبالؔ کے لیے ایما کی رفاقت بہت غنیمت اور راحتِ دل و جاں بن گئی اور اگر ہم تکلف برطرف یہ بات کہیں تو بے جا نہ ہوگا کہ اقبالؔ کی زندگی کا اہم گوشہ جو محروم اور تشنہ چلا آ رہا تھا، وہ اُسے سیراب و آباد کرنے کی سوچنے لگے ہوں گے۔ مغرب کی پری زاد پہلے ہی پر تول رہی تھی۔ مشرق کے درویش کی شخصیت نے بھی اُس کی ذات کو اپنے خیال کی پاکیزہ آغوش میں لے لیا۔

ایما ایک نیک دل اور سچی خاتون ہے، اُس کے رویے نے اقبالؔ کو اس قدر متاثر کیا کہ وہ اُس کو اپنی زندگی کی حقیقی قوت اور جرمنی کو اپنا دوسرا روحانی وطن سمجھنے لگے ہیں لیکن قدرت کچھ اور فیصلہ کر چکی ہے، اُس نے اقبالؔ کو ایما اور جرمنی کے لیے نہیں پوری اُمتِ مسلمہ کے لیے مختص کر دیا ہے۔ ہمیں یہ وجہ تلاش کرنے کی ضرورت نہیں کہ اقبالؔ کے ارادے میں کیا چیز مانع ہوئی؟ کیا اقبالؔ میں قوتِ فیصلہ کی کمی تھی؟ یا دوسری مجبوریاں اُن کی راہ میں حائل تھیں؟ کوئی بھی سبب رہا ہو لیکن ہمارا ایمان اس بات پر ہے کہ یہ اوپر کے فیصلے تھے۔ وہ آفتاب جو مشرق و مغرب کے ذہنوں کی تاریکیاں دور کرنے والا تھا، اُسے جرمنی کے ایک گوشہ میں کیوں کر غروب ہونے دیا جاتا۔ یہ بہت سوچنے اور شدید محسوس کرنے والی بات ہے کہ اقبالؔ نے اپنی ملت کی خاطر کتنی بڑی قربانی دی۔ زندگی کے قیمتی ترین جذبات اپنے اندر ہی تھپک کر سلا دیے۔ یہ نہ سوچا کہ عشقِ مشرق، حسنِ مغرب کی نظر میں بے وفا کہلائے گا۔ اتنا بڑا الزام اپنے سر لے لیا، لیکن اس اقبالؔ کو بچا کر رکھ لیا جس نے آنے والے کل میں لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند، اپنے نفسِ گرم کے ذریعہ مُردہ دلوں کو ولولۂ تازہ دے کر خود کو اُن کی نظروں میں سرخ رو بنا دیا۔ کئی عشروں کے بعد اپنی آرزوئے محروم کے ایصالِ ثواب کی خاطر، ہائڈل برگ میں چھوڑ آنے والی زندہ یادگار کی طرف جو مکتوب لکھا تو سارے فسانے میں وہی ذکر نہ تھا، جو ہونا چاہیے تھا۔ لگتا ہے اقبالؔ ایما سے نظریں

جا رہے ہوں گے۔ بارگاہِ ایزدی میں شکوہ سنج ہونے والا بے باک مردِ قلندر، مغرب کی ایک خاموش طبع اُستانی کے آگے بہت ہی کم زور لہجے میں خیریت کا طالب نظر آیا، لفظ و بیاں کے حاتم کو معذرت خواہی کے لیے دو لفظ بھی نہیں ملے۔ محض رسماً مخاطب ہوتے ہیں۔

"میں ہائڈل برگ کے وہ ایام کبھی فراموش نہیں کرسکوں گا، جب آپ نے مجھے گوئٹے کا "فاؤسٹ" پڑھایا اور دیگر کئی طرح سے میری مدد کی تھی۔ وہ کیا ہی بہجت افزا دن تھے، میں اپنی سی پوری کوشش کروں گا کہ میں ہائڈل برگ آؤں اور آپ سے اُسی مقام پر ملاقات کروں، مجھے اب تک دریائے نیکر یاد ہے، جس کے کنارے پر ہم دونوں ایک ساتھ گھوما کرتے تھے۔"

"ایک ساتھ گھومنے" کے ذکر سے ہمیں اقبالؔ کی نظم، "ایک شام، دریائے نیکر کے کنارے" میں تضاد نظر آتا ہے، جس میں احساسِ تنہائی، یاسیت اور افسردگی کا بھرپور تاثر ملتا ہے، لیکن ذرا غور کرنے پر یہ تضاد بیانی کا گمان ختم ہو جاتا ہے، اس طرح کہ یقیناً اقبالؔ کے یہ احساسات اُس وقت کیا ہوں گے جب ایما کے ساتھ اُن کی قربت و رفاقت اتنی نہیں بڑھی تھی، وہ تنہا نیکر کے کنارے محوِ خرام ہوتے ہوں گے تو شاعر کی طبیعت نے ضرور رنگ دکھایا ہوگا اور احساسِ تنہائی اشعار بن کر ہونٹوں پر آ گیا ہوگا۔ آیے دیکھتے ہیں، اقبالؔ تنہائی کی انگلی تھامے، دریائے نیکر کے کنارے چلتے ہوئے کیا نغمہ سرائی کر رہے ہیں:

خاموش ہے چاندنی قمر کی
شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی
وادی کے نوا فروش خاموش
کہسار کے سبز پوش خاموش
فطرت بے ہوش ہو گئی ہے
آغوش میں شب کی سو گئی ہے

کچھ ایسا سکوت کا فسوں ہے
نیکر کا خرام بھی سکوں ہے
تاروں کا خموش کارواں ہے
یہ قافلہ بے درا رواں ہے
خاموش ہیں کوہ و دشت و دریا
قدرت ہے مراقبے میں گویا
اے دل تو بھی خموش ہو جا
آغوش میں غم کو لے کر سو جا

واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے کہ شاعر کا دل اِس خاموشی اور تنہائی میں کسی ہم دمِ دیرینہ کی خواہش میں دھڑک رہا ہے، اور جب بے قابو ہونے لگتا ہے تو شاعر اُسے بہلانے کی خاطر نہیں بلکہ ہوش دلانے کے لیے کائنات کی طرف متوجہ کراتا ہے اور اپنے گرد و پیش کی ایک ایک چیز کی طرف اشارہ کر کے بتاتا ہے کہ اس وقت اُس کی کیا کیفیت ہے اور آخر میں اُسے تلقین کرتا ہے کہ جب ہر طرف یہ عالم اور کیفیت کا سماں ہے تو تجھے بھی چاہیے کہ اپنے غم اور اپنی تنہائی کو اپنے اندر ہی چھپا کر خود کو نیند کے حوالے کر دے۔ کیوں کہ اِس وقت کربِ تنہائی سے چھٹکارا پانے کا بس یہی ایک محفوظ راستہ ہے۔"

یقیناً یہ ایک دو روز کی بات نہ ہوگی، اِس تکلیف دہ احساس نے پھر اعادہ کیا ہوگا اور اقبالؔ نے پھر دل کو سمجھا بجھا کر اور دریائے نیکر کے منظر سے نکال کر اپنی خواب گاہ تک لے جانے کی کوشش کی ہوگی، لیکن یہ احساسِ تنہائی اتنا دھیما اور کم زور نہیں ہوتا کہ فوراً ہی اُسے تھپک کر سلا دیا جائے۔ شاعر جانے کب تک آتشِ احساسِ تنہائی میں جلتا رہا ہوگا، تب ہی تو یہ کرب و درد الفاظ بن کر شعروں میں ڈھلنے لگے ہوں گے:

تنہائی میں ہے حزیں کیا؟
انجم نہیں تیرے ہم نشیں کیا؟

یہ رفعت آسمان خاموش
خوابیدہ زمیں، جہان خاموش
یہ چاند، یہ دشت و در، یہ کہسار
فطرت ہے تمام نسترن زار
موتی خوش رنگ پیارے پیارے
یعنی آنسوؤں کے تارے
کس شے کی تجھے ہوس ہے اے دل؟
قدرت تری ہم نفس ہے اے دل!

اے دل یہ تنہائی ایسی کیا بڑی اور تکلیف دہ چیز ہے کہ تو غم زدہ اور اُداس ہے۔ اگر کوئی اور نہیں تو کیا یہ آسمان پر اَن گنت ستارے تیرے ہم نشیں نہیں ہیں؟ اور یہ خاموش آسمان کی بلندی، یہ سوئی ہوئی زمین اور خاموشی میں ڈوبا ہوا جہان، کوئی ایک ہو تو کہوں، یہ چاند، یہ دشت و دریا اور کہسار اور چاروں طرف گل و لالہ کے رنگ و بو میں قدرت کا ظہور، اور اِن سب چیزوں کے درمیان میرا یہ گریہ جس کے سبب آنکھوں سے خوش رنگ موتیوں کی طرح ٹپکتا خونِ جگر یا یوں کہو کہ میری آنکھوں سے بہتے آنسو جو دامن میں ستاروں کی طرح ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے ہیں، اِس قدر ہجوم میں بھی تو خود کو تنہا سمجھ رہا ہے؟ سمجھ میں نہیں آتا آخر اِن تمام چیزوں کے ہوتے ہوئے بھی تجھے اور کس چیز کی خواہش ہے؟ پوری قدرت تو تیری ہم نفس و ہم نوا بنی ہوئی ہے۔ (اِس صورت میں تجھے خود کو تنہا نہیں سمجھنا چاہیے)

اور اب دیکھیے انسانی فطرت کیسی تنوع رکھتی ہے، اقبالؔ نے جس شدت سے اپنے احساسِ تنہائی کو شعر میں ڈھالا اور اپنے اِس کرب کا اظہار کیا جس کو یہ ظالم تنہائی، انسان کے دل میں پیدا کرتی ہے، لیکن جب کسی کی رفاقت میسر آ گئی، وصل کا چاند طلوع ہو گیا اور تنہائی کی تاریکی رخصت ہو گئی تو اِسی شدت اور اُمنگ بھرے انداز میں شاعر اس طرح نغمہ سرائی کرنے لگا:

ہے مرے باغِ سخن کے لیے تو بادِ بہار
میرے بے تاب تخیل کو دیا تو نے قرار

جب سے آباد ترا عشق ہوا سینے میں
نئے جوہر ہوئے پیدا مرے آئینے میں
حسن سے عشق کی فطرت کو ہے تحریکِ کمال
تجھ سے سرسبز ہوئے میری اُمیدوں کے نہال
قافلہ ہو گیا آسودۂ منزل میرا

شاعر جشنِ وصال کے موقع پر دل جیسے محوِ رقص ہے اور خوشی میں گا رہا ہے:

جستجو جس گل کی تڑپاتی تھی اے بلبل مجھے
خوبیِ قسمت سے آخر مل گیا وہ گل مجھے

بلاشبہ اقبال کو ایما کی شکل میں آئیڈیل میسر آ گیا۔

مگر آہ!...... ہم اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں بلکہ خود اقبال کو بھی شاید اس بات کا شدید احساس ہے کہ یہ وصل کی گھڑیاں ہجر میں بدلنے والی ہیں، کیوں کہ نوے دن کا یہ عرصہ مکمل ہونے کو ہے، اقبال جرمن زبان سیکھنے آئے تھے، عشق کی زبان بولنے لگے، اور انسانی زبان سکھانے والی اُستانی ایما فرشتوں کی زبان بولنے لگی۔ لیکن لگتا ہے دونوں ہی ''اہلِ زبان'' ہوتے ہوئے بھی ''بے زبان'' بنے رہے۔ یا اگر کچھ گفتگو ہوئی بھی ہو گی تو تا کجا...... کہنے اور سننے کی گھڑیاں مختصر تھیں، بیت گئیں، یہی دیکھ کر اقبال چپ نہ رہ سکے، بول اُٹھے:

''مہینے وصل کے گھڑیوں کی صورت اُڑتے جاتے ہیں۔''

اور ابھی موسمِ خزاں شروع نہیں ہوا کہ دلوں میں پت جھڑ کی رُت دبے پاؤں چلی آئی۔ اکتوبر شروع ہو گیا۔ یہاں قیام کا آخری مہینہ ہے، گویا اکتوبر نے دسمبر کا روپ اختیار کر لیا۔ اقبال ہائڈل برگ سے رخصت ہو گئے۔ ایما کو بھی لگا جیسے اب دریائے نیکر خشک ہو گیا ہے، وہ بھی رخصت لے کر اپنے آبائی علاقے ہائبل برون چلی گئی۔ بعد میں معلوم ہوا، ایک عشرہ تک لوٹ کر نہیں آئی۔

☆☆

اقبال ہائڈل برگ سے میونخ آئے، یہاں انھیں زبانی امتحان کا سامنا کرنا تھا۔ چناں چہ میونخ میں رہ کر اس مرحلے کے لیے تیاری شروع کر دی۔ کیوں کہ بزار مشق کے باوجود اُن کے لیے جرمن زبان ایک نامانوس اور اجنبی زبان تھی، اس لیے خود محسوس ہوا، یا پھر یونی ورسٹی نے مزید انھیں زبان کی کم زوریوں اور نقائص کو دور کرنے کا مشورہ دیا۔ لہٰذا اس کے لیے بذریعہ اشتہار ایک اور ٹیوٹر کا انتظام کیا گیا۔ اتفاق سے یہ ٹیوٹر بھی خاتون ہی ہوئیں۔ بہر حال فرہاد نے پہاڑ کاٹ لیا اور جوئے شیر برآمد کر لی گئی۔ اُدھر اُن پروفیسران نے جنھیں اقبال کا مقالہ مطالعہ کے لیے دیا گیا تھا، اپنی بہت ہی مثبت آرا یونی ورسٹی کو بھجوا دیں۔ پروفیسر ہومل نے لکھا:

> ''پروفیسر اقبال سے براہِ راست گفت و شنید کے بعد، پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ صاحب موصوف عربی اور فارسی زبانوں کے ایک عمدہ دانش ور ہیں۔''

پروفیسر آرنلڈ نے اپنی رائے اس طرح دی:

> ''یہ مقالہ تاریخ فکرِ اسلامی میں ایک بیش بہا اضافے کے مترادف ہے۔''

اب وہ مرحلہ آیا کہ اقبال ایسے سیف زبان کو ایک نئی زبان کے امتحان سے گزرنا تھا۔ ۴ر نومبر ۵ بجے کا وقت تھا کہ وہ یونی ورسٹی کی طرف سے تشکیل کردہ پانچ رکنی بورڈ کے سامنے پیش ہوئے اور بورڈ کے اراکین اور اُن کے سربراہ پروفیسر ہومل کے سوالات کے اُنھی کی زبان میں اس قدر موثر انداز سے جوابات دیے کہ بورڈ کے سب ہی ارکان اقبال کی قابلیت، صلاحیت، علمیت

اور اندازِ گفتگو سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ انھیں اعتراف کرنا پڑا کہ یہ کوئی معمولی طالب علم نہیں بلکہ خود اپنی جگہ علم و فضل کی ایک مکمل درس گاہ ہے، چناں چہ یونی ورسٹی کی طرف سے ڈاکٹریٹ کی جو ڈگری آپ کو جاری کی گئی۔ اس پر نہایت شان دار الفاظ میں یہ نوٹ لکھا۔

"یہ سند نہایت تعریف کے ساتھ معروف عالم، فاضل اور لائق فخر شخص کو جاری کی جاتی ہے۔"

اس طرح اقبالؔ کی محنتِ شاقہ کا ثمر قدرت نے انھیں دے دیا اور اب انھیں لندن واپس ہونا تھا، لیکن اس سے قبل اُن کا ارادہ کوئے دوست کی طرف جانے کا ہوا۔ وہ ہائیڈل جا کر ایما سے ملاقات کرنا چاہتے تھے کہ یہ حسرت دل ہی میں رہ گئی۔ پروفیسر آرنلڈ کا پیغام ملا، "فوراً لندن پہنچیں۔" اس حکم نامہ کی وجہ تھی کہ آرنلڈ صاحب کیمبرج یونی ورسٹی میں بی اے کے طلباء کو عربی خود پڑھاتے تھے، لیکن انھیں باوجود مصر جانا پڑا، اور اپنی جگہ وہ اپنے اس لائق شاگرد کو مقرر کر گئے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اقبالؔ اپنی عالمانہ حیثیت اپنے اساتذہ تک سے منوا چکے تھے۔ آرنلڈ کی طرف سے ہدایت تھی کہ وہ یعنی اقبال ۵ر نومبر کو لندن میں ہوں تا کہ اُسی روز سے تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا جائے۔ ظاہر ہے اقبالؔ نے اپنے شفیق و مہربان اُستاد کے فرمان پر لبیک کہا۔ زبانی امتحان کے مرحلہ سے گزرنے کے بعد اُسی رات کو لندن کے لیے روانہ ہو گئے اور دیارِ دوست جا کر اُس سے الوداعی ملاقات نہ کر سکے۔ البتہ ایک مکتوب لکھا جس میں اتنی باعجلت جانے کی وجہ بتائی۔ لکھتے ہیں:

میرے لیے ۵ر نومبر کو لندن میں ہونا ضروری ہے، (کیونکہ) پروفیسر آرنلڈ (کسی وجہ سے) مصر گئے ہیں، اور (اُن کی جگہ غالباً عارضی طور پر) میں عربی کا پروفیسر مقرر کیا گیا ہوں، میرے ذمہ ہفتے میں دو لیکچر ہیں۔"

اقبالؔ پروفیسر آرنلڈ کی جگہ چھ ماہ کے لیے عربی کے اُستاد مقرر ہوئے۔ چناں چہ میونخ سے لندن پہنچ کر انھوں نے اسی صبح سے یونی ورسٹی میں عربی زبان کی کلاس لینا شروع کر دی۔ یہ لیکچر ہفتے میں صرف دو بار دیے جاتے تھے۔ یہ مصروفیت تو عارضی تھی، اصل توجہ کا مستحق بیرسٹی کا امتحان تھا، لہٰذا زیادہ وقت اُس کی تیاری میں گزارنے لگے۔ یوں بھی اب لندن میں گزشتہ سال کی طرح

یار دوستوں کی محفل وہ نہیں رہی تھی، عطیہ بیگم اور عبدالقادر وطن لوٹ چکے تھے، آرنلڈ صاحب کی صحبت میں کچھ دیر گزار سکتے تھے سو، وہ بھی اُس وقت مصر میں تھے۔ البتہ اب بھی کچھ احباب ایسے ہیں جن کے ساتھ کبھی کبھار محفل جم جاتی ہے۔ اُن میں ایک میاں عبدالعزیز اور دوسرے اُردو کے مشہور مورخ محمود شیرانی ہیں۔ ایک آدھ بار وقت نکال کر کیمرج بھی چلے جاتے ہیں، جہاں سید علی بلگرامی موجود ہیں، اُن سے تبادلۂ خیالات کرتے ہیں۔

☆☆

maablib.org

ڈاکٹر اقبال نے تین ماہ کا عرصہ جو ہائڈل برگ میں گزارا تھا، وہ ناقابلِ فراموش تھا، لہٰذا یکایک اُس انجمن کو چھوڑ کر آنا پڑا تو یقیناً اُنہیں خالی خالی محسوس ہوا ہوگا اور جو وابستگی اور جذباتیت اُنہیں اُن تو ے دنوں میں ہائڈل برگ کی محفلوں سے ہو چکی تھی، جس کی روحِ رواں ایما تھی، تو وہ ایسی نہ تھی کہ فوراً اُن کا رخ کسی اور طرف موڑ دیا جاتا، بلکہ ممکن تھا کہ اقبال وہاں سے واپسی پر دل شکستہ اور دل بستہ ہو جاتے، جس سے اُن کے مقصد کو صدمہ پہنچ سکتا تھا۔ لیکن قدرت نے اِس نقصان سے بچانے کے لیے پہلے ہی اُن کے دل میں ایک خیال پیدا کر دیا تھا۔ جس کو انہوں نے جرمنی سے واپسی کے ایک ماہ پہلے ہی اتفاقی طور پر اپنے ایک مکتوب میں لکھا:

"ہر خوب صورت چیز عارضی ہے، وہ زیادہ دیر نہیں رہتی۔"

دراصل جیسا کہ ہم کئی بار ذکر کر چکے ہیں اقبال اپنے لیے نہیں، ملتِ اسلامیہ کے لیے پیدا کیے گئے تھے۔ شروع سے ہی اُن کے ذہن میں قوم و ملت کی سوچوں نے گھر کر لیا تھا۔ وہ اپنی "قوم" اور "وطن" کے لیے کچھ کرنا چاہتے تھے، بلکہ بہت کچھ کرنے کا عزم رکھتے تھے، لہٰذا اپنی ذات کو بچا بچا کر اُس طرف لیے جا رہے تھے، جہاں وقت اُن کی خدمات کا منتظر تھا۔ چناں چہ اُنہوں نے مقالے کے تمام مراحل سے فارغ ہو کر، جرمنی سے لندن آتے ہی، اپنے ذہن کو اپنے اعلیٰ مقصد کی طرف مبذول کر دیا۔ اِس کے لیے اُنہیں کئی فورم ایسے میسر آ گئے جہاں وہ اپنے اِن خیالات کا اظہار کر سکیں جو مغرب میں رہ کر اُن کے ذہن میں موجودہ عالمی سیاسی نیرنگیاں اور خصوصاً عالمِ اسلام کے دگرگوں اور مخدوش حالات سے متعلق پیدا ہو رہے تھے۔ چناں چہ لندن

میں مسلم طلباء کی سرگرمیوں نے انہیں اپنی جانب متوجہ کیا اور وہ اُن کے کام میں دلچسپی لینے لگے۔ یہ پین اسلامک سوسائٹی اُس دیارِ غیر میں اُن کے لیے غنیمت تھی۔ اس انجمن کے سیکریٹری حافظ محمود شیرانی تھے جو اقبال کے قریبی دوست بن چکے تھے، اُنہی کے توسط سے انہوں نے انجمن کی کئی تقریبات میں شرکت کی اور اظہارِ خیال کیا۔ خصوصاً انجمن کا ایک اجلاس کیسٹن ہال لندن میں ہوا۔ جس میں پہلے مذاکرے کا موضوع تھا، ''مذہب اسلام کے بعض پہلو'' اقبال نے اس عنوان کے تحت کاغذوں پر نہیں لکھا، بلکہ فی البدیہہ ایسا زوردار خطاب کیا کہ سامعین کو مسحور کر کے رکھ دیا۔ اس انجمن کا تعارف یہ ہے کہ مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کے مقابل چونکہ کم ہے، لہٰذا اس طرح وہ ایک مجبور اقلیت بن کر رہ جائیں گے اور جیسا کہ آگے چل کر اس سازشی ٹولے (کانگریس) نے کیا۔ یہ ایک تفصیل طلب حقیقت ہے جو یہاں بیان کرنا مناسب نہیں۔

لندن میں دو ہندوستانی مسلمان ڈاکٹر عبداللہ مامون سہروردی اور مشیر حسین قدوائی نے ایک سوسائٹی پین اسلامک نام سے قائم رکھی تھی، جس کا مقصد یورپی قوموں کی اسلام کے خلاف سازشوں اور ان کی ریشہ دوانیوں کو بے نقاب کرنا اور اس کے خلاف احتجاج کرنا تھا۔ اقبال پہلے ہی اسلام کے بارے میں حساس تھے اور اتحاد عالم اسلامی کا جذبہ اپنے دل میں رکھتے تھے، بصد شوق اس سوسائٹی کے رکن بن گئے۔ دراصل یورپی اقوام جو مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے اور ان کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے میں سرگرم تھیں، پین اسلامک سوسائٹی کیونکہ ان کی مکروہ کوششوں کے پردے چاک کرتی رہتی تھی سو انہوں نے سوسائٹی کے خلاف غلط پروپیگنڈا پھیلا رکھا تھا۔ چنانچہ اقبال جب رکن بنے تو ان پر بھی تنقید کی گئی، لیکن انہوں نے بابانگ دہل اظہار کیا......

''مجھ کو پین اسلامسٹ کہا جاتا ہے، جس سے مجھے انکار نہیں، مجھے یقین ہے کہ میری قوم شاندار مستقبل رکھتی ہے، جو مشن اسلام کا ہے وہ پورا ہو کر رہے گا اور اسلامی روح آخر غالب آ کر رہے گی''۔

اقبال کے یہ جذبات دورانِ تعلیم کے ہیں، ابھی وہ یہاں سے فارغ التحصیل نہیں ہوئے ہیں کہ انہوں نے قوم کے مستقبل کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔

اُدھر آل انڈیا مسلم لیگ جو ۱۹۰۶ء میں قائم ہو چکی تھی او ندوستان میں اس نے مسلمانوں

--- جاری ہے

کی نمائندہ جماعت کے طور پر اپنا سیاسی کردار ادا کرنا شروع کر دیا تھا یہاں لندن میں بھی اس کی شاخ قائم ہو چکی تھی اقبال نے اسے بھی نظر انداز نہیں کیا اور اس کی رکنیت حاصل کرنے میں دیر نہیں کی۔ اس کی چودہ رکنی کمیٹی میں شامل ہو گئے۔ اس سے ان کے سیاسی عزائم کی نشاندہی ہوتی ہے جو وہ مستقبل کے لیے اپنے ذہن میں رکھتے تھے۔ یاد رہے یہ وہ زمانہ تھا کہ جناح صاحب سمیت بڑے بڑے مسلم رہنما آل انڈیا کانگریس میں شامل تھے۔ ہم چاہیں گے کہ اس جگہ کانگریس اور مسلم لیگ کا ہلکا سا پس منظر بیان کر دیا جائے۔ اس کے لیے ہمیں کچھ پیچھے جانا پڑے گا۔ ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں نے ہندوستان میں اپنے رہے سہے اقتدار کو بچانے کی آخری کوشش کی جسے ہم جنگ آزادی اور غاصب انگریز اسے "غدر" کہتے ہیں۔ لیکن مسلمان باوجود کہ یہ جنگ ہار گئے اور اس طرح پورے ہندوستان پر سات سمندر پار سے آنے والی گوری قوم کا تسلط قائم ہو گیا۔ جس کے نتیجے میں ان قذاقوں نے آزادی کی جدوجہد کرنے والوں کو باغی قرار دے کر جی بھر کے تہہ تیغ کیا، جنگ آزادی میں مسلمانوں کے ساتھ کچھ تعداد میں ہندو بھی شریک تھے، لیکن انگریزوں کا اصل نشانہ مسلمان تھے، ان کی گولیوں نے جوانوں، بوڑھوں حتیٰ کہ بچوں اور عورتوں میں بھی تمیز نہیں کی اور لاکھوں افراد موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ دراصل انگریز نے اقتدار مسلمانوں سے چھینا تھا اس لیے وہ اپنا اصل دشمن مسلمانوں ہی کو سمجھتے تھے۔

ہندو مصلحت کوش تھا، یہ سوچ کر کہ وہ پہلے مسلمانوں کے زیر تسلط تھے، اب انگریز کے ہیں تو کیا حرج ہے، انہوں نے انگریز سے ہاتھ ملا کر انہیں آقا تسلیم کر لیا اور مسلمانوں نے ایک پل کے لیے بھی دل سے فرنگی راج کو قبول نہیں کیا۔ لیکن کیونکہ وہ اپنی طاقت کھو چکے تھے لہٰذا بامر مجبوری انہیں خاموش رہنا پڑا۔ اس میں ایک شخصیت سید احمد نے جو بعد میں اپنی مصلحانہ کوششوں کے صلہ میں سر کے خطاب سے نوازے گئے، مسلمانوں کو وقت کے ساتھ چلنے اور نئے حکمرانوں سے مفاہمت پیدا کرنے کا درس دیا اور یوں اب مسلمانوں کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ بھی نہیں تھا، تاہم انگریز چیل کی آنکھ رکھتا ہے، اپنی اس کالونی ہندوستان کے حالات اور خصوصاً مسلمانوں کے مزاج کو دور بین سے دیکھتا رہا اس نے ہندوستانی عوام کو مقامی حکومت سازی میں شامل کرنے کے لیے اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ ایک سیاسی جماعت آل انڈیا نیشنل کانگریس کو جنم دیا۔ جس میں ہندو

مسلم ذہنوں کو ایک قوم کے طور پر رکھا گیا۔ گویا یہ مسلمانوں کے وجود کو ختم کرنے کی ایک انتہائی بھیانک اور خطرناک سازش تھی کہ ہندوستان میں رہنے والوں کو ہندوستانی، یعنی ایک قوم قرار دے دیا جائے۔ انگلستان میں رہتے ہوئے اقبالؔ خطوط کے ذریعہ ہندوستان میں اپنے احباب کے ساتھ رابطہ رکھے ہوئے تھے۔ لیکچروں کا سلسلہ شروع کیا تو اِس کا تذکرہ خواجہ حسن نظامی کے نام ایک مکتوب میں کیا جس سے اُن کے اِس رجحان کا پتا چلتا ہے کہ اُنہوں نے تعلیماتِ اسلامی میں در آنے والی "بدعات" اور اسلام کے حوالے سے مختلف عنوان پر تیزی سے سوچنا شروع کر دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> "انگلستان میں، میں نے اسلامی تہذیب و تمدن پر لیکچروں کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے۔ ایک لیکچر ہو چکا ہے، دوسرا اسلامی تصوف پر فروری کے تیسرے ہفتے میں ہوگا۔"

اس کے علاوہ کچھ اور لیکچروں کا بھی تذکرہ کیا جو ابھی دینے تھے، ایک "مسلمانوں کا اثر تہذیبِ یورپ پر۔" دوسرا، "اسلامی جمہوریت" اور تیسرا، "اسلام اور عقلِ انسانی۔"

انہی افکار میں مصروفیت کے سبب اقبالؔ شاعری کو زیادہ وقت نہ دے سکے، بلکہ ایک وقت تو ایسا بھی آیا کہ شاعری کو بالکل ہی ترک کر دینے کا ارادہ کر لیا، لیکن کئی احباب نے جس میں خصوصی طور پر پروفیسر آرنلڈ اور شیخ عبدالقادر شامل ہیں، آپ سے بہ زور احتجاج کیا کہ وہ اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کریں اور تب آپ اپنا ارادہ بدلنے پر مجبور ہو گئے۔

ہم دیکھ رہے ہیں کہ اقبالؔ ایک طرف تعلیم کے میدان میں فتح مندی کے پرچم اُٹھائے آگے بڑھتے جا رہے ہیں، دوسری جانب اسلامی موضوعات پر اپنے فکر انگیز لیکچروں کی وجہ سے ایک بڑے اسلامی اسکالر کے طور پر نمایاں ہونے لگے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ عالمی اُفق پر بدلتے ہوئے سیاسی مناظر پر بھی آپ کی نظر ہے، خصوصاً ہندوستان میں، ہندو مسلم کی سیاسی جماعت آل انڈیا نیشنل کانگریس کی مسلم گریزی اور ہندو نوازی کو دیکھ کر ڈاکٹر اقبالؔ کے اندر ہندو مسلم اتحاد کا نظریہ تغیر پذیر ہونے لگا۔ لہٰذا یہ اطلاع پا کر کہ مسلم راہ نماؤں نے کانگریس سے مایوس ہو کر دسمبر ۱۹۰۶ء میں اپنے لیے ایک الگ سیاسی جماعت مسلم لیگ کی بنیاد رکھی ہے، برطانیہ میں

مقیم سب ہی ہندی مسلمانوں کے لیے ایک خوش آئند بات تھی، انھیں محسوس ہوا کہ اِس طرح مسلمان بہرحال ہندوستان میں اپنی ایک الگ شناخت کرا سکیں گے، ورنہ کانگریس میں موجود متعصب ہندو لیڈروں نے تو بحیثیت قوم مسلمانوں کے وجود ہی کو ختم کرنے کا ناپاک منصوبہ بنالیا تھا۔ چناں چہ لندن میں بھی جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے مسلم لیگ کی شاخ قائم کرنے کی کوششیں ہونے لگیں۔ لیکن یہاں اُس کا نام "برٹش کمیٹی" تجویز ہوا۔ کمیٹی کا افتتاحی اجلاس مئی ۱۹۰۸ء کو لندن کے کیکسن ہال میں زیرِ صدارت مشہور مورخ سید امیر علی منعقد ہوا۔ لندن میں مقیم مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔ اجلاس کے صدر نشیں کو ہی کمیٹی کا صدر منتخب کیا گیا اور ڈاکٹر اقبال مجلسِ عاملہ کے رکن منتخب ہوئے، اور کمیٹی کے قواعد وضوابط مرتب کرنے کے لیے جو سب کمیٹی بنائی گئی، اُس کے بھی رکن نامزد کیے گئے۔

ان مصروفیات سے واضح ہوتا ہے کہ اقبال مسلم امہ کو بیدار کرنے کا عزم کر چکے تھے، اس کا اندازہ اس نظم سے ہوتا ہے جو انہوں نے لندن میں رہتے ہوئے اپنے دیرینہ دوست شیخ عبدالقادر کے نام لکھی:

(چیدہ اشعار)

اٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افقِ خاور پہ
بزم میں شعلہ نوائی سے اجالا کردیں
اہلِ محفل کو دکھادیں اثرِ صیقلِ عشق
سنگِ امروز کو آئینۂ فردا کردیں
جلوۂ یوسفِ گم گشتہ دکھا کر ان کو
تپش آمادہ تر از خونِ زلیخا کردیں
اس چمن کو سبق آئینِ نمو کا دے کر
قطرۂ شبنمِ بے مایہ کو دریا کردیں
دیکھ یثرب میں ہوا ناقۂ لیلیٰ بے کار
قیس کو آرزوئے نو سے شناسا کردیں

گرم رکھتا تھا ہمیں سردیٔ مغرب میں جو داغ
چیر کر سینہ اسے وقفِ تماشا کر دیں

اِن تمام سرگرمیوں میں حصہ لینے کے باوجود آپ نے اپنے تعلیمی مقاصد سے توجہ نہیں ہٹنے دی، دراصل وہ شروع سے ہی حصولِ تعلیم کے معاملے میں بہت زیادہ حساس اور ذمے دار واقع ہوئے تھے، چناں چہ اُنہوں نے بار ایٹ لاء کے لیے نہایت پابندی اور انہماک کے ساتھ تیاری شروع کر دی۔ پھر وہ گھڑی آ گئی، یعنی اِسی سال، جس میں ہونے والی سرگرمیوں کی جھلکیاں ابھی ہم نے دیکھیں، مئی میں امتحان کی تاریخ کا اعلان کر دیا گیا۔ ڈاکٹر اقبالؔ نے پورے اعتماد کے ساتھ اُس میں شرکت کی اور نتیجہ کا انتظار کرنے لگے۔

اس دوران میں وہ ایما ویگے ناست سے خط و کتابت کے ذریعہ رابطہ میں رہے۔

جون کے شروع میں اُنہیں علم ہوا کہ عطیہ فیضی کی ایک بہن دیگر عزیزوں کے ساتھ لندن پہنچی ہیں تو عطیہ بیگم سے دوستانہ رسم کی بنیاد پر اُن کی ہمشیرہ سے ملنے اُن کی قیام گاہ پر تشریف لے گئے اور اُن سے رسمی گفتگو کی، یقیناً اِس دوران عطیہ صاحبہ کی خیر خیریت ضرور دریافت کی ہوگی، آپ کو بار ایٹ لاء کی سند تفویض کر دی گئی اور اس کے فوراً ہی بعد آپ نے وطن واپسی کے لیے رختِ سفر باندھ لیا۔ ارادہ تھا کہ واپسی سے پہلے آپ ایما سے ملاقات کرنے اُس کے ٹاؤن ہائیل برون جائیں گے، لیکن کچھ نہیں کہہ سکتے کہ یہ اچھا ہوا کہ برا ہوا۔ مگر لگتا یوں ہے کہ یہ اتفاقات قدرت کی طرف سے تھے اور کچھ اقبالؔ بھی اِس لنک کو باقی رکھنا چاہتے تھے۔ کیوں کہ اُن کے نزدیک شکستہ آئینہ ہی نگاہِ آئینہ ساز میں عزیز تر ہے۔ یہی نکتہ آپ کی ایک غزل میں بڑی شان سے نمایاں نظر آتا ہے:

نہ بچا بچا کے تو رکھ اِسے، ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

امتحان کے دو ماہ بعد جولائی میں بیرسٹری کا نتیجہ آ گیا۔ ڈاکٹر صاحب کامیاب قرار دیے گئے۔

یورپ میں ڈاکٹر اقبالؔ کا تعلیمی دورانیہ تین سالوں پر مشتمل ہے جو مجموعی طور پر بے حد کامیاب رہا۔ لیکن اس سے بھی کہیں زیادہ یہ کہ یہاں رہ کر آپ نے اپنے فکری سفر کو مہمیز لگائے

رکھا۔ اعلیٰ تعلیم کے حصول کی تکمیل کے ساتھ ساتھ اس سے بھی کہیں اعلیٰ وہ نصب العین تھا جس کی اپنے ذہن میں نقشہ سازی کرتے رہے۔ کثیر المطالعہ اور گہرے مشاہدے کے ذریعے آپ کی فکر رسا بہت سے معنی خیز اور بہتر نتائج کو شعور میں مرتب کرتی رہی۔ اس تین سالہ ذہنی سفر اور فکر و شعور کی نتیجہ خیز پرواز کی روداد جس نے آپ کے اندر ایک انقلابی تغیر پیدا کیا، آپ آگے چل کر ۱۹۲۱ء میں خود اس طرح بیان کرتے ہیں۔

''اس زمانے میں سب سے بڑا دشمن اسلام، اسلامیوں کا نسلی امتیاز اور ملکی قومیت کا خیال ہے، پندرہ برس ہوئے جب پہلے پہل میں نے اس کا احساس کیا، اس وقت میں یورپ میں تھا، اور اس احساس نے میرے خیالات میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یورپ کی آب وہوا نے مجھے مسلمان بنا دیا۔''

یہی احساس ہے جس کا اظہار اس شعر میں نظر آتا ہے:

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی

رسالہ ''نقیب'' کے مدیر وحید احمد کے نام اسی مکتوب میں ڈاکٹر صاحب مزید لکھتے ہیں:

''کبھی فرصت ہوئی تو اپنے قلب کی تمام سرگزشت قلم بند کروں گا جس سے مجھے یقین ہے، بہت لوگوں کو فائدہ ہوگا، اس دن سے، جب یہ احساس مجھے ہوا، آج تک برابر اپنی تحریروں میں یہی خیال میرا مطمحِ نظر رہا ہے، معلوم نہیں میری تحریروں نے اور لوگوں پر اثر کیا یا نہیں، لیکن ایک بات یقینی ہے کہ اس خیال نے میری زندگی پر حیرت انگیز اثر کیا ہے''۔

☆

قارئین کرام کو اس وقت نہایت سنجیدگی سے سوچنے اور غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اقبال بھرپور جوان ہیں، پُرکشش اور خوبصورت شخصیت کے حامل ہیں، یورپ کے صنم کدے میں روز و شب گزار رہے ہیں، ہر ایک بزم میں مرکز نگاہ بنے ہوئے ہیں، لیکن یہ مرد درویش یا تو اپنی تعلیم طرف توجہ مبذول کیے ہوئے ہے یا پھر اپنی ذات سے نکل کر عصر حاضر کے تناظر میں اپنی ملت بارے میں فکرمند نظر آتے ہیں۔ مسلسل سوچتے رہتے ہیں کہ اس مرد بیمار کا کیا علاج ممکن ہے؟

کیا یہ کوئی معمولی بات ہے؟ کیا یہ کسی عام شخص کا قصہ ہے جو اس وقت ہم دہرا رہے ہیں؟ یہ شخصیت جو اس پس منظر سے نکل کر آہستہ آہستہ پیش منظر کا حصہ بن رہی ہے وہ اس حقیقت کی واضح تصویر ہے کہ یہ فقیر روزگار اپنے کردار میں، گفتار میں اللہ کی برہان بننے جا رہا ہے۔ یہ بجا طور پر اس بات کا حق دار ہے کہ اپنی ہی ہم سفر صدی میں خود اس کا وجدان اس سے کہلوا کر رہے گا کہ میرے بعد...... ''دگر دانائے راز آید کہ نا آید۔''

سوچنا چاہیے کہ انگلستان جیسی رنگین اور جگمگاتی نمائش میں آ کر بھی اقبال پر ان کا رنگ نہیں چڑھتا، بلکہ وہ اس کے کچے رنگ و روغن کی نشاندہی کر کے گویا اس کی قلعی کھول رہے تھے، تو کیا وجہ تھی کہ اقبال کی جوانی نہ لندن کے صنم سے متاثر ہوئی، نہ ان کی سوچ نے دانش فرنگ سے اثر قبول کیا اور نہ ہی وہ مغرب کی نام نہاد ترقی سے مرعوب ہوئے تو اس کی بنیادی وجہ تو یہی تھی کہ اقبال کی فکر کلیتاً اسلام کے رنگ میں رنگی ہوئی تھی، اس کی روشنی میں جب آپ نے حقیقت کی نظر سے ادیان عالم اور ترقی یافتہ اقوام عالم کی تہذیب و تمدن کا جائزہ لیا تو آفتاب اسلام اور اس کی تابندہ تہذیب کے مقابل وہ سب بے حقیقت، ہیچ اور ٹمٹماتے دیوں کی صورت نظر آئیں۔ یہی دیکھ کر اقبال کے اندر کی دنیا میں ہلچل مچ گئیں۔ طبیعت میں ایک عجیب اضطراب پیدا ہونے لگا۔ جو نتائج آپ نے روز و شب کی فکر اور غور کے بعد حاصل کیے تھے، ان کے اظہار کے لیے آپ بے تاب ہو گئے۔ غیروں کے سامنے اس لیے کہ وہ اس خوش فہمی اور خوف فریبی سے باہر آئیں کہ وہ ایک ترقی یافتہ تہذیب و معاشرے کے حامل ہیں جب کہ اسلام ایک قدامت پسند مذہب ہے۔ ڈاکٹر اقبال نے اپنے لیکچر کے ذریعہ ان کی فہمائش کی کہ وہ اسلام کی اعلیٰ قدروں کو انصاف اور غیر متعصبانہ نظروں سے دیکھیں اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اپنی سوچ اور رویے میں تبدیلی لائیں، مسلمانوں کو ہیچ اور غیر مہذب سمجھنا چھوڑ دیں۔ یہ وہ قوم ہے کہ جس کے چراغوں سے ہی تم نے اپنے دیئے روشن کیے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر اپنوں کے سامنے بھی یہ بات رکھنا چاہتے تھے کہ وہ اپنی عظمت رفتہ کو بھول کر چکا چوند کرنے والی تہذیب جدید سے مرعوب نہ ہوں، ان کی جدیدیت کے سحر سے نکل آئیں اور اس حقیقت کو پیش نظر رکھیں کہ جو قومیں اپنی تاریخ کو فراموش کر دیتی ہیں وہ اپنی شناخت بھی ختم کر دیتی ہیں، ہم نے بھی اپنے تابناک ماضی کو بھلا کر اور اپنی

دینی اور نظریاتی اقدار سے روگردانی کر کے ذلت کو گلے لگالیا ہے، اور سب سے بڑی ذلت غلامی ہے جس کا ہمارے گلے میں پڑا ہوا طوق ہمارے ہماری اپنی اپنی کوتاہیوں اور بداعمالیوں کا نتیجہ ہے۔

اقبال کے افکار سے مغرب کی پیشانی شکن آلود ہوتی ہوگی جب انہوں نے انہیں کے گھر میں بیٹھ کر ان کے چہرے کے داغ دھبے انہیں دکھائے تھے، اس جگہ ہم چاہیں گے کہ ڈاکٹر اقبال کی شاعری کے حوالے سے وہ نشاندہی پیش کر دی جائے کہ کس طرح آپ نے انہیں آئینہ دکھایا ہے کہ جس تہذیب کی ایک دنیا، خصوصاً اہلِ مشرق دیوانہ نظر آتی ہے۔ اقبال نے جب باریک بینی سے اس کا مشاہدہ کیا تو یہ حقیقت ان پر کھل گئی کہ تہذیب فرنگ محض ایک سراب ہے، اس کی بنیاد ہی کمزور اور کھوکھلی ہے۔ یہ ایک ایسے رنگیں پیکر کی مانند ہے جو اندر سے تاریک اور روح سے خالی ہے۔ یہ ایک ایسا رنگین خواب ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں، یا ایک ایسا خوب صورت مجسمہ ہے جو اشتہار کی صورت سجا دیا گیا ہے۔

اس حقیقت سے آگاہی کے بعد اقبال کو اقوام مشرق خصوصاً ملت اسلامیہ پر سخت افسوس ہونے لگا کہ وہ ایک شاندار اعلیٰ تہذیبی روایت کی وارث ہوتے ہوئے بھی مغرب کی مصنوعی جدیدیت سے مرعوب اور احساس کمتری کا شکار نظر آتی ہے۔ آپ نے ایک باوقار فرد کی حیثیت سے اہل مغرب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان کی تہذیب اور تمدن پر بے لاگ تبصرے کیے:

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا، عام دیدار یار ہوگا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا
گزر گیا اب وہ دور ساقی کہ چھپ کے پیتے تھے پینے والے
بنے گا سارا جہان میخانہ، ہر کوئی بادہ خوار ہوگا

اقبال کی یہ پیش گوئی نہیں تھی بلکہ جو کچھ آپ تہذیب عالم میں جدیدیت کے نام پر آبرو باختہ انقلاب دیکھ رہے تھے اس مشاہدے کی روشنی میں آپ کی بصیرت اندازہ لگا چکی تھی کہ یہ جنون آگے چل کر کیا رنگ دکھائے گا۔

اقبال کو اچھی طرح احساس ہے کہ ان کی اس بے باک و بے لاگ تنقید سے بہت سے لوگ چیں بجبیں ہوں گے اور مجھے دیوانہ اور جانے کیا کیا کہا جائے گا۔ کیونکہ اس ترقی اور جدیدیت کے

سیلاب میں بہنے والوں کو میری آواز گریزاں پسند نہیں آئے گی:

کیا مرا تذکرہ جو ساقی نے بادہ خواروں کا انجمن میں
تو پیر میخانہ سن کے کہنے لگا کہ منہ پھٹ ہے خوار ہوگا

تاہم ایک طرف وہ مغرب کی تہذیب نو اور جدت میں ڈھلتے ہوئے تمدن پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر رہے ہیں، دوسری طرف انہیں یہ امید افزا احساس ہے کہ مغرب اپنی کتنی ہی عیارانہ اور اسلام دشمن چالیں چل کر دیکھ لے، مسلمان کی غیرت بہر حال جاگے گی، اسے اپنی پستی کا احساس ہوگا، وہ دوست اور دشمن کو پہچانے گا اور برسوں کی غفلت بھری نیند سے بیدار ہوگا:

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو اُلٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

اور اب یہ مردِ مومن مغرب میں بیٹھ کر مغرب کے ناخداؤں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتا ہے کہ جس تہذیب اور ترقی پر تمہیں ناز ہے جو دراصل محض متاعِ غرور اور کمزور بنیادوں پر تعمیر کردہ ہے۔ صرف ایک ایسے جسم کی مانند ہے جس میں روح نکل چکی ہو۔ فرماتے ہیں:

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

اس کے ساتھ ہی آپ نے اپنی تاریخ اور اسلامی تعلیم اور اقدار کو اپنے لیکچرز کے ذریعہ نہایت موثر طریقہ پر ان کے سامنے رکھا اور یہ حسن اتفاق ہے کہ ان خیالات و نظریات کے اظہار کے لیے آپ کو پین سلامک سوسائٹی کا فورم میسر آ گیا تھا۔

اساسِ ایمانی:

اس جگہ ضروری ہے کہ ہم اقبال کے اس رخِ حیات کو ایک بار پھر غور و فکر کی نظر سے دیکھنے کی کوشش کریں۔ تو جیسا ہم شروع سے کہتے آئے ہیں کہ اقبال کی رگ و پے میں روحِ قرآنی سرایت کیے ہوئے ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں جس گھریلو ماحول میں آپ نے آنکھ کھولی تھی وہاں دین و

ایمان کا چرچا تھا، تعلیم قرآن اور تفہیم دین کی فضا تھی، والد ناخواندہ ہوتے ہوئے بھی دینی شعور رکھتے تھے۔ سید میر حسن جیسے پیکر علم وعمل استاد و مربی تھے، ان کی صحبت سرپرستی میں عربی و فارسی زبانوں سے آگاہی کے ساتھ ساتھ شعر فہمی وشعر گوئی کا ذوق بھی میسر آیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پندرہ سال کی عمر میں ہی اقبال کے اندر مومن کے اوصاف نمایاں ہونے لگے تھے۔ پھر کالج کی زندگی میں مطالعہ وسیع تر ہوا اور فکر کی پرواز نے زور بھرا تو دل و دماغ میں مردِ مومن کی دھنک پھوٹ نکلی جس کے رنگ ان کی نثر و نظم میں واضح نظر آنے لگے اور دیکھنے والوں کی توجہ کا مرکز بننا شروع ہو گئے اور اب اعلیٰ تعلیم کے لیے دیارِ مغرب میں آنے والے اقبال کی شخصیت میں اس اعتبار سے چار چاند لگ گئے ہیں کہ آپ اس تہذیب کا بچشم خود اور قریب سے مشاہدہ کر چکے ہیں۔

مراجعت:

اقبال جو تین سال قبل ہندوستان کی ماسٹر ڈگری لیے انگلستان آئے تھے، اور اب واپس ہوئے ہیں تو بیرسٹری اور ڈاکٹریٹ کی اسناد آپ کی تعلیم کا حصہ بننے پر فخر کر رہی ہیں۔ بلکہ ابھی آپ نے انگلستان سے کوچ نہیں کیا کہ آپ کا پی ایچ ڈی کا مقالہ "ایران میں مابعد الطبیعات کا ارتقاء" (THE DEVELOP OF METHAPHYSICS BIN PERSIA) لندن کے ایک اشاعتی ادارے لوزاک کمپنی نے کتابی صورت میں شائع کر دیا۔ ڈاکٹر اقبال کی یہ دوسری کتاب ہے جو انگریزی زبان میں شائع ہوئی۔

۳ر جولائی ۱۹۰۸ء کی تاریخ ہے کہ ڈاکٹر بیرسٹر اقبال کا قافلہ انگلستان سے ہندوستان کی طرف جادہ پیما ہوتا ہے، اس وقت آپ کے احساسات کیا ہیں؟ دل و دماغ کیا سوچ رہے ہیں؟ ہم اُن کا سراغ لگانے کی بجائے اگر نظر انداز کرنا چاہیں، تب بھی اُن جذبات کو صرفِ نظر نہیں کر سکتے جو اُس وقت اُن کے دل میں موجزن ہوں گے۔ خصوصاً جب اُن کا جہاز سطحِ سمندر پر سفر کرتا ہوا المانیہ کے جزیرے سلی کی ساحل کو چھوتا ہوا گزرنے لگا تو تاریخ مسلم کے اوراق گم شدہ آنسو بن کر آنکھوں میں جھلک اُٹھے۔ اُس وقت موجودہ جزیرہ سلی (صقلیہ) سرزمین ارضی کے طور پر نہیں بلکہ "تہذیب حجاز کے مزار" کی شکل میں اُن کے سامنے آ کر دل کو تڑپانے لگا۔ وہ جذبات

پر قابو نہ رکھ سکے، آنکھیں بھر آئیں اور اُن کے اندر بیٹھا ہوا شاعرِ اسلام اپنی عظمتِ رفتہ پر منظوم نوحہ گری کرنے لگا۔

گریہ عظمت رفتہ:

رو لے اب دل کھول کر اے دیدۂ خوں نابہ بار
وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار

تھا یہاں ہنگامہ اُن صحرا نشینوں کا کبھی
بحرِ بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی

زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے
بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے

اک جہانِ تازہ کا پیغام تھا جن کا ظہور
کھا گئی عصرِ کہن کو جن کی تیغِ ناصبور

مُردہ عالم زندہ جن کی شورشِ قُم سے ہوا
آدمی آزاد زنجیرِ توہّم سے ہوا

غلغلوں سے جس کے لذت گیر اب تک گوش ہے
کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہے

نظم کے ایک ایک لفظ سے اقبالؔ کے دردمند دل کی آہ وزاری کا پتا چل رہا ہے کہ وہ ملتِ اسلامیہ کے شہریاروں کی تعریف میں دل نکال کر رکھے دے رہے ہیں۔ کہتے ہیں۔

''جنہوں نے ایک عالم کو اپنی حوصلہ مندیوں اور اللہ کی نصرت و مدد سے فتح کیا۔''

اس وقت اقبالؔ کے پیشِ نظر سلی کی بندرگاہ ہے جو مسلمانوں کی فتوحاتِ عالم میں سے ایک

نشان یادگار ہے۔ جس پر آج غیروں کا قبضہ ہے تو اُن کا دل خون ہو کر رہ گیا ہے۔ اُندلس جس پر مسلمانوں نے کئی صدیاں حکومت کی، آج وہاں اُن کا نام نہیں۔ البتہ نشان موجود ہے، اقبالؔ کہتے ہیں، یہ صقلیہ کا جزیرہ جو آج غیروں کے قبضے میں ہے، کل اُن توحید پرستوں کے زیرِ تسلط تھا جن کی تکبیروں سے بڑے بڑے صاحبانِ تخت و تاج کے دربار لرز کر رہ جاتے تھے، جن کی تلواریں ظلم و باطل کے خلاف بجلیوں کی سی تیزی اور چمک رکھتی تھیں۔ یہ وہ اہلِ حق تھے کہ جس طرف نکل جاتے، پیغامِ الٰہی سے مردہ دلوں کو زندہ کر دیا کرتے تھے اور جن کی تڑپتی ہوئی شمشیروں نے دنیا کے پرانے فرسودہ اور ظلم و جبر کے نظام کو تل پٹ کر کے رکھ دیا تھا۔ یہ جہان ایک مردہ لاش کی مانند تھا کہ اُن کے ایک نعرۂ قُم (اُٹھ) سے جی اُٹھا، آج بھی اُن کی فاتحانہ نعرہ زنی کانوں کو لذت بخش رہی ہے، یعنی اُن کے کارنامے سن سن کر دلوں میں ایک خوش کن جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ لیکن یہ تو گزشتہ کی باتیں ہیں، آج وہ ولولہ انگیز سرگرمیاں کہاں گئیں؟ کیا وہ اللہ اکبر کی صدائیں ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی ہیں؟

اقبالؔ اب براہِ راست جزیرہ سسلی سے تخاطب کرتے ہوئے اظہارِ تاسف کرتے ہیں:

آہ! اے سسلی سمندر کی ہے تجھ سے آبرو
رہنما کی طرح اِس پانی کے صحرا میں ہے تو

زیب تیرے خال سے رخسارِ دریا کو رہے
تیری شمعوں سے تسلی بحر پیما کو رہے

"تو سمندر کی آبرو ہے، اس لیے کہ تیرا وجود پانی کے صحرا میں ایک راہ نمائی کی طرح ہے۔ تو دریا کے رخسار پر تل بن کر اُسے رونق بخشے ہوئے ہے، تیرے ٹاور کی روشنی بحر پیمائی کرنے والوں کو دور ہی سے تسلی بخش دیتی ہے کہ ساحل قریب ہے (جزیرہ میں بنے ہوئے ٹاور کی روشنی کی طرف اشارہ ہے جو لائٹ ہاؤس کہلاتا ہے) ڈاکٹر اقبالؔ اپنے مقصد سے نہیں ہٹتے، یہاں اُن کا موضوع محض جزیرہ کی تعریف کرنا نہیں، بلکہ یہ تو ایک حوالہ ہے اپنے شاندار ماضی کا، اس لیے فوراً ہی اصل مقصد پر آتے ہوئے کہتے ہیں:

تو کبھی اِس قوم کی تہذیب کا گہوارہ تھا
حسنِ عالم سوز جس کا آتشِ نظارہ تھا

اب اقبالؔ کا طائرِ فکر پرواز کرتا ہوا بغداد اور دلی کی طرف نکل جاتا ہے، کہتے ہیں:

نالہ کش شیراز کا بلبل ہوا بغداد پر
داغ رویا خون کے آنسو جہان آباد پر
آسماں نے دولتِ غرناطہ جب برباد کی
ابنِ بدروں کے دلِ ناشاد نے فریاد کی
غم نصیب اقبالؔ کو بخشا گیا ماتم ترا
چن لیا تقدیر نے وہ دل کہ تھا محرم ترا

جس طرح بلبلِ شیراز سعدی نے سقوطِ بغداد پر آہ وزاری کی، اور داغ نے دلی کی تباہی پر خون کے آنسو بہائے اور جب غرناطہ (اندلس) میں مسلمانوں کی صدیوں پر محیط حکومت کا خاتمہ ہوا تو عرب کے شاعر ابن بدروں نے اُس کی بربادی پر آہ وفغاں کی، اِس طرح آج تیرا ماتم کرنے کے لیے قدرت نے اِس غم نصیب اقبالؔ کو منتخب کیا ہے۔"

اقبالؔ کا نوحہ ابھی ختم نہیں ہوا۔ اپنے سامنے جزیرہ صقلیہ کو پا کر مسلسل اُس سے مخاطب ہیں اور اپنے دردِ دل کا اظہار کر رہے ہیں:

ہے ترے آثار میں پوشیدہ کس کی داستاں
تیرے ساحل کی خموشی میں ہے اندازِ بیاں
درد اپنا مجھ سے کہہ، میں بھی سراپا درد ہوں
جس کی تو منزل تھا، میں اُس کارواں کی گرد ہوں
رنگ تصویرِ کہن میں بھر کے دکھلا دے مجھے
قصہ ایامِ سلف کا کہہ کے تڑپا دے مجھے
میں ترا تحفہ سوئے ہندوستاں لے جاؤں گا
خود یہاں روتا ہوں اوروں کو وہاں رلواؤں گا

''اے جزیرہ سسلی! مجھے معلوم ہے کہ تیرے آثار میں یہ کس کی داستاں پوشیدہ ہے؟ تیرے ساحل کی خاموشی کو بیان کرنے کا انداز بھی تجھے آتا ہے، تو پھر تُو مجھ سے اپنی داستانِ دردبیان کر، اس لیے کہ میں خود بھی تیری جدائی پر سراپا درد بنا ہوا ہوں۔ میں تیرے لیے اجنبی نہیں بلکہ جو کاروان کبھی تیرے ساحل پر آ کر لنگر انداز ہوتے تھے، میں بھی انھی گزرے ہوئے کاروانوں کا ایک شریک ہوں جو غبارِ راہ بن کر رہ گیا ہے۔ اس منظر کو جب تیرے دامن میں مسلمانوں کے بیڑے لنگر انداز ہوا کرتے تھے، پھر سے تازہ کردے اور میرے اُن اسلاف کے قصے سنا کر مجھے تڑپا دے۔ (کیوں کہ میں تو ایک مسافر ہوں۔ گردِ راہ کی طرح اُڑتا پھر رہا ہوں) میں تیری داستانِ درد کو تحفہ سمجھ کر دل میں رکھ لوں گا اور جس طرح اس وقت میں تیرے سامنے قصۂ ماضی کو یاد کر کے رو رہا ہوں، وہاں ہندوستان میں اپنی قوم کے لوگوں کو یہ داستانِ عبرت سنا کر رلاؤں گا، یعنی اُنھیں یاد دلاؤں گا کہ اے بدنصیب قوم، یاد کر تو کیا تھی اور آج کیا ہوگئی ہے۔''

اقبالؔ کے اِس اندازِ بیاں سے واضح ہے کہ آپ اپنی ملت کو اُس کا ماضی یاد دلا کر، اِس پستی سے جس میں وہ گری ہوئی ہے، نکلنے اور اپنے کھوئے ہوئے وقار کو بازیاب کرانے کا عزم وارادہ رکھتے ہیں۔

☆

آبی جہاز، مغرب سے چلتا ہوا آیا اور مشرق کی حدود میں داخل ہو کر، ہندوستان کے ساحل، بمبئی کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوگیا۔ ڈاکٹر اقبالؔ دردمند دل مگر بہ عزم دماغ کے ساتھ دیارِ ہند میں قدم رکھ رہے ہیں تو ہزار قسم کے تجربات بھی ساتھ لیے ہوئے ہیں۔ مسافر یقیناً فطری طور پر جلد سے جلد اپنی منزل پر پہنچ جانا چاہتا ہے۔ ڈاکٹر اقبالؔ کو بھی لاہور پہنچنے کی ایسی ہی جلدی ہوگی۔ یہاں سے لاہور کے لیے ریل کا سفر درپیش ہے۔

خوش نصیب ریل گاڑی ایک عظیم مسافر کو لیے لاہور روانہ ہوئی اور ۲۷ر جولائی کی دوپہر کو اپنی منزل پر پہنچ گئی۔ احباب کی ایک بڑی تعداد اپنے عزیز کے لیے آنکھیں فرشِ راہ کیے اسٹیشن پر موجود ہے۔ یارانِ وطن نے آگے بڑھ کر گلے لگایا اور خود اقبالؔ نے بھی عزیز و اقارب کی بادۂ محبت کو دل میں اور وطن کی خوشبو کو مشامِ جاں میں اُترتا محسوس کیا۔ اِن احباب میں اقبالؔ کے ایک دیرینہ دوست گلاب دین بھی موجود ہیں، اُنہوں نے بیرون بھاٹی دروازے میں آپ کے اعزاز میں ضیافت کا اہتمام کر رکھا ہے۔ اقبالؔ کو ہمیشہ خاطرِ احباب کا خیال رہا، اِس لیے اِس تقریب میں شرکت قبول کرلی، ورنہ اُس وقت اُن کا دل سیال کوٹ میں پڑا ہوا ہے۔ جہاں جلد سے جلد پہنچ کر وہ اپنے بزرگوں کی قدم بوسی کے لیے بے قرار ہیں۔ چناں چہ تقریب کے اختتام پر فوراً ہی اسٹیشن پہنچے اور شام کی کسی گاڑی سے اپنے آبائی شہر کی طرف روانہ ہوگئے۔ اللہ اللہ، کیا منظر ہوگا جب تین سال کے طویل عرصے کے بعد آپ ماں کی ممتا اور باپ کی شفقت سے ہم آغوش ہو رہے ہوں گے۔

☆☆

maablib.org

برسوں کا بچھڑا ہوا اقبال، کئی ہفتے تک اپنے گھر، شہر اور اپنے شہر کے دوستوں اور عزیز و اقارب سے ملتا، روز اُن کی دعائیں لیتا اور پیار وصول کرتا رہا۔ پھر جلد ہی لاہور کے لیے روانہ ہونا پڑا، اِس لیے کہ معاش کا مسئلہ درپیش تھا۔ کیوں کہ کالج کی ملازمت ترک کر چکے تھے، انگلستان میں قیام کے دوران ہی آپ نے باوجوہ استعفیٰ لکھ بھیجا تھا۔ اِس فیصلے کا بنیادی سبب یہ تھا کہ اب سرکاری ملازمت کی پابندیوں میں رہ کر وہ کام نہیں کر سکتے تھے جو آپ اپنے ذہن میں ترتیب دے کر آئے تھے۔ یہ کام آزاد فضا میں رہ کر ہی انجام دیا جا سکتا تھا، چناں چہ وکالت کا پیشہ آپ کے لیے مناسب تھا، لیکن اُس کے لیے بھی وسائل درکار تھے، فوراً اور یک لخت اُس کا شروع کرنا ممکن نہ تھا، دفتر کے قیام اور رہائش کے لیے مالی ضرورت تھی سو، ہمیشہ کی طرح برادرِ کلاں، شیخ عطا محمد کی معاونت کام آئی۔ لاہور کے موہن لال روڈ پر ایک مکان کرائے پر لیا اور دفتری سامان خرید کر اُسی جگہ کو دفتر اور اُسی کو رہائش گاہ بنا لیا گیا۔ قانونی پریکٹس کی ابتدا نچلی عدالتوں سے کی گئی۔ ۳۰ر اکتوبر ۱۹۰۸ء بہ حیثیت ایڈووکیٹ آپ کی این رول منٹ ہو گئی اور چیف کورٹ پنجاب میں پریکٹس شروع کر دی۔ مقدمات کی تیاری کے لیے آپ کو سخت محنت کرنی پڑتی تھی، لیکن ایسا کرنا ناگزیر تھا، کیوں کہ اُس وقت یہی آپ کا ذریعۂ معاش تھا۔ آپ جس ذہن و فکر کے انسان تھے، یہ وکالت کا پیشہ مادی طور پر تو یقیناً کسی قدر سود مند تھا، لیکن فکری صلاحیتوں کے لیے باعثِ زیاں بھی تھا کیوں کہ شعر و سخن کے لیے وقت میسر نہیں آ رہا تھا۔

فکری زیاں:

گویا وکالت نے ذہن کو کل وقت اپنا کر، فکر کو جیسے اپنے پاس رہن رکھ لیا تھا۔ اس صورتِ حال میں کچھ عرصہ تک تو یہ ہوا کہ ڈاکٹر اقبالؔ تخلیقی کام سے قریباً قریباً بے تعلق ہو کر رہ گئے۔ ظاہر ہے یہ کیفیت آپ کے لیے نہایت ہی ناگوار بلکہ ناقابلِ قبول تھی۔ لگتا ہے، آپ کو اس بات کا پہلے ہی علم ہو گیا تھا کہ وکالت کا پیشہ شطرنج کی طرح ہے۔ اس میں جیت کے لیے مختلف چالیں سوچنا اور چلنا پڑتی ہیں۔ اس طرح ذہن ایک بڑا شاطر تو بن جاتا ہے لیکن اقبالؔ ایسے مفکر کو اپنی فکری اور اعلیٰ صلاحیتوں کے اظہار کا وقت نہ ملنے سے خاصا روحانی نقصان ہو سکتا ہے۔ اس تکلیف دہ احساس کا اظہار خود آپ نے اپنے ایک شاگرد، شاطر مدراسی کے نام مکتوب میں اس طرح کیا:

"گزشتہ تین سال سے بہت کم اتفاق شعر گوئی کا ہوا ہے اور اب تو میں پیشہ ہی وہ اختیار کرنے کو ہوں جس کو شاعری سے کوئی نسبت نہیں۔"

ایسی ہی بات آپ نے خواجہ حسن نظامی کو ایک مکتوب میں تحریر کی:

"مجھے معلوم نہیں تھا کہ قانونی پیشے میں اس قدر مصروفیت رہے گی۔"

بہر حال یہ حقیقت ہے کہ مادی ضروریات پوری کرنے کے لیے آدمی کو بہت سی لطافتوں سے محروم ہونا پڑتا ہے۔

ڈاکٹر اقبالؔ، موہن روڈ پر، جو آج کل اُردو بازار کہلاتا ہے، نہایت مختصر عرصہ رہے، یوں لگتا ہے جیسے یہ جگہ اضطراری کیفیت اور فوری ضرورت کے لیے لی گئی تھی جو ڈاکٹر صاحب کے حسب خواہش نہیں تھی، یہی وجہ ہے کہ کُل تین ماہ بعد ہی یعنی اکتوبر ۱۹۰۸ء کو آپ لاہور کے مشہور انارکلی بازار میں منتقل ہو گئے۔ یہ جگہ پہلے، مشہور سیاسی شخصیت سر محمد شفیع کی رہائش گاہ رہی تھی، آج کل اُسے نیو مارکیٹ کہا جاتا ہے۔ یہ مکان ۱۹۲۲ء تک ڈاکٹر صاحب کے زیرِ استعمال رہا۔

قانونی مشقت:

دفتر میں بیرسٹر اقبالؔ کے دستِ راست ایک ہندو منشی تھے لیکن جھگڑالو طبیعت ہونے کے سبب آپ نے اُنہیں رخصت کر دیا اور اُن کی جگہ ایک اور صاحب منشی طاہر الدین کو اپنا معتمد

خاص رکھ لیا۔ منشی صاحب بہت نرم خو اور خوش اخلاق انسان تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آخر دم تک وہ ڈاکٹر اقبالؔ کے ساتھ رہے، بلکہ خود ڈاکٹر صاحب کو اُن پر اتنا اعتماد تھا کہ اپنے ذاتی اُمور اور گھریلو معاملات تک میں اُنھیں شریک رکھتے تھے۔ گویا آپ نے اُنھیں اپنے گھر کا فرد بنایا تھا۔ یہاں تک کہ جب آپ نے اپنے بچوں کے لیے جو وصیت تحریر فرمائی تو اُس میں درج جن تین سرپرستوں کا نام تھا، اُن میں ایک منشی طاہرالدین بھی تھے۔

مثالی خادم:

ڈاکٹر اقبالؔ کے متعلقین میں علی بخش ایک بہت قابلِ ذکر نام ہے، یہ آپ کا خدمت گار خاص تھا اور یہ بھی تا دمِ مرگ آپ کے ساتھ رہا۔ علی بخش کی آپ کے ساتھ وفاداری ''تاریخ اقبالؔ'' میں مثال بن گئی ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے، علی بخش آپ کو اُس وقت ہاتھ آیا، جب آپ بھاٹی دروازے میں رہائش پذیر تھے اور علی بخش اسلامیہ کالج کے پرنسپل مولوی حاکم علی صاحب کے ہاں ملازم تھا۔ لیکن بعد میں آپ کی خواہش پر اور مولوی صاحب کی اجازت اور مرضی سے آپ کے ہاں آ گیا۔ لیکن جب آپ یورپ جانے لگے تو اُسے اپنے بڑے بھائی صاحب شیخ عطا محمد کے پاس ہنگور (کوہاٹ) بھیج دیا، شیخ صاحب اُن دنوں وہاں تعینات تھے، لیکن علی بخش کا وہاں دل نہ لگا اور وہ واپس لاہور آ گیا۔ پھر جب ڈاکٹر اقبالؔ یورپ سے واپس آئے تو آپ نے علی بخش کی ضرورت محسوس کی اور اُس کی تلاش جاری رکھی۔ ایک روز ڈاکٹر صاحب ہائی کورٹ سے نکل رہے تھے کہ اچانک اُس پر نظر پڑی، دیکھتے ہی بغل گیر ہو گئے۔ ظاہر ہے، اب وہ کہاں جانے کا تھا، ڈاکٹر صاحب اُسے اپنے ساتھ گھر لے آئے اور پھر ہمیشہ کے لیے آپ کا ساتھی بن کر رہ گیا۔

پیشہ ہوا مزاحم:

ہم بیرسٹر محمد اقبال کا وکالت کے حوالے سے تذکرہ کر رہے ہیں تو یہ بھی کہتے چلیں کہ آپ شروع میں پیدل ہی کورٹ آتے جاتے تھے، پھر گھوڑا گاڑی کی طرز کی ایک سواری خرید لی، اُس کے لیے ایک پوربی شخص کو ملازم رکھا اور کبھی کبھی خود بھی ہانک لیا کرتے تھے۔ کچھ روز موٹر کار بھی آپ کے پاس رہی، لیکن جب دیکھا کہ آئے دن خراب رہتی ہے تو اُسے فارغ کر دی۔

ہر چند کہ وکالت کا پیشہ ڈاکٹر اقبال کے اس مشن کے آڑے آ رہا تھا جو وہ اپنے دل و دماغ میں ترتیب دے چکے تھے، حالاں کہ یورپ سے واپسی پر کئی تعلیمی اداروں کی طرف سے آپ کو پروفیسری کی پیشکش کی گئی۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں تاریخ پڑھانے اور ایم اے او کالج علی گڑھ میں فلسفے کے پروفیسر کا منصب سنبھالنے کو کہا گیا۔ لیکن آپ نے اِن میں سے کسی پیش کش کو قبول نہیں کیا، کیوں کہ سرکاری ملازمت سے آزاد رہ کر بہر حال وہ ایک آسودگی محسوس کرتے تھے۔ تو پروفیسری اُن کے ذوق وشوق اور مزاج سے مطابقت رکھتی تھی اور سرکاری پابندیوں میں آرام میسر تھا۔ لیکن اس قید با آرام کی نسبت انہیں، وکالت کی آزادی با مشقت زیادہ قابلِ قبول تھی۔

کشمیری وابستگی:

قانون کا پیشہ تھکا دینے والا عمل تھا، اور آپ کا تمام وقت اُس نے اپنے نام کر لیا تھا، تاہم آپ ملک میں ہونے والے سیاسی اور سماجی حالات و معاملات سے بے خبر نہیں تھے، بلکہ ملک میں رونما ہونے والی ایک ایک بات پر آپ کی گہری نظر رہتی تھی۔ مسلمان کشمیر میں ریاستی ظلم و جبر کا شکار تھے، ڈوگرا خاندان کا راجا اُن پر فرعون کی طرح مسلط تھا اور آئے روز مسلمانوں پر ستم کے پہاڑ توڑتا رہتا، غالباً یہی وجہ تھی کہ مسلمانوں کی ایک خاصی تعداد کشمیر سے نقل مکانی کر کے پنجاب کے مختلف شہروں میں آباد ہو گئی تھی، خصوصاً لاہور اُن کا مرکز تھا، چناں چہ ۱۹۰۹ء میں انجمن کشمیری مسلمانانِ پنجاب کا قیام عمل میں آیا تو ڈاکٹر اقبال نے اس لیے نہیں کہ آپ خود کشمیری نژاد تھے، بلکہ کشمیری مسلمان صرف کشمیری ہی نہیں، مسلمان بھی تھے اور اُن کے بنیادی حقوق سلب کر لیے گئے تھے اور اُن کے ساتھ غیر انسانی برتاؤ کیا جا رہا تھا، اس وجہ سے آپ نے اس انجمن میں شمولیت اختیار کی تاکہ اُن کی آزادی کے لیے آواز بلند کی جا سکے، انجمن کے افتتاحی اجلاس میں آپ کو سیکریٹری منتخب کر لیا گیا۔

وکالت کی مشقت:

ڈاکٹر صاحب سرکاری ملازمت چھوڑ چکے تھے اور وکالت کے پیشے سے مطمئن نہیں تھے کہ اُس کی مصروفیت میں آپ کو تخلیقی اُمور کے لیے وقت نہیں مل رہا تھا۔ انہی دنوں ایک بار پھر

گورنمنٹ کالج لاہور کی طرف سے پروفیسری کی عارضی اسامی کے لیے آپ سے استدعا کی گئی۔ دراصل فلسفہ کے پروفیسر آسٹن وائٹ جیمز کی اچانک وفات کے بعد کالج کو اُن کا مترادف میسر نہیں آ رہا تھا، اِس لیے آپ سے رجوع کیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اِس شرط کے ساتھ کہ تدریسی اوقات اُن کے موجودہ پیشہ وکالت کی مصروفیات میں حائل نہ ہوں گے، اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا چناں چہ اب معمول یہ تھا کہ علی الصباح کالج پہنچتے، اور تین گھنٹے تک وہاں تدریس کے فرائض انجام دیتے، پھر وہاں سے چیف کورٹ جاتے اور شام چار بجے تک مقدمات نمٹاتے، اِس عرصے میں اگر فرصت کے لمحات میسر آتے تو بار روم میں کچھ دیر ہم پیشہ قریبی دوستوں کے ساتھ مل بیٹھ کر ہلکی پھلکی گفتگو کر لیا کرتے۔

درس و تدریس جو بجائے خود ایک تھکا دینے والا عمل ہے، اِس پر وکالت کا پیشہ جو قانون و موشگافیوں سے بھرا ہوا ہے اور اُس کو شطرنج کی طرح ڈیل کرنا پڑتا ہے، اور بھی زیادہ محنت طلب کام ہے، اِس میں مقدمے کے مختلف پہلوؤں کو دیکھنا اور سمجھنا ہوتا ہے، کہیں دعویٰ اور کہیں دفاع کرنا اور اِس کے لیے قانونی پیچیدگیوں کو سامنے رکھ کر تیاری کرنی ہوتی ہے۔ بحث اور اِس کے دوران، وکیل کو گزشتہ فیصلوں کے حوالے بھی پیش کرنے ہوتے ہیں۔ اِن باتوں کی روشنی میں بیرسٹر اقبالؔ کی محنت کا اندازہ لگانا زیادہ مشکل نہیں۔

قاتلِ روح:

کالج میں لیکچر دینے کے لیے متعلقہ موضوع کی پیشگی تیاری اور کالج میں جا کر لیکچر دینا، اور وہاں سے آ کر عدالتوں میں پہنچ کر، مقدموں میں سر کھپانا، ان دہری مصروفیات کی وجہ سے تھک کر چور ہو جاتے، لیکن معاشی ضروریات آپ کو یہ دقت اُٹھانے پر مجبور کیے ہوئے تھیں۔ اُن پر آمدنی کا حساب یہ تھا کہ پڑھانے کی تنخواہ پانچ سو روپے تھی اور وکالت کی آمدنی کو تو ہوائی روزی ہی کہہ سکتے ہیں، لیکن اُس سے اُن کے تخلیقی عمل کو جو نقصان ہو رہا تھا، وہ اُس سے کہیں زیادہ تھا۔ بیرسٹر ڈاکٹر اقبالؔ اس قلق کو شدت سے محسوس کر رہے تھے۔ لہٰذا اور زیادہ صبر و انتظار کیے بغیر آپ نے تیزی سے سوچنا شروع کر دیا کہ کوئی ایسا ذریعۂ معاش ہاتھ آ جائے کہ وہ آزادی اور آسودگی قلب

کے ساتھ تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں تاکہ وہ مشن آگے بڑھ سکے جس کو وہ ذہن میں ترتیب دے کر یورپ سے وطن واپس ہوئے ہیں، وہ مشن کیا ہے؟ کیا اس کے سوا اُسے کچھ اور بھی کہہ سکتے ہیں کہ اُن کے پیشِ نظر قوم کی زبوں حالی ہے، وہ چاہتے ہیں کہ اپنے افکار کے ذریعہ قوم کو خوابِ غفلت سے بیدار کیا جائے اور اِس مصیبت سے نجات دلائی جائے جس میں وہ ایک مدت سے جتلا چلی آتی ہے۔ خصوصاً قوم کے نوجوانوں کے اندر احساس بیداری پیدا کیا جائے کہ وہ ایک زندہ قوم کے فرد ہیں۔ اُنہیں چاہیے کہ وہ اپنی فراموش کردہ تاریخ کو یاد کریں، اور اپنے اندر سے احساسِ محرومی کو دور کر کے اپنے دین کی اعلیٰ قدروں اور روایات کو اپنے عمل سے زندہ کرنے میں اپنا کردار ادا کریں۔ اِسی طرح یہ پسماندہ اور پژمردہ قوم حیاتِ نو پا کر اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر سکتی ہے۔ اقبالؔ کے اِس مشن کو اور با آسانی سمجھنے کے لیے اُن کے مکتوبات سے مدد مل سکتی ہے کہ اُس دور میں وہ کیا سوچ اور کیا مقاصد لیے ہوئے ہیں، خصوصاً ایک مکتوب جو اُنہوں نے مشہور اسلامی اسکالر اور مفسرِ قرآن مولانا عبدالماجد دریا آبادی کو لکھا، اُس سے اُن کے اضطراب کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ لکھتے ہیں۔

"فکرِ روزی قاتلِ روح ہے، یک سوئی نصیب نہیں۔"

باایمان شاعری:

اِس جگہ ہمیں اپنے ذہن میں یہ بات بٹھا لینی چاہیے کہ اقبالؔ کو اپنی معاشی سرگرمیوں کی وجہ سے عدیم الفرصتی کا شکوہ اس وجہ سے نہیں کہ وہ اپنی شاعری کے حجم میں اضافہ کی خواہش رکھتے۔ دراصل شاعری تو اُن کے لیے اپنے خیالات کے اظہار کا محض ایک ذریعہ تھی۔ اِس پر بھی اُنہیں بہ حیثیت شاعر شہرت پانے کی نہ کبھی خواہش رہی، نہ آرزو، جیسا کہ اپنی اِس بے نیازی کا اظہار اُنہوں نے ۱۴راگست ۱۹۰۸ء میں اپنے ایک شاگرد شاطرؔ مدراسی کو اُس کی اِس خواہش کے جواب میں لکھا جو کلامِ اقبالؔ کو مرتب کر کے شائع کرانے کی خواہش رکھتا تھا۔ ڈاکٹر اقبالؔ لکھتے ہیں:

"میں کیا اور میرا کلام کیا، نہ مجھے اِن اوراقِ پریشاں کو جمع کرنے کی فرصت ہے، نہ حقیقت میں اِس کی ضرورت ہے، محض دوستوں کے دل

بہلانے کے لیے کچھ لکھ لیتا ہوں اور وہ بھی مجبوراً۔"

جب کہ اقبال کی شاعری کا یہ بھی اعجاز و کمال ہے کہ وہ اسلامی شعائر اور نشانات کو عصر حاضر میں احیائے اسلام کے لئے مسلمانوں کو جگانے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ اور جہاں انہیں کوئی نظر نہ آئے تو خود اس کے داعی بن جاتے ہیں:

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکمِ اذاں لا الٰہ الا اللہ

اقبال نے شاعری کی ابتدا مسلمانوں کے زمانہ تنزل کے ایک روایتی غزل گو کی حیثیت سے مشاعروں میں کی۔ مگر انہوں نے عہد تنزل کی بجائے احیا کے ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں، اسی لئے وہ اپنے گردو نواح سے متاثر ہوئے بغیر کیونکر رہ سکتے تھے۔ چند سالوں ہی میں ان کا مشاعروں میں شریک ہونا ختم ہو گیا تھا اور ان کی شاعری نے قوم اور وطن کی محبت کی شاعری کا رنگ اختیار کر لیا۔

قوم اور وطن سے ان کی مراد دیار ہند اور ساکنان ہند سے تھی جس میں ہندو مسلمان سب شامل تھے۔ لیکن آپ کی اس فکر کا یہ دور نہایت مختصر ثابت ہوا۔ یورپ میں قیام کے دوران آپ کے ذہن و قلب میں ایک عظیم انقلاب پیدا ہوا جس نے ان کی شاعری کا رُخ آخر کار اسلام کی طرف پھیر دیا۔ اور یہی وہ وقت تھا جب آپ نے مخزن کے مدیر اور اپنے دیرینہ دوست شیخ عبدالقادر کو ایک مکتوب میں اپنے آئندہ کے عزائم سے منظوم شکل میں آگاہ کیا تھا۔

کمال برائے اسلام:

حضرت علامہ کا یہ ذہنی ارتقا اور فکری انقلاب واضح طور پر نظر آنے لگا تھا اور اب یعنی آپ نے قطعی فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنی باقی عمر کی شاعری سے احیائے ملت کا کام لیں گے جیسا کہ آئندہ چل کر آپ نے فرمایا۔ میرے والد نے مجھ سے خواہش کی تھی کہ اپنے کمال کو اسلام کی خدمت میں صرف کرنا۔ اور جیسا کہ سرسید نے حالی کی شاعری کا رخ پھیرنے میں اہم کردار ادا کیا اور واقعتاً حالی نے جوہر شاعری کو ملت کے لئے وقف کر دیا، حالانکہ سرسید کے انگیخت کرنے سے پہلے حالی کی شاعری اس وصف سے خالی تھی، یعنی وہ بھی روایتی تغزل کے سوا اپنے ہیئت شاعری میں کچھ اور

نہ رکھتے تھے، لیکن اقبال کے اندر یہ جذبہ شروع سے ہی موجود تھا۔ والد گرامی اور استاذی محترم نے آپ کی ساخت و پرداخت میں یہ عنصر ابتدا میں ہی رکھ دیا تھا البتہ اس جذبہ کو شدت اور گرمی مغرب کی ہوا نے دی۔ جیسا کہ قیام یورپ کے دوران کہا جانے والا کلام بخوبی اس حقیقت کو واضح کرتا نظر آتا ہے اور اس کے لئے صرف ان کا یہی ایک مصرع کافی ہے۔

"مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے"

دردِ ملت:

جیسا کہ وطن اور قوم کی محبت میں کی جانے والی شاعری میں بھی آپ کے ہاں اسلامیت کا عنصر بخوبی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ہماری مراد ان نظموں سے ہے جو انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں پڑھی گئیں۔ گو اس وقت آپ ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے، تاہم مسلم تشخص کو اس وقت بھی آپ نے اپنی فکر کا سرنامہ بنایا ہوا تھا، اس کی نمایاں جھلک ۱۹۰۴ء میں شائع ہونے والے ان کے مضمون "قومی زندگی" میں نظر آتی ہے جس میں آپ برصغیر میں مسلم معاشرے کا نقشہ ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

> "مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اگر اس اعتبار سے مسلمانوں کو دیکھا جائے تو ان کی حالت نہایت مخدوش نظر آتی ہے۔ یہ بدقسمت قوم حکومت کھو بیٹھی ہے، صنعت کھو بیٹھی ہے، تجارت کھو بیٹھی ہے، اب وقت کے تقاضوں سے غافل اور افلاس کی تیز تلوار سے مجروح ہو کر ایک بے معنی توکل کا عصا ٹیکے کھڑی ہے اور باتیں تو خیر ابھی تک ان کے مذہبی نزاعوں کا ہی فیصلہ نہیں ہوا۔ آئے دن ایک نیا فرقہ پیدا ہوتا ہے جو اپنے آپ کو جنت کا وارث سمجھ کر باقی تمام نوع انسان کو جہنم کا ایندھن قرار دیتا ہے۔ غرض کہ ان فرقہ آرائیوں نے خیر الامم کی جمعیت کو کچھ ایسی طرح منتشر کر دیا ہے کہ اتحاد و یگانگت کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔"

☆☆

گورنمنٹ کالج، لاہور میں ڈاکٹر اقبالؔ نے بامرِ مجبوری فلسفہ پڑھانے کی ذمے داری قبول کی تھی، کیوں کہ جیسے پہلے ذکر ہو چکا ہے، سرکاری ملازمت کو اپنی طبیعت کے منافی سمجھتے تھے، لیکن دوبارہ اس اسامی کو اس وجہ سے قبول نہیں کیا کہ یہ عارضی تھی، متبادل انتظام ہونے پر اس ذمے داری سے دست کش ہونا ہوگا اور معاشی اُلجھنیں بہ دستور برقرار رہیں گی، اس لیے آپ نے اب لاہور سے باہر دیکھنا شروع کر دیا اور اس سلسلہ کا پہلا دورہ حیدرآباد دکن تجویز کیا۔ لیکن اس سے قبل کہ ہم حیدرآباد کا رخ کریں، آپ کی قومی اور سماجی مصروفیت کی ایک جھلک ملاحظہ کرتے ہیں۔

سرسید کی قائم کردہ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس ۲۷ تا ۲۹ دسمبر کو امرتسر میں ہونا قرار پایا۔ اس موقع پر ڈاکٹر اقبال ایک نمائندہ وفد لے کر اجلاس میں شریک ہوئے۔ کانفرنس کے صدر نواب آف ڈھاکا خواجہ محمد سلیم اللہ خاں سے ملاقات کر کے اُنھیں فارسی زبان میں سپاس نامہ پیش کیا۔ جس کا متن ظاہر ہے، مسلمانانِ برصغیر کے حالات و مسائل سے تعلق رکھتا تھا۔ خصوصاً اُن سے درخواست کی گئی کہ وہ انجمن مسلمانانِ کشمیر کی سرپرستی قبول فرمائیں، خواجہ صاحب نے آپ کو مایوس نہیں کیا اور انجمن کی سرپرستی قبول کر لی۔ نواب خواجہ محمد سلیم اللہ ہندوستانی مسلمانوں کے ایک سچے بہی خواہ اور بلند کردار راہ نما تھے، اُنھی کی قیام گاہ پر ۱۹۰۶ء میں مسلمانانِ ہند کی نمائندہ سیاسی جماعت کی داغ بیل ڈالی گئی تھی اور خود اقبالؔ نے لندن میں قیام کے دوران مسلم لیگ کی رکنیت اختیار کر لی تھی، اور واپس آ کر، پنجاب مسلم لیگ میں شامل ہو گئے تھے اور بعد میں مسلم لیگ کے حوالے سے مسلمانانِ برصغیر کے لیے آپ کی خدمات تاریخ کا حصہ بن گئیں،

خصوصاً ۱۹۳۱ء کو شہر الٰہ آباد میں مسلم لیگ کے سالانہ جلسہ میں آپ کا صدارتی خطبہ ہی وہ خواب کہلاتا ہے جس میں آپ نے ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے ایک آزاد و خود مختار ریاست کا تصور پیش کیا، جس کی تعبیر آخر پاکستان کی شکل میں دیکھنے کو ملی۔ جیسا کہ پہلے بتایا گیا کشمیر میں مسلمان ریاستی جبر و ستم کا شکار تھے، ڈوگرہ خاندان اُن پر مسلط تھا، غالباً اِسی وجہ سے کشمیریوں کی ایک بڑی تعداد کشمیر چھوڑ کر پنجاب کی طرف آ نکلی تھی، اور یہ لوگ پنجاب کے مختلف علاقوں میں آن بسے تھے، خصوصاً لاہور ان کا مرکز تھا۔ اِنہی حضرات نے ۱۹۰۹ء میں انجمن مسلمانانِ کشمیری کی بنیاد رکھی تھی، تاکہ ریاست جموں و کشمیر میں مسلمانوں پر جو ظلم ڈھائے جا رہے ہیں اور اُن کے بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہو رہی ہے، لہٰذا اِس ظلم کے خلاف کوئی آواز بلند کی جا سکے۔ تو ڈاکٹر اقبالؔ بھی انجمن کا حصہ بنے۔ اِس لیے بھی کہ آپ کشمیری تھے اور اِس لیے بھی کہ کشمیری بہرحال مسلمان تھے اور یوں بھی ایک خالص انسانی مسئلہ تھا۔ آپ نے نہ صرف انجمن کے افتتاحی اجلاس میں شرکت کی بلکہ انجمن کا سیکریٹری بننا قبول کر لیا۔

جاہل راجا کا لطیفہ:

امرتسر میں منعقدہ ایجوکیشنل کانفرنس میں شرکت کے بعد، ڈاکٹر اقبالؔ کی ایک اور سیاسی و سماجی مصروفیت نظر آتی ہے، اِس کی روداد یہ ہے کہ کشمیریوں نے ایک وفد کی صورت میں مہاراجا کشمیر پرتاپ سنگھ سے ملنے کا پروگرام بنایا۔ وہ اِن دنوں لاہور آیا ہوا تھا، وفد کا مقصد اُس غاصب حکمران کو عام کشمیریوں خصوصاً مسلمانوں کی مشکلات نوٹ کرانی تھی۔ وفد کے اراکین نے ڈاکٹر اقبالؔ سے بھی رابطہ کیا اور وفد میں شمولیت کی دعوت دی۔ آپ پہلے تو باوجوہ انکار کرتے رہے لیکن پھر اپنے ایک عزیز دوست محمد دین فوق کے اصرار پر بامرِ مجبوری اور دل نہ چاہتے ہوئے بھی وفد میں شامل ہو گئے۔ ملاقات لاہور کے کشمیر ہاؤس میں ہوئی۔ اِس ملاقات میں ایک دل چسپ بلکہ مضحکہ خیز واقعہ یہ پیش آیا کہ کشمیر کے ناجائز اور غیر سنجیدہ حکمران کو ہندوستان کے غاصب فرنگیوں نے نہ معلوم کس خوشی میں سر کا خطاب دے رکھا تھا۔ ڈاکٹر شیخ محمد اقبالؔ سے تعارف کے وقت بولا۔

"ڈاک دار صاحب، سنا ہے آپ بید بناتے ہیں!"

ڈاکٹر صاحب نے برجستہ کہا۔ ''سرکار بید نہ کبھی میں نے بنائے ہیں، نہ کبھی میرے باپ دادا نے، اس کے علاوہ میں ڈاک دار بھی نہیں، نہ میں نے کبھی ڈاک کا کام کیا ہے اور نہ میرے بزرگوں نے۔''

مہاراجا صاحب یہ سن کر اراکینِ وفد کا منہ تکنے لگے۔ دراصل اُس احمق نے ڈاکٹر اقبالؔ کی شاعرانہ حیثیت کا چرچا سن رکھا تھا، وفد کے ایک فرد نے وضاحت کر کے راجا جی کی حیرانی دور کرنے کی کوشش کی۔

''حضور! یہ شاعر ہیں اور شعر کہتے ہیں، شعر کو بیت کہتے ہیں۔ مگر اُنہوں نے بیت کو بید سمجھ لیا تھا، جس سے کرسیاں بنائی جاتی ہیں۔''

اب مہاراجا نے اپنے ایک اور اعلیٰ ذوق کا مظاہرہ کیا، ڈاکٹر اقبالؔ صاحب سے شعر سنانے کی فرمائش کر دی۔ آپ نے خیالِ خاطرِ احباب، خصوصاً اپنے دوست دین محمد فوق کا منہ دیکھتے ہوئے، راجا صاحب کی فرمائش رد نہیں کی، لیکن ابھی آپ شعر سنانا چاہتے تھے کہ راجا جی فوراً بولے۔ ''ایسا نہیں، گا کر سنائیے۔''

ممکن ہے ڈاکٹر صاحب، دل مسوس کر رہ جاتے، لیکن چپ نہ رہ سکے، فوق صاحب کی طرف دیکھ کر دبی زبان میں بولے۔

''جی تو کرتا ہے، کہوں، میرے اِن دوستوں کے پاؤں میں گھنگھرو بندھوادو تو میں گاؤں۔''

مگر فوق کی آنکھوں میں درگزر کی درخواست دیکھ کر آپ راجا جی کی طرف متوجہ ہو گئے اور اپنے مخصوص لحن میں شعر گنگنانے لگے۔

راجا صاحب معلوم نہیں، شعروں کا مفہوم سمجھے اور کلامِ اقبالؔ سے محظوظ یا متاثر ہوئے کہ نہیں البتہ اُنہوں نے جواباً فارسی کے کچھ شعر خود بھی سنا ڈالے، جو سننے والوں کو عالمِ حیرت میں ڈالنے کیلئے کافی تھے۔

☆☆

دنیا میں مروجہ سیاست اپنے جن معنی میں متعارف ہے، وہ کوئی قابلِ رشک نہیں۔ علاوہ شخص اس میں حصہ نہیں لے سکتا جو اپنے ذہن کو صراطِ مستقیم پر گام زن رکھتا ہو۔ اس کے لیے ٹیڑھی چال کے لوگ ہی درکار ہوتے ہیں۔ کیوں کہ سیاست پُر پیچ راستوں کا مجموعہ ہے، اس میں قدم رکھنے والے کو آنکھ مچولی کا کھیل آنا چاہیے، جو چہرے بدلنا جانتا ہو، لفظوں کی شعبدہ بازی اور شطرنج کی سی چالوں کا ماہر ہو، اور جیسا کہ کہا جاتا ہے، سیاست کے سینے میں دل نہیں ہوتا اور یہ کہ سیاست میں کوئی بھی بات آخر نہیں ہوتی وغیرہ وغیرہ۔ لہٰذا ظاہر ہے، اقبال جیسا شخص حنیف اس ہشت راہا میں کیوں کر قدم رکھنا پسند کر سکتا تھا، سیاست کا یہ انداز آپ کی طبیعت اور مزاج کے بالکل خلاف تھا، تاہم جہانِ فکر میں رہتے ہوئے بھی آپ کی عقابی نظر نیرنگی سیاست کا جائزہ لیتی رہتی تھی، بلکہ کہنا چاہیے برصغیر کے علاوہ ایشیائی سیاسی ماحول اور عالمی طاقتوں کی سیاسی بازی گری بھی آپ کی آنکھ سے پوشیدہ نہیں تھی اور مسلمانوں کے مسائل کے حل اور اُن کی فلاح و بہبود کے لیے اس آتشِ نمرود میں کودنے سے بھی آپ کو انکار نہیں تھا، یہی وجہ ہے کہ ۱۹۰۶ء میں مسلمانوں کی سیاسی جماعت مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا تو اس وقت آپ انگلستان میں تھے اور جب لندن میں لیگ کی شاخ قائم ہوئی تو آپ نے اس کی رکنیت حاصل کرنے میں دیر نہیں کی، پھر جب آپ ۱۹۰۸ء کو انگلستان سے واپس لاہور آئے تو یہاں آپ سے پہلے ہی ۱۹۰۷ء میں مسلم لیگ کا ذیلی دفتر قائم ہو چکا تھا اور رکنیت سازی شروع کر دی گئی تھی، لیگ کے مقامی ذمے داروں میں آپ کے قریبی دوست اور کالج کے ہم مکتب مرزا جلال الدین تھے، اُن کی دعوت پر یا آپ خود ہی مسلم لیگ کی طرف مائل ہوئے اور اُن کے ساتھ مل کر عملاً لیگ کی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے۔ بلکہ کچھ عرصے بعد، پنجاب صوبائی لیگ کے اسسٹنٹ سیکریٹری چن لیے گئے۔ ۲۸ رافراد پر مشتمل اس وفد میں بھی آپ شامل ہوئے جس نے یکم اپریل ۱۹۱۱ کو لارڈ ہارڈنگ کو سپاس نامہ پیش کیا۔

☆☆

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، علامہ صاحب کو وکالت نہیں بھا رہی تھی، اور اس کا سبب یہی تھا کہ اس کی بہت زیادہ مصروفیت ان کے فکری اور تخلیقی امور کو نقصان پہنچا رہی تھی، لہٰذا آپ کا ارادہ تھا کہ کوئی اور ایسا ذریعہ معاش ہاتھ آ جائے جو ان کی فکری و علمی راہ میں رکاوٹ نہ بن سکے، چنانچہ، آپ نے ہندوستان کی ایک سب سے بڑی مسلم ریاست کی طرف جانے کا ارادہ کیا۔

سوئے حیدر آباد دکن:

فکر و شعور کے حوالے سے ہندوستان بھر میں ڈاکٹر اقبالؔ کی شہرت عام ہو چکی تھی، بالخصوص حیدر آباد دکن میں قومی شاعر کی حیثیت سے خاص و عام میں آپ مقبول تھے۔ وہاں کی کئی سر آوردہ شخصیات سے بھی آپ کے ذاتی بلکہ دوستانہ تعلقات قائم ہو چکے تھے، ان میں ریاست کے صدرِ اعظم راجا کشن پرشاد اور ریاست کے مالیاتی امور کے نگران سر اکبر حیدری کے علاوہ ایک اور بے تکلف دوست مولانا غلام قادر گرامی بھی حیدر آباد میں ہی مقیم تھے، حیدر آباد کی ایک بہت ہی اہم شخصیت شعلہ بیان خطیب اور عاشقِ رسول بہادر یار جنگ جنہوں نے آگے چل کر قائداعظم کے ساتھ تحریکِ پاکستان میں بڑی گرم جوشی سے حصہ لیا، وہ بھی اقبالؔ کے مداحوں میں تھے۔ ان تمام باتوں کے پیشِ نظر ڈاکٹر اقبالؔ نے معاشی آسودگی کے لیے حیدر آباد کا انتخاب کیا۔ گو انہیں یہ بھی علم تھا کہ اگر حیدر آباد میں کوئی مناسب منصب مل بھی گیا تو ریاست کا انتظامی ڈھانچہ جو اپنی محلاتی سازشوں میں مشہور ہے، ان کے لیے مسئلہ بن سکتا ہے۔ اُس کی انتظامیہ کا سازشی ٹولا بیورو کریٹس

زیادہ دیر کسی کو ٹکنے نہیں دیتا۔ نظام صاحب (نواب ریاست) اپنی دھن میں مگن رہتے ہیں، کاروبارِ حکومت وزیرِاعظم کے سپرد ہے، جب کہ خود وزیرِاعظم بھی اس سازشی ٹولے کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔ اس لیے وزیرِاعظم کو بھی اس سے بنا کر رکھنی ہوتی ہے، دوسری صورت میں خود اُن کی اپنی وزارت بھی خطرے میں پڑ جاتی ہے، سازشوں کے ماہرین اس کے خلاف، نواب صاحب کے کان بھرنا شروع کر دیتے ہیں اور بہت جلد معزولی کا پروانہ وزیرِاعظم صاحب کے ہاتھ میں تھما دیا جاتا ہے۔ اس صورتِ حال کے باوجود ڈاکٹر اقبالؔ محض یہ سوچ کر کہ ہندوستان میں یہ ایک بڑی مسلم ریاست ہے جو ہندو راجواڑوں کے درمیان بہرحال مسلمانوں کے وجود اور اُن کے امتیاز کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ وہاں جانے پر تیار ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب کا ارادہ تھا کہ اگر نواب صاحب تک رسائی ہو گئی تو وہ اپنے مقاصد سے انھیں آگاہ کر سکیں گے کہ وہ تصنیف و تالیف سے متعلق اپنے ذہن میں جو ایک منصوبہ رکھتے ہیں وہ برصغیر کے مسلمانوں کے لیے حال و مستقبل میں کس طرح نہایت سودمند ثابت ہو سکتا ہے۔ لیکن ایسا موقع ہی نہ آ سکا۔

حسرت انگیز منظر:

اقبالؔ حیدرآباد گئے، مگر نواب صاحب تک باریابی نہ ہو سکی۔ تاہم سر اکبر حیدری نے آپ کو مہمان رکھا اور اُن کی بیگم نے اعلیٰ میزبانی کا ثبوت دیا۔ آپ کو کسی چیز کی تکلیف نہ ہونے دی۔ سیر و تفریح بھی مہیا کی، خصوصاً گولکنڈا کے مشہور تاریخی آثار جو حیدرآباد میں قطب شاہ سلاطین سے تعلق رکھتے ہیں اور خود اُن سلاطین کے مقبروں کا بھی آپ کو مشاہدہ کرایا۔ یہ معائنہ اتفاق سے اُس وقت ہوا جب شام ڈھل چکی تھی اور رات نے اپنا سفر شروع کر دیا تھا، چاروں طرف خاموشی پھیلی ہوئی تھی اور آسمان پر بادلوں کی ٹکڑیاں تیرتی پھر رہی تھیں، اُن کے درمیان سے چاندنی چھن چھن کر یہاں حکمرانوں کے مقبروں پر حسرت کی طرح برس رہی تھی۔ اس حسرت انگیز منظر نے ڈاکٹر اقبالؔ کو بے حد متاثر کیا۔ یہ تاثرات آپ نے غالباً وہیں رہتے ہوئے یا پھر واپسی پر سفر کے دوران ''گورستانِ شاہی'' کے عنوان سے منظوم کیے۔ اس طویل نظم کے تمام اشعار نقل کرنا اس جگہ ممکن نہیں، صرف وہ چند اشعار جو موت کے حوالے سے عبرت پذیر ہیں اور خصوصاً وہ اشعار ضرور

پیش کریں گے جہاں سے انہوں نے گریز کرتے ہوئے غمِ ملت کا اظہار کیا ہے، جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اقبالؔ کی شاعری کا مرکز و محور ملت اور ملت بن کر رہ گیا تھا۔

نظم کی ابتدا اس منظر سے ہوتی ہے جس کا ہم ذکر کر چکے ہیں یعنی اقبالؔ بطور تمہید گورستان پر چھائی ہوئی پُر اسرار خاموشی کا منظر پیش کرنے کے بعد اس حقیقت کا اظہار کرتے ہیں:

رنگ و آبِ زندگی سے گل بدامن ہے زمیں
سینکڑوں خوں گشتہ تہذیبوں کا مدفن ہے زمیں

غالبؔ نے محض اپنی جمالیاتی حس کی تسکین کے لیے اس "رنگین" فلسفہ کا اظہار کیا تھا کہ:

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

لیکن اقبالؔ سلاطین کے مقبروں کے درمیان عبرت پذیر منظر پیش کرتے ہوئے خاک میں پوشیدہ چند گل فاموں کی نہیں پوری تہذیبوں کے پیوندِ زمیں ہونے کا مرثیہ کا پڑھ رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ "یہ زمین فقط گورستانِ شاہی کا قطعہ نہیں بلکہ پوری زمین ہی زندگی کے رنگوں اور اس کی چمک کو اپنے دامن میں لیے یوں نظر آ رہی ہے گویا پھولوں سے اس نے جھولی بھر لی ہو، اور یہ چند پھولوں کی بات نہیں، تہذیبوں کا پورا گلستان فنا ہو کر زمیں بوس ہو گیا ہے۔"

اس کے بعد علامہ صاحب بادشاہوں کی قبروں پر حسرت کی نظر ڈالتے ہوئے کہتے ہیں:

"یہ سلاطین جو کبھی محلات میں راحت افزا نیند کے مزے لیتے تھے، اور اب یہ ان کی خواب گاہیں جو حسرت ناک منظر پیش کر رہی ہیں۔"

اس کے بعد اقبالؔ اس حقیقت کا اظہار کرتے ہیں کہ کوئی صاحب تاج و تخت کیسی ہی شاہانہ اور جنت مکیں زندگی گزارے، بہر حال اس کا آخری ٹھکانا یہی دو گز زمین ہوتا ہے:

بادشاہوں کی بھی کشتِ عمر کا حاصل ہے گور
جادۂ عظمت کی گویا آخری منزل ہے گور

مزید کہتے ہیں "اب کوئی شادیانے بجائے یا عود و لوبان سلگائے یا روز و شب ان کا ماتم کرے اور ان پر آنسو بہائے، یا میدانِ کارزار میں ان کے جانشینوں کی شمشیریں ہنگامے برپا

کرتی رہیں، یا خون کو گرمانے والے نعرے بلند ہوتے رہیں۔ یہ سب اُن کے لئے لاحاصل ہے:

اب کوئی آواز سوتوں کو جگا سکتی نہیں
سینۂ ویراں میں جانِ رفتہ آ سکتی نہیں

موت وزندگی دو ایسی حقیقتیں ہیں کہ اِن کو جھٹلایا نہیں جاسکتا، اقبال حیات وموت کے اِنھی دو وقفوں کو اس طرح بیان کر رہے ہیں:

زندگی انساں کی ہے مانندِ مرغِ خوش نوا
شاخ پر بیٹھا کوئی دم، چہچہایا، اُڑ گیا

جیسے کوئی خوش آواز پرندہ کسی شاخ پر کچھ دیر چہچہانے اور نغمہ سرائی کرنے کے بعد اُڑ جاتا ہے، اِسی طرح زندگی بھی ایک مدت تک رونے ہنسنے کے بعد دوسرے جہان پرواز کر جاتی ہے اور یہ عمل انسانوں کے کسی مخصوص گروہ کے لیے مختص نہیں، بلکہ:

موت ہر شاہ و گدا کے خواب کی تعبیر ہے
اِس ستم گر کا ستم انصاف کی تصویر ہے

موت ایک ایسی ستم گر ہے کہ غریب ہو یا امیر، بادشاہ ہو کہ فقیر، سب کے ساتھ یکساں انصاف اور سلوک کرتی ہے۔

اب اقبال موت کے کینوس کو اور زیادہ وسعت دیتے ہوئے کہتے ہیں:

زندگی اقوام کی بھی ہے یونہی بے اعتبار
رنگ ہائے رفتہ کی تصویر ہے اِن کی بہار

اِسی طرح قوموں کی زندگی کا بھی کوئی اعتبار اور بھروسا نہیں کہ یہ کب ختم ہو جائیں، پھر یہ ہوتا ہے کہ ان کی چمک دمک، شان وشوکت اور عروج وکمال کے رنگ اُڑ جاتے ہیں، بس تصویر کی طرح ان کے قصے، اُن کی یاد دلانے کو رہ جاتے ہیں۔"

اِن آفاقی حقیقتوں کو بیان کرنے کے بعد شاعرِ اسلام ملتِ مسلم کی عظمتِ رفتہ پر آنسو بہاتے ہوئے نالہ سرا ہوتا ہے:

آہ! مسلم بھی زمانے سے یونہی رخصت ہوا

آسماں سے ابرِ آزادی اُٹھا، برسا گیا

اس کے بعد ایک بار پھر اقبال، فنا کی تصویریں پیش کرنے کے بعد اسی غمِ ملت سے مغلوب ہوکر آہیں بھرنے لگتے ہیں:

اس نشاط آباد میں گو عیش بے اندازہ ہے
ایک یعنی غم ملت ہمیشہ تازہ ہے

دنیا میں عیش و سرت کی کمی نہیں، لیکن ایک غم، ایک غم، یعنی غم ملت ہمیشہ تازہ ہے، یہ ایسا ہے جو تمام خوشیوں کو پھیکا کر دیتا ہے، اور وہ ہے غمِ ملت کہ افراد کی موت پر تو آخر کسی وقت صبر آجاتا ہے، لیکن پوری قوم کی قوم مردہ ہو جائے تو اس غم کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ یہ غم ہمیشہ تازہ رہتا ہے۔

☆

حاصل بھی لا حاصل بھی:

ڈاکٹر اقبال کئی روز سر اکبر حیدری کے مہمان رہے، حیدر آباد کی کئی سرکردہ شخصیات سے بھی ملاقاتیں ہوئیں، واپسی پر اورنگ آباد میں مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے مزار پر حاضری دی۔ اس طرح ۲۹ مارچ ۱۹۱۰ء کو واپس لاہور پہنچے۔ اس سفر کے تاثرات اور مقصد کا اظہار لاہور پہنچنے کے دوسرے روز ہی آپ نے عطیہ فیضی کو ایک مکتوب میں اس طرح کیا۔

"اگر میرا قیام حیدر آباد میں کچھ دن اور رہتا تو مجھے یقین ہے کہ ہز ہائی نس نظام مجھے ضرور شرف باریابی بخشتے۔ میں حیدر آباد میں جملہ اکابر سے ملا، اکثر نے مجھے اپنے ہاں مدعو کیا، میرا سفرِ حیدر آباد بلا مقصد نہ تھا۔ عندالملاقات عرض کروں گا۔ میرے پاس رخصتِ اتفاقی کے صرف چند روز تھے، جو ۲۸ مارچ کو ختم ہو گئے۔ میں ۲۳ مارچ کو حیدر آباد سے روانہ ہوا، اور لاہور پہنچنے میں چار دن لگے۔ علاوہ ازیں واپسی پر مجھے حضرت عالمگیرؒ کے مزارِ پُرانوار پر بھی حاضر ہونا تھا۔ حضرت عالمگیرؒ پر ایک ایسی وجد انگیز نظم لکھوں گا کہ اُردو والوں نے آج تک دیکھی نہ ہوگی۔ میں ۲۹ مارچ کی صبح لاہور پہنچا۔ سیدھا کالج گیا اور وہاں سے عدالتِ عالیہ۔ اِن حالات میں میرے لیے جنجیرہ کا سفر کیوں کر ممکن تھا۔"

تگ و دو کا سبب:

یاد رہے جنجیرہ ایک چھوٹی سی ریاست، بمبئی کے قریب ہی ہے اور جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے عطیہ فیضی کا تعلق اسی ریاست کے حکمرانوں سے تھا اور ہمیں یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ اقبال فکرِ معاش سے آزاد ہو کر شعروادب کی طرف توجہ دینا چاہتے تھے تا کہ قومی مقاصد کے حصول میں دل چسپی لے سکیں۔ لیکن چوں کہ سرکارِ برطانیہ کی ملازمت آپ کے اس مقصدِ عظیم کے حصول کی راہ میں حائل ہوتی تھی۔ لہٰذا آپ کی خواہش بلکہ آرزو تھی کہ کسی دیسی ریاست میں جگہ مل جائے تا کہ ایک طرف معاش سے بے فکری ہو جائے، دوسری طرف آزادی کے ساتھ وہ اس آواز کو بلند کر سکیں جس کی اس وقت ملت کو سخت ضرورت تھی، دوسرے لفظوں میں ساکنانِ برصغیر، خصوصاً برصغیر کی مسلم آبادی کو ہوش دلا سکیں کہ وہ احساسِ زیاں کھو چکی ہے۔ ورنہ وہ ایک زندہ اور باوقار قوم ہے، لیکن برسوں کی غلامی نے اُن کی آبرومندی اور تشخص کو گرد آلود کر دیا ہے۔ یہ تڑپ اور آرزو اور یہ سوز تھا آپ کے سینے میں اپنی قوم کے لیے، جس نے آپ کو مضطرب کر رکھا تھا۔ لیکن اقبال بلند حوصلہ تھے، ہمت ہارنے والے نہ تھے، چاروں طرف ہاتھ پاؤں مار رہے تھے کہ کسی طرح اس عذاب سے جان چھوٹ جائے جو معاش کے نام پر آپ کو پسپا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کو شکست دینے کی غرض ہی سے آپ حیدرآباد گئے تھے اور اکبر حیدری کے ہاں قیام پذیر ہوئے تھے۔

سر اکبر حیدری:

اس جگہ میرے لئے ضروری ہو گیا ہے کہ میں حیدرآباد کی اس شخصیت کا تعارف قارئین سے کروا دوں جس نے ہمارے اقبال کو حیدرآباد میں مہمان رکھا اور ان کی نہایت شاندار پذیرائی کی ......تو آیئے دیکھتے ہیں، یہ اکبر حیدری صاحب کون ہیں؟ محمد اکبر نذر علی حیدری سے علامہ اقبال کی ملاقات اس وقت ہوئی جب آپ ۱۹۱۰ء میں حیدرآباد تشریف لائے، سر اکبر حیدری بمبئی میں پیدا ہوئے، بی اے کے امتحان میں امتیازی حیثیت سے کامیاب ہوئے، پھر انڈین آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس کے امتحان میں کامیابی کے بعد محکمۂ مالیات میں ملازم ہو گئے اور ترقی کر کے صوبہ جات

متحدہ کے اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ جنرل مقرر ہوئے۔اس کے بعد بمبئی اور مدراس میں ڈپٹی اکاؤنٹنٹ جنرل کے عہدے پر فائز ہوئے۔اکتوبر ۱۹۰۰ء میں ریاست حیدرآباد نے ان کی خدمات مستعار لے لیں۔یہاں شعبۂ مالیات کے علاوہ اکاؤنٹنٹ جنرل، سیکریٹری تعلیمات، عدالت، امور مذہبی، صنعت و حرفت وغیرہ محکموں پر بھی فائز رہے۔بعد میں خود حکومت برطانیہ ہند میں ان کی خدمات واپس لے لیں لیکن کچھ ہی عرصہ بعد نظام حیدرآباد نے انہیں پھر بلا کر مشیر مالیات مقرر کیا اور نواب حیدر نواز جنگ بہادر کا خطاب عطا کیا۔بعد میں سرکار برطانیہ نے انہیں ''سر'' کا خطاب دیا۔

سر اکبر حیدری کی حیدرآباد میں خدمات بہت نمایاں ہیں، مثلاً انہوں نے محکمۂ آثارِ قدیمہ قائم کیا، یہاں موجود ''اجنتا اور ایلورا'' کے مشہور غاروں کے تحفظ کو یقینی بنایا۔ریاست کے دستور میں ضروری اصلاحات کیں، عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام حیدری صاحب کا نمایاں ترین کارنامہ ہے، کیونکہ اس میں انہوں نے اُردو کو ذریعۂ تعلیم قرار دیا۔

جیسا کہ آپ کے علم میں آچکا ہے کہ علامہ صاحب مارچ ۱۹۱۰ء میں حیدرآباد تشریف لے گئے تو اکبر حیدری صاحب نے ان کا استقبال کیا اور اپنے ہاں ٹھہرایا۔اسی عرصے میں ریاست گوالیار سے بھی رابطہ ہوا۔وہاں بھی کوئی مناسب صورت نہ بن سکی۔انہی دنوں سر علی امام کی طرف سے آپ کو اطلاع ملی کہ راجستھان کی ریاست الور میں راجہ صاحب کے سیکریٹری کی جگہ خالی ہوئی ہے، آپ وہاں ضرور جایئے، چناں چہ رابطہ کرنے کے بعد آپ علی بخش کو لے کر وہاں پہنچے لیکن تنخواہ حسبِ خواہش نہ تھی، اس لیے واپس آگئے۔آپ نے ریاست حیدرآباد دکن کی ایک مقتدر اور اعلیٰ صفات شخصیت کشن پرشاد شاد کو خود ایک مکتوب میں لکھا: ''الور کی ملازمت نہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ تنخواہ قلیل تھی، سات آٹھ سو روپے ماہوار تو لاہور میں بھی مل جاتے ہیں۔اگرچہ میری ذاتی ضروریات کے لیے تو اس قدر رقم بھی کافی ہے، بلکہ اس سے زیادہ ہے، تاہم چوں کہ میرے ذمے اوروں کی ضروریات کا پورا کرنا بھی ہے، اس واسطے اِدھر اُدھر دوڑ دھوپ کرنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے، گھر بھر کا خرچ میرے ذمے ہے، بڑے بھائی جان جنہوں نے اپنی ملازمت کا اندوختہ میری تعلیم پر خرچ کر دیا، اب پنشن پا گئے، اُن کے اور اُن کی اولاد کے اخراجات بھی میرے ذمے

ہیں اور ہونے چاہئیں۔ غرض کہ مختصر طور پر یہ حالات ہیں جو مجھے بسا اوقات مزید دوڑ دھوپ کرنے پر مائل کر دیتے ہیں۔"

یہاں ان صاحب یعنی کشن پرشاد سے متعلق بھی قارئین کو بتا دینا ضروری ہے، خصوصاً یہ بات کہ کشن پرشاد صاحب کا ہمارے اقبال صاحب سے کیا تعلق تھا۔

مہاراجا کرشن پرشاد، شاد تخلص کرتے تھے، ان کے والد، راجا ہری کشن دکن میں محکمۂ نظم جمعیت میں سرشتہ دار تے، شاد نے ابتدائی تعلیم کے بعد، فارسی، عربی اور سنسکرت زبانوں اور فنون میں خطاطی اور سپہ گری میں مہارت حاصل کی۔ پیش کاری اور فوج میں صدر المہام کے عہدے پر رہے اور دو بار ریاست دکن کے صدر اعظم (وزیر اعظم) منتخب ہوئے۔ شاد صاحب کا رہن سہن امیرانہ تھا، لیکن مزاج میں فقیری تھی، گویا یا مسلماں اللہ اللہ، یا برہمن رام رام کے صوفیانہ مسلک سے منسلک تھے۔

کہتے تھے:

میں ہوں ہندو، میں ہوں مسلماں
ہر مذہب ہے میرا ایماں

ان کے اس خیال و نظریہ کی تصدیق نہ صرف ان کی عملی زندگی سے ہوتی ہے بلکہ مزید صراحت ان کے اس وصیت سے عیاں ہے جو انھوں نے اپنے بیٹے کو کی۔ کہتے ہیں:

"میں تعصب اور نفرت کو بری نظر سے دیکھتا ہوں۔ ہر مذہب اور قوم کی عزت کرتا ہوں، انصاف، راستی اور عدل کو انسان کے بہترین جوہر سمجھتا ہوں۔"

علامہ اقبال کی ان سے پہلی ملاقات ۱۹۱۰ء میں ہوئی جب آپ حیدر آباد تشریف لے گئے۔ جس کا ابھی تذکرہ ہو چکا ہے۔ وہاں نہ صرف آپ نے ہندستان کی اس شاندار مسلم ریاست کی تعریف میں شعر کہے وہیں ریاست کے صدر اعظم کرشن پرشاد شاد کی بھی منظوم تعریف کی:

مسند آرائے وزارت راجۂ حشم
روشن اس کی رائے روشن ہے نگار روز گار

اس کی تقریروں سے رنگیں گلستان شاعری
اس کی تحریروں پہ نظم مملکت کا انحصال
نقش وہ اس کی عنایت نے مرے دل پر کیا
محو کر سکتا نہیں اس کو مرور روزگار

مہاراجا صاحب ۱۹۱۳ء میں پنجاب کی سیر کو آئے تو علامہ صاحب سے بھی ملاقات کی، یہ ان دونوں اہل علم کی دوسری ملاقات تھی، اس طرح ۱۹۱۶ء سے باہمی خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

سفر کے تاثرات:

حیدر آباد دکن سے آپ 28/مارچ کو واپس لاہور پہنچے اور اپریل کے مہینے سے آپ نے اپنی یادداشتیں (تاثرات) بہ عنوان STRAY REFLECTION لکھنا شروع کیں۔

ایک مقالہ بہ عنوان۔POLITICAL THOUGHT IN ISLAM (اسلام کا سیاسی نظریہ) تحریر کیا جو ہندوستان ریویو میں شائع ہوا۔

حیدر آباد دکن میں جس طرح آپ کا پُرتپاک استقبال کیا۔ اس وقت کے تاثرات علامہ صاحب نے، عطیہ فیضی کے نام اپنے ایک مکتوب میں اس طرح تحریر کیے ہیں۔

''حیدری صاحب ایک پابند وضع اور وسیع المشرب بزرگ ہیں، ان سے ملاقات سے قبل میری رائے تھی کہ وہ اعداد و شمار سے کام رکھنے والے ایک خشک طبع انسان ہوں گے، لیکن میں نے دیکھا ہے قدرت نے انہیں دردِ دل اور نگہ بلند کی نعمتوں سے مالا مال کیا ہے۔''

علامہ صاحب اپنے سفر حیدر آباد کی روداد لکھتے ہوئے بیان کرتے ہیں۔

''مسٹر نذر علی حیدری بی اے مشیر فنانس کی قابل قدر خدمات اور وسیع تجربہ سے دولت آصفیہ مستفید ہو رہی ہے، مجھے ایک شاندار مگر حسرت ناک گنبدوں کی زیارت کو لے گئے، جن میں سلاطین قطب شاہیہ سو رہے ہیں، رات کی خاموشی، ابر آلود آسمان اور بادلوں سے چھن کر آتی ہوئی چاندنی نے پُرحسرت منظر کے ساتھ مل کر میرے دل پہ گہرا اثر کیا جو کبھی فراموش نہیں ہوگا۔ میری نظم ''گورستان شاہی'' انہی بے شمار تاثرات کا ایک اظہار ہے۔ اس کو میں اپنے سفر کی

یارجنگ۔ میں مسٹر حیدری اور ان کی بیگم صاحبہ مسز حیدری کے نام منسوب کرتا ہوں، جنہوں نے میری مہمان نوازی اور میرے قیام حیدرآباد کو دلچسپ بنانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔"

پاکستان سے پہلے پاکستان:

: یہ تو بیان تھا ڈاکٹر اقبال کا جو اپنی عزت افزائی کا حرف سپاس پیش کرنا ضروری سمجھتے تھے، لیکن اس وقت نہ جانے کیوں مجھے میرا دل اس جگہ مجبور کر رہا ہے کہ میں ہندوستان میں مسلمانوں کی اس متمول ترین ریاست کے بارے میں اپنے قارئین کو یہ بتاتا چلوں کہ جو پاکستان سے پہلے پاکستان کی حیثیت رکھتی تھی، جس خطہ میں پاکستان قائم ہوا تو وہاں خاک اُڑ رہی تھی، مادی اعتبار سے نہایت پسماندہ، نادار اور مفلوک الحال علاقے اس کو میسر آئے تھے، خزانے میں کوڑی نہیں تھی اور اس نوزائدہ ریاست کو پیر جمانے کے لیے پیسے ٹکے کی سخت ترین ضرورت تھی، اس نازک ترین وقت میں اسی ریاست کے نظام (سربراہ) نے اپنے ایک وزیر میر لائق علی کو کئی کنستر سونے کے بھروا کر بذریعہ ہوائی جہاز پاکستان روانہ کیا جس سے پاکستان نے اپنی شیر خواری کے وقت آنکھیں کھولیں اور طاقت پکڑنا شروع کی۔ جب کہ اس محسن پاکستان ریاست کے سفیر نے اسی ملک پاکستان میں، لانڈھی کے علاقے میں اپنے آخری ایام گزارے، اور پاکستان کے بعد کے "قابضین" نے ان کی کوئی خیر خبر نہ لی، سنا ہے میر صاحب موصوف نے ماچس بنانے کا چھوٹا سا کارخانہ قائم کرلیا تھا، اسی میں اپنی گزر بسر کر کے اس پاکستان کا نمک بن گئے۔ جہاں وہ وزیر و سفیر بن کر آئے تھے ایک یہی کیا، پاکستان کے شہید اعظم پہلے وزیر اعظم نواب زادہ لیاقت خان کی بہو کو گھر میں بسکٹ بنا کر فروخت کرتے ہوئے دیکھا گیا ہے جب کہ بعد کے لوگوں نے پاکستان کے ہر بڑے شہر میں بلاول ہاؤس قسم کے محلات اور جاتی امرا قسم کے طلسماتی قلعے تعمیر کر رکھے ہیں۔

قارئین سے معذرت کہ میں ان باتوں سے ذکر اقبال کو آلودہ کرنا نہیں چاہتا، لیکن اقبال مندی کے ساتھ ساتھ دردمندی بھی رکھتا ہوں، مجبور ہو گیا تھا تاہم مکرر معذرت خواہ ہوں۔

محسن پاکستان ریاست:

ہاں تو بات حیدرآباد کی ہو رہی تھی، جو ابھی ختم نہیں ہوئی، یہی عظیم مسلم ریاست ہے جس

نے پاکستان کے ساتھ الحاق کا اعلان کیا اور عین اس رات جب بانی پاکستان اپنی قوم کو الوداع کہہ کر خالق حقیقی سے ملاقات کے لیے جا رہے تھے، کہ ہندوستان نے "اعلان جرم" کی پاداش میں ریاست پر شب خون مارا اور عسکری قوت کے ذریعے اس پر قبضہ کر لیا۔ لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ ہم صرف کشمیر کو روتے رہتے ہیں، اور حیدر آباد ایک اور دوسری مسلم ریاست جوناگڑھ کا تذکرہ ڈھیلے سروں میں بھی نہیں کرتے اس لیے کہ ان کے ڈانڈے یہاں کی کسی مقامی قومیت سے نہیں ملتے۔

اسی سال ۲۶ رجولائی، کالج کی انجمن نے علامہ صاحب کو سیکریٹری منتخب کیا اور 31 ردسمبر آپ نے کالج کی ملازمت خیر باد کہہ دی۔ آپ کو الوداعیہ دیا گیا۔ اسی دوران آپ نے انگریزی کے ایک نمایاں شاعر رابرٹ براؤننگ کی شاعری پر لیکچر دیا۔

☆☆

maablib.org

اقبالؔ کو ستانے کے لیے ایک طرف فکرِ معاش تھی اور دوسری طرف خانگی زندگی میں گھلی ہوئی تلخی، جو کم ہونے کی بجائے روز بہ روز بڑھتی جا رہی تھی، اِس تلخی کا سبب وہ فیصلہ تھا جو بزرگوں نے فریقین کی مرضی معلوم کیے بغیر کم سنی میں کر دیا تھا، گو چھوٹی عمر میں شادی کا رواج اُس زمانے میں کوئی انوکھا نہ تھا۔ ماں باپ اُس دور میں اولاد کو بالغ ہوتے ہی رشتۂ ازدواج میں باندھ دیا کرتے تھے۔ لیکن اقبالؔ کا معاملہ الگ تھا۔ وہ ایک حساس دل اور روشن دماغ انسان تھے، شادی کے وقت اُن کی عمر سولہ سال تھی جبکہ اہلیہ اُن سے دو تین سال بڑی تھیں۔ مسئلہ یہ نہیں تھا، خرابی دراصل یہ تھی کہ دونوں کے مزاج میں زمین و آسمان کا سا فرق تھا، کریم بی بی متمول گھرانے سے تعلق رکھتی تھی، ناز و نعم میں پلی بڑھی تھی، جبکہ اقبالؔ کی داخت و پرداخت نہایت سادہ اور درویشی ماحول میں ہوئی تھی۔ اِن باتوں کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو یہ ایک بے جوڑ شادی تھی، اِس کے باوجود اقبالؔ نے ایک سعادت مند بیٹے کی طرح اپنے بزرگوں کے فیصلے کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا، اور اہلیہ کو بھی برابری کا درجہ دے کر اُس کے ساتھ ہر چیز نبھانے کی کوشش کی، جس کا ثبوت یہ ہے کہ صاحبِ اولاد ہوئے۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی اُن سے ہوئی لیکن ۱۸۹۰ء سے کشیدگی شروع ہوئی تو بڑھتی چلی گئی اور اقبالؔ جب یورپ گئے تو عائلی ناآسودگی اُن کے ساتھ تھی۔ اِن حالات کے پیشِ نظر اُن کے دل میں دوسری شادی کا خیال آنا فطری عمل تھا، ممکن ہے ایسا ہوا بھی ہو، کیوں کہ کچھ مواقع ایسے میسر بھی آئے، ہمارا اشارہ عطیہ فیضی اور ایما ناست کی طرف ہے۔ لیکن عطیہ کی جانب سے غیر معمولی توجہ کے باوجود اقبالؔ نے اُن کی طرف سے دریچۂ دل بند کیے رکھا کیوں کہ عطیہ شاہانہ

ماحول کی پروردہ تھی۔ یہ درست ہے کہ وہ بہت ذہین اور فطین تھی فکر وخیال کی بزم سجانا جانتی تھی نشست و برخاست میں بھی خوب سے خوب تر تھی لیکن اُس کی یہ تصویر اقبالؔ ایسے قلندر کے خانہ حیات کے لیے مناسبت نہیں رکھتی تھی۔ اُس دور میں جب عطیہ فیضی سے اقبالؔ کا تعارف ہوا، دوسری خاتون ایما اُن کے دائرۂ نظر میں داخل ہوئی جو حسنِ اتفاق کہ اُن کی اُستانی بن کر آئی۔ ہائیڈل برگ میں گزارے ہوئے اقبالؔ کے شب و روز کی کہانی میں سے اِس بات کو بہرحال حذف نہیں کیا جا سکتا کہ غیر ارادی اور محسوس کن طور پر اُستاد و شاگرد دونوں کی شخصیت نے ایک دوسرے کو متاثر بھی کیا اور قبول بھی کیا تھا۔ جس کی روداد ہم یورپ کے حوالے سے کسی قدر واضح انداز میں بیان کر آئے ہیں۔ ایما ناست نوشباب ہوتے ہوئے بھی ایک پختہ کار خاتون تھی، وہ علم و ادب کی پروردہ تھی اور اپنے خاندان کا دماغ سمجھی جاتی تھی۔ اگر دل میں اقبالؔ کی طرف سے کسی چاہت اور محبت کا ستارہ طلوع ہوا بھی تھا تو اِس لیے کہ وہ آدابِ محبت سے واقف تھی، محبت کے تقدس سے بھی آشنا تھی، اقبالؔ رشتے میں اُس کے شاگرد تھے لیکن اُن کی غیر معمولی شخصیت کو سر اُٹھا کر دیکھتی ہوگی تو اُسے وہ ایک ناقابلِ تسخیر ہستی نظر آتے ہوں گے۔ اِدھر اقبالؔ نے اگر ایما کو اپنے دل کے قریب خرامِ ناز کرتے محسوس کیا ہوگا تو اُن کے لیے بھی ممکن نہ تھا کہ مغرب کی شہزادی کو مشرق کے ایوان میں مدعو کرنے کے لیے تمام تکلفات کو اُٹھا کر بالائے طاق رکھ دیتے، وہ کوئی معمولی انسان نہ تھے۔ اِس کے باوجود کہ اُن کی زندگی میں ایک بڑا خلا تھا، جسے وہ شدت سے محسوس کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ کوئی اُن کے افکار و جذبات کی محفل میں شریک ہو، اُن کا ہم دم و دم ساز بنے، لیکن ان جذبات سے مغلوب نہیں ہوئے، ہائیڈل برگ کی رومان پرور فضا، اور ایما ایسی روح کو چھونے والی دل شناس شخصیت کی رفاقت نے اُنھیں اُن کے مقصد سے ذرہ برابر بھی دور نہیں ہونے دیا، اقبالؔ ایما سے جرمن زبان سیکھتے رہے اور اُس زبان کو بھی سمجھتے رہے جو وہ اپنی آنکھوں سے بولتی اور ادا کرتی تھی، لیکن اقبالؔ نے جواب میں تجاہلِ عارفانہ سے کام لیا۔ فقط گوئٹے کے فن کو جاننے اور سمجھنے کی خواہش کا اظہار کرتے رہے۔ اِسی احتیاط نے دونوں کو اظہار کے لیے کچھ اور ہی نہیں بخش دی، اقبالؔ نے دریائے نیکر کے کنارے بیٹھ کر اپنے جذبات کو باہر نہ آنے دیا، لیکن بعد میں جب اقبالؔ اُس کے پاس سے لوٹ گئے تو اُن کو کاغذ پر مکتوب کی شکل

میں منتقل کر دیا۔ وہ کچھ کہہ دیا جو ہائڈل برگ کی خاموش اور رومان پرور فضا میں اتنے بلند آہنگ میں وہ نہ کہہ سکے تھے۔

وطن آ کر معمول کی زندگی شروع کی اور کریم بی بی سے اُسی عزت و احترام کے ساتھ پیش آئے جو باوجود ذہنی اختلاف کے آپ نے اُن سے روا رکھے ہوئے تھے۔ وہ جب بھی لاہور آتیں ، اقبالؔ اُن کا ایک فرض شناس شوہر کی طرح خیال رکھتے ، لیکن اختلاف کی خلیج بڑھتی گئی اور پھر اُس نے ایک سرد جنگ کی شکل اختیار کر لی۔ ڈاکٹر صاحب کے والد محترم اور برادر معظم نے بہت کوشش کی کہ آپ کوئی ایسا قدم نہ اُٹھائیں جو اولاد کے لیے تکلیف کا سبب بنے مگر اقبالؔ کا گویا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا تھا ، بڑی کشمکش اور اضطراب کے عالم میں روز و شب گزار رہے تھے۔ لہٰذا اب آپ کے پاس اِس کے سوا کوئی راستہ نہیں رہ گیا تھا کہ علیحدگی اختیار کر لیں۔ لیکن کریم بی بی نے طلاق کو اپنی عزت نفس کے خلاف سمجھا اور آخر طلاق کے بغیر "اِدھر ہم ، اُدھر تم" کی بنیاد پر فیصلہ طے پا گیا۔ [illegible] کفالت کی ذمے داری قبول کر لی جس کو آخر دم تک نبھاتے رہے۔ جیسا کہ آپ نے خود فرمایا:

> "شرعاً میرے سامنے دو ہی راستے تھے ، طلاق یا کفالت کی ذمے داری ، والدہ آفتاب طلاق پر راضی نہ ہوئیں ، میں نے بہ خوشی کفالت کی ذمے داری قبول کر لی۔"

اِس تصفیے کے بعد اقبالؔ ہر ماہ ایک مقررہ رقم بھیج دیا کرتے ، یہاں تک کہ آخری علالت کے دوران بھی اِس میں ناغہ نہ آنے دیا ، البتہ علالت نے طوالت اختیار کر لی اور مالی پریشانی بڑھ گئی تو بامرِ مجبوری رقم میں کچھ کمی کرنا پڑی۔ آخری منی آرڈر ڈاکٹر صاحب نے ایک رفیق نذیر نیازی کے ہاتھوں روانہ کیا۔

دراصل ڈاکٹر اقبالؔ کی ازدواجی زندگی کا یہ تکلیف دہ معاملہ اِس لیے بھی پیش آیا کہ رشتہ کرنے میں عجلت برتی گئی۔ رشتہ کرانے والے نے دونوں خاندانوں کے مابین فرق کو نہیں دیکھا ، اقبالؔ کا گھرانا سادگی کا پیکر ، تکلفات سے بری ، جب کہ ڈاکٹر عطا محمد صاحب کا خاندان متمول ہونے کے سبب پُرتکلف "لائف آف اسٹائل" والا تھا۔ نیز دونوں خاندان الگ الگ شہروں میں

ہونے کے سبب پوری طرح ایک دوسرے کے حالات سے بھی ناواقف تھے۔ ایک گھرانا سیال کوٹ میں، دوسرا خاندان گجرات میں تھا، اس طرح طرفین کے مزاج کے فرق کو سمجھے بغیر انھیں ایک دوسرے کا رفیقِ حیات بنا دیا گیا۔ اس کے باوجود اقبالؔ کے قریبی حضرات اور اُن کے اس ازدواجی اُلجھن سے واقف احباب کا بیان ہے کہ اقبالؔ نے نبھانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن کوئی صورت نہ نکل سکی۔ بات بنتی تو کیسے کہ ایک طرف والدہ آفتاب کی طبیعت کا اپنا انداز تھا، جو وہ میکے سے لے کر آئیں، بدلنے پر بالکل تیار نہ تھیں۔ مزاج صلح جوئی سے خالی تھا، دوسری طرف اقبالؔ کے لیے بھی اپنی روش کو بدلنا ممکن نہ تھا۔ یہ تمام عوامل تھے جن کی بنیاد پر حالات میں بگاڑ آتا چلا گیا۔ درمیان میں کئی احباب نے صلح کی کوشش کی لیکن ناکام رہے، البتہ اُنھیں اس بات کا بہ خوبی علم ہو گیا تھا کہ اقبالؔ اپنے موقف میں درست اور حق بہ جانب ہیں۔ ان خیر خواہ ثالثین نے دیکھ لیا تھا کہ اقبالؔ کی وسیع القلبی اور خیر اندیشی کے جواب میں دوسری جانب رویہ مختلف ہے، اس طرح آخر کار یہ ناگوار صورتِ حال اپنے منطقی نتیجے پر پہنچ کر ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔

☆☆

maablib.org

ایک نیا غم:

اس مستقل علیحدگی کے بعد یہ نہیں کہ اقبالؔ سکھ کا سانس لینے لگے۔ بلکہ وہ ازدواجی سکون جو اب تک آپ کو میسر نہ آ سکا تھا، آپ کو اور بھی زیادہ اُس کی ضرورت محسوس ہونے لگی، لیکن وہ جو کہتے ہیں "دودھ کا جلا چھاج کو بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے"، آپ ایک ایسے ساتھی کی تلاش میں تھے جو آپ کو گھریلو سکون پہنچانے کے ساتھ ساتھ اِس خلا کو بھی پُر کر سکے جو آپ کی شاعرانہ زندگی میں بھی واضح طور سے نظر آ رہا تھا۔ آپ کی اِس بے چینی اور اضطراب کو آپ کے احباب اچھی طرح سے محسوس کر رہے تھے، لہٰذا اُنہوں نے اِس سلسلہ میں کوششیں شروع کر دیں، ظاہر ہے، مختلف خاندانوں سے رابطہ کیا ہوگا اور جو ہمارا معاشرتی انداز ہے، اُسے اختیار کرتے ہوئے سلسلہ جنبانی آگے بڑھانے کی کوشش کی ہوگی، چناں چہ اِس تگ و دو کے نتیجے میں قرعہ فال کشمیری خاندان کی ایک صاحب زادی سردار بیگم کے نام نکلا، جو محض قرآن کریم پڑھی ہوئی تھی، اور کہا جاتا ہے کچھ اُردو کی شد بد بھی تھی جو گھر پر ہی پڑھنے سے آ گئی ہوگی۔ یہ خاندان لاہور کے موچی دروازے میں رہائش پذیر تھا اور یوں ۱۹۱۰ء میں انیس سالہ سردار بیگم شیخ محمد اقبال کے نکاح میں آ گئیں، لیکن یکا یک رخصتی کو موخر کرنا پڑا۔ اس اِلتوا کا سبب یہ ہوا کہ عین وقت پر ڈاکٹر صاحب کو کئی گم نام خطوط ایسے موصول ہوئے جن میں سردار بیگم کے کردار کو مشکوک بنا کر پیش کیا گیا تھا۔ ظاہر ہے، اقبالؔ کیا کسی بھی شخص کے لیے یہ صورتِ حال پریشانی کا سبب بن سکتی تھی۔ آپ تذبذب میں پڑ گئے اور آخر آپ نے نو بیاہتا بیگم کو رخصت کرا کے گھر لانے سے ہاتھ روک

لیا۔ لیکن اس طرح ذہنی اُلجھنوں میں اور اضافہ ہوگیا۔ عجیب بات ہے کہ ابھی ایک بیوی سے علیحدگی کا تکلیف دہ مرحلہ گزر چکا تھا کہ دوسری کے متعلق جو ابھی رخصت ہو کر بھی نہیں آئی، یہ ناگوار بات سن کر عجیب کشمکش میں پڑ گئے اور شدید ذہنی دباؤ محسوس کرنے لگے۔ اپنی اس پریشانی کا اظہار آپ نے اپنے کچھ احباب سے کیا، جنہوں نے اِس معاملے کی اصل حقیقت جاننے کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔ لیکن خطوط کی تحریر پڑھ کر ڈاکٹر اقبالؔ کی غیرت نے گوارا نہ کیا کہ وہ ایسی خاتون کو گھر میں لائیں۔ چناں چہ طلاق کا ارادہ کر لیا، تاہم فیصلہ محفوظ رکھا۔

☆☆

شکوہ:

یں آپ کی قابلِ ذکر نظم ''شکوہ'' ہے جو آپ نے انجمن حمایت الاسلام کے سالانہ جلسہ میں پڑھی، جس میں آپ کے والدِ بزرگ وار بھی تشریف رکھتے تھے۔ ہم اِس واقعے کو ذرا تفصیل سے بعد میں بیان کریں گے۔ پہلے کچھ دیگر مصروفیات کی بات کرتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ دہلی میں ہونے والی ''آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس'' کے تیسرے اجلاس کے آپ صدر نشین ہوئے اور علامہ شبلی نعمانی نے آپ کو پھولوں کا ہار پہنایا۔ اپریل کی ۱۵ تاریخ کو پنجاب پراونشل ایجوکیشن کی داغ بیل ڈالی گئی اور آپ کو اس کی ایگزیکٹو کمیٹی کا سیکریٹری منتخب کیا گیا۔ اسی سال کے ختم ہوتے ہوتے آپ نے ایک مقالہ MUSLIM COMMUNITY تحریر کیا، جس کا ترجمہ مشہور صحافی و شاعر مولانا ظفر علی خاں نے اُردو میں، ''ملتِ بیضا پر ایک نظر'' کے عنوان سے کیا، جو علی گڑھ یونی ورسٹی میں پڑھا گیا۔ یہ مضمون اس اعتبار سے بہت اہمیت رکھتا ہے کہ یہ گویا آپ کے اعلیٰ مشن کی تمہید تھی۔ یا یوں کہیے کہ ملت کے بارے میں آپ کے فکر و نظر کا یہ پیش لفظ تھا۔ اس طرح یہ پورا سال آپ کی قلمی کاوشوں اور فکری کوششوں کے لیے بھرپور سال ثابت ہوا۔ لیکن ہم آگے بڑھنے سے پہلے اِس سال میں پڑھی جانے والی نظم ''شکوہ'' کا خصوصی تذکرہ کرنا ضروری خیال کرتے ہیں۔ دراصل اقبالؔ اپنی قوم کی حالتِ زار کا نہایت غور اور دردمندی کے ساتھ، گہرا مشاہدہ کرنے کے بعد خود کو جیسے کسی تپتے ہوئے صحرا میں آبلہ پائی کرتے محسوس کر رہے تھے۔ جس قدر ملتِ اسلامیہ کی زبوں حالی کو دیکھتے اسی قدر آپ کے اضطراب میں شدت پیدا ہوتی چلی

جاتی، یہاں تک کہ سوزِ دلی، جنونی کیفیت میں بدل گئی، اور فکر کا زاویہ ملت کی طرف سے خالق کی جانب ہو گیا۔ قوم کا مقدمہ لے کر خدا کے حضور حاضر ہو گئے۔ غمِ ملت، شکوہ بن کر لبوں پر آ گیا۔ یہی وہ منظوم شکوہ ہے جو اس دور میں تخلیق ہوا۔ جیسا کہ کہا گیا، یہ طویل نظم آپ نے انجمن حمایت الاسلام کے سالانہ جلسہ میں پڑھی اور سامعین میں آپ کے والدِ بزرگوار بھی تشریف رکھتے تھے۔ نظم پر اعتراض اُٹھ کھڑے ہوئے، پھر شائع ہونے کے بعد تو مخالفت نے اور بھی طوفانی صورت اختیار کر لی۔ اول تو نظم کا عنوان ہی (شکوہ) بہ ظاہر قابلِ گرفت لگ رہا تھا کہ ایک بندے کا اپنے خالق سے شکوہ بارگاہِ ایزدی میں خلافِ ادب ہے، دوم یہ کہ بادی النظر میں لہجہ بھی بے باک اور باغیانہ اختیار کیا گیا تھا۔ چناں چہ چاروں طرف سے تنقید و اعتراض کی ناوک فگنی شروع ہو گئی۔ بلکہ بعض مذہبی حلقوں کی طرف سے تو آپ کے خلاف کفر کے فتوے بھی صادر کر دیے گئے۔

سنگ زنی:

''اقبالؔ گستاخ ہے، دریدہ دہن ہے، اس کی طرف سے خدائے بزرگ و برتر کو نہایت گستاخانہ انداز میں مخاطب کر کے اُس عظیم ہستی کے لیے ''ہرجائی'' ایسا بے ہودہ اور نازیبا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔'' بلاشبہ ایسا ہی تھا، اقبالؔ اُمتِ احمدِ مرسل صلی اللہ علیہ وسلم کی وکالت کرتے اور اُس کا مقدمہ بارگاہِ خداوندی میں پیش کرتے ہوئے حدِ اعتدال سے گزر گئے تھے۔ لیکن سچ پوچھیے تو وہ اپنے ہوش میں ہی کب تھے، غمِ ملت نے اُن کے دل و دماغ کو زیروزبر کر کے رکھ دیا تھا۔ لیکن کیا کوئی مثال ایسی بھی لفظ و بیاں کی تاریخ میں ملتی ہے کہ کوئی پوری ملت کا مقدمہ لے کر جنابِ باری میں حاضر ہوا؟ اور اُس کا حالِ زار بیان کرتے ہوئے اتنا تڑپا اور مچلا کہ اپنے ہوش ہی کھو بیٹھا، جس نے اپنا ایمان ہی داؤ پر لگا دیا۔ تاہم بعد میں جب وہ ہوش میں آئے تو احساس ہوا کہ اُن کا اندازِ بیان اور لب و لہجہ جن اہلِ ایمان کو ناگوار گزرا ہے، خود اُن کو یہ ادراک کہاں کہ اس حال کو سمجھ سکے جو خدا اور بندے کے درمیان ہے، خدا دل کا حال جانتا ہے، وہ جانتا ہے کہ بندہ جذبات کی رو میں بہہ گیا تھا، تاہم اُس کے خلوص میں کوئی شک نہیں، لیکن اس کی سوزِ دلی نے اس کو شعلہ بار بنا دیا اور وہ جنوں میں کیا کیا کہہ گیا۔ تاہم اقبال یہی سمجھے کہ یہ اُن کا اور اُن کے خدا کا

معاملہ ہے، اور خدا اُن کے دل کی حقیقت کو جانتا ہے جو اخلاص ومحبت سے لبریز ہے، بہر حال ظاہر بینوں نے اُن کا سخت محاسبہ کیا، کڑی گرفت کی اور اُن پر اعتراض کی یلغار کر دی۔ لیکن اقبالؔ کو اُن کے خلوص نے مضبوط رکھا، یوں بھی قدرت نے اُنھیں بلند ہمت اور حوصلہ مند دل عطا فرمایا تھا، اِس یلغار سے پسپا ہو کر بیٹھ نہیں گئے، بلکہ اپنے مخالفین کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے، ایک دوسری نظم کہنا شروع کی جو اِس متنازعہ "شکوہ" کے جواب میں "جوابِ شکوہ" کے عنوان سے دوسرے سال منظرِ عام پر آئی جو ہمارے نزدیک عام فہم لکھی گئی ایک صفِ اوّل کی نظم ہے، جو ملت کے عام وخاص تمام لوگوں کے لیے ایک آئینہ ہے جس میں اُن کے تمام خدوخال واضح طور پر نظر آجاتے ہیں۔

فکرِ اقبال کی مقبولیت:

یہ ہنگامہ خیزی اپنی جگہ، تاہم اقبالؔ کی ملی شاعری نے دلوں کو گرما کر رکھ دیا تھا۔ آپ کے اشعار، خیبر سے لے کر راس کماری تک پڑھے اور سراہے جا رہے تھے۔ دوسری طرف سیاسی سطح پر بھی آپ قومی مصلح کی حیثیت سے متحرک ہو چکے تھے۔ قومی وملکی معاملات کے اہم ترین موقعوں پر آپ کی شرکت کو ضروری اور باعثِ اعزاز سمجھا جانے لگا تھا۔ ۱۹۱۲ء میں فروری کی پہلی تاریخ کو لاہور کے باغ بیرون موچی دروازہ میں مسلمانوں کے ایک جلسۂ عام سے نہ صرف آپ نے خطاب کیا بلکہ وہ نظم بھی سنائی جو، اس سے قبل کی نظم شکوہ کے جواب میں لکھی گئی تھی جس کا عنوان ہی "جوابِ شکوہ" ہے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے کہا، یہ نظم کیا ہے ایک آئینہ ہے، جس میں مسلم قوم آج بھی اپنا چہرہ دیکھ کر نادم وپشیمان بھی ہو سکتی ہے اور اپنے چہرے پر سے داغ دھبوں کو صاف کرنے کی سعی بھی کر سکتی ہے۔ اس جگہ ہمارے لیے اُن حضرات کا شکریہ ادا کرنا لازمی ہے جنھوں نے حضرتِ اقبالؔ کی نظم شکوہ پر اعتراضات کیے اور اُن کا لہجہ اِس قدر شدید ہو گیا کہ آپ پر کفر کا فتویٰ بھی صادر فرما دیا گیا۔ سوچتا ہوں قدرت کے انداز بھی نرالے ہیں کہ اگر وہ حضرات معترض نہ ہوتے تو "جوابِ شکوہ" ایسا حقیقت انگیز اور مسلمانوں کی اصلاح کے لیے انتہائی اہم ترین شعری کلام معرضِ وجود میں نہ آتا۔ نظم "جوابِ شکوہ" کی اہمیت اس وجہ سے بھی بہت زیادہ ہے کہ اِس

میں بیان کردہ حقائق زمانے کے پابند نہیں، خصوصاً آج بھی مسلمانانِ عالم جس حالت سے گزر رہے ہیں اور اُن کی پریشانی اور بدحالی کے جو اسباب ہیں وہ اِس نظم میں انتہائی واضح اور پُر اثر انداز سے روزِ روشن کی طرح نمایاں نظر آتے ہیں۔ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ اِس وقت پوری دنیا میں اِس ملت کے سوا جس کے ساتھ لفظ "اسلامیہ" کا لاحقہ لگانا بھی اب غیر مانوس لگتا ہے، کسی اور قوم کو اتنی ذلت نہیں اُٹھانی پڑ رہی۔ کوئی اسلامی ملک ایسا نہیں جہاں بدامنی، بدحالی اور خون کی ارزانی نہ ہو، یہاں تک کہ اِس ملت کے افراد خود اپنے ہی لوگوں کے خونِ ناحق سے اپنے ہاتھ آلودہ کر کے اپنی پہچان اور شناخت کرا رہے ہیں۔ اِن حالات کو دیکھ کر ایامِ گزشتہ کی تمام خونیں داستانیں منظرِ عام سے محو ہو گئی ہیں۔

فکری سفر:

اب ہم اقبال کے اسی دور اور اِسی تسلسل میں لکھی گئی کچھ دوسری نظموں کا تذکرہ کرتے ہیں جو اِس بات کی غماز ہیں کہ ڈاکٹر اقبال کی فکر کس طرح اپنے اسلامی تشخص کو نمایاں کرتی نظر آتی ہے۔ اِس ضمن میں سب سے اوّل "ترانۂ ہندی" کا تذکرہ ضروری ہے، جس کا آج کے کچھ ناقدینِ اقبال اور نام نہاد دانش ور نہایت جاہلانہ اور بھونڈے انداز میں حوالہ دیتے رہتے ہیں کہ اقبال اپنے ہندوستانی ہونے پر فخر کرتے اور ہندوستان کو فخریہ طور پر اپنا وطن کہنے میں رطب اللسان نظر آتے ہیں اور جو، اُن کی کلیات میں "ترانۂ ہندی" کا عنوان لیے ہوئے آج بھی موجود ہے۔ ہم اُن ناقدین کی خدمت میں اولاً تو یہ گزارش کرتے ہیں کہ اقبال کے ہم عصر اکابرین میں سے کون سا ایسا مسلم راہ نما ہے جو اُس وقت ہندوستان کو اپنا وطن نہیں کہتا تھا، اور کیا ہندوستان کی زمین اُس خدا کی بجائے جس کو ہم معبودِ برحق جانتے ہیں، بت پرستوں کے جھوٹے خداؤں اور دیوتاؤں کی تخلیق کردہ ہے؟ جس کو اقبال اچھوت سمجھ لیتے؟ بالکل اِسی طرح کہ جیسا یہ دیوی دیوتاؤں کے پجاری خود اقبال اور آپ کی قوم کو اچھوت، ملیچھ اور شودر سمجھتے تھے، اور آج بھی مسلمان اُن کی نظر میں یہی حیثیت رکھتے ہیں۔ کیا اِس زمین پر مسلمان فاتحین نے ربِ کعبہ کے گھر تعمیر نہیں کیے؟ کیا توحید پرستوں کی جبینیں اِس سرزمین پر سجدہ ریز نہیں ہوئیں؟ کیا اِس زمین پر

مسلمان رویتِ ہلال سے چشم پوشی کرتے رہے؟ کیا یہاں اہلِ ایمان نے استقبالِ رمضان نہیں کیا؟ روزے نہیں رکھے؟ سحر و افطار کا اہتمام نہیں کیا؟ عیدین اور جمعہ کی نمازیں ادا نہیں کیں؟ کیا اس زمین پر رہ کر مسلمان اہلِ نصاب زکوٰۃ نہیں دیتے رہے؟ کیا اسی سرزمین سے مسلمان حج کے لیے نہیں گئے؟ کیا یہ وہ سمندر نہیں جس کی موجوں پر مسلمان سفر کرتے ہوئے سوئے حرم جاتے تھے اور جس کی موجیں ہندوستان کے ساحل سے ٹکراتی ہیں اور کیا یہ بحرِ ہند عرب نہیں کہلاتا؟ کیا اس زمین پر سینکڑوں اولیاء اللہ، صوفیا اور علمائے حق کے مدفن نہیں؟ اور کیا ہم اس زمین میں اپنے بزرگوں کو سپردِ خاک نہیں کرتے رہے؟ اور کیا اس سرزمین پر لاکھوں بت پرستوں نے اپنے دلوں میں شمعِ توحید روشن نہیں کی؟ کیا اس سرزمین پر خود اقبالؔ کے آبا کو دولتِ ایمان نصیب نہیں ہوئی؟ اور جب قصیدہ "بانت سُعاد" کے شاعر کعب بن مالک نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو "شمشیرِ ہند" سے تشبیہ دی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خوش ہو کر اپنی ردائے مبارک سے انھیں نہیں نوازا؟ تو اقبالؔ نے اگر اس دیارِ ہند کو اصطلاحاً اپنا وطن قرار دیا اور اُس کی تعریف میں شعر کہے تو ایسا کیا کسی کی نیت میں خلل آ گیا؟ کیا ایمان میں کفر گھل گیا؟ پھر جب اقبالؔ نے وطنیت کے اسلامی عالمی تصور کو پیش کیا تو کیا چین و عرب کے ساتھ ہندوستان کا نام نہیں لیا؟ کیا یہ وہ ہندوستان نہیں جس کے لیے رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی طرف سے آنے والی خوشبو کی خصوصی تعریف فرما کر اسے ہمارے لیے لائقِ تکریم بنا دیا؟ ہمارا خیال ہے ترانۂ ہندی کا طعنہ دینے والوں کو ان حوالوں کے بعد اپنی عقل کی بگڑی ہوئی صحت پر ضرور توجہ دینی چاہیے۔ اقبالؔ نے اصولی طور پر ہندوستان کو اپنا وطن خیال کیا، لیکن اُس وقت بھی اپنی قومیت کو ہندوستان تک ہی محدود نہیں رکھا، اُس وقت بھی آپ کے ذہن میں بہ حیثیت قوم ہندوستانی، ایرانی، تورانی اور افغانی کا تصور نہیں تھا، یعنی کسی موقع پر آپ نے وطنی قومیت کی بات نہیں کی، بلکہ جیسے جیسے قوتِ پرواز بڑھی، خیالات میں وسعت پیدا ہوئی تو آپ کے خیالات و نظریات میں واضح تغیر پیدا ہوتا چلا گیا، اور آپ نے روحِ اسلامی کی روشنی میں اُمتِ وسط کو جغرافیائی اور علاقائی قید و بند سے نکال کر عالمی سطح پر اور آفاقی فضا میں سانس لینے کا درس و پیام دیا۔ واضح طور پر اُمتِ اسلامیہ کے بارے میں کہا کہ وہ دیگر اقوام سے جدا اور اپنا ایک خاص تشخص رکھتی ہے۔ فرمایا:

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ

لہٰذا ''ترانہ ہندی'' منسوخ کیے بغیر آپ نے ''ترانہ ملی'' لکھا جس نے عام مسلمانوں کے ذہنوں سے قوم اور وطنیت سے متعلق جو دھند پھیلی ہوئی تھی وہ دور کر دی اور اقبالؔ محض ہندی نہیں بلکہ خالص اسلامی فکر رکھنے والے شاعر اور فلسفی بن کر سامنے آئے۔ اسی دوران آپ نے طرابلس کی جنگ کے حوالے سے کئی نظمیں تخلیق کیں، خصوصاً اس جنگ میں ایک کم سن عرب بچی فاطمہ بنت عبداللہ جو میدانِ جنگ میں زخمی مجاہدین کو پانی پلاتے ہوئے دشمن کا گولہ لگنے سے جامِ شہادت نوش کر گئی، جس نے اقبالؔ کے دل کو تڑپا کر رکھ دیا اور آپ نے اُس ننھی شہید کا وہ مرثیہ لکھا کہ سننے والوں کے دل پگھل کر رہ گئے۔

☆☆

ہوسِ ملک گیری میں سرتاسر ڈوبی ہوئی مغربی حکومتیں مسلمانوں کے علاقوں پر شب خون مار کر انہیں اپنے زیرِ تسلط کرنے کا کاروبار زور و شور سے کر رہی تھیں، اسی سلسلے کی ایک یلغار ۱۹۱۲ء میں لیبیا کی طرف ہوئی، جو اٹلی کی طرف سے کی گئی اور یہ جنگ طرابلس کہلاتی ہے، اس محاذ پر غازیوں کو پانی پلاتے ہوئے ایک عرب کم سن بچی دشمن کے گولوں کا نشانہ بن گئی۔ اس کی شہادت نے جہاں پوری امت کے دلوں کو فگار کر دیا، وہیں اقبالؔ تڑپ کر رہ گئے، اور اپنے خونِ دل کو اس معصوم شہید، فاطمہ بنت عبداللہ کی نذر کر دیا۔ پوری نظم سے ظاہر ہے گویا اقبالؔ کی زخم خوردہ روح اُڑ کر اسی محاذ پر جا پہنچی ہے جہاں یہ اس ننھی پری نے شہادت کا تاج اپنے سر پر سجایا تھا۔ تڑپ تڑپ کر اسے خراجِ عقیدت پیش کر رہے ہیں۔

فاطمہ! تو آبروئے امتِ مرحوم ہے
ذرہ ذرہ تیری مشتِ خاک کا معصوم ہے
یہ سعادت، حورِ صحرائی! تری قسمت میں تھی
غازیانِ دیں کی سقائی تری قسمت میں تھی

اس ننھی شہید کی غازیوں کے لئے سقائی کو علامہ صاحب ایسا جہاد قرار دے رہے ہیں جو

بے تیغ وسپر انجام دیا جاتا ہے۔فرماتے ہیں۔

یہ جہاد اللہ کے رستے میں بے تیغ و سپر
ہے جسارت آفریں شوقِ شہادت کس قدر

اور پھر فخر وانبساط سے سرشار ہو کر کہتے ہیں:

یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی
ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی

اور اس مجاہدانہ منظر کو دیکھ کر نہایت امید افزا انداز میں کہتے ہیں:

اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں
بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں

اقبالؔ کے اس فکری جہاد نے مسلمانانِ عالم پر ثابت کر دیا کہ اس "ہندی شاعر" کے سینے میں وہ بیدار وحساس دل دھڑکتا ہے جو پوری ملتِ اسلامیہ کے لیے مضطرب رہتا ہے۔تو کیا یہ حقائق ہمیں باور نہیں کراتے کہ اقبالؔ محض ایک شاعر نہیں بلکہ ایک عظیم مفکر و فلسفی اور قومی مصلح بن کر قومی و سیاسی اُفق پر جلوہ گر ہو رہے ہیں جو شعر کے پردے میں اپنی ملت کو بیدار اور اُس کی شخصیت سازی کرنے میں حکیمانہ انداز اپنا کر اپنا ملی فریضہ انجام دینے میں مصروفِ عمل ہو چکے ہیں۔

انہی دنوں ہندوستان کے بیشتر شہروں میں ہندو مسلمان فسادات پھوٹ پڑے۔کانپور میں مسلمانوں کو خون میں نہلا دیا گیا۔ان کے گھروں کے علاوہ مساجد کو بھی نذرِ آتش کیا گیا۔جس پر مسلمانوں نے شدید احتجاج کیا لیکن اس اصولی اور فطری ردِعمل کو بھی انگریز انتظامیہ نے طاقت کے ذریعہ روکنے کی کوشش کی اور مظاہرین پر گولی چلا دی۔جس کے نتیجہ میں کئی مسلمان شہید ہوئے، خصوصاً ان میں کئی بچے بھی شامل تھے۔انہی معصوم شہیدوں کو علامہ شبلی نعمانی نے نہایت جگر پاش انداز میں منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا۔جس میں قومی بے حسی کا بھی شکوہ شامل ہے۔

یہی دس بیس ہیں گر کشتگانِ تیغِ آزادی
تو مجھ کو سعیِ بازوئے قاتل سے شکایت ہے

شہیدانِ وفا کے قطرۂ خوں کام آئیں گے
عروسِ بحرِ زیبا کو بھی افشاں کی ضرورت ہے
عجب کیا ہے جو نوخیزوں نے سب سے پہلے جانیں دیں
کہ یہ بچے ہیں ان کو جلد سو جانے کی عادت ہے

اس ظالمانہ کارروائی کے بعد بڑی تعداد میں خود مسلمانوں کو گرفتار کرلیا گیا۔ اس خونیں واقعہ کے سلسلہ میں ڈاکٹر اقبال ایک مقدمہ کی پیروی کرنے کانپور تشریف لے گئے۔ خواجہ حسن نظامی بھی یہاں آئے ہوئے تھے، ان کے ہمراہ آپ نے شہر کے کلکٹر سے ملاقات کی۔ ظاہر ہے، انگریز افسر کی توجہ اس ظالمانہ کارروائی اور خونِ ناحق کی طرف کرائی ہوگی اور بتایا ہوگا کہ ایک تو مسلمانوں کی مقدس عبادت گاہ کی بے حرمتی کی گئی، پھر ان کے جائز احتجاج پر انہیں خون میں نہلا دیا گیا اور حد یہ ہے کہ انہیں پر مقدمے قائم کر دیئے گئے۔!!

کانپور سے آپ الٰہ آباد بھی تشریف لے گئے، جہاں، دہلی سے حکیم اجمل خاں آئے ہوئے تھے، حکیم صاحب نہایت سنجیدہ اور صاحب ثروت شخصیت کے مالک تھے، ہر طبقہ فکر بلکہ مقتدر حلقوں میں بھی عزت واحترام سے دیکھے جاتے تھے، علامہ صاحب نے حکیم صاحب سے ملاقات کی اور قومی معاملات پر ان سے تبادلہ خیال کیا۔

یہی سال تھا کہ آپ کی پہلی اولاد، اٹھارہ سالہ معراج بی بی خنازیر کے مرض میں ۱۴ نومبر کو وفات پا گئیں۔ مرحومہ کو اپنے والدین کی ناچاقی کا بہت صدمہ تھا، جو فطری عمل تھا، دراصل انہیں حقیقت حال کا علم ہوگیا تھا کہ والد نے تو مفاہمت کی حتی الامکان کوشش کی لیکن وہ..... بہرحال یہی ہونا تھا، سو ہو کر رہا۔

حسن چشم براہ:

سیالکوٹ میں موسم گرما کی تعطیلات گزار کر لاہور پہنچے تھے کہ پنجاب کے سابق حکمراں رنجیت سنگھ کی پوتی راجکماری صوفیہ جنداں بامبا کی طرف سے آپ کو پیغام ملا کہ آج شام ان کے ہاں مدعو ہیں۔ یہ اہتمام جیل روڈ پر واقع کوٹھی میں کیا گیا تھا اس طویل ملاقات کا سبب جنداں بامبا

کی آسٹریلین سہیلی کی خواہش تھی جو اپنے ملک سے یہاں آئی ہوئی تھی اور راجکماری جنداں کے ہاں مہمان تھی اور یہاں اس کی دیگر مصروفیات میں افقِ ہند پر ابھرتے ہوئے ہمالہ سے اونچے آفتابِ سخن سے شرفِ ملاقات حاصل کرنا بھی تھا۔ اقبال تشریف لے گئے اور ان باذوق خواتین کے ساتھ بزم آرائی فرمائی۔

اس ملاقات کے کچھ روز بعد راجکماری جنداں نے آپ کو پھر چائے پر مدعو کیا اور یہ اہتمام شالامار باغ میں کیا گیا۔ ملاقات میں مختلف موضوعات پر گفتگو کے دوران ایک شگفتہ پھول توڑ کر آپ کو پیش کیا اس پر آپ نے بعد میں ایک نظم کہی۔ جنداں کی ایک اور سہیلی بھی اس ملاقات میں شریک تھی، اس کے ساتھ اس کی پالتو بلی بھی تھی جس کو اس نے گود میں اٹھا رکھا تھا، یہ دیکھ کر اقبال کی شاعرانہ رگ پھڑک اٹھی اور اس منظر کو ذہن میں رکھ کر اس عنوان پر بھی "............ کی گود میں بلی دیکھ کر" نظم تحریر کی، یہ دونوں نظمیں آپ کے شعری مجموعے "بانگ درا" میں شامل ہیں۔ اس دور کی کئی نظمیں جو بانگ درا میں درج ہیں، ان میں "غرہ شوال"، "نوید صبح" اور بنت عبداللہ" کے علاوہ حیدر آباد دکن میں شاہی قبرستان کی "سیر" کے موقع پر لیے گئے تاثرات کے تناظر میں چھیڑی گئی نظم "گورستان شاہی" تخلیق پذیر ہوئی جو بعد میں بانگ درا کی زینت بنی۔

اقبال کی فکر نظم و نثر کے ذریعہ خوشبو کی طرح پھیلنا شروع ہو چکی تھی۔ باذوق ذہنوں نے آپ کو محسوس کرنا شروع کر دیا تھا، گویا عوام کے ساتھ ساتھ خواص کے ایوان بالا تک میں بھی فکر اقبال کے عطر آمیز جھونکوں نے رسائی حاصل کر لی تھی۔

☆

اس جگہ یہ بھی بیان کرتے چلیں کہ حضرت اقبال قومی معاملات پر اپنے ہم عصروں کے ساتھ رابطے میں رہتے تھے۔ انہی میں مشہور زمانہ شاعر اکبر الہ آبادی سے بھی آپ کی خط و کتابت شروع ہو چکی تھی۔ جناب اکبر الہ آبادی خالص قوم پرست اور راسخ الایمان مسلمان، قادر الکلام اور اپنی طرز کے منفرد شاعر ہیں۔ دراصل وہ بھی محض ایک شاعر نہیں، بلکہ قومی اور اصلاحی شاعر ہیں۔ انہوں نے اپنی اصلاحی و قومی شاعری کو اس ڈھب سے اختیار کیا کہ بادی النظر میں اُن کی شعری کاوشیں شگفتہ اور مزاح لیے نظر آتی ہیں، لیکن فی الاصل اُن کے اندر نہایت سنجیدہ اور حکیمانہ

پیغام پنہاں ہیں۔ اُن کا خیال تھا کہ قوم بہت زیادہ سنجیدہ باتوں اور نصیحت و پند پر توجہ نہیں دیتی اور نہ ہی اتنی گہرائی میں جا کر گمبھیر خیالات پر غور کرنے اور اُنہیں سمجھنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ بلکہ زندگی کے دیگر معاملات کی طرح اِس میں بھی بہت سہل پسند اور تن آسان ہو چکی ہے، لہٰذا حضرت اکبر الٰہ آبادی نے اپنی شاعری میں اِس حکمت کو اپنایا کہ مذاق ہی مذاق میں قوم کے سامنے پند و نصائح بیان کیے جائیں کہ سننے والا بیان کی شگفتگی سے حظ اُٹھائے اور جب ذرا ہنسی سے فرصت ملے تو اُس کے متن کی سنجیدگی کو محسوس کیے بغیر نہ رہ سکے۔ مثلاً اُن کا مشہور شعر ہے:

ہم ایسی سب کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے لڑکے، باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

دراصل حضرتِ اکبر کا اصلاحی محاذ خصوصی طور پر اُن ذہنوں کی اصلاح کرنا تھا جو مغربی تہذیب کی آبرو باختگی کا شکار ہو رہے تھے، یعنی اکبر، سرسید کی برپا کردہ تحریک مغربی تعلیم یا جدید تعلیم کے نہیں، مغربی تہذیب کے خلاف تھے، اور سرسید کے سب سے بڑے نقاد سمجھے جاتے تھے، اُنہیں اسلامی اقدار سے پیار تھا، وہ اُن کو مسلمانوں کے قومی تشخص اور اُن کی شناخت کے لیے ضروری قرار دیتے تھے، جب کہ مغربی طرزِ زندگی مسلمانوں کی نہ صرف دینی اقدار بلکہ دین سے ہی دور ہونے کا سبب بن رہی تھی۔ لہٰذا اکبر اپنی شگفتہ بیانی کے ذریعہ اُن لوگوں کو جو مغربی تہذیب کو آنکھیں بند کر کے دیوانہ وار قبول کر رہے تھے۔ خبردار کرنے لگے تھے کہ یہ عمل تمہیں کہیں کا نہ رکھے گا نہ تم "گورے" بن سکو گے اور نہ "کالے" رہو گے، اپنی شناخت ہی بھول جاؤ گے، بلکہ تمہارا وجود ہی خطرے میں پڑ جائے گا۔ اِس صورتِ حال میں حضرتِ اکبر کا کام بہت ہی اہم اور بروقت تھا، گویا وہ مغرب کی اِس اندھی تقلید پر ٹھیک ٹھیک نشانے لگا رہے تھے۔ ظاہر ہے درد ملت رکھنے والے اقبالؔ کو ایسی شخصیت کیوں نہ پسند آتی۔ اکبر، اقبالؔ کی پسندیدہ شخصیات کی فہرست میں شامل تھے، اِدھر خود اکبر، اقبالؔ کے مداحوں میں شامل ہو چکے تھے اور دونوں حضرات کے درمیان موانست کا رشتہ قائم ہو چکا تھا اور خط و کتابت کے ذریعہ اپنے خیالات و احساسات کا تبادلہ کرتے رہتے تھے۔ حضرتِ اکبر ڈاکٹر اقبالؔ سے اظہارِ محبت و مودّت اِس صورت بھی کرتے تھے کہ کوئی موسم کا پھل آپ کی طرف بھیج دیتے۔ ایک بار مشہور لنگڑا آم تحفۃً ڈاکٹر صاحب کو بھجوایا تو

آپ نے شکریہ کا جو خط لکھا، اُس میں ازراہِ تفنن یہ بھی تحریر فرمایا:

ترے فیضِ مسیحائی کا ہے یہ سب اثر اکبر
الٰہ آباد سے لنگڑا چلا لاہور تک پہنچا

انسان کو ہم خیال اور ہم ذوق نہ ملے تو وہ ایک طرح سے تنہائی محسوس کرنے لگتا ہے۔ اِس ضمن میں اقبال بھی تنہائی کا شکار تھے۔

آپ کے گردوپیش کوئی ایسا شخص نہیں تھا جو آپ کا ہم راز بن سکتا، آپ کے دل کی بات سنتا اور سمجھتا۔ اِسی احساس کا اُظہار آپ نے اپنے ایک مکتوب بہ نامِ اکبرالٰہ آبادی جس انداز سے کیا، اِس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ دونوں شخصیات میں تعلقِ خاطر کتنی شدت اختیار کر چکا تھا اور اِس باہمی میل و محبت کا سبب قومی دردِ مشترک تھا جو دونوں کے دلوں کو گرم جوش رکھے ہوئے تھا اور جس کی تپش روز و شب اُنھیں مضطرب رکھتی تھی۔ اقبال لکھتے ہیں:

"لاہور ایک بڑا شہر ہے، لیکن میں اِس ہجوم میں تنہا ہوں، ایک فرد بھی ایسا نہیں جس سے دل کھول کر جذبات کا اظہار کیا جاسکے۔"

یہ مختصر سا جملہ اقبال کے دل میں اُٹھنے والے اِس قومی درد کا ایک ایسا طوفان لیے ہوئے ہے جو، اُن کی تمام ہستی کو ڈانوں ڈول کیے دے رہا ہے۔ اِس کیفیت اور اضطراب کو اقبال شعر کے قالب میں ڈھال کر کچھ آسودگی حاصل کرتے تھے۔

☆

تو آخر وہ کیا احساسِ تنہائی تھا، وہ کیا سبب تھا جو اقبال کو مضطرب کیے ہوئے تھا؟ یقیناً آدمی کے ذاتی معاملات اور مشکلات بھی اُسے پریشان اور بے کل کر دیتے ہیں لیکن یہاں ایک آدمی کی نہیں خاص آدمی کی بات ہو رہی ہے، یہ اقبال ہے سینے میں ایک حساس دل لیے ہوئے ہے اور دل میں ملتِ اسلامیہ کا درد ہے جو، اُن کی بے چینی کا سب سے بڑا سبب ہے، عالمِ اسلام پر جب نظر کرتے ہیں تو دل خون کے آنسو روتا ہے۔ ہندوستان میں تو جو مسلمانوں کا حال ہے، وہ ہے ہی، غلامی سب سے بڑا عذاب ہے، آزاد اسلامی ملکوں کے حالات اور بھی تکلیف دہ ہیں، سلطنتِ عثمانیہ یعنی ترکی جس میں قائم خلافت کی وجہ سے مسلمان اُسے اپنا مرکز خیال کرتے ہیں اور اُمتِ

مسلمہ کی اُس سے ایک جذباتی وابستگی ہے، وہ برسوں سے اندرونی خلفشار اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار چلی آ رہی تھی، اب یہ بیمار قریب المرگ پہنچ چکا ہے۔ یورپی طاقتیں اُس کو لخت لخت کرنے کی سازشوں میں مصروف ہیں۔ غیر تو غیر ہیں، خود اپنے آپس میں دست و گریباں ہیں، اس لیے بیرونی حملوں نے ترکی کو مسلسل پسپائی پر مجبور کر دیا ہے۔ بلقان کی ریاستیں یاجوج ماجوج کی طرح اُس کو چاٹنے کے لیے حملے کر رہے ہیں۔ اُدھر اٹلی طرابلس پر حملہ آور ہے اور تیونس، الجزائر اور مراکش پر فرانس نے قبضہ جما لیا ہے۔ یونان سالونیکا پر قابض ہو چکا ہے، مارچ ۱۹۱۳ء میں سقوط اورنہ کا سانحہ پیش آ چکا ہے۔ اس دل خراش صورت حال نے عالمِ اسلام خصوصاً مسلمانانِ ہند میں ایک اضطراب پیدا کر دیا ہے۔ اخوتِ اسلامی کا جوش بڑھ چڑھ کر بول رہا ہے۔ کلمہ گو کی ہم دردیاں ان متاثرہ اسلامی ملکوں، خصوصاً ترکی کے ساتھ ہیں۔ کیوں کہ وہ ترکی کے خلیفہ کی اطاعت کو اپنے اوپر لازم سمجھتے ہیں اور جمعہ اور عیدین کے خطبے میں خلیفہ عثمانیہ کا نام شامل کرتے ہیں۔ ان حالات میں اقبال ایسا دردِ ملت رکھنے والا شاعر اپنے جذبات کو بولنے سے کیوں کر روک سکتا ہے۔ ہندوستان میں اہلِ ایمان اپنے ترک بھائیوں کے لیے مادی اور طبی ضرورتوں کو جمع کر رہے تھے، مرد و خواتین کمالِ جوش و جذبات کے ساتھ ترک بھائیوں کی امداد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے، خواتین نے اپنے زیورات تک اُن کی نذر کر دیے تھے، زخمی ترک سپاہیوں کی طبی امداد کے لیے ایک مسلم رہنما اور سماجی شخصیت ڈاکٹر مختار انصاری کی قیادت میں ایک طبی وفد ترکی روانہ کیا گیا۔

گریۂ خوں ناب:

اقبال نے اپنا محاذ سنبھالا کہ ایسے موقعوں پر شعر کی طاقت بھی تلوار کی کا...
زود اثر ہوتی ہے۔ شاعرِ اسلام کے منظوم جذبات نے اہلِ ایمان کے جوش...
پہنچا دیا۔ خبر آئی کہ طرابلس پر اٹلی کے حملے میں بڑی تعداد میں مسلمان شہید...
ہند تڑپ اُٹھے، اقبال سراپا اشک بن گئے۔ لاہور کی بادشاہی مسجد میں طرابلس...
عقیدت پیش کرنے کے لیے اہلِ ایمان جمع ہوئے۔ اکابرین میں سر محمد شفیع...

نظام الدین، میاں عبدالعزیز، حکیم محمد یوسف حسن اور میاں محبوب عالم وغیرہ ایسے اکابر بھی شامل تھے۔ اقبالؔ تو جیسے اپنا خونِ دل اشعار کی شکل میں لے کر حاضر ہوئے تھے۔ مقررین نے اس سانحے پر اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ خصوصاً ''پیسہ اخبار'' کے مدیر محبوب عالم نے اٹلی کی جارحیت کے خلاف اپنی تقریر میں نہایت غیظ و غضب کا لہجہ اختیار کیا۔ پھر کچھ احتجاجی قراردادیں منظور ہوئیں اور پھر ڈاکٹر اقبالؔ کو دعوت دی گئی کہ آپ اس موقعے پر کچھ فرمائیں۔ اقبالؔ سراپا درد کی صورت کھڑے ہوئے اور نظم کے عنوان کا اعلان فرمایا: ''حضور رسالت مآب ؐ میں۔'' حاضرین بصد عقیدت گوش بر آواز ہو گئے: اقبالؔ کی سوز میں ڈوبی ہوئی آواز گونجی:

گراں جو مجھ پہ یہ ہنگامۂ زمانہ ہوا
جہاں سے باندھ کے رختِ سفر روانہ ہوا
قیودِ شام و سحر میں بسر تو کی لیکن
نظامِ کہنۂ عالم سے آشنا نہ ہوا
فرشتے بزمِ رسالت میں لے گئے مجھ کو
حضورِ آیۂ رحمت میں لے گئے مجھ کو
کہا حضورؐ نے ''اے عندلیبِ باغِ حجاز
کلی کلی ہے تری گرمیٔ نوا سے گداز
ہمیشہ سرخوشِ جامِ ولا ہے دل تیرا
فتادگی ہے تری غیرتِ سجودِ نیاز
اُڑا جو پستیِ دنیا سے تو سوئے گردوں
سکھائی تجھ کو ملائک نے رفعتِ پرواز
نکل کے باغِ جہاں سے برنگِ بو آیا
ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کے تو آیا؟

اقبالؔ نے اس جگہ ایک ہلکا سا وقفہ کیا اور سامعین کی سوالیہ نظریں آپ پر ٹھہر گئیں۔ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور اپنے اُمتی سے فرمائیں کہ تو ہمارے واسطے کیا لایا ہے؟ اقبالؔ جواب

میں عرض کرتے ہیں:

''حضورؐ! دہر میں آسودگی نہیں ملتی
تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاضِ ہستی میں
وفا کی جس میں ہو بو، وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں
جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی

سامعین کی آنکھوں میں سوال کا رنگ اور گہرا ہو گیا۔ ایسی کیا چیز ہے جو جنت میں بھی نہیں ملتی؟

جواب میں اقبالؔ چھلکتی آنکھوں سے عرض کرتے ہیں:

چھلکتی ہے تری اُمت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

مجمع چیخیں مار کر رو پڑا۔ ہر طرف سے آہوں اور سسکیوں کی آوازیں آنے لگیں، یہاں تک کہ لوگوں نے اپنے گریبان چاک کر لیے۔ کوٹ اور ٹوپیاں اُتار کر زمین پر پھینک دیں اور ہائے ہائے کرتے ہوئے زمین پر لوٹنے لگے۔ پھر ایک طرف سے نعرۂ تکبیر بلند ہوا، تب ہوش سنبھلے۔ اقبالؔ کا اصل مشن تو یہی تھا کہ قوم ہوش میں آئے، جاگے اور خود کو طرابلس نہ بننے دے۔ دشمن کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر جینا سیکھے۔

مناکحت ثلاثہ:

دردِ ملت کے ساتھ ساتھ خود ڈاکٹر اقبال اپنے اندر کی کسک کو بھی شدت سے محسوس کر رہے تھے، پہلی بیوی کے تکلیف دہ معاملہ کے بعد دوسری مناکحت بھی آپ کو راس نہ آئی اور انتہائی افسوس ناک صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑا یعنی دوسری بیوی والا معاملہ ابھی تک معلق تھا، کہ تین سال کا عرصہ گزر گیا لیکن دہری خلش بہ دستور رہی، ایک اس اچانک حادثہ کی جو اس نکاحِ ثانی پر

پیش آیا اور دوسری یہ کہ عائلی زندگی میں خلا جوں کا توں رہا۔ اِسی کیفیت سے گزر رہے تھے کہ یکا یک مناکحت کا ایک اور موقع آپ کی زندگی میں در آیا، اِس کی روداد یہ ہے کہ آپ کے ایک دیرینہ دوست سید شبیر حیدر ایکسائز انسپکٹر کی حیثیت سے شہر لدھیانہ میں تعینات تھے۔ وہاں ایک متمول کشمیری گھرانے سے اُن کے قریبی تعلقات تھے جو نولکھوں کا خاندان کہلاتا تھا۔ انسپکٹر صاحب نے اُن کی ایک صاحب زادی مختار بیگم کے لیے ڈاکٹر اقبالؔ کا رشتہ تجویز کیا جو اُنہوں نے فوراً منظور کر لیا۔ پھر شبیر حیدر لاہور آئے اور آپ کی رضامندی حاصل کی اور یوں رشتہ طے پا گیا اور اقبالؔ باقاعدہ بارات کی شکل میں لدھیانہ گئے اور دلہن کو رخصت کرا کے لاہور لے آئے۔ اِن دنوں آپ انارکلی کے مکان میں رہائش پذیر تھے۔

عائلی نیرنگیاں:

عائلی معاملات میں اقبالؔ کی زندگی عجیب اتفاقات لیے ہوئے ہے۔ حالات کی نیرنگی دیکھیے کہ اقبالؔ کے جو احباب سردار بیگم سے متعلق مذکورہ گم نام خطوط کے بارے میں متجسس تھے اور مسلسل اُن کی تفتیش و تحقیق میں لگے رہے تھے، بہر حال اپنی کوششوں میں کامیاب ہوئے اور اصل معاملہ کی تہہ تک پہنچ گئے، عقدہ یہ کھلا کہ گم نام خطوط لکھنے والا کوئی وکیل تھا جو سردار بیگم سے اپنے بیٹے کا رشتہ کرنا چاہتا تھا۔ اِس بھاری الزام سے بریت کے بعد اِسی اثنا میں سردار بیگم نے جو تین سال تک ایک ذہنی کوفت اور اذیت میں مبتلا رہی تھیں، خود جرأت کر کے ایک خط ڈاکٹر اقبال کو بھجوایا جس میں آپ کو مخاطب کر کے لکھا گیا تھا کہ آپ کو اِس بہتان پر یقین نہیں کرنا چاہیے تھا اور یہ کہ میرا نکاح آپ سے ہو چکا ہے تو اب دوسرے نکاح کا تصور بھی میرے لیے ممکن نہیں، میں اِسی حالت میں زندگی پوری کروں گی اور قیامت کے دن آپ کا دامن پکڑوں گی۔"

یہ خط پڑھ کر آپ کو اپنی غلطی پر سخت پشیمانی ہوئی اور آپ نے گوارا نہ کیا کہ جس عورت نے حیرت ناک ثابت قدمی کے ساتھ اُن کے لیے طرح طرح کے مصائب برداشت کیے ہوں، وہ اُسے اپنی بیوی نہ بنائیں۔ کاش دوسری بیوی لانے سے پیشتر یہ حال معلوم ہو جاتا۔ آپ نے مختار بیگم کو یہ صورتِ حال بتائی تو وہ نرم دل اور حلیم طبع خاتون بھی سردار بیگم کی مظلومیت کو برداشت

نہ کرسکیں، آب دیدہ ہو گئیں اور شوہر کو اجازت دی کہ وہ اپنی اُن بیگم کو بھی گھر لے آئیں، لیکن آپ کے لیے ایک نیا مسئلہ آن کھڑا ہوا، یہ کہ ایک مرحلہ پر آپ اپنے دل میں طلاق کا فیصلہ کر چکے تھے، اس لیے تجدیدِ نکاح ضروری سمجھا گیا جو آپ نے کیا اور انہیں گھر لے آئے۔ مختار بیگم خوش دلی کے ساتھ اس پورے عمل میں شریک رہیں۔ پھر کچھ روز کے لیے اپنے میکے لدھیانہ چلی گئیں اور ڈاکٹر اقبالؔ سردار بیگم کو لے کر سیالکوٹ روانہ ہو گئے۔ کچھ دنوں کے بعد جب آپ واپس لاہور آئے تو مختار بیگم بھی لدھیانہ سے لوٹ آئیں اور انارکلی والے مکان میں دونوں بیگمات اکٹھی ہو گئیں۔

مثالی سوکنیں:

اللہ کی شان دیکھیے دونوں ہم عمر بیگمات میں ایسی محبت اور یگانگت ہوئی کہ دیکھنے والوں کو سوکنوں کی جگہ بہنیں نظر آتیں۔ گویا اقبالؔ کو یہ اُن کے صبر کا پھل ملا تھا۔ عائلی زندگی کا بے ہنگم اور تکلف دہ دور گزر گیا، اُس کی جگہ اطمینان بخش ماحول میسر آ گیا، انارکلی والا وہ مکان جس میں آپ تنہائی کو لیے روز و شب بسر کرتے رہے یا پھر ایک وفادار ملازم علی بخش ہوا کرتا تھا، وہاں اب چہل پہل رہنے لگی، بالکل اِس طرح کہ جیسی خود ڈاکٹر صاحب کے آبائی گھر سیالکوٹ میں تھی۔ گویا لاہور میں اقبالؔ کی رہائش پہلے مکان میں تھی اور اب گھر میں تبدیل ہو گئی۔ اس گھر کی خوش کن آبادی میں آپ نے اپنی ایک بہن کریم بی بی کو بھی شامل کر لیا۔ انہیں آپ نے محض اس لیے یہاں بلا لیا تھا کہ وہ ابھی گھر گرہستی کی نہیں ہوئی تھیں، سردار بیگم بھی اپنے ساتھ ڈاکٹر صاحب کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد کی دو چھوٹی بیٹیوں عنایت بیگم اور وسیمہ بیگم کو سیالکوٹ سے لے آئیں اور اِس طرح اب ڈاکٹر اقبالؔ کی رہائش گاہ ایک بھرپور گھرانے کی شکل اختیار کر گئی جو خوشیوں کا گہوارہ نظر آنے لگا۔

اِس کے باوجود کہ شیخ محمد اقبالؔ ایک اور ہی دنیا کے انسان تھے۔ تاہم وہ اپنے اندر رہتے ہوئے بھی باہر کی دنیا میں اپنے فرائض کی ادائی سے غافل نہ تھے، اپنے خارجی ماحول کی سرگرمیوں میں بھی بھرپور حصہ لیتے، یہاں تک کہ اپنی مصروفیات میں سے وقت نکال کر شام کو اپنی بیگم اور بہن

بھتیجیوں کے ساتھ بیٹھ کر ہنسی مذاق کی باتیں کرتے اور کبھی کبھی تاش اور لوڈو کے کھیل میں بھی اُن کے شریک ہو جاتے اور جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کبوتر بازی کا بچپن ہی سے شوق رہا تھا، یہاں بھی یہ برقرار رہا، یہاں بھی آپ نے کبوتر پال رکھے تھے اور کبھی کبھی کوٹھے پر چڑھ کر اُڑاتے اور اُن کی پرواز سے جی خوش کرتے۔ گرمیوں کی تعطیلات میں سیال کوٹ چلے جاتے اور وہاں بزرگوں کے سائے میں پیار اور محبت کی محفلیں ایک مسرت انگیز ماحول پیدا کرتیں۔ لاہور میں مردانے میں کچھ دوست احباب آ جاتے، علم و فکر کی باتیں ہوتیں، حالاتِ حاضرہ پر گفتگو کرتے، شعر و شاعری کا بھی دور چلتا اور یوں آپ کو ایک آسودہ حال زندگی میسر آ گئی اور اس کے ساتھ ہی تخلیقی سرگرمیوں میں بھی تیزی سے اضافہ ہونے لگا۔

☆☆

maablib.org

سلطنت عثمانیہ کی شکست وریخت:

ہم اقبالؔ کی اِس دور میں تخلیق ہونے والی اُس فقید المثال مثنوی کا ذکر ضرور کرتے ہیں جس کا عنوان ہے ''اسرارِ خودی'' یادر ہے ڈاکٹر محمد اقبالؔ اپنی شعری تخلیقات کے حوالے سے اُردو سے فارسی میں زیادہ سرمایہ دار ہیں۔ آپ کے کلام پندرہ ہزار (۱۵۰۰۰) اشعار میں نو ہزار (۹۰۰۰) کی تعداد فارسی اشعار کی ہے۔ خصوصاً ''اسرارِ خودی'' اپنے موضوع اور بیان کے اعتبار سے دنیائے ادب میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔ یہ ایک ایسی شاہ کار منظوم ہے جس کا بدل تاہنوز نہیں ہوسکا۔ دراصل اقبالؔ جب انگلستان میں کیمرج سے وابستہ تھے اور اُنہی دنوں ایک انگریزی رسالے کے لیے اسلامی سیاست کے موضوع پر ایک مضمون رقم کر رہے تھے کہ یکا یک آپ کے ذہن میں سوال پیدا ہوا تھا کہ زوالِ مسلم کے اسباب میں بنیادی اور اصل نفسیاتی محرک کیا ہوسکتا ہے؟ چناں چہ اِس بات کو جاننے کے لیے آپ نے اِس موضوع پر جو کچھ علمی اور کتابی ذخیرہ موجود تھا اور میسر آسکا، اُس سب کی ورق گردانی کرڈالی، لیکن کافی دماغ سوزی کے بعد بھی آپ کو تشفی نہ ہوسکی۔ اِس سوال کا کوئی تسلی بخش جواب آپ کو نہ مل سکا جو شدت کے ساتھ آپ کے دل ودماغ کو پریشان کیے ہوئے تھا۔ تب آپ نے غور وفکر کا ایک طویل سفر طے کرنے کے بعد، مسلمانوں کی تنزلی کے جو اسباب مرتب کیے وہ یہ تھے کہ:

> ''مسلمانوں کے اندر قوتِ عمل معدوم ہو چکی ہے، ان میں وہ جوش وولولہ اور ایثار وقربانی کا جذبہ دم توڑ چکا ہے جو، اُن کے اسلاف کا خاصہ تھا۔

توحید کی روح ان کے اندر سے پرواز کرچکی ہے۔دلوں میں خوفِ خدا کی جگہ دوسری اُن باتوں نے بسیرا کرلیا ہے جن کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔''

ان حقائق کے پیشِ نظر اقبالؔ نے مسلمانوں کے اندر نئے سرے سے روح پھونکنے اور مسلم نشاۃِ ثانیہ کے احیا کے لیے اپنے ذہن میں ایک نظامِ فکر ترتیب دیا، جو اسی وقت سے عملی جامہ پہنانے کے لیے آپ کو آواز دیتا آرہا تھا، لیکن جیسا کہ ہم دیکھتے آرہے ہیں، وطن لوٹ آنے کے بعد، حصولِ معاش کی تگ ودو نے آپ کو سانس ہی نہیں لینے دیا۔ اِس پر مستزاد یہ کہ عائلی معاملات کی ناگوار صورتِ حال الگ آپ کے ذہن ودل کو پراگندہ ومضطرب کرتی رہی۔ تاہم کئی سال اِن جاں گسل حالات سے گزرنے کے بعد اب حالات معمول پر آئے تو تخلیق کا وہ عمل جو سست روی کا شکار ہوگیا تھا، اُس میں تیزی آئی اور جیسا کہ ہم سن چکے ہیں کئی فکر انگیز نظمیں تخلیق ہوئیں۔ اُن میں ''شکوہ'' خصوصاً قابلِ ذکر ہے۔ جس نے ایک تنازعہ کھڑا کردیا، تاہم عام مسلمان اُس کے اندر بیان کردہ حقائق سے خاصے متاثر ہوئے اور نظم کو عوامی سطح پر خاصی پذیرائی ملی۔ نظمِ مذکور کے سبب سے اقبالؔ پر مذہبی حلقوں کی طرف سے طرح طرح کے الزامات لگائے گئے، آپ کے عقیدے پر بھی شک وشبہ کا اظہار کیا گیا، یہاں تک کہ کفر کے فتوے صادر کیے گئے۔ ظاہر ہے یہ تکلیف دہ باتیں تھیں، جس سے وقتی طور پر ضرور آپ کے خلوص کو ٹھیس پہنچی اور آپ کو ذہنی کلفت اُٹھانی پڑی تاہم مخالفین کے اِس عمل سے آپ مرعوب وخوف زدہ نہ ہوئے بلکہ ناقدین کو صرفِ نظر کرکے اپنے کام میں لگے رہے، گو آپ نے آگے جاکر اِسی نظم شکوہ کے بعد، ''جوابِ شکوہ'' لکھ کر اپنے اِس عمل کا ازالہ کردیا جو ''شکوہ'' کی صورت میں جذباتی طور پر حد سے تجاوز کرگیا تھا۔ اِس جگہ ہم اِس کی تفصیل میں نہیں جاتے اور اُن دونوں مذکورہ نظموں، ''شکوہ'' اور ''جوابِ شکوہ'' کا جائزہ بعد میں لیں گے۔

اس وقت ہمارے زیرِ موضوع اقبالؔ کا وہ اصلاحی پروگرام ہے جس کو آپ نے اپنے ذہن میں انگلستان میں قیام کے دوران ترتیب دیا تھا، چناں چہ اب آپ مجبور ہے تھے کہ وہ وقت آگیا ہے کہ اِس فکری نظام کو ملت کے سامنے رکھ دیا جائے جو اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے احیا کے لیے نسخۂ

کیمیا کی حیثیت رکھتا ہے۔

حضرت اقبالؔ کے غور و فکر کا ماحصل یہ تھا کہ جب تک مسلمان اپنے اندر اس روح کو زندہ نہیں کریں گے جو ابتدا میں اُن کی شان و عظمت کا سبب اور نشان بنی تھی، اور اپنے اندر پہلے کی طرح اُس الٰہیت کو پیدا نہیں کریں گے، یعنی ہر ماسوا سے دامن کش ہو کر خدائے حقیقی سے رشتہ نہیں جوڑیں گے جس سے وہ گرمجوش تھی، ہرگز انھیں میدانِ عمل میں کوئی کامیابی نصیب نہیں ہو سکتی۔ اقبالؔ کو یہ دیکھ کر بھی بہت مایوسی ہوئی تھی کہ ادبیات کے ذخیرہ میں بلاشبہ مختلف اور اہم ترین موضوعات پر کتابوں کی کمی نہیں لیکن کوئی ایسی تخلیق نہیں پائی جاتی جو مسلمانوں میں خودی کو اُجاگر کر سکے اور اُن کے اندر جدوجہد اور عملِ پیہم کے خوابیدہ جذبات کو جگا سکے۔ بلکہ آپ نے جو محسوس کیا، وہ اس کے برعکس تھا، یعنی کتابوں کی دنیا میں جن موضوعات کا سکہ رواں ہے، وہ خودی، خودداری، ہمت، جوش اور ایثار کے جذبات کو کمزور اور پژمردہ کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ چناں چہ اِن مطالعاتی تجربات کے نتیجے میں انگلستان میں دورانِ تعلیم اس تشنگی کو دور کرنے کے لیے آپ کے ذہن میں دو مثنویوں کی تخلیق کا خاکہ اپنے خطوط واضح کر چکا تھا۔ اُن میں سے ایک کا تعلق "حیاتِ فرد"، یعنی انسان کی اپنی ذات سے تھا، اس تخلیق کو آپ نے "اسرارِ خودی" کا نام دیا اور دوسری مثنوی "حیاتِ ملت" یعنی قومی زندگی سے متعلق تھی، جس کا عنوان "رموزِ بے خودی" رکھا گیا۔ اوّل الذکر مثنوی، اسرارِ خودی بہ قول اقبالؔ دو سال میں مکمل ہوئی، لیکن اس کی تمہید اُس وقت شروع ہو چکی تھی جب کہ آپ نے انجمن حمایت الاسلام کے ایک سالانہ اجلاس میں "تصوف اور اسلام" کے عنوان سے خطبہ دیا تھا۔ آپ نے اپنے گہرے مطالعہ کی بنیاد پر واضح طور سے فرمایا:

"اِس مروجہ تصوف کو اسلام کے سادہ قواعد اور عربی روحِ دین سے کوئی علاقہ نہیں، اور اِس کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ یہ تصوف خودی کو تباہ کرتا ہے، حالاں کہ خودی ہی ایک ایسی چیز ہے جو افراد اور اقوام کی زندگی کی ضامن ہے اور انسان کو بلند ترین مادی اور روحانی مدارج پر پہنچانے کی کفیل ہے۔"

علامہ اقبالؔ کے اِس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں میں اُس زمانے میں (اور غالباً

اب بھی) جو تصوف رائج ہے، جس کا دعویٰ ہے کہ یہ کمالِ روحانی کا ذریعہ اور زینہ ہے جو انسان کو خدا سے ملاتا اور اُس کی معرفت پیدا کرتا ہے۔ مزید برآں یہ کہ انسان جب تک اپنی نفی نہیں کرتا، خدا کے اثبات اور اُس کے اقرار سے محروم رہتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں، ''خودی مٹاؤ تا جب تک خدا نہیں ملتا۔'' اقبالؔ نے اس مسلک کی شدت سے تردید کرتے ہوئے، انجمن کے اسی اجلاس میں، مزید فرمایا:

> ''تصوف کے لٹریچر میں جہاں کہیں خودی کو مارنے کا حکم آیا ہے، جہاں عوام اس کے معنی غرور و تکبر کرتے ہیں جو دراصل رذائل میں سے ہے اور اس سے ہر مسلمان کو اجتناب کرنا چاہیے، لیکن متصوفین نے یہ لفظ غرور کے معنی میں استعمال نہیں کیا۔ بلکہ احساساتِ ذات ''اَنا'' اور ''میں'' کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ اُن کا مقصد یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو مٹا دے، اپنے نفس کی نفی کر دے، تب معرفت کی منزل پر فائز ہو سکتا ہے۔ حالاں کہ یہ تصور بالکل خلافِ اسلام ہے، اسلام چاہتا ہے کہ ہر انسان کی خودی نہ صرف قائم رہے بلکہ ارتقاء کی منزلیں طے کرتے کرتے اُس مقام پر پہنچ جائے جو اُس کے لیے مقدر ہے، اور جس سے بڑا کوئی مقامِ انسانی تصور میں نہیں آ سکتا۔''

اسی خطبہ میں اقبالؔ آگے چل کر فرماتے ہیں:

> ''میں نے اسرارِ خودی کے نام سے ایک مثنوی مرتب کی ہے، جس میں خودی کے متعلق واضح حقائق بیان کیے ہیں۔ یہ مثنوی عن قریب شائع ہوگی اور اس سے عجمی تصوف کا وہ طلسم پاش پاش ہو جائے گا جس نے مسلمانوں کو توفیقِ عمل سے محروم کر کے جامد و منجمد بنا رکھا ہے۔''

یہ تقریر فی الحقیقت اس کتاب یعنی اسرارِ خودی کی ایک تصویر تھی جو اقبالؔ کی تعلیمات کا مرقع اور آپ کے افکار کی مستقل اور مستند دستاویز بننے والی تھی۔ لیکن چوں کہ بہ قولِ اقبالؔ ''اسرارِ خودی'' ابھی طباعت کے مرحلہ میں ہے، لہٰذا جب یہ منظرِ عام پر آئے گی، اُس وقت اِس پر گفتگو کریں

گے۔ فی الوقت جو حضرتِ اقبال کا اہم ترین ذاتی معاملہ ہے، اُس کی طرف رخ کرتے ہیں۔

اقبال اس اعتبار سے بہت خوش نصیب ہیں کہ آپ کو بہت شفیق اور نہایت دین دار والدین میسر آئے۔ والد بزرگ وار نا خواندہ ہوتے ہوئے بھی، اہلِ علم و عمل اور فکر و نظر سے صحبت رکھتے تھے، اِس نسبت و تعلق نے اُنھیں ایک طرح کا عالم بلکہ ''فلسفی'' بنا دیا تھا، دوسری طرف والدہ امام بی بی محترمہ بھی اپنی نیک صفاتی، درویشانہ طبیعت میں شوہر سے کم نہ تھیں۔ جب کہ ماں تو پھر ماں ہوتی ہے، کیسی ہی ہو۔ اقبال کی '' بے جی'' بھی اُن کے لیے چتر چھاؤں تھی۔ اولاد بلکہ آس پڑوس کے سب بچے، بچیاں اور عورتیں اُنھیں اسی نام سے یعنی '' بے جی'' کہہ کر مخاطب کرتی تھیں۔ بچہ کتنا ہی بڑا ہو جائے، لیکن ماں باپ کے نزدیک چھوٹا ہی رہتا ہے، اور اولاد بھی بڑی ہو کر خود کو والدین کے سامنے بچہ ہی خیال کرتی ہے، جتنا آرام و سکون اُنھیں ماں باپ کے قدموں میں بیٹھ کر محسوس ہوتا ہے، بڑی سے بڑی بزمِ طرب، محفلِ نشاط میں بھی اُنھیں یہ راحت و خوشی میسر نہیں آتی۔ ماں باپ کی سادہ باتوں کے آگے، عقل و دانش اور فکر و فلسفہ کی بڑی بڑی کتابیں ہیچ اور بے معنی لگتی ہیں۔

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال بھی جب سیال کوٹ آتے تو گھر میں قدم رکھتے ہی بچہ بن جاتے، ماں باپ کی قدم بوسی کر کے لگتا آسمان سے زیادہ بلند ہو گئے ہیں۔ لیکن آہ! ایک تجربہ ایسا بھی ہے جس سے ہر شخص کو گزرنا پڑتا ہے، یعنی وہ جو کہا جاتا ہے کہ کسی کے ماں باپ سدا نہیں رہتے، سو، اقبال کو بھی ماں کی جدائی کا صدمہ پیش آیا۔ اُن کی '' بے جی'' اُنھیں چھوڑ کر اپنے خالقِ حقیقی کی طرف لوٹ گئیں۔ کیا عجیب اتفاق ہے کہ جس تاریخ کو اقبال کی دنیا میں آمد ہوئی تھی، وہی یعنی ۹ رنومبر، اُنھیں جنم دینے والی بے جی کی دنیا سے رخصتی کی تاریخ ٹھہری۔ اس طرح ۱۹۱۴ء اقبال کے لیے صدمۂ عظیم کا سال ثابت ہوا۔ آپ ماں ایسی مہربان و عظیم شخصیت سے محروم ہو گئے۔ شاعر تھے، اپنے آنسوؤں کو سمونے کے لیے شعر سے بہتر اور کیا جگہ ہو سکتی تھی۔ ملت کا نوحہ پڑھنے والا شاعر، ماں کا مرثیہ لکھنے بیٹھا تو دل نکال کر روحِ والدہ کے قدموں میں رکھ دیا۔

نظم کے ابتدائی بند میں اقبال نے اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ موت سے کس کو رستگاری ہے؟ یہاں آدمی بالکل مجبور اور بے بس نظر آتا ہے، پھر اس تمہید کے بعد وہ اپنا دورِ طفلی یاد

کرتے ہوئے، والدہ مرحومہ کی روح سے مخاطب ہوتے ہیں:

جب ترے دامن میں پلتی تھی وہ جانِ ناتواں
بات سے اچھی طرح محرم نہ تھی جس کی زباں
اوراب چرچے ہیں جس کی شوخیِ گفتار کے
بے بہا موتی ہیں جس کی چشمِ گوہر بار کے

وہ بچہ جوایک کمزوری جان تھا جس نے تیری آغوش میں آنکھیں کھولی تھیں، جس کی زبان بات کرنے سے قاصر تھی، لیکن آج اُسی اقبال کی شوخیِ گفتار یعنی شاعری کی دھوم مچی ہوئی ہے اور وہ شاعری کیا ہے، غمِ ملت میں رونے والی آنکھ سے ٹپکے ہوئے اَن مول موتی ہیں۔''

اس کے بعد اقبال، عمر کے مختلف ادوار کا تذکرہ کرتے ہیں کہ اُن ادوار میں انسان علم سیکھتا ہے، اُسے بات چیت کا ڈھنگ آجاتا ہے، جوانی اور بڑھاپے کے تقاضوں کا شعور آجاتا ہے۔ اقبال بھی زندگی میں بہت بڑی بڑی کامیابیوں اور اعلیٰ درجات پر پہنچنے کے بعد جب ماں کے پاس بیٹھتے ہیں تو ساری علمی ڈگریاں، اعلیٰ منصب اور اپنی سماجی حیثیت بھول کر خود کو اُسی طرح بچہ محسوس کرتے ہیں جیسا کہ وہ پہلے ماں کی گود میں تھے:

زندگی کی اوج گاہوں سے اُتر آتے ہیں ہم
صحبتِ مادر میں طفلِ سادہ رہ جاتے ہیں ہم

اقبال اُسی فردوسِ گم شدہ کو یاد کرتے ہوئے آہیں بھرنے لگتے ہیں:

کس کو اب ہوگا وطن میں آہ! میرا انتظار
کون میرا خط نہ آنے سے رہے گا بے قرار
خاکِ مرقد پر تری لے کر یہ فریاد آؤں گا
اب دعائے نیم شب میں کس کو میں یاد آؤں گا

میں وطن سے دور ہوا تو میرے آنے کا اب کون انتظار کرے گا؟ اور میرے خط میں تاخیر سے کون ہے جو بے قرار ہوجایا کرے گا۔ اب تو میں خود ہی ترے مرقد پر جا کر پکاروں گا کہ (اے میری دعا گو) اب کون ہے جو آدھی راتوں کو اُٹھ کر (تہجد کی نمازوں میں) اپنی دعاؤں میں مجھے

یاد رکھے گا۔"

مزید کہتے ہیں کہ یہ تیری ہی تربیت ہے جس نے مجھے آج روشن ستارہ بنا دیا ہے، جس کی وجہ سے میرے خاندان کا نام روشن اور عزت کی دولت سے مالا مال ہے۔

تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا
گھر مرے اجداد کا سرمایۂ عزت ہوا
دفترِ ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات
تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات

تیرا وجود کتابِ زندگی میں ایک سنہری باب کی حیثیت رکھتا ہے، تیری ذات سراپا دین و دنیا کا سبق تھی، یعنی تیرا اک اک عمل اور زرین اصول دین و دنیا کے درس کا نمونہ تھا۔"

اس کے بعد، اقبالؔ نے جس حسرت کا اظہار کیا، اس نے اہلِ دل کو تڑپا کر رکھ دیا

عمر بھر تیری محبت میری خدمت گر رہی
میں تری خدمت کے قابل جب ہوا، تو چل بسی

اقبالؔ اپنے اس اظہارِ غم میں اپنے برادرِ معظم کو نہیں بھولے، ماں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔ تیری خدمت میں مجھ سے بازی لے جانے والا اور میری زندگی کے معاملات میں قدم قدم میرا ساتھ دینے والا جو مجھے تیری ہی طرح چاہتا رہا ہے، مگر اب وہ بھی بچوں کی طرح روز و شب تیرے غم میں گریہ کناں رہتا ہے اور دامنِ صبر اب ہاتھ سے چھوڑ چکا ہے:

تخم جس کا تو ہماری کشتِ جاں میں بو گئی
شرکتِ غم سے وہ الفت اور محکم ہو گئی

تیری تربیت نے ہر اولاد کے اندر باہمی پیار اور محبت کا جو بیج بو دیا ہے، آج ہم تیرے غم میں شریک ہو کر ایک دوسرے کے اور قریب آ گئے ہیں۔

اقبالؔ بہ ظاہر، اپنی والدہ مرحومہ کا مرثیہ رقم کر رہے ہیں، لیکن حقیقت میں اُن کی فکرِ رسا، موت و حیات کا عبرت انگیز فلسفہ پیش کر رہی ہے۔ کائنات کی مختلف اشیا کی مثالیں دے کر اس حقیقت کا اظہار کر رہے ہیں کہ ہر چیز آخر اپنی فنا کی منزل پر ضرور پہنچتی ہے:

آہ یہ دنیا، یہ ماتم خانہ برنا و پیر
آدمی ہے کس طلسمِ دوش و فردا میں اسیر

یہ دنیا بوڑھے اور جوان سب کا ایک ماتم خانہ ہے، آدمی روز و شب کی گردشوں کے سحر میں گرفتار رہتا ہے:

کتنی مشکل زندگی ہے، کس قدر آساں ہے موت
گلشنِ ہستی میں مانندِ نسیم ارزاں ہے موت

زندگی کے مقابلہ میں موت بہت آسان ہے۔ جس طرح دنیا میں ہوا کی کمی نہیں، بے مانگے، بے خواہش اور بے طلب اور بلا قیمت ہر جگہ مل جاتی ہے، اسی طرح موت بھی گلشنِ ہستی میں ہوا کی طرح دندناتی پھرتی ہے اور جس گُل اور کلی کو چاہتی ہے ایک پل میں لے اُڑتی ہے:

زلزلے ہیں، بجلیاں ہیں، قحط ہیں، آلام ہیں
کیسی کیسی دخترانِ مادرِ ایام ہیں

یہ آفات جن کا تذکرہ کیا گیا ہے، یہ دراصل سب موت کے پیامی اور بہانے ہیں، اور یہ چیز ایسی ہے کہ اس کے لیے غریب و امیر سب برابر ہیں اور نہ ہی یہ کسی جگہ کی پابند ہے۔ ہر جگہ پہنچ جاتی ہے:

کلبۂ افلاس میں، دولت کے کاشانے میں موت
دشت و در میں، شہر میں، گلشن میں، ویرانے میں موت

مزید کہتے ہیں:

موت ہے ہنگامہ آرا قلزمِ خاموش میں
ڈوب جاتے ہیں سفینے موج کی آغوش میں

خاموش دریاؤں کے اندر موت طوفان بن کر برپا ہو جاتی ہے اور خرامِ ناز کرتے ہوئے سفینے تیز موجوں کی نذر ہو جاتے ہیں۔''

چناں چہ اقبالؔ موت کے فلسفہ کو مزید بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں، یہ عام ہے اور اس معاملے میں آدمی نہ شکوہ کر سکتا ہے، نہ شکایت کی گنجائش ہے کہ وہ اس مسئلہ پر کوئی بات کر سکے:

نے بحالِ شکوہ ہے، نے طاقتِ گفتار ہے
زندگانی کیا ہے اک طوقِ گلو افشار ہے

اقبالؔ غمِ والدہ میں تیز روانی کے ساتھ سخن سرائی کرتے رہے، پھر یکایک اِس حقیقت کی طرف رخ کرتے ہیں کہ موت کوئی اختتامِ زندگی تو نہیں، اور یوں بھی اقبالؔ خوفِ مرگ سے ہمیشہ بے نیاز رہے، لہٰذا اب موت کی اصل حقیقت سے پردہ اٹھاتے ہیں:

ختم ہو جائے گا لیکن امتحاں کا دور بھی
ہیں پسِ نہ پردۂ گردوں ابھی دور اور بھی

یہ غمِ مادر کا امتحان جس سے میں گزر رہا ہوں، گزر جائے گا، کیوں کہ ہر امتحاں کا ایک محدود وقت ہوتا ہے، جس کو بہر حال گزرنا ہے، دوسرے امتحانات ابھی باقی ہیں، یعنی ابھی کتنے غموں سے واسطہ پڑتا ہے، کتنے امتحانوں سے گزرنا ہے، کون جانے آسمان ابھی کتنے ایسے دور چھپائے ہوئے ہے:''

سینہ چاک اِس گلستاں میں لالہ وگل ہیں تو کیا
نالہ و فریاد پر مجبور بلبل ہیں تو کیا
جھاڑیاں، جن کے قفس میں قید ہے آہِ خزاں
سبز کر دے گی انہیں بادِ بہار جاوداں
خفتہ خاکِ بے پر میں ہے شرار اپنا تو کیا
عارضی محمل ہے یہ مشتِ غبار اپنا تو کیا
زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں
ٹوٹنا جس کا مقدر ہو یہ وہ گوہر نہیں

اگر گلستانِ زندگی میں لوگ اپنے پیاروں کی جدائی میں اپنے سینوں کو چاک کیے دے رہے ہیں، آہ وزاری کر رہے ہیں تو اِس سے کیا حاصل، یہ جھاڑ جھنکار، خزاں کی آگ میں جھلسائے ہوئے یہ درخت و برگ و بار، جس طرح آج موت کا منظر پیش کر رہے ہیں، کل بادِ بہاری اِن کی مرجھائی ہوئی شاخ اور پتوں کو ہرا بھرا کر دے گی، تو پھر اگر انسان کے پیکرِ خاکی میں زندگی کی

چنگاری چھپ کر رہ گئی ہے تو کیا غم ہے، اور یہ مشتِ غبار یعنی جسمِ انسانی عارضی محمل کی طرح ہے تو کیا ہوا، وہ سواری اور وہ منزل کوئی اور ہے جو مستقل ہے۔ زندگی جو آتشِ جوش و خروش سے بھری ہوئی ہے، وہ انجام کار را کھ نہیں ہو سکتی۔ یہ وہ قیمتی موتی ہے جس کے مقدر میں شکستگی اور پژمردگی نہیں لکھی ہوئی، اس کی آب و تاب ہمیشہ رہنے والی ہے۔ اس لیے کہ:

زندگی محبوب ایسی دیدۂ قدرت میں ہے
ذوقِ حفظِ زندگی ہر چیز کی فطرت میں ہے

قدرت بھی، زندگی کو محبوب رکھتی ہے، اسی لیے ہر چیز کی فطرت میں زندگی کا تحفظ شامل ہے:

موت کے ہاتھوں سے مٹ سکتا اگر نقشِ حیات
عام یوں اس کو نہ کر دیتا نظامِ کائنات

اگر موت کے اختیار میں ہوتا، کہ وہ زندگی کا نام و نشان ہی مٹا ڈالے تو آج کائنات میں چاروں طرف پھیلی ہوئی زندگی اور زندگی کے آثار نظر نہ آتے:

ہے اگر ارزاں تو یہ سمجھو اجل کچھ بھی نہیں
جس طرح سونے سے جینے میں خلل کچھ بھی نہیں

موت اگر اتنی ہی سستی ہے تو پھر اس کی کیا حیثیت ہے، یعنی جو چیز عام طور پر، ہر جگہ اور آسانی مل جائے، اس کی قدر و قیمت گر جاتی ہے، قیمت و حیثیت اور وقعت کم یاب و نایاب شے کی ہوتی ہے کہ جس طرح سو جانے سے زندگی میں کوئی خلل نہیں پڑتا، اسی طرح مر جانے سے بھی زندگی میں کوئی فرق نہیں آتا:

آہ! غافل! موت کا رازِ نہاں کچھ اور ہے
نقش کی ناپائیداری سے عیاں کچھ اور ہے

لیکن اے غفلت شعار! موت کے اندر جو راز پوشیدہ ہے، وہ کوئی اور ہی چیز ہے، ناپائیدار نقش سے جو بات عیاں ہے، وہ یہ نہیں جو نظر آتی ہے، یعنی ہر چند کہ زندگی کا کوئی اعتبار نہیں، یہ ایک نہایت ہی خام اور ناپائیدار شے ہے، تاہم یہ سبب ظاہر ہے، حقیقت اس کی کچھ اور ہے۔ اسی

لیے اقبالؔ زندگی کے جاودانی تصور کو پیش کرتے ہیں وہ زندگی کی فنائیت کو قبول نہیں کرتے، بلکہ اِسے ہردم جواں اور جاوداں کہتے ہیں، ہم اِس جگہ اپنے قارئین کو خبردار کرنا چاہتے ہیں کہ اقبالؔ اِن مفکرین اور فلسفیوں میں سے نہیں جو عقل کے غلام ہیں اور محض قیاس آرائیوں اور مفروضات کے سہارے کسی چیز کے متعلق رائے قائم کرتے ہیں، اور بہ زعمِ خود سمجھنے لگتے ہیں کہ "مستند ہے اپنا فرمایا ہوا" بلکہ ہم اقبالؔ کو اِس لیے مستند سمجھتے ہیں کہ اقبالؔ کی فکر کا مرکز وماخذ، اللہ کا وہ کلام ہے جو ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے، لہٰذا اقبالؔ اگر موت وزندگی کے کسی رخ کو دکھاتے ہیں یا اِس کے بارے میں اپنی فکر کا اظہار کرتے ہیں تو وہ اِسی کلام کا عکس ہوتا ہے جس کی روشنی میں اُن کی فکر نے پرورش پائی ہے۔

اقبالؔ اِس نظم کے اندر سفر کرتے ہوئے، فلسفۂ حیات وموت کو، کائناتی تغیرات کے حوالے سے بھی مختلف مثالیں دے کر پیش کرتے ہیں اور اپنے دلائل کو نقطۂ عروج پر پہنچادیتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ:

"بساطِ فلک پر روشن شمعیں ازل سے آویزاں ہیں، اُن کے وجود اور آفرینش کی عمریں حدِ شمار سے باہر ہیں، تو کیا وہ شعلہ جو پیکرِ خاکی میں روح رواں ہے، آسمان کی اُن چنگاریوں سے بھی گیا گزرا ہے کہ فوراً ہی بجھ کر رہ جائے گا، اور کیا حیاتِ انسانی کا سورج ستاروں سے بھی کم تر ہے کہ ستارے تو روز بجھ کر دوبارہ اُسی آب وتاب کے ساتھ فلک پر روشن ہوجائیں اور آفتاب (اشرف المخلوقات انسان) ایک بار ڈھل کر ہمیشہ کے لیے غروب ہوجائے؟ اور دوبارہ طلوع نہ ہو۔"

اس کے بعد اقبالؔ حیاتِ جاودانی کے حق میں مزید دلائل دیتے ہیں۔ کہتے ہیں:

"پھول کا بیج خاک کی تہ میں بھی آنکھ کھولے ہوئے نشوونما پانے کے لیے بے قرار رہتا ہے۔ زیرِ خاک دانے کے اندر پوشیدہ شعلۂ زندگی فطری طور پر خود کو نمایاں کرنے اور پروان چڑھنے پر مجبور ہے، اِس لیے زمین میں دبا ہوا بیج اپنی "تربت" سے پھول کی صورت باہر آجاتا ہے، موت گویا اُس کو

لباس زندگی پہنا دیتی ہے۔"

اقبالؔ فرماتے ہیں:

"موت زندگی کو تنوع بخشتی ہے، نموِ زندگی کی تجدید کا نام موت ہے۔

خواب کے پس پردہ بیداری کی پیامی ہے:

موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے"

ڈاکٹر اقبالؔ جس موضوع کو اپنے فلسفیانہ رنگ میں پیش کرتے ہیں، اُس میں اپنی کوشش سے کماحقہٗ عہدہ برآ ہونا چاہتے ہیں۔ لہٰذا مذکورہ نظم کے باقی اور اختتامی حصے میں زور دار دلائل پیش کرتے ہوئے اِس عالم سے اُس عالم میں پہنچ جاتے ہیں:

مختلف ہر منزلِ ہستی کی رسم و راہ ہے
آخرت بھی زندگی کی ایک جولاں گاہ ہے

نظم کا اختتام دعائیہ کیا گیا ہے اور ایسا ہی ہونا بھی چاہیے تھا، ایک بیٹا ماں کی جدائی میں اشک بار ہے، اُس کی نوحہ گری نے اہلِ ایقان کو فلسفۂ حیات و موت پر مبنی ایک فکر انگیز نظم عطا کی ہے جو ایک نیک دل اور خدا ترس خاتون کی واضح کرامت اور اُس کا کھلا ہوا فیض ہے۔ تو کیوں نہ ہم بھی اقبالؔ کے ہم نوا ہو کر اپنی اُس محسنہ کے حق میں کلمۂ خیر بلند کریں جس نے اقبالؔ ایسا بطلِ جلیل اِس قوم کو دیا:

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اِس گھر کی نگہبانی کرے

☆☆

ڈاکٹر اقبال، خودی کے ساتھ ہی بے خودی کے قائل ہیں۔ ابھی ذاتی غم سے نبرد آزما تھے کہ غمِ ملت کے نتیجے میں تخلیق ہونے والی شاہ کار مثنوی "اسرار خودی" کی اشاعت نے ایک بار پھر آپ کے خلاف ایک طوفان کھڑا کر دیا۔ جیسا کہ نظم "شکوہ" کے موقع پر مختلف حلقوں کی طرف سے آپ کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا تھا اسی طرح اسرار خودی کے منظرِ عام پر آتے ہی کچھ حلقوں نے آپ کے خلاف صف بندی کر لی۔ اس بار مخالف فوج میں ہراول دستہ صوفیا کا تھا، ظاہر ہے یہ ایک فطری ردِ عمل تھا، علامہ نے اسرار خودی میں مروجہ تصوف پر بے لاگ تبصرہ کیا تھا، بادہ کہنہ کے عادی حضرات کو مے نو ہضم نہ ہو سکی۔ وہ اُس کو ترشی سمجھ کر قبول کرنے پر تیار نہ تھے؟ ان کا نشہ خراب کر سکتی تھی۔ در آں حالاں کہ وہ زہر نہیں تریاق تھا، اُس سم قاتل کو زائل کرنے کا مجرب نسخہ تھا جو تصوف کے نام پر اور غلط فہمی کی وجہ سے صوفیوں اور مشائخ کی رگوں میں اُتر چکا ہے۔ حضرت اقبال نے جس غلط تصوف کی نشان دہی کی اور اُس کو خلافِ اسلام بتایا، وہ تبصرہ اُن کی اپنی اُپج یا کوئی ذہنی اختراع نہیں، اور نہ ہی اُس کو آپ نے اپنی رائے پر محمول کیا، بلکہ روحِ اسلام کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ رائج الوقت تصوف، نہ صرف نظریۂ اسلام کی ضد ہے بلکہ انسانی خودی کو مردہ کرتی ہے۔ یہ فکر کو ارتقا کی طرف نہیں جانے دیتی اور انسان کو اس دار العمل دنیا میں متحرک ہونے سے باز رکھتی اور حیات کی گوناگوں منزلوں کی طرف پیش قدمی سے روکتی ہے۔ آپ کے نزدیک موجودہ تصوف "خودی مٹاؤ نہ جب تک خدا نہیں ملتا"، کے نظریہ پر مبنی ہے۔ یہ دراصل عجمی فکر و فلسفہ سے ماخوذ ہے۔ اس کا اسلام سے دور کا بھی تعلق اور واسطہ نہیں۔ لیکن کیوں کہ صدیوں کے

بعد، یہ پہلی آواز تھی جو مسلمانوں میں در آنے والی نام نہاد صوفیت کے خلاف اُٹھی تھی، لہٰذا اِس کا ایک مخالفانہ ردِعمل تو ہونا ہی تھا۔ عجمی تصوف کے خرقہ پوشوں کو تشویش ہوئی کہ اِس طرح تو اُن کی خانقاہیت خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ چناں چہ وہ اور اُن کے دوسرے حامی اقبالؔ کے خلاف مورچہ بند ہو گئے۔ اُن میں خود اقبالؔ کے کئی اپنے قریبی دوست اور احباب نے بھی محاذ قائم کر لیا۔ خصوصاً مشہور صوفی بزرگ خواجہ نظام الدین اولیاء کے سجادہ نشیں، خواجہ حسن نظامی جو ڈاکٹر اقبالؔ سے بہت قریبی اور خوش گوار تعلقات رکھتے آئے تھے اور بہت سے علمی و فکری معاملات میں فریقین کے درمیان خط و کتابت ہوتی رہتی تھی لیکن اس معاملہ میں خواجہ صاحب اور اُن کے کئی احباب نے بھی اپنے شدید ردِعمل کا اظہار کیا۔ بلکہ سب سے اوّل مخالفانہ مضمون ہی خواجہ صاحب کے ایک قریبی ساتھی ذوقی شاہ نے لکھا۔ اس کے جواب میں کسی صاحب نے کشاف کے قلمی نام سے ایک مراسلہ ۲۲ ر دسمبر ۱۹۱۰ء کے جریدہ "وکیل" میں شائع کرایا۔ مخالفت کا سلسلہ چلتا رہا، یہاں تک کہ خود خواجہ حسن نظامی بھی اسرارِ خودی کی مخالفت میں قلم سنبھال کر بیٹھ گئے۔ اِدھر حمایت میں اقبالؔ کے کئی دوست اور ہم درد بھی میدان میں آ گئے۔ خصوصاً بابائے صحافت اور نعت گو شاعر مولانا ظفر علی خاں نے حمایت میں قلم فرسائی کی، تاہم تنقید کا سلسلہ جاری رہا اور آخر علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؔ کو مذکورہ مثنوی کی تخلیق کے بارے میں اپنا وضاحتی بیان شائع کرانا پڑا۔ آپ نے فرمایا:

> ''مثنوی'' جس کا نام ''اسرارِ خودی'' ہے، ایک مقصد کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے، میری فطرت کا طبعی اور قدرتی میلان سکر و مستی اور بے خودی کی طرف ہے، مگر قسم ہے اُس خدائے واحد کی جس کے قبضہ میں میری جان و مال و آبرو ہے، میں نے یہ مثنوی از خود نہیں لکھی، بلکہ مجھ کو اِس کے لکھنے کی ہدایت ہوئی ہے اور میں حیران ہوں کہ مجھ کو ایسا مضمون لکھنے کے لیے کیوں انتخاب کیا گیا۔ جب تک اِس کا دوسرا حصہ ختم نہ ہوئے گا، میری روح کو چین نہ آئے گا۔ اس وقت مجھے یہ احساس ہے کہ بس میرا یہی فرض ہے اور شاید میری زندگی کا اصل مقصد ہی یہ ہے، مجھے یہ معلوم تھا کہ اس کی مخالفت ہوگی، کیوں کہ ہم سب انحطاط کے زمانے کی پیداوار ہیں،

اور انحطاط کا سب سے بڑا جادو یہ ہے کہ یہ اپنے تمام عناصر و اجزا و اسباب اپنے شکار (اور شکار، کوئی قوم ہو خواہ فرد) کی نگاہ میں محبوب و مطلوب بنا دیتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بدنصیب شکار اپنے تباہ و برباد کرنے والے اسباب کو اپنا بہترین مربی تصور کرتا ہے، مگر

''من نوائے شاعر فرد استم۔''

اور:

نا اُمیدستم ز یارانِ قدیم
طور من سو زد کہ می آید کلیم

نہ خواجہ حسن نظامی رہے گا نہ اقبالؔ۔ یہ بیج جو مردہ زمین میں اقبالؔ نے بویا ہے، اُگے گا، ضرور اُگے گا اور علی الرغم مخالفت، بارآور ہوگا۔ مجھ سے اس کی زندگی کا وعدہ کیا گیا ہے۔ الحمد اللہ۔''

قارئین کرام! یہ بات فراموش نہ کیجیے کہ زیرِ مطالعہ اس کتاب کی تالیف کا ہمارا مقصد، اقبالؔ پسندوں، خصوصاً اہلِ ذوق نوجوانوں کو، ادبیات میں موجود نام نہاد ترقی پسندوں اور آج کل کے ٹی وی چینلز کے شوباز اینکروں اور اخلاق باختہ مغربی فکر و ثقافت (کلچر) کے دل دادہ تجزیہ نگاروں کے اس جاہلانہ اور زہریلے پروپیگنڈے سے محفوظ رکھنا ہے۔ جو یہ بونے، اقبالؔ ایسے قد آور مردِ مومن اور مفکرِ اسلام کو اپنی طرح کا بے معنی، مضحکہ خیز ماڈریٹ اور نام نہاد روشن خیال بنا کر، بے دلیل پیش کرتے رہتے ہیں۔ دراصل دین بیزار اور اسلام سے کد رکھنے والوں کی یہ جاہلیت، ہمیشہ آپ اپنا مذاق بنتی رہی ہے کہ یہ دین سے بے بہرہ و بے علم افراد، دین و مذہب پر تنقید کرنے بیٹھ جاتے ہیں، بالکل اسی طرح جیسے فی زمانہ کچھ ادبی نقاد و تبصرہ نگار، کسی کتاب کو پڑھے بغیر اُس پر اپنی رائے پیش کر کے خود کو بڑا ادب شناس ثابت کرنے کی کومیڈی کرتے رہتے ہیں۔

اس جملۂ معترضہ سے صرفِ نظر کرتے ہوئے، ہم اپنے اصل موضوع پر آتے ہیں کہ اس کتاب کی تالیف کا بنیادی مقصد یہی ہے جو ابھی سطورِ بالا میں بیان کیا گیا ہے اور اب تک جو

واقعات وحقائق اقبالؔ کے حوالے سے آپ کے سامنے آتے رہے ہیں، کیا یہ اس حقیقت کے غماز نہیں کہ اقبالؔ کے افکار ونظریات اسلام کی روشنائی میں ڈھلے ہوئے ہیں اور یہ کہ خود اقبالؔ سر کے بال سے پاؤں کے ناخن تک، نہ صرف مومن، بلکہ ملتِ اسلامیہ کے درد میں ڈوبی ہوئی تصویر ہیں۔ ممکن ہے، کچھ حضرات آج بھی اس بات پر چیں بہ جبیں ہوں کہ اگر تصوف کے بارے میں اقبالؔ کا نظریہ تسلیم کرلیا جائے تو صوفیائے عظام کا ایک بڑا گروہ اور روحانی پیشواؤں کا صدیوں پر محیط سلسلہ غلط اور کسی حد تک راہِ راست سے ہٹا ہوا کہلا سکتا ہے۔ ہمارا خیال ہے یہ سوچنا غلط ہے کہ اقبالؔ تصوف کے سرے سے خلاف ہیں، نہیں بلکہ آپ اندازِ تصوف کے مخالف ہیں۔ عجمی اور یونانی متصوفانہ طریقِ عمل کو غلط سمجھتے ہیں جو اہلِ ایمان کو اس منصب جلیلہ سے معزول کرتا ہے جیسا کہ فرمایا گیا: ''اِنی جاعل فی الارض خلیفہ'' تو کیا وہ ذات جو ہمیشہ قائم رہنے والی ہے، جس کو نہ نیند آتی ہے اور نہ اُونگھ، جو زمین وآسماں کا خالق ومالک اور مختارِ کل ہے، اس کا نائب اس وصف کو ہی مٹانے کے درپے ہوجائے جو خودی کے نام پر اُس کے خالق نے اُس کے اندر ودیعت کیا ہے؟ جو ایک جوہرِ فعال کی حیثیت رکھتا ہے، جس کا سرِ نہاں لاالہ الا اللہ ہے، جو شمشیر در نیام نہیں، تیغ فشاں کی مانند ہے، تو پھر انسان کو کیوں کر یہ اختیار دیا جاسکتا ہے کہ وہ غلط فیصلہ کرنے کا مجاز ٹھہرے، یعنی وہ اِس لفظ کو ہی اپنی لوحِ ہستی پر سے کھرچ ڈالے جو اِس کے اعلیٰ مخلوق ہونے کی نشانی اور شناخت ہے اور اپنی اِس خودی کو مٹا کر اس خوش فہمی کا شکار ہوجائے کہ بس اب اُس پر چودہ طبق روشن ہوگئے، اُس کے اور خدا کے درمیان سے سارے حجابات اُٹھ گئے، اب اُسے معرفتِ الٰہی نصیب ہوگئی۔ اب اِس کی چشم بینا ہے اور جلوۂ حسنِ ازل ہے۔

اقبالؔ نے خودی کو زندہ رکھنے، اِسے بلند کرنے اور اِس معرفت وحقیقت کے جاننے کو تصوف قرار دیا ہے کہ:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اقبالؔ خودی کی فنا کا نہیں، خودی کی بقا کا پیغام دیتے ہیں، اُن کے عارف، فقیری میں بھی بادشاہی کے حامل ہوتے ہیں، خودی کے نام پر اپنی:

طاقت اور قوتِ لا یموت رکھتے ہیں جس کے آگے دونوں عالم دست بستہ حاضر نظر آتے ہیں، اقبالؔ خود فقیرِ روزگار ہے، درویشِ خدامست ہے، قلندری مزاج کا حامل ہے کہ یہی اوصاف تو خودی کے رنگ، روشن خدوخال اور اجزائے ترکیبی ہیں، بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اقبالؔ خود اپنی ذات میں صوفی ہیں، لیکن اقبالؔ کا تعلق اُس تصوف سے ہے جو شریعت سے مملو ہے، وہ تصوف بہ قیدِ شرع کے قائل ہیں، جس کا منبع و مخرج عجم نہیں عرب ہے، جس تصوف میں فقرِ محمدی کا نور، صدقِ بوبکر کا ظہور اور جس کے رخ پر غیرتِ فاروقی کا رنگ، حیائے عثمانی کا ڈھنگ، اور علی کی بوترابی کا غازہ نظر آتا ہو۔ اقبالؔ کا یہی تصوف ہے اور وہ اِسی کے صوفی ہیں، البتہ اُس تصوف کی سختی سے تردید کرتے ہیں جو روحِ اسلامی سے خالی، اُسوۂ محمدیؐ کے منافی اور لارہبانیہ فی الاسلام کے اصول کے خلاف نظر آتا ہو کیونکہ دست بکار، دل بیار کے اصول پر مبنی مسلک ہی ایک مومن کے لیے قابلِ قبول ہو سکتا ہے، یہی مومن کی درویشی، یہی قلندری، یہی معرفت اور یہی طریقت اور روحانیت ہے اور یہی تصوف ہے۔

اسی رواروی میں خواجہ حسن نظامی کی طرح، اکبر الٰہ آبادی بھی آپ کے مخالفوں کی صف میں شامل ہو گئے، اِس کا سبب یہ تھا کہ اُنہوں نے اسرارِ خودی میں صرف اُنہی اشعار کا مطالعہ کیا جو حافظ شیرازی سے متعلق تھے۔ یعنی اقبالؔ نے حافظ کی شاعری پر یہ کہہ کر تبصرہ کیا تھا کہ ”خمریات“ پر مبنی یہ شاعری اپنے قاری کو بے عمل اور غیر فعال بناتی ہے۔“ چناں چہ دیگر اہلِ ادب کی طرح اکبر کو بھی حافظ ایسے صوفی اور بزرگ شاعر پر اقبالؔ کا تبصرہ ناگوار گزرا، اور وہ بھی اقبالؔ سے بدظن ہو گئے۔ علامہ اقبالؔ کو اکبر الٰہ آبادی ایسے ہم خیال سے یہ اُمید نہ تھی، لہٰذا آپ نے اُنہیں لکھا۔

”آپ کے خطوط سے یہ معلوم ہوا کہ آپ نے مثنوی اسرارِ خودی کے صرف وہی اشعار دیکھے ہیں جو حافظ سے متعلق لکھے گئے ہیں۔ باقی اشعار پر شاید نظر نہیں فرمائی۔ کاش! آپ کو اُن کے پڑھنے کی فرصت مل جاتی تاکہ آپ ایک مسلمان پر بدظنی کرنے سے محفوظ رہتے۔“

مزید، آپ نے اُنہیں یہ بھی لکھا...... ”آپ میرے ساتھ ناانصافی نہ کریں، بحث علمی انداز میں ہونی چاہیے، یعنی مقصود یہ ہو کہ حریف قائل ہو کر راہِ راست پر آ جائے، یہ نہ ہو کہ اسے بدنام کیا جائے۔“

چناں چہ اکبرالہ آبادی نے آپ کے مکتوب سے قائل ہو کر یا کسی اور وجہ سے متاثر ہو کر آپ کو لکھا:

"آپ کے مطمحِ نظر میں جواہر ہے، اگر میں اُس کی قدر نہ کروں تو مسلمان نہیں۔"

یقیناً اکبر کو یہی کہنا ہی چاہیے تھا، اس لیے کہ وہ خود بھی اقبالؔ کی فکر کے قریب تھے۔ مثلاً اُن کا یہ شعر جس میں وہ اپنی قوم پر تبصرہ فرما رہے ہیں، حافظؔ سے متعلق اقبالؔ کے خیال کی تائید کرتا ہے: کہتے ہیں۔

ان میں باقی ہے کہاں خالد جانباز کا رنگ
دل پہ غالب ہے فقط حافظ شیراز کا رنگ

ظاہر ہے، اقبالؔ نے اپنی مثنوی میں حافظؔ صاحب کے متعلق یہی تو کہا ہے نا کہ اُن کا کلام اسلامی قوتِ عمل اور ہمتِ شجاعت کے منافی ہے جس کا پیکر خالدؔ ایسے جانباز نظر آتے ہیں۔

اسرارِ خودی کے حوالے سے علامہ اقبالؔ پر ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ آپ نے کتاب کا انتساب ایک ایسے شخص سے منسوب کیا ہے جو، اُن کے بہ قول انگریز دوست ہے، حالاں کہ بیرسٹر علی امام محض "سر" ہی نہیں نہایت عالی دماغ اور خلوص و محبت سے بھرا دل رکھنے والے انسان تھے، اُن کی خوب صورت شخصیت ذاتی و صفاتی خوبیوں سے مزین تھی۔ بہار کے مردم خیز علاقہ پٹنہ سے تعلق تھا، مشہور قانون داں اور ہندوستان پر انگریز سرکار کی انتظامیہ کے رکن یعنی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر رہ چکے تھے۔ بعد میں دولتِ آصفیہ حیدرآباد دکن کے صدرِ اعظم ہو گئے۔ علامہ سے اُن کی دوستی میں ذہنی ہم آہنگی، ہم ذوقی و ہم مزاجی کو گہرا تعلق تھا۔ آئندہ چل کر ہندوستان سے انگلستان تک ہم سفر بھی رہے۔

سر علی امام کو انگریز پسند کہا جاتا تھا۔ حالاں کہ خود انگریز اشرافیہ اور دانشور طبقہ ان کی شخصیت سے متاثر تھا، اس جگہ مناسب ہے کہ موصوف کے بارے میں چند باتیں مذکور کر دی جائیں۔ کہتے ہیں ان کے دادا بہار کے معقول اور با اثر افراد میں سے تھے۔ یکا یک ان کے دل میں یہ خیال جاگزیں ہو گیا کہ یہ دنیا بے کار جگہ ہے، چناں چہ جو کچھ ان کے پاس تھا اللہ کی راہ میں لٹا دیا، اس

وقت ان کے فرزند امداد امام، خردسال تھے، ان کو بھی انہوں نے اللہ کے حوالے کر دیا۔ امداد امام صاحب کا قصہ یہ ہے کہ حصولِ تعلیم کے لیے وہ پٹنہ سے کلکتہ کے لیے پیدل ہی روانہ ہو گئے۔ نازو نعم میں پلے تھے، کچھ ہی فاصلہ طے کرنے پر تھک گئے، یہاں تک کہ بے ہوش ہو گئے، کچھ راہگیروں نے دیکھا تو انہیں اٹھا کر قریب ہی زمیندار کی حویلی میں لے گئے۔ بچے کو ہوش میں لایا گیا اور زمیندار کو جب ان کی اصلیت کا علم ہوا تو ان کی بہت دیکھ بھال اور پزیرائی کی گئی۔ دراصل ایک تو اس زمانے میں ویسے بھی اور کچھ اس علاقہ میں مذہبی تعصب کی ہوا اتنی سرگرم نہ تھی، ہندو زمیندار نے مناسب انتظام کر کے کم عمر امداد امام کو کلکتہ پہنچا دیا۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ نواب امداد اثر کے دونوں فرزند علی امام اور حسن امام بیرسٹری کرنے کے بعد لندن سے واپس ہوئے تو نواب صاحب نے انہیں اپنے گھر نہیں اترنے دیا بلکہ دو روپے کی کوٹھری کرائے پر لے دی اور کہا کہ اپنی لیاقت اور قابلیت پر ترقی کر کے دکھاؤ، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو روپے کی کوٹھری میں رہنے والا علی امام، اپنی محنت اور جدوجہد پر ترقی کر کے اس جگہ پہنچا جہاں انگریز سرکار نے انہیں نہ صرف سر کے خطاب سے نوازا بلکہ بادشاہی کونسل کی رکنیت کا اعزاز بھی پایا، یہ اس وقت کی بات ہے جب لارڈ ہارڈنگ ہندوستان کا وائسرائے تھا جو لندن میں ان کا کلاس فیلو رہ چکا تھا۔ یہ اسی تعلق کا سبب تھا کہ ۱۹۰۶ء کو جب ڈھاکا میں مسلم لیگ کی بنیاد رکھی گئی تو سر علی امام کی کوششوں سے ہی مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخابات منظور کرانے میں آسانی ہو سکی۔

ہمارا دل کر رہا ہے کہ اس شخصیت کے حوالے سے ان کے متعلق کچھ اور بھی تذکرہ کر دیا جائے۔ مزید یہ کہ سر علی امام اور حسن امام دونوں بھائی اپنے والد محترم کے مثالی فرماں بردار تھے۔ ایک بار والد صاحب نے سر علی امام سے پچاس ہزار روپے طلب کیے، حکم بجالانے میں قدرے تاخیر ہو گئی تو روپیہ منہ پر دے مارا، بولے: "اس قدر عزیز ہے تم کو پیسہ!"

اور سنیے...... نواب علی امداد صاحب ہمیشہ ڈیوڑھے میں سفر کرتے تھے۔ اس طرح وہ کہیں جا رہے تھے کہ اسی ریل میں وائسرائے کا خصوصی سیلون لگا ہوا تھا جس میں سر علی امام ایکٹنگ وائسرائے کی حیثیت سے سفر کر رہے تھے۔ (یاد رہے، موصوف ہندوستان کے پہلے اور آخری فرد تھے جو اتنے بڑے انگریزوں کے ہم حیثیت منصب پر فائز ہوئے۔)

سرعلی امام کو علم ہوا کہ اسی ٹرین میں والد صاحب بھی سفر کر رہے ہیں تو ان کو اپنے سیلون میں آنے کو کہا، لیکن نواب حاجب نے سختی سے انکار کر دیا۔ بلکہ بھرے پلیٹ فارم پر بیٹے کو سخت وست سنا ڈالی اور بیٹا جو اس وقت وائسرائے کا جانشین تھا، ہاتھ باندھے اور سر جھکائے چپ چاپ سنتا رہا۔

آگے چل کر مسجد کانپور جو مسجد بابری کی طرح کا مسئلہ تھا، انہی علی امام کی کوششوں سے طے پا سکا۔ بعد میں ریاست دکن نے انہیں ان کی انہی خدمات کی بنا پر ریاست کا وزیر بنالیا۔

خواجہ حسن نظامی نے، اسرارِ خودی کے جہاں دیگر مندرجات پر اعتراضات کیے تھے، انتساب پر بھی وہ سخت معترض تھے، اُنہوں نے کہا:

''مثنوی کو سرعلی امام سے نام زد کر کے اقبال نے اپنی خودی پر چوٹ لگائی ہے۔''

علامہ صاحب نے اس کے جواب میں فرمایا:

''خواجہ صاحب شاید انتساب کے معنی نہیں سمجھتے، اُن کی خدمت میں عرض ہے۔ اس سے مراد محض اظہارِ محبت و اخلاص ہے جو دو آدمیوں کے ذاتی تعلقات پر مبنی ہوتا ہے۔ میں نے اِن اشعار میں ڈیڈیکشن (انتساب) کی وجہ صاف لکھ دی ہے۔ آپ اِن اشعار کو غور سے پڑھتے تو خود بخود یہ بات معلوم ہو جاتی۔''

علم و ادب کا ایک ادنیٰ طالب و خادم ہونے کی حیثیت سے میں یہ اندازہ لگا سکا ہوں کہ علامہ اقبال کے بعض ہم عصر اہلِ علم و دانش یقیناً فضیلت و مرتبہ کے لوگ تھے۔ تاہم اقبال کو اقبال کی حیثیت سے سمجھنے میں اُنہوں نے بھی کماحقہٗ فکرو سعی نہیں کی، اُن کی سوچ میں نہ تنوع اور نہ نیا پن پایا جاتا ہے اور نہ ہی وہ حکیمانہ درک تھی جو اقبال ایسے قلندر کی شخصیت اور اُن کے افکار کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔ یہ حضرات محض قدیم سے چلی آنے والی مروّجہ نقد و نظر کی شطرنج کا کھیل جانتے تھے، یہ بالکل شعر کو جانچنے والے اُس نقاد کی طرح تھے جن کی نظر محض اِس حد تک ہوتی ہے کہ اس میں کیا شعری لوازمات استعمال ہوئے ہیں، شعر وزن میں ہے، بحر سے تو خارج نہیں؟ اور کیا کیا صنائع و بدائع رکھتا ہے۔ رہا اُس کے اندر اعلیٰ مفہوم اور کوئی حکیمانہ نکتہ، اُس تک پہنچنے کی

انہیں چنداں ضرورت نہیں ہوتی، یا یوں کہیے کہ ان میں وہ لیاقت ہی نہیں ہوتی۔ چناں چہ اقبالؔ کے ناقدین کا عمل بھی کچھ ان تبصرہ نگاروں سے زیادہ مختلف نہیں، اور اس حقیقت کے پیشِ نظر ہم بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ اقبالؔ کی فکر و نظر اور آپ کے ویژن تک پہنچنے کے لیے محض دماغ نہیں، دل کی بھی ضرورت ہے، کاغذی علم کی اسناد رکھنے والے افراد اقبالؔ ایسے مکتبِ عشق سے فارغ التحصیل اہلِ دل کی حدیثِ روح کو کیا سمجھ سکتے ہیں۔ کیوں کہ ہمیں دورِ اقبالؔ کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اُس وقت کئی طرف سے یہ عامیانہ آوازیں بھی آتی سنائی دی تھیں کہ، اقبالؔ نے اپنے فلاں شعر میں، یہ لفظ صحیح استعمال نہیں کیا، فلاں نظم میں زبان کا یہ نقص اور عیب پایا جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ حالاں کہ اقبالؔ کے انکسار کا یہ عالم ہے کہ ایسے موقعوں پر اکثر کہتے سنائی دیتے ہیں۔ میں اہلِ زبان نہیں، میری مادری زبان اُردو نہیں۔ جب کہ اُن اہلِ زبان سے کوئی پوچھے، آپ نے اپنی ٹکسالی، بیگماتی، قلعۂ معلّٰی کی اعلیٰ وارفع زبان دانی سے ملک و قوم کی کیا خدمت کی! بس اس جاہلانہ خوش فہمی میں زندگیاں برباد کر گئے کہ خود کو شرفا، دوسروں کو رزیل، خود کو اہلِ زبان، دوسروں کو "کرخندار" کہتے رہے۔

ساحل پر کھڑے ہو کر سمندر کی گہرائی اور گیرائی کو جانچنے اور سمجھنے والے سمندر کی تہ تک نہیں پہنچ پاتے جیسا کہ بلبلِ شیراز فرماتے ہیں:

سعدی بہ بلب دریا در دانہ کجا یابی
در کام نہنگان رو، گر می طلبی کامے

وہ اقبالؔ کے اس نکتۂ خرد افروز کو بھی سمجھنے سے قاصر تھے کہ:

الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا
غوّاص کو مطلب ہے صدف سے کہ گُہر سے

اے سعدی دریا کے کنارے پر کھڑے رہنے سے گوہر ہاتھ میں نہیں آتا، اس کے لیے دریا میں کود کر مگر مچھوں کے جبڑے چیرنے پڑتے ہیں، تب کہیں کامیابی ملتی ہے، یعنی گوہرِ مقصود پانے کے لیے کاوش و سخت جانی کے عمل سے گزرنا پڑتا ہے۔ اقبالؔ رود زندہ ہے۔ جو لوگ ساحل پر کھڑے اُس کی گہرائی و گیرائی کا اندازہ لگاتے اور اُس کی موجوں کی تیزی و روانی پر تبصرے کرتے

رہے انہیں کیا ملا اور جو اقبالؔ کے اندر اتر گئے، وہ ضرور اُس گوہرِ آب دار کو پا گئے جو یہ زندہ رود اپنے دامن میں لیے آوازیں دے دے کر کہہ رہا تھا، ''آؤ اور میرے دامن کی وسعتوں سے اپنا حصہ لے کر اپنا دامن بھر لو''۔ اور جن لوگوں نے اخلاص کے ساتھ اپنے ذوق کے مطابق اقبال کے بحر میں غوطہ زنی کی وہ یقیناً گوہرِ مقصود پا گئے، میں اس دور کی صرف ایک غواص جرمن میری شمل کی مثال دے سکتا ہوں۔ جس خاتون نے فکرِ اقبال کی روشنی کو اپنا لباس بنالیا۔

لیکن ہم تو اس وقت اقبال کے دور میں ہیں اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں، کیا سمجھ رہے ہیں! اقبالؔ بحرِ بے کراں کی طرح ٹھاٹھیں مارتا ہوا اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔ یہ ۱۹۱۸ء ہے کہ آپ نے اسرار خودی کا دوسرا حصہ ''رموزِ بے خودی'' مکمل کرلیا، بلکہ شائع ہوکر منظرِ عام پر آ گیا۔ مزید اس سلسلے میں یہ ہوا کہ مثنوی کے دونوں حصوں کو یک جا کر کے، ''اسرار و رموز'' کے نام سے شائع کر دیا۔ اس بار یہ کیا حافظ شیرازی کے کلام پر آپ نے جو تبصرہ کیا تھا اور جس وجہ سے حافظ کے ''نادان دوستوں'' نے آپ پر اعتراضات بلکہ برہمی کا جو طوفان برپا کیا تھا، اُس کو حافظ شیرازی سے مخصوص کرنے کی بجائے آپ نے ادبیاتِ اسلامیہ کی اصلاح کے عنوان میں بدل دیا۔

یہ بھاری گفت و شنید تحفظات و اعتراضات اپنی جگہ، لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضرت علامہ کی اس شاہ کار فکری کاوش ''اسرار و رموز'' نے اسلامی ادبیات میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ مشرق سے زیادہ مغرب والے فکرِ اقبال سے چونک پڑے، یہاں تک کہ مغرب کے فلسفی و مفکرین ایک دوسرے کو طعنہ دینے لگے کہ فکر و فلسفہ کے میدان میں ہم کیا بچکانہ حرکتیں کر رہے ہیں اور ہندوستان میں بیٹھا ایک شخص (اقبالؔ) کیا فکری کارنامے انجام دے رہا ہے۔''

☆☆

moolib.org

شریکِ انجمن:

انجمن حمایت الاسلام سے آپ کو شروع سے ہی ایک طرح کا خصوصی لگاؤ رہا تھا۔ دراصل آپ کا پہلا عوامی تعارف ہی اس کے پلیٹ فارم سے ہوا تھا۔ جنوری ۱۹۱۶ء میں آپ کو انجمن کی جنرل کونسل کا رکن منتخب کرلیا گیا تو یقیناً آپ کو ایک دلی طمانیت کا احساس ہوا ہوگا۔

جسم وجاں میں انتشار:

جسمانی صحت انسان کی مصروفیات اور اِس کے ارادوں کی تکمیل کے لیے نہایت اہمیت کی حامل ہوتی ہے، ذرا اِس کے مزاج بگڑے کہ کاروبارِ زندگی ٹھپ ہوکر رہ جاتا ہے۔ حضرت علامہ بھی اپنے معمولات میں مصروف تھے کہ اِسی سالِ رواں میں یکم جولائی کو یکا یک دردِ گردہ کی شکایت ہوئی۔ لیکن اقبالؔ اپنے لیے کب تھے جو ایسی رکاوٹوں کی پروا کرتے، مگر تکلیف حد سے بڑھی اور ناقابلِ برداشت ہونے لگی تو انگریزی دواؤں سے گزر کر یونانی طریقۂ علاج سے رجوع کیا گیا۔ دہلی میں حکیم نابینا سے علاج کرایا گیا اور اللہ تعالیٰ نے شفا نصیب فرمائی اور آپ کا یہ قول صحیح ثابت ہوا کہ "طب جسم کی شاعری ہے، جسم کا بھی ایک حسن ہے، صحت اِس جسم کی روح ہے۔" الحمد اللہ آپ نے صحت پائی اور اِس طرح آپ کا مشن متاثر نہ ہوسکا۔ کاروانِ فکر آگے بڑھتا رہا۔

اجنبی پودا:

۱۹۱۷ء کو آپ کا ایک فکر انگیز مضمون قومی زندگی کے عنوان سے ماہنامہ مخزن میں شائع ہوا۔اور اسی سال ۱۳رنومبر سید سلیمان ندوی کو آپ نے ایک مکتوب میں یہ اہم نکتہ تحریر فرمایا:

''تصوف وجودی، سرزمین اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے، جس نے عجمیوں کی آب و ہوا میں پرورش پائی ہے۔''

دراصل یہ اسی اعتراض کے جواب کا حصہ تھا جو اسرار خودی کی اشاعت کے بعد ایک ہنگامے کی صورت اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔جس کا سبب ہم جان چکے ہیں، ڈاکٹر صاحب نے مسلمانوں میں رائج الوقت تصوف پر سخت تنقید کی تھی، فرمایا تھا کہ یہ عجمی فکر کی پیداوار ہے، اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ اسلام عمل کا دین ہے جب کہ یہ عجمی نژاد تصوف جس کو مسلمانوں نے غلطی سے بڑی عقیدت ومحبت سے گلے لگا رکھا ہے، انسان کو غیر فعال بناتا اور اس کی خودی کو مجروح کرتا بلکہ ماردیتا ہے، اس خودی کو جو اسے انسانیت کی اس منزل اور اس منصب پر دیکھنا چاہتی ہے جو قدرت نے اسے اپنی خلافت جلیلہ پر متمکن فرمایا ہے۔

خوں آشام جشنِ فتح:

حیاتِ اقبال کے روز وشب ایک بار پھر تعلیم وتدریس سے وابستہ نظر آتے ہیں۔یہ ۱۹۱۸ء ہے کہ اسلامیہ کالج لاہور میں آپ کو ایم اے فلسفہ کی مدرسی کا منصب سنبھالنے کی درخواست کی جاتی ہے جسے آپ قبول فرمالیتے ہیں۔یہی وہ عرصہ ہے کہ مثنوی اسرار خودی کا دوسرا رخ ''رموزِ بے خودی'' شائع ہوکر منظر عام پر آتا ہے۔اسی دوران، قومیت کے نام پر، حصولِ زر کے لیے لڑی جانے والی پہلی عالمی جنگ جو یورپی اقوام کے مابین ۱۹۱۴ء میں شروع ہوئی تھی، ہزاروں لاکھوں انسانوں کو آگ اور خون میں نہلانے کے بعد اپنے منطقی نتیجہ پر پہنچ کر ختم ہوگئی۔انگلستان نے اپنی اس خوں آشام فتح کا جشن منایا۔دنیا کی تمام برطانوی مقبوضات میں اس جشنِ مسرت کی محفلیں منعقد کی گئیں۔ ہندوستان تو اس کی سب سے بڑی کالونی تھا، یہاں بھی انگریز نے بغلیں بجائیں ودسرکاری سطح پر منائے جانے والے اس جشنِ مسرت کی تقریبات میں، ہندو مسلم اکابرین اور

عمائدین کو دعوت دی گئی۔ لاہور میں ہونے والی تقریب میں دیگر مقامی عمائدین کے علاوہ ڈاکٹر محمد اقبالؔ کو بھی مدعو کیا گیا۔ تقریب کے دوران، پنجاب کے منتظمِ اعلیٰ سر مائیکل اوڈوائر نے آپ سے شعر سنانے کی فرمائش کی جو اس بات کا ثبوت ہے کہ انگریز کو یقین ہو چکا تھا کہ کلامِ اقبالؔ نہ صرف مسلمان بلکہ برصغیر کے علاوہ تمام ایشیائی اقوام کے لیے ایک تازیانہ کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن انگریز اس تازیانے کو خود اپنی پشت پر لگتا محسوس کرنے لگے ہیں۔ اسی لیے اقبالؔ کی طرف سے چوکنا بھی ہیں اور انہیں اپنے حلقۂ اثر میں لینے کی خواہش اور کوشش بھی کرتے رہتے ہیں۔ مگر شاہین زیرِ دام آنے والا کہاں۔ اقبالؔ کو اس طرح کی فرمائش پر شعر سنانا پسند نہیں تھا چاہتے تو انگریز لارڈ صاحب کی فرمائش پر طرح دے جاتے لیکن مناسب خیال کیا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنا کچھ پیغام حاضرین کے گوش گزار کر دیا جائے، چناں چہ کئی نظموں سے سامعین کو آپ نے نوازا اور داد وصول کی۔

انگریز کی بدعہدی:

اِدھر جشنِ فتح کی خوشی میں انگریز لارڈز صاحبان جام لنڈھا رہے ہیں، اُدھر ہندوستانی عوام اُن کے خلاف سڑکوں پر نکل آئے ہیں۔ اس احتجاج کی وجہ یہ ہے کہ جنگ کے دنوں میں برطانیہ مختلف مشکلات کا شکار تھا، اِس صورت میں حکومت کے لیے ضروری تھا کہ وہ اندرونی خلفشار سے بچی رہے۔ اس کے زیرِ تسلط علاقوں خصوصاً ہندوستان میں حالات "نارمل" رہیں، ہندوستانی عوام اِن کے لیے کوئی مسئلہ پیدا نہ کریں کیوں کہ سیاسی بے چینی یہاں مدت سے چلی آ رہی تھی۔ چناں چہ ہندوستانیوں کو رام کرنے کے لیے وزیرِ ہند مسٹر مانٹی گور ۱۰ راگست ۱۹۱۷ء کو اعلان کر چکا تھا کہ جنگ کے اختتام پر ہندوستان میں مقامی باشندوں پر مشتمل حکومت قائم کر دی جائے گی جو خود مختار ہو گی، اور خود کو ہی جواب دہ ہو گی۔ اہلِ ہند نے اس اعلان کو خوش آئند سمجھا تھا، ہندو مسلم دونوں قوموں کی طرف سے اس کا خیر مقدم کیا گیا۔ لیکن اب جنگ ختم ہوتے ہی انگریز اپنے عہد سے پھر گیا، اِس نے گزشتہ اعلان کی جگہ ایک نئے قانون "رولیٹ ایکٹ" کے نفاذ کا اعلان کر دیا جس سے لوگوں میں شدید غم و غصہ پھیل گیا اور پورا ملک سراپا احتجاج بن گیا۔

اس وعدہ خلافی کے ساتھ ہی فرنگیوں نے ایک اور بدعہدی کا مجرمانہ فعل کیا، وہ یہ کہ انہوں نے مسلمانوں سے وعدہ کیا تھا کہ جنگ اگر اُن کے حق میں ختم ہوئی تو وہ ترکی کو نقصان نہیں پہنچائیں گے جو اُن کے حریف کا اتحادی ہے اور اُن کی مخالف طاقتوں کے ساتھ جنگ میں شریک ہے۔ لیکن جیسے ہی جنگ کا نتیجہ انگریز اور اُن کے اتحادیوں کے حق میں ہوا، برطانیہ مسلمانوں سے اپنے عہد کو فراموش کر بیٹھا اور ترکی کے استحصال پر کمربستہ ہو گیا۔ یعنی خلافتِ عثمانیہ کو ختم کرنے کے منصوبے بنانے لگا۔ یہ اقدام مسلمانانِ ہند کے لیے ناقابلِ برداشت تھا، اس لیے کہ وہ ترکی سے ایک جذباتی وابستگی رکھتے تھے۔ ترکی میں مسلمانوں کی یہ علامتی و آخری خلافت تھی اور مسلمان اس کو اپنا مرکز خیال کرتے، بلکہ جیسا کہا گیا اپنے جمعہ کے خطبات میں ترکی کے خلیفہ کا نام استعمال کرتے تھے۔ چناں چہ انگریزوں کی اس دہری بدعہدی نے ہندوستانی عوام کو شعلہ بار بنا دیا۔

خلافت کمیٹی کا قیام:

احتجاج کا یہ سلسلہ طول پکڑتا گیا۔ اس میں ہندو اور مسلمان دونوں ہی شریک تھے کہ ۲۰ رمئی ۱۹۱۹ء کو، لکھنؤ کے مولانا عبدالباری فرنگی محل نے بمبئی کے ایک اجتماع میں ''خلافت کمیٹی'' کے قیام کا اعلان کر دیا۔ جس کا مقصد ترکی میں خلافتِ عثمانیہ کے تحفظ میں تحریک چلانا تھا۔ دسمبر میں دہلی کے اندر منعقدہ خلافت کمیٹی کے اجلاس میں ہندوؤں کے مشہور لیڈر مسٹر گاندھی اور موتی لال نہرو کے علاوہ کئی اور ہندو راہنماؤں نے شرکت کی اور تحریک خلافت کے لیے اپنی غیر مشروط حمایت کا یقین دلایا۔

علی برادران اور بی اماں:

تحریک خلافت کے اصل روحِ رواں علی برادران مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی جوہر ٹھہرے۔ بہت ہی جری، نڈر اور شعلہ بیان مقرر تھے۔ انگریز کے لیے دردِ سر بن گئے۔ دراصل ان دو بھائیوں سے پہلے سرزمینِ ہند پر کسی نے انگریز کو اس طرح نہیں للکارا تھا، گویا فرنگی رعب داب کا بت پاش پاش کرنے والے سب سے پہلے یہی دونوں بھائی ہیں جو علی برادران کے نام سے مشہور ہوئے، جنھوں نے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں، لیکن انگریز کے استبداد کے آگے نہ

جھکے نہ نرم پڑے، بلکہ ان بہادر سپوتوں کی والدہ بزرگ وار بھی میدان میں نکل آئیں اور ایک ایسا نعرۂ مستانہ قوم کو دیا جو ہندوستان کے بچے بچے کی زبان کا ترانہ بن گیا اور وہ "بی اماں" کے معزز نام سے پکاری جانے لگیں۔ اُنہوں نے جو سرفروشانہ نعرہ بُلند کیا وہ یہ تھا کہ......

"بیٹا جان خلافت پہ دے دو!"

تحریک خلافت کی حمایت:

تحریک خلافت کے ذیلی دفاتر ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں قائم کیے گیے، اور لاہور میں بھی اس کا دفتر قائم ہوا اور یہ تحریک زور پکڑتی گئی۔

علامہ اقبالؔ طبعاً اور کچھ اِس وجہ سے کہ ہندوستان میں سیاست بے جہت یا پھر مایوس کن انداز میں ہو رہی ہے، سیاسی جلسے جلوسوں سے دور رہنے لگے تھے، البتہ اب بھی آپ صرف فکری محاذ پر مورچہ بند تھے۔ لہٰذا شروع میں تحریکِ خلافت کو اپنے مزاج کے قریب پایا، مسلمانوں کی بقا اور خصوصاً ترکی ایسے اسلامی ملک کے ساتھ علامہ کے دل کی دھڑکنیں شامل تھیں، لہٰذا آپ نے خلافت کمیٹی کی بھرپور حمایت کی، حالاں کہ اِس سے قبل ایک موقع پر مولانا شوکت علی نے علامہ صاحب کو لکھا۔ ڈاکٹر صاحب مجھے بڑی خوشی ہوگی کہ آپ علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوی ایشن کے سالانہ اجلاس میں شریک ہوں، آپ کا کلام ہمارے لئے گرمیِ ایمان کا ذریعہ ہے۔"

علامہ صاحب نے جواب میں تحریر فرمایا:

"دنیا اور اہل دنیا کے ساتھ تھوڑا بہت تعلق ضروری ہے مگر اسی وجہ سے کہ روٹی کھانے کی مجبوری ہے۔ تم مجھے علی گڑھ بلاتے ہو، میں ایک عرصہ سے خدا گڑھ میں رہتا ہوں اور اس مقام کی سیر کئی عمروں میں ختم نہیں ہو سکتی۔ بھائی شوکت! اقبالؔ عزلت نشیں ہے اور اِس طوفانِ بدتمیزی کے زمانے میں گھر کی چار دیواری کو کشتیِ نوح سمجھتا ہے۔"

لیکن اب خلافتِ عثمانیہ کے تحفظ کا سوال آیا تو اقبالؔ گھر میں نہیں بیٹھے رہے، بلکہ تحریک خلافت کے سلسلہ میں لاہور میں ہونے والے اجتماعات میں تواتر کے ساتھ شریک ہوئے۔

تحریک سے گریزاں:

یاد رہے تحریکِ خلافت کے ساتھ گاندھی جی نے ترکِ موالات کی مہم بھی شامل کر دی تھی، لہٰذا یہ دونوں احتجاجی تحریکیں ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ اِس طرح کا جلسہ ۵؍دسمبر ۱۹۱۹ء کو لاہور کے باغ بیرون موچی دروازہ میں منعقد ہوا۔ صدارت میاں فضل حسین نے کی۔ جلسہ کا ایجنڈا یہ تھا "برطانیہ سے مطالبہ کیا جائے کہ وہ ترکی کے حصے بخرے نہ کرے اور نہ ہی خلافتِ عثمانیہ کا سقوط کیا جائے۔" اقبالؔ کی بصیرت، ان مطالبہ کرنے والوں سے کہیں بہت زیادہ اعلیٰ تھی۔ آپ برطانیہ اور اُس کے اتحادیوں کے استعماری مزاج کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ اُن سے کسی خیر کی توقع عبث تھی۔ چناں چہ آپ نے اِن عیاروں سے اِس طرح کے مطالبات کو ایک طرح سے بھیک تصور کیا، اپنی تقریر میں فرمایا:

> "ہم کیوں کسی بندے کے سامنے شکایت کریں، ہمیں خدا کے سامنے شکایت کرنی چاہیے۔ خدا کے سوا کسی اور کی اطاعت ہمارے لیے واجب نہیں:
>
> اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے جائے
> تو احکامِ حق سے نہ کر بے وفائی"

☆

اب ہم چاہیں گے کہ حضرت علامہ اقبالؔ کی علمی، ادبی اور سماجی، بہ شمول سیاسی سرگرمیوں کا اختصار کے ساتھ جائزہ لیں، تا کہ آپ کے مشن کی روانی اور پیش قدمی ایک تسلسل کے ساتھ ہمارے سامنے آتی چلی جائے۔

اس وقت تو ہم دیکھ رہے ہیں کہ سالِ رواں کا گیارہ واں مہینہ ہے کہ ۱۹۱۴ء میں چھڑنے والی جنگِ عظیم اپنے اختتام کو پہنچ چکی ہے۔ انگریزی استعمار پہلے جنگ کی وجہ سے کم زور پڑتا جا رہا تھا، لہٰذا دورانِ جنگ، یہاں اپنی "رعایا" سے جو خوش کن وعدے کیے تھے، اب جنگ کے نتیجے کو اپنے حق میں دیکھ کر ان وعدوں کو فراموش کر کے برصغیر میں ہنگامی قانون دفاعِ ہند کی بہ جائے

ایک نیا قانون رولیٹ ایکٹ نافذ کردیا۔ اس نئے ایکٹ کے خلاف ہندوؤں کے ایک بڑے لیڈر مسٹر گاندھی نے سخت مخالفت کرتے ہوئے "ستیہ گرہ تحریک" شروع کردی اور اس ملک گیر احتجاج نے شدت اختیار کرلی۔ اسی دوران اسی تحریک کے سلسلے میں ہونے والے ایک احتجاجی جلسہ پر جو پنجاب کے شہر امرتسر کے اندر جلیاں والہ باغ میں ہورہا تھا، انگریز جنرل ڈائر کے حکم پر پولیس ایکشن کیا گیا، جس میں سینکڑوں جانیں تلف ہوگئیں۔ یہ دورِ فرنگی کا نہایت ہی خونیں سانحہ تھا۔ ظاہر ہے اس کا ردِ عمل بھی ہونا تھا۔ جس کی پیش بندی کے لیے انگریز انتظامیہ نے پنجاب کے کئی شہروں میں مارشل لا نافذ کردیا۔ یہ صورتِ حال تھی جو برصغیر کی سیاسی اُفق پر دھند چھائی ہوئی تھی۔ اس کے باوجود ہندوستان کی دو بڑی سیاسی قوتیں مسلمان اور ہندو، ہندوستان کے مستقبل کے لیے ایک صفحہ پر نہیں تھیں، بلکہ انگریز کی تو شروع سے پالیسی ہی یہ رہی کہ "تقسیم کرو اور حکومت کرو"، اور وہ اپنی اسکیم میں کامیاب چلا آرہا تھا، بلکہ اب عالمی جنگ کے خاتمہ پر اُس کی چالاکی زور آوری میں بدل گئی۔ تشدد پر اتر آیا، جس کی مثال جلیاں والہ واقعہ ہے۔

علامہ اقبالؔ ملک میں پیدا ہونے والے اِن واقعات اور حالات سے بے خبر نہیں تھے، بہت گہری نظر رکھے ہوئے تھے اِن سب معاملات پر۔ خصوصاً مسلمانوں کی طرف سے بہت زیادہ فکرمند تھے سوچ رہے تھے کہ اس ملک میں ان کا کیا مستقبل ہے۔ علامہ کو انتہائی افسوس یہ تھا کہ خود مسلمانوں کے اندر اتفاق و یکجہتی نہیں ہے۔ اُن کے زعماء و راہ نما ابھی تک سب مل کر کوئی ایسا واضح اور ٹھوس لائحۂ عمل نہیں بنا سکے ہیں جو ان کی مضبوط اور موثر آواز بن سکے۔ مسلم لیگ قائم ہوچکی تھی، لیکن اس جماعت کے اندر بھی کوئی ایسا راہ نما نہیں تھا جو موجودہ حالات کا سامنا کرتے ہوئے برصغیر کے مسلمانوں کی ڈانواں ڈول کشتی کو کنارے لگا سکتا۔

علی برادران کی "خلافت کمیٹی" بھی کوئی بہتر اور مطلوبہ نتائج حاصل نہیں کرسکی تھی، بلاشبہ علی برادران، یعنی مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی جوہرؔ نہایت بے باک نڈر اور مردانِ حر تھے، انگریزوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُنہیں للکار رہے تھے اور صلے میں قید و بند کی صعوبتیں جھیل رہے تھے، لیکن لگتا یہ تھا کہ یہ اِن مجاہدین کی انفرادی آواز ہے، عوامی طاقت وقوت اُن کے ساتھ ایسی نہیں جو انگریز کو مشکل میں ڈال سکے، تاہم اُن دونوں شیروں نے انگریزوں کے پسینے

چھیڑ رکھے تھے، بلکہ برصغیر کی تاریخ میں یہی دو بھائی ہیں جنھوں نے انگریز کو اس طرح بے خوف ہو کر للکارنے کی ہمت کی تھی، انہی کی پہل پر دوسرے لوگوں میں بھی ہمت ہوئی اور اُن کے لب کھلے، ورنہ ہندوستان کے بڑے بڑے لیڈر اوّل تو اظہارِ حق میں ویسے ہی بودے تھے، اور اگر قوم کی ترجمانی کرتے بھی تھے تو مصلحت کا شکار نظر آتے، معذرت خواہانہ لب و لہجہ میں انگریز کو مخاطب کرتے۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا علی برادران کی خلافت کمیٹی کے قیام اور اُس کی تحریک کا مقصد ترکی میں مسلم خلافت کا تحفظ کرنا تھا، کیوں کہ خلافتِ عثمانیہ کے نام سے یہ حکومت عالمِ اسلام کے لیے مرکزی حیثیت رکھتی تھی۔ مسلمانوں کی خلافتِ عثمانیہ سے جذباتیت اسی وجہ تھی کہ برصغیر کے مسلمان گو کہ انگریز کے زیرِ تسلط تھے، لیکن دل سے کبھی اُنہوں نے گوروں کو اپنا حاکم تسلیم نہیں کیا تھا، وہ شروع سے ہی اُنہیں قابض اور غاصب خیال کرتے رہے، اس کے برعکس ترکی میں قائم خلافتِ عثمانیہ اصل میں ان کی اپنی نظریاتی حکومت تھی بلکہ جمعہ کے خطبہ میں یہاں خلیفۂ ترکی کا نام لیا جاتا اور ان کے لئے دعائے خیر کی جاتی تھی۔ لہٰذا اقبالؔ جو مسلم نشاۃِ ثانیہ کے لیے فکری محاذ پر روز و شب مصروفِ جہاد تھے، آپ کی خلافت کمیٹی سے وابستگی بھی فطری بات تھی، لیکن آپ نے دیکھا کہ ہندو لیڈر کرم چند گاندھی نے خلافت کمیٹی کے پلیٹ فارم کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا ہے، بلکہ خود خلافت کمیٹی نے قیادت کی باگ ڈور گاندھی کے سپرد کر دی ہے تو اقبالؔ نے اُس سے علیحدگی اختیار کر لی۔ گو خلافت کمیٹی کا یہ فیصلہ کہ اس نے گاندھی کو اپنا سرخیل بنا دیا غالباً ہندوستان میں ہندوؤں کے ساتھ خیر سگالی کے بہ طور تھا، تاکہ ہندو مسلم طاقت کو مشترکہ اور یک جا دیکھ کر انگریز سوچنے پر مجبور ہو سکے اور جیسا کہ محمد علی جوہر انگریز کو للکار کر کہہ رہے تھے۔ "انگریز کو چاہیے اپنا بوریا بستر گول کر کے یہاں سے چلتا بنے، ورنہ ہمیں اسے اُٹھا کر پھینکنا پڑے گا۔" ان کا خیال تھا کہ مسلم و ہندو اتحاد سے انگریز کمزور پڑ جائے گا، لیکن اقبالؔ کی دوررس نظریں کچھ اور دیکھ رہی تھیں یہ کہ گاندھی دیکھنے میں کچھ اور برتنے میں کچھ اور ہے، وہ مسلمانوں کو ساتھ لے کر صرف عوامی طاقت کا مظاہرہ کرنا چاہتا ہے، ورنہ جب اُس کا کام نکل جائے گا تو وہ اسی طرح مسلمانوں سے آنکھیں پھیر لے گا جیسا کہ ہندو ذہنیت ہمیشہ سے یہی مظاہرہ کرتی رہی ہے۔ اس

موقعے پر اکبرالہ آبادی نے بھی گاندھی کی چالاکی اور مسلمانوں کی سادگی پر بہت خوب صورت تبصرہ کیا، فرمایا:

بدھو میاں بھی حضرت گاندھی کے ساتھ ہیں
گو مشتِ خاک ہیں مگر آندھی کے ساتھ ہیں!

یعنی بھولا مسلمان گاندھی ایسے گھاگ کی باتوں میں آ کر اُس کے ساتھ اور اُس کے ہم قدم ہو گیا ہے، جب کہ وہ (گاندھی) ایک ایسی آندھی ہے جو مسلمان قوم کو اپنے ساتھ اُڑا کر لے جائے گی۔ مطلب یہ ہے کہ اگر انگریز ہندوستان چھوڑ کر چلے بھی گئے اور ہندوستانیوں کو آزادی مل بھی گئی تو گاندھی جی مسلمانوں کو ایک اقلیت ضرور تسلیم کر لیں گے لیکن اُنھیں برابری کا درجہ ہرگز نہیں دے سکیں گے جیسا کہ کہا گیا۔

۱۹۱۹ء کو امرتسر میں سیاسی جماعت کانگریس، مسلم لیگ، خلافت کمیٹی اور جمعیت علماء کے بہ یک وقت اجلاس ہوئے تھے، اور علامہ نے خلافت کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کی اور اس شرکت کا سبب آپ کے نزدیک محض خلافت کمیٹی کی ایک ملی اور مذہبی حیثیت تھی جیسا کہ بیان کیا گیا کہ مسلمان ترکی میں سلطنتِ عثمانیہ کو اپنا مرکز سمجھتے تھے اور سربراہِ مملکتِ عثمانیہ کو عالمِ اسلام کا خلیفہ تسلیم کرتے تھے، اس وجہ سے علی برادران کی قائم کردہ خلافت کمیٹی ہندوستان میں مسلمانوں کے دلوں کی دھڑکن بن گئی تھی اور بہت سے اہلِ ایمان تحریکِ خلافت میں شامل ہو گئے تھے، اُن میں اقبالؔ بھی تھے، لیکن جب خلافت کمیٹی نے اس اہم خالص مسلم لیگی تحریک کو کرم چند گاندھی کے حوالے کر دیا تو اقبالؔ اس تحریک اور کمیٹی سے الگ ہو گئے۔

قاتل جنرل ڈائر:

جمہوریت کے چیمپئن برطانیہ صاحب بہادر کو یہ بھی برداشت نہ تھا کہ اس کے بوٹ تلے دبے اس کے غلام آہ بھی کر سکیں۔ احتجاج کرنا جو ساری دنیا میں انسانی حقوق میں شمار ہوتا ہے، لیکن فرنگی فرعون نے ۱۳ راپریل ۱۹۱۹ء کو شہر امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں ہونے والے ایک احتجاجی جلسہ پر جنرل ڈائر یکٹر کے حکم سے گولیاں چلادیں اور دیکھتے ہی دیکھتے چار سو سے زیادہ گوشت پوست کے جیتے جاگتے انسانوں کو خون میں نہلا کر موت کی نیند سلا دیا۔ ایک دوسرے گورے

پنجاب کے گورنر مائیکل اوڈوائر نے پنجاب بھر میں مارشل لگا دیا اور جگہ جگہ پھانسی گھاٹ قائم کر دیے گیے۔ ایسا لگا تاریخ پھر ایکشن ری پلے کر رہی ہو۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کا خونین باب جیسے پھر کھل گیا ہو۔ اوڈوائر کی چنگیزیت نے لوگوں کو اس قدر دہشت زدہ کر دیا کہ مولانا ابو الکلام آزاد، حکیم محمد اجمل خاں، مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی جوہر اور کرم چند گاندھی جیسے اکابرین لاہور پہنچے تو کسی نے ڈر کے مارے اُن کے لیے دروازہ نہ کھولا۔ ہر شخص اُنھیں اپنے ہاں ٹھہراتے ہوئے خوف زدہ تھا۔ بالآخر ایک شخصیت میاں عبدالعزیز بار ایٹ لا نے جرأت دکھائی اور اِن زعماء کو اپنے ہاں ٹھہرایا۔

ننگ پادشاہی:

ملک میں احتجاج اور ہنگامہ آرائی سے کچھ حاصل نہ ہو سکا۔ انگریز بہادر طاقت کے نشہ چور تھا۔ ہندوستان رعایا کو کیڑے مکوڑے سمجھتا تھا، گولی کے زور پر اِن کو دبانا چاہتا تھا، یہ الگ بات کہ اگر کروڑوں عوام مل کر اُس پر تھوک بھی دیتے تو چند ہزار انگریز اِس میں ڈوب کر مر جاتے، لیکن خود ہندوستانیوں کو بھی برسوں کی غلامی نے کم زور، بے جوش اور خوفِ مرگ میں مبتلا کر دیا تھا۔ لگتا تھا ان کے منہ میں تھوک اور رگوں میں خون بھی خشک ہو گیا ہے۔ تھوڑا بہت جوش و جذبہ جو نظر آ رہا تھا تو بلا مبالغہ اُس مردِ مومن کے ولولہ انگیز پیغام کا نتیجہ تھا جس کا نام اقبالؔ ہے۔ ہندوستانیوں کی دوسری کم زوری اور بے اثری کا سبب صحیح لیڈر شپ کا فقدان تھا۔ کوئی ایسا راہ نما میدانِ سیاست میں نہ تھا جو اِس بکھری ہوئی طاقت کو یک جا کرنے میں کام یاب ہو سکتا جو کروڑوں عوام پر مشتمل تھی۔ کیوں کہ نہ وہ سب ایک پرچم تلے جمع تھے، نہ اُن سب کی عنان کسی ایک کے ہاتھ میں تھی اور نہ ہی اُن کے سامنے کوئی واضح راستہ اور نصب العین تھا۔ لہٰذا یہی اسباب تھے کہ اتنی جانیں گنوانے اور نقصان اُٹھانے کے بعد بھی نہ تحریکِ خلافت اور نہ ہی گاندھی جی کی ترکِ موالات نتیجہ خیز ثابت ہو سکی۔ آخر کار مسلمان بڑوں نے فیصلہ کیا کہ ایک وفد تشکیل دیا جائے جو برطانیہ جا کر حکومت سے درخواست کرے کہ خلافتِ عثمانیہ کو برقرار رکھا جائے۔ وفد میں محمد علی جوہر اور سید سلیمان ندوی ایسے زعماء شریک کیے گئے۔ علامہ اقبالؔ نے اس اقدام کو سخت ناپسند کیا اور فرمایا یہ بات خلافت کے شایان نہیں بلکہ یہ ایک طرح کی گدائی کے مترادف ہے، یہ خیالات نظم بند کر کے آپ نے سید

سلیمان ندوی کو اُن کے مجلے "معارف" کے لیے بھیج دیے۔ یہ نظم "دریوزہ خلافت" کے عنوان سے آج بھی بانگِ درا میں موجود ہے:

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے جائے
تو احکامِ حق سے نہ کر بے وفائی
نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا
خلافت کی کرنے لگا تو گدائی
خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے
مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشاہی

دیدِ کشمیر:

اقبال کے آباؤ اجداد کا تعلق چوں کہ کشمیر سے تھا اس لیے فطری طور پر انھیں کشمیر دیکھنے کی بڑی چاہ تھی۔ لیکن ایسا کوئی موقع نہیں ملتا تھا کہ وہ اپنی اس خواہش کو پورا کریں۔ اتفاقاً جون ۱۹۲۰ء کو منشی سراج الدین ریونیو اسسٹنٹ نے ایک دیوانی مقدمہ کی پیروی کے لیے آپ کو دعوت دی، آپ نے مقدمہ کی نوعیت کے پیشِ نظر، لاہور کے ایک مشہور وکیل مولوی احمد دین اور منشی طاہر الدین کو ہمراہ لیا اور کشمیر کے لیے روانہ ہو گئے۔ راولپنڈی سے روز بھی کو ہالہ روڈ کے راستے کو اختیار کیا اور سری نگر پہنچ کر ہاؤس بوٹ میں قیام پذیر ہوئے۔ مقدمہ میں قانونی سقم تھا اس وجہ سے کامیابی نہ مل سکی، البتہ وہاں ایک اور قتل کا مقدمہ مل گیا۔ آپ نے پیروی کی اور ملزم موت کی سزا سے بچ گیا لیکن قید کی سزا قائم رہی۔

کشمیر کے قیام کے دوران شاد باغ میں نظم "ساقی نامہ" تخلیق کی۔ نظم کے شروع میں بہار کی رنگینیاں بیان کر کے کشمیریوں کی زبوں حالی بیان کی ہے:

خوشا روزگارے، خوشا نو بہارے
نجوم پرن است از مرغزارے

آخر میں اہلِ کشمیر کو بیداری اور خود شناسی کا پیغام دیا ہے۔ اسی سفر کے دوران میں کشمیر کے

عنوان سے ایک اور نظم لکھی جو چھ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے:

رخت بہ کاشمر کشا کوہ و تل و دمن نگر
سبزہ جہاں جہاں بہ بیں لالہ چمن چمن نگر

اس دورے نے ڈاکٹر صاحب کی ایک دیرینہ خواہش کی تکمیل کردی۔

☆☆

maablib.org

منافرانہ ذہنیت:

ہندوستان میں مسلمانوں نے صدیوں حکومت کی لیکن یہاں کی مقامی آبادی کو کبھی غیر نہیں سمجھا، اُن کے ساتھ ہمیشہ رواداری اور برابری کا برتاؤ کیا، بڑے بڑے اور کلیدی عہدوں پر بلا امتیاز مذہب وملت منصب دیے گئے، لیکن اِس بدنصیب قوم نے مسلمانوں کے خلوص کا اکثر اُلٹا جواب دیا۔ صدیوں ایک ساتھ رہنے کے بعد بھی اُن کے اندر سے عصبیت کا روگ ختم نہ ہوسکا، جب بھی موقع ملا اُنہوں نے مسلمانوں کے ساتھ اپنی بدعہدی کی روایت کو برقرار رکھا۔ نیتاؤں کی اس ہندو ذہنیت نے عوام کے اندر بھی مذہبی منافرت کا زہر گھول دیا تھا، جو آئے دن مسلم کُش فسادات کی صورت میں رونما ہوتی رہتی تھی، بلکہ یہی وہ ذہنیت اور رویہ ہے جس کی وجہ سے آگے چل کر مسلمانوں کو برصغیر میں اپنے لیے ایک الگ وطن کی ضرورت محسوس ہوئی اور اس کے نتیجے میں ہی پاکستان معرضِ وجود میں آیا۔

پرانا پاپی:

پنجاب جو مسلمانوں کی اکثریت کا علاقہ تھا، لیکن ہندو ذہنیت اپنی فتنہ پروری سے یہاں بھی باز نہ آئی۔ یہ ۱۹۲۲ء کا واقعہ ہے کہ لاہور میں شاہ عالمی دروازے کے باہر ایک چھوٹا سا قطعہ اراضی پڑا ہوا تھا جو سرکاری ملکیت تھا۔ کچھ مسلمانوں کو وہاں مسجد تعمیر کرنے کا خیال آیا لیکن ہندو اس کے مقابل مندر بنانے کا ارادہ لے کر میدان میں آگئے، حالاں کہ تحقیق پر یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ مندر اس علاقے میں پہلے ہی موجود ہے، البتہ قریب کوئی مسجد نہیں۔ لہٰذا مسلمانوں نے محض اپنی

ضرورت کے تحت مسجد کی تعمیر کا ارادہ کیا، نہ کہ مندر کے مقابلہ میں مسجد کی تعمیر کو ضروری خیال کیا۔ چناں چہ مسلمانوں نے دیکھا کہ ہندو مندر بنانے پر بہ ضد ہیں اور پر تول رہے ہیں کہ کسی بھی وقت تعمیر شروع کر دیں گے، لہٰذا مسلمانوں کی ایک معزز شخصیت میاں عبدالعزیز مانواڈہ نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ کسی تاخیر کے بغیر مسجد کی تعمیر شروع کر دیں۔ بس پھر کیا تھا، نہایت جذباتی انداز میں بجلی ایسی تیزی کے ساتھ راتوں رات تعمیر کر کے مسجد کی شکل دے دی گئی۔ ہندو دانت کاٹتے رہ گئے، لیکن کچھ کر نہ سکے۔

عام مسلمان اِس جذباتی بلکہ کرشماتی کام اور واقعہ کو سن کر خوش ہو سکتا ہے، لیکن علامہ اقبالؔ مسلمان کو کچھ اور دیکھنا چاہتے تھے، آپ اہلِ ایمان کو کردار میں، گفتار میں اللہ کی برہان دیکھنے کے آرزومند ہیں، وہ مسلمان کی اس تصویر کو دنیا کے سامنے رکھنا چاہتے ہیں جو قاری نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں ہمہ تن قرآن ہے، یعنی اُس کا ہر عمل قرآن کی تفسیر ہونا چاہیے، وہ احکامِ الٰہی کا پابند ہو، مسلمان کو جس مقصد کے لیے اُس کے خالق اور رب نے منتخب فرمایا ہے، وہ اُس پر پوری طرح اُترتا ہو، محض جذباتی نعرے لگانے والا مسلمان علامہ اقبالؔ کو نہ پسند ہے اور نہ ہی یہ اُن کا تصور ہے، چناں چہ جیسے ہی آپ کو اِس واقعہ کا علم ہوا کہ مسلمانوں نے ایک ہی رات میں مسجد تعمیر کر کے اس میں فجر کی نماز بھی ادا کر لی ہے، جو ظاہر ہے، محض ضد اور بحث کا نتیجہ ہے، اِس میں ایمان کی وہ حرارت کارفرما نہیں جو مسلمان کی اصل شناخت ہے، اِس جوہر کی نایابی کو شدت سے محسوس کرتے ہوئے آپ نے برجستہ فرمایا:

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا

☆

ہم حیاتِ اقبالؔ کے جن مختلف پہلوؤں کا مطالعہ اب تک کرتے آ رہے ہیں، اب اُن میں قومی معاملات کے حوالے سے زیادہ تر وہ مناظر دیکھنے کو ملے ہیں جو آپ کی نجی زندگی، ملی شاعری اور نثری اصلاحی کاوشوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن شاعرِ ملت، مفکر، دانشور اور فلسفی کے ساتھ ساتھ سیاست میں بھی آپ کا ایک کردار رہا ہے، عملی سیاست کے حوالے سے بات کریں تو ۱۹۲۳ء

میں آپ کے بعض دوست احباب نے پنجاب کی قانون ساز مجلس میں اہالیانِ لاہور کی نمائندگی کے لیے آپ سے درخواست کی، بے حد اصرار اور مسلسل تقاضے کے بعد آپ نے محض خیال خاطرِ احباب کے مصداق رضامندی ظاہر کر دی۔ کاغذات نامزدگی داخل کر دیے گئے۔ لیکن معلوم ہوا کہ آپ کے ایک قریبی دوست میاں عبدالعزیز بھی اسی حلقہ سے انتخاب میں حصہ لے رہے ہیں تو آپ نے معذرت کر لی اور اُمیدواری سے دست بردار ہو گئے۔

☆☆

سر اقبال:

ہمارے لیے یہ باعثِ اطمینان ہے کہ ہم علامہ اقبال کی ادبی اور ملی خدمات سے متعلق آگاہی حاصل کرتے چلے آرہے ہیں اور یہ بھی کہ آپ کے نجی اور معاشی حالات کیا رہے اور یہ بھی ہمارے علم میں آچکا ہے کہ اس نابغہ روز شخصیت کو شروع سے ہی معاشی مسائل نے گھیرے رکھا۔ لاہور میں کرائے کے مکان میں رہتے رہے، کئی سال انارکلی کے مکان میں گزارنے کے بعد اسی سال کے آخر دسمبر میں میکلوڈ روڈ پر واقع ایک خستہ حال کوٹھی جو کسی بیوہ کی ملکیت تھی، کرائے پر لی اور وہاں منتقل ہو گئے۔ یہ وہ دور ہے کہ آپ ایک منفرد شاعر، عظیم مفکر اور دانشور کی حیثیت سے نہ صرف پورے برصغیر میں مشہور ہو چکے تھے بلکہ ایشیا اور مغرب میں بھی آپ کے فکر و فلسفہ کی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔ اس اعتبار سے آپ کی مصروفیات میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ علم و ادب کے علاوہ، سیاسی، سماجی اور حکومتی حلقوں میں بھی آپ کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جا رہا تھا۔ کئی فکری معاملات میں اختلاف رکھنے والے افراد بھی اسلام کے حوالے سے آپ کی سوچ اور ملتِ اسلامیہ کے لیے آپ کے پُر خلوص جذبات سے انکار نہیں کر سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی اُن خدمات کے اعتراف میں یکم جنوری ۱۹۲۳ء کو سالِ نو کے موقع پر حکومت نے آپ کو "نائٹ ہڈ" یعنی "سر" کا خطاب دینے کا فیصلہ کیا۔ شروع میں آپ نے اس اعزاز کو قبول کرنے میں کسی قدر تذبذب کا اظہار کیا، کیوں کہ آپ کسی نام و نمود کے قائل نہ تھے۔ آپ کی بے نیازانہ طبیعت کے اندر یہ تھا ہی نہیں کہ کوئی آپ کی مدح سرائی کرے یا آپ کی شہرت و عزت میں اضافہ ہو۔

آپ خالصتاً لوجہِ اللہ، ملتِ اسلامیہ کے لیے اپنے حصے کا کام انجام دے رہے تھے۔

احترامِ اُستاد:

تاہم کچھ پس وپیش کے بعد اِس شرط پر آپ نے رضامندی ظاہر کی کہ آپ کے اُستادِ محترم سید میر حسنؔ کو بھی ایسے ہی کسی اعزاز کا مستحق سمجھا جائے۔ کہا جاتا ہے کہ اِس مطالبے پر حکومت کی ایک سرکردہ شخصیت نے آپ سے سوال کیا کہ:

> ''مولوی صاحب نے ایسا کیا کارنامہ انجام دیا ہے جس کی سفارش آپ کر رہے ہیں؟''

ڈاکٹر اقبالؔ نے برجستہ فرمایا:

> ''سید صاحب کا یہ زندہ کارنامہ آپ کے سامنے ہے۔ یعنی کیا یہ کافی نہیں کہ اُنہوں نے اقبالؔ کو اِس لائق بنا دیا ہے کہ آپ اُسے 'سر' کے خطاب سے نواز رہے ہیں؟''

ظاہر ہے حکومت کے پاس اس بات کی تردید میں کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ لہٰذا آپ کے ساتھ ہی مولوی سید میر حسن صاحب کو بھی ''شمس العلماء'' کا خطاب دیا گیا۔ علامہ اقبالؔ نے انگریز سرکار سے یہ بھی کہا تھا کہ اُستادِ محترم کیوں کہ ضعیف ہیں، اُنہیں سند کی وصولی کے لیے یہاں آنے کی زحمت نہ دی جائے، چناں چہ سید میر حسن کے بیٹے ڈاکٹر علی تقی شاہ نے سند وصول کی جو ان دنوں گورنر ہاؤس میں ہی میڈیکل افسر کی حیثیت سے مامور تھے۔

بدگماں اقبال:

مخالفین بھی ایک صنف کی حیثیت رکھتے ہیں، یہ ایک قدیم مخلوق ہے، جو از آدم تا ایں دم، کب نہیں پائی گئی۔ نبی ہو، ولی ہو، یا کوئی مصلح، اِس گروہ سے ہر ایک کو مخالفت کا سامنا کرنا پڑا ہے، گویا بغیر رقابت کے دنیا کی کہانی چل ہی نہیں کرسکتی۔ یہ مردِ قلندر جو بجز باطل کسی کو اپنا مخالف نہیں جانتا تھا، اُس کے مخالفین بھی کم نہ تھے۔ 'سر' کا خطاب ملتے ہی برساتی مینڈکوں کی طرح نکل پڑے اور ٹرانے لگے۔ اُن کا خیال تھا کہ اقبالؔ نے 'سر' کا خطاب قبول کر کے خود کو فرنگی استعماریت کی

مخالفت سے دست برداری اختیار کر لی ہے اور آپ انگریزوں کے حامی ہو گئے ہیں۔

گاندھی نے ترکِ موالات ختم کر دی تھی لیکن ہندوستانیوں کا انگریزوں کے خلاف غم و غصہ برقرار تھا اور وہ اب بھی خاموش احتجاج اور حالتِ جنگ کی سی کیفیت میں تھے۔ مشہور صحافی کالم نویس اور شاعر عبدالمجید سالک نے تو آپ کے خلاف طنز و طعن سے بھری ہوئی پوری نظم لکھ ڈالی۔ اُس کے دو نمائندہ شعر درج کیے جاتے ہیں:

کہتا تھا کل ٹھنڈی سڑک پر کوئی گستاخ
سرکار کی دہلیز پہ سر ہو گئے اقبالؔ
سر ہو گیا ترکوں کی شجاعت سے سمرنا
سرکار کی تدبیر سے سر ہو گئے اقبالؔ

مردِ مومن، مردِ حق:

اقبالؔ کو اللہ نے بہت اعلیٰ ظرف عطا فرمایا تھا، شاید آپ اپنے کسی بھی مخالف کا جواب دینے میں اپنا قیمتی وقت ضائع نہ کرتے، لیکن کچھ قریبی دوست اور احباب نے آپ کو برانگیختہ کیا کہ کوئی وضاحتی بیان جاری کریں۔ چناں چہ آپ نے اپنے ہم مکتب اور مشہور شخصیت میر غلام بھیک نیرنگ کو اُن کے خط کے جواب میں مکتوب تحریر کیا:

"اِن شاء اللہ دنیا کی کوئی طاقت مجھے حق کہنے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ اقبالؔ کی زندگی مومنانہ نہیں، لیکن اُس کا دل مومن ہے۔"

مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے بھی آپ کے قبولِ خطاب پر اپنی ناراضی و ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ علامہ صاحب نے اُنھیں بھی ایک خط میں لکھا۔

"یہ بات عن قریب دنیا کو معلوم ہو جائے گی کہ اقبالؔ کلمۂ حق کہنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ ہاں کھلی کھلی جنگ اِس کی فطرت کے خلاف ہے۔"

آپ کے ایک بے تکلف دوست، مولانا غلام قادر گرامی نے مخالفین کی باتوں کو حاسدانہ قرار دیتے ہوئے کہا۔ "یہ بے معنی شور ہے، اِس سے بوئے حسد آ رہی ہے۔" اِس ضمن میں

اُنہوں نے فارسی میں چار مصرعے بھی اس موقع پر کہے:

اقبال سر اقبال شد از جوہر علم

حاسد عو عو کند علاجش سنگ است

اقبال، اقبال کے جوہر علم کے آگے ہی سر ہو سکتا ہے اور رہا حاسدوں کا غوغا تو اس کا علاج پتھر کے سوا اور کچھ نہیں۔

خطابات کی حقیقت:

دراصل جس وقت انگریز سرکار کی طرف سے اقبال کو یہ خطاب دیا گیا وہ انگریز کے لیے ہندوستان میں انتہائی ناپسندیدگی کا دور تھا، ایسے ماحول میں اقبال ایسی خالص قومی شخصیات کا اپنے "دشمن" سے خطاب وصول کرنا لوگوں کو نامناسب لگا۔ ورنہ یہ معمولات کے خطابات تھے جن میں سرسید سے لے کر آغا خان تک دسیوں شخصیات کے نام آتے ہیں اور یہ بھی درست تھا کہ اس طرح کے اقدامات سے انگریز اُن افراد کو جو اُن کے لیے کسی خطرہ کا باعث بن سکتے ہیں۔ اپنے جال میں پھانس کر اپنا ہم نوا بناتے رہے تھے۔ یقیناً فرنگی ذہن یہی کرتا رہا، لیکن اقبال کے ساتھ ہرگز ایسا نہیں تھا۔ حکومتِ وقت کی طرف سے علمی وفکری خدمات کے صلہ میں بھی اعزازات دینا معمول کی بات رہی تھی، ضروری نہیں کہ محض یہ سیاسی اسٹریجی تھی بلکہ اقبال ہندوستان کی زمین کا ایک روشن ستارا اور جلیل جلیل تھا۔ اس کی عظمت کا اعتراف نہ کرنا بھی حکومت کے لیے سبکی کا سبب بن سکتا تھا۔ یوں بھی اقبال محاذ آرائی سے پرہیز کرتے تھے اور یہ ضروری بھی تھا کہ اگر آپ کھل کر مزاحمت کرتے تو اپنا پیغام اپنی قوم تک پہنچانے میں شاید ناکام رہتے، تاہم اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ سر، خان بہادر اور شمس العلماء کے خطابات پانے والوں کی اکثریت قوم کی غدار تو نہیں، مگر سرسید کی طرح انگریز کی یار ضرور تھی۔ لیکن "سر اقبال" کے لیے یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ کعبہ سے غداری کر کے کلیسا سے یاری کر سکتا ہے۔ اُس کی یاری تو اپنی قوم سے تھی، دین وملت سے رشتہ تھا، اُس کی رگ رگ میں جذبۂ حریت کارفرما تھا، وہ اُن جانبازوں کا جانشیں تھا جو تاجِ سردارا کو بھی اپنی ٹھوکروں میں رکھتے ہیں۔ فرنگی کے ایک روایتی خطاب کی قیمت پر کیوں کر اپنا دین و

ایمان بیچ سکتا ہے، حق گوئی سے باز آسکتا ہے، ضمیر کا گلا گھونٹ سکتا ہے، جو نعرہ زن تھا۔

آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی

اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

ان کی غیرت اسلامی اور حمیت ملی کا اندازہ اس سے لگایئے کہ جب آپ کے ایک رفیق سید نذیر نیازی نے آرنلڈ صاحب کی اسلام پسندی اور مسلم دوستی پر اپنے کامل یقین کا اظہار کیا تو اس مردِ ہوشیار نے انہیں خبردار کرتے ہوئے نہایت بے باک اور دوٹوک انداز میں فرمایا:

''کون سی اسلام دوستی؟ تم ان کی کتاب ''الدعوہ الی الاسلام'' کی بات کرتے ہو؟ وہ حکومت برطانیہ کے لئے کام کرتے ہیں۔''

علامہ صاحب نے اپنے رفیق سے مزید فرمایا:

''جب میں برطانیہ میں تھا آرنلڈ صاحب نے مجھ سے کہا کہ میں ایڈورڈ براؤن کی تاریخ ادبیات کا ترجمہ کروں۔ لیکن میں نے یہ کام نہیں کرنا چاہا، کیونکہ میں نے دیکھا کہ اس کتاب میں سیاسی مقاصد کی آمیزش کی گئی ہے۔''

اعترافِ فضیلت:

چند لوگوں کے اعتراض کے باوجود عام تاثر اس وقت یہی لیا گیا کہ حکومت کی طرف سے ملنے والا ''سر'' کا خطاب بہت بڑا اعزاز ہے اور یہ اعزاز اقبال کو اُن کی ادبی خدمات کے صلہ میں دیا گیا ہے اور اس کے وہ بجا طور پر مستحق ہیں۔ لہٰذا آپ کے عقیدت مند اور معززین شہر کی جانب سے ۱۷ جنوری کو آپ کے اعزاز میں مقبرۂ جہانگیر کے مقام پر ایک استقبالیہ کا اہتمام کیا گیا۔ تقریب میں گورنر پنجاب اور مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے ہندو مسلم عمائدین، سرکاری وغیر سرکاری ملازمین، قانون داں و دانش ور اور ادبی شخصیات نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ لیکن اس تقریب کی روحِ رواں اقبال پسندوں کی اکثریت تھی۔ اس موقع پر آپ نے انگریزی میں خطاب کیا اور آخر میں یہ مژدہ سامعین کے گوش گزار کیا کہ آپ عنقریب ممتاز جرمن شاعر و مفکر گوئٹے کے ''دیوانِ غربی'' ● کے جواب میں ''پیامِ مشرق'' کے نام سے اپنا فارسی کلام کتابی صورت میں شائع کرانے والے ہیں۔

ہم دیکھ سکتے ہیں کہ حضرت علامہ پر قدرت اعزازات کی گویا بارش کر رہی ہے۔ سال ایک قدم اور آگے بڑھ گئی ہے۔ اقبال کے افکار عالیہ منظوم شکل میں ایک اُبلتے ہوئے چشمے کی طرح منظر عام پر آ رہے ہیں۔ اپنے جذبات دروں کو آپ نہایت ولولہ انگیزی کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر منتقل کر رہے ہیں۔ باذوق افراد سن رہے ہیں، پڑھ رہے ہیں اور اپنے ذہن و دل کی دنیا کو بدلتا ہوا محسوس کر رہے ہیں، اور خود اقبال کے لیے بھی یہ امر باعثِ طمانیت ہے، کیونکہ آپ یہی تو چاہتے ہیں کہ کوئی بھی صورت اور کسی بھی طرح آپ کا پیغام عام اور خاص کی سماعتوں تک پہنچتا رہے، اس کے ساتھ ہی آپ اس بات پر بھی نظر رکھے ہوئے ہیں کہ اُن کی آہ شرر بار کیا اثر دکھا رہی ہے، کلامِ اقبال اپنے مخاطبین کے اندر کیا نمایاں تبدیلی لا رہا ہے؟ اس کے باوجود آپ کے دل میں کبھی یہ خیال نہ آیا کہ اِن موتیوں کو ایک لڑی میں پرو دیا جائے، سوائے فارسی کلام کے یعنی مثنوی ''اسرارِ خودی'' اور ''رموزِ بے خودی'' لیکن اُردو کلام ابھی تک کتابی صورت میں مرتب و شائع نہیں کیا گیا۔ جب کہ احباب کا پُر زور مطالبہ اور تقاضا ہے کہ اُردو کلام بھی کتابی شکل میں آنا چاہیے، مگر لگتا ہے آپ کو اس سے کوئی دلچسپی اور رغبت نہیں، تاہم ۱۹۲۳ء میں پیامِ مشرق کی اشاعت کے بعد آپ نے اس دیرینہ مطالبہ کی طرف توجہ کی اور اُس وقت تک کے اُردو کلام میں سے کچھ حصہ متروک کر کے ''بانگِ درا'' کے نام سے ایک کتاب ترتیب دے دی۔ اس پہلے شعری مجموعہ کا مقدمہ ماہنامہ ''مخزن'' کے مدیر بیرسٹر شیخ عبدالقادر نے تحریر کیا اور مسودہ کتابت کے لیے فروری کے مہینے میں عبدالمجید پروین رقم کے حوالے کر دیا گیا اور یوں ستمبر ۱۹۲۴ء کو ''بانگِ درا'' کا پہلا ایڈیشن شائع ہو گیا۔

اسی سال ''پیامِ مشرق'' کا دوسرا ایڈیشن بعض تبدیلیوں اور اضافوں کے ساتھ اشاعت پذیر ہوا۔ اسی دور میں تسلسل کے ساتھ وہ تخلیقات شروع ہوئیں جو بعد میں مجموعہ کی صورت میں ''زبورِ عجم'' کے نام سے منظرِ عام پر آئیں۔ یہ علامہ اقبال کے اُردو کلام پر مبنی دوسری کتاب ہے۔

☆☆

سلسلۂ اشک و تبسم:

اقبالؔ کی شخصیت ایک ایسی کُلّیات ہے جس کے مختلف ابواب ہیں، جس میں مختلف موضوعات پر فکر انگیز مضامین پڑھنے کو ملتے ہیں، آپ شاعر بھی ہیں، فلسفی بھی ہیں، مدرس بھی ہیں، خطیب بھی ہیں، سیاست سے بھی واسطہ رکھتے ہیں، علمِ معاشیات سے بھی آپ کو دلچسپی ہے بلکہ اِس موضوع پر کتاب بھی لکھ چکے ہیں۔ اور بچوں کیلئے نصابی کتب بھی ترتیب دی ہیں۔

آدمی پیکرِ خاکی ہے، بشریت کی چھاپ اس پر لگی ہوئی ہے، ذہن اپنے امور انجام دیتا ہے، فکر کی پرواز اپنی جگہ ہے اور بشریت کے اپنے تقاضے اور حقوق ہوتے ہیں، یعنی فطرت، کارِ حنابندی میں مصروف رہتی ہے۔ دانائے راز، ترجمانِ حقیقت علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؔ دوسری اور تیسری شادی کے بعد اولاد سے محروم چلے آرہے تھے، لیکن آرزو بہر حال رکھتے تھے، بلکہ مجدد الف ثانی شیخ سرہندی کے مزار پر حاضری کے دوران، آپ کے توسط اور وسیلہ سے بارگاہِ رب العزت میں اولاد کے لیے دعا مانگ چکے تھے تو الحمدللہ آپ کی دونوں بیگمات مختار بیگم اور سردار بیگم بہ یک وقت اُمید سے ہوئیں۔ اسی سال جو "بانگِ درا" کا سنِ اشاعت ہے، سردار بیگم کے ہاں بیٹا تولد ہوا، جس کا نام جاوید رکھا گیا، جب کہ دوسری بیگم مختار صاحب لدھیانہ اپنے میکے میں تھی اور وہیں اُن کی زچگی ہوئی لیکن دورانِ زچگی انتقال کر گئیں۔ اِنا للہ و اِنا الیہ راجعون

مرحومہ بہت صابرہ اور ایثار پیشہ خاتون تھیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کی مغفرت فرمائے، کہا جاتا ہے زچگی کے دوران وفات پا جانے والی بی بی شہید کہلاتی ہے، سو قدرت نے اُنہیں اُن کی نیک ذاتی

کا یہ بہتر صلہ عطا فرما دیا۔

حضرت اقبالؔ کو جہاں بیٹے کی خوشی ہوئی، وہیں ایک نیک اور وفا شعار رفیقۂ حیات کی حسرت انگیز موت نے یقیناً غم زدہ وملول کیا ہوگا۔ لیکن ہم شروع سے دیکھتے آ رہے ہیں کہ اقبالؔ کی نجی زندگی کا یہ پہلو ایسے حادثات واتفاقات کی آماج گاہ نظر آتا ہے۔ اب یہ تازہ واقعہ بھی اسی تسلسل کی کڑی ہے جو آپ کے ساتھ جڑا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

ایک حساس دل کے لیے اس اچانک جدائی کا صدمہ معمولی نہ تھا۔ جس خاتون کی بارہ سال تک آپ کے ساتھ رفاقت رہی اور اس عرصہ میں اس نے کبھی آپ کو کسی شکایت کا موقع نہیں دیا اور نہ ہی اپنی ''سوکن'' کو سوکن سمجھا، جیسا کہ ہمارے معاشرے میں ''سوکناپے'' کا روایتی تصور ہے، کہ اگر ایسا ہوتا تو خانۂ اقبالؔ جہنم زار بن جاتا، بلکہ مرحومہ کے ساتھ خود دوسری بیگم، سردار بیگم کا بھی برتاؤ اور سلوک بہنوں جیسا رہا۔ اگر دل میں احساس زندہ ہے تو ہم یہ سوچ سکتے ہیں کہ حضرت اقبالؔ جس طرح اپنے نج کے حالات ومعاملات سے گزرتے آئے ہیں، وہ بجائے خود کس قدر اعصاب شکن اور دل خراش رہے ہیں لیکن یہ حادثات آپ کو زندگی کے اعلیٰ مقاصد کی راہ میں متزلزل نہ کر سکے۔ بہت بلند ہمت اور مضبوط حوصلے کے انسان تھے۔ یاسیت وناامیدی آپ کے دل کو چھو کر بھی نہیں گزری تھی۔

منزلِ صبر وشکر:

دراصل آپ کی سوچ کا براہِ راست تعلق خدا کی کتاب سے تھا، اور یہ قرآن کا معجزہ ہے کہ جو اس کو مضبوطی سے تھام لیتا ہے، وہ دنیا کے ہر غم سے آزاد ہو جاتا ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت اور بڑے سے بڑا حادثہ بھی اُسے اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتا۔ نصابِ الٰہی سے وابستہ ہو کر ہی انسان راضی بہ رضا رہ سکتا ہے۔ اُس کی زندگی کے روز وشب صبر وشکر کے درمیان گزرتے ہیں، خوشی میں شکرانے کا سجدہ گزارتا ہے اور غم اور پریشانی میں صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتا، گویا عسر ویسر ہر دو حالت میں مشیتِ ایزدی کے آگے دست بستہ کھڑا رہتا ہے۔ اقبالؔ بھی ایسے ہی صابر وشاکر بندوں میں سے ہیں۔ خراب سے خراب حالات میں بھی غم کو زیادہ دیر خود پر غالب نہیں آنے

دیتے، مایوسی کے لیے وہ تو اس حقیقت سے واقف تھے کہ یہ کفر کے مترادف ہے، جیسا کہ ایک موقع پر خود آپ نے فرمایا: "مایوس ہونے سے ایمان میں خلل پڑتا ہے، اور اس سے اللہ کریم کی توہین ہوتی ہے، اچھے مسلمان کو اس کی احتیاط کرنی چاہیے۔"

صاحبِ عمل:

اقبالؔ صاحب ایمان ہی نہیں، صاحب عمل بھی تھے، جو کہتے، وہی کرتے، لندن کی مثال ہمارے سامنے ہے، نوجوان تھے، خوب رو تھے، دل کش و متاثر کن شخصیت کے مالک تھے، اس وقت بھی کردار میں، گفتار میں، اللہ کی برہان نظر آتے تھے، اور اب یہاں دیارِ ہند میں تو وہ عمر کے اُس دور میں داخل ہو چکے تھے جہاں نوجوانی کی جولانیاں ویسے ہی ستانے لگتی ہیں۔ شروع عمر میں ایمان کا جو پودا آپ کی کشتِ جاں میں لگایا گیا تھا، وہ اب تناور درخت بن چکا تھا، عمل پھل پھول سے بارآور ہو چکا تھا، شعور کی آنکھ کھلتے ہی آپ نے غور و فکر کا کاروبار شروع کر دیا تھا، روحِ اسلام نے آپ کو اس حکیمانہ نکتہ سے واقف کر دیا تھا کہ مومن کی زندگی اپنے لیے نہیں دوسروں کے لیے ہوتی ہے۔ لہٰذا عین شباب کے عالم میں ہی اپنے روز و شب اوروں کی نذر کر دیے تھے، جب سے اب تک اگر انہیں کوئی غم تھا تو ملت کا تھا، اور کوئی بات خوشی کا باعث بنتی تھی سو وہ قوم کی بیداری اور اُس کے اندر احساسِ خودی کا پیدا ہونا تھا۔

☆☆

maablib.org

شیخ محمد اقبالؔ، جس کی فکر نے اپنی پرواز کا آغاز شاعرانہ فضا میں کیا تھا، لیکن اب اُن کی شاعری اُس اصل کی طرف لوٹ چکی تھی جو، اُن کی فکر کی بنیاد اور اساس تھی، شاعرِ ملت ایک طرف اپنے فلسفیانہ افکار کو جو دردِ ملت میں ڈوبے ہوئے تھے، نظم نثر کی صورت میں ڈھال رہے تھے، دوسری طرف پیشہ ورانہ مصروفیات سے نبرد آزما تھے۔ تاہم اُن کی فکری پختگی اُس منزل پر پہنچ چکی تھی جہاں وہ اِس سے بڑھ کر آپ سے چاہتی تھی۔ آپ نے اِس کے تقاضے کو سمجھا اور غور کیا اور پھر اس نتیجے پر پہنچے کہ اسلام کے فقہی مسائل کو بھی عصرِ حاضر کے حالات اور پس منظر میں رکھ کر طے کرنے کی ضرورت ہے، اور اِس کی تجدید تو اجتہاد کے ذریعہ ہی ممکن ہو سکتی ہے۔ لہٰذا اِس اہم مگر نازک ترین موضوع پر آپ نے قلم اُٹھایا، مضامین رقم کرنا شروع کیے۔ اِن میں سے بعض تو انجمن حمایت الاسلام کے جلسوں میں پڑھے اور کچھ بعد میں علی گڑھ، حیدر آباد، مدراس اور خود لاہور میں اہلِ علم کے سامنے انگریزی زبان میں پیش کیے گئے۔

آپ کی طبیعت میں تنوع تھا، کبھی نظم اور کبھی نثر کو اپنے افکار کے اظہار کا ذریعہ بناتے تھے، لیکن ہر دو اصناف کا مرکز و محور قوم کی اصلاح اور اُن کے خیالات کی درستی آپ کا مقصد تھا جو بیرون سے اُن کے دماغ میں در آتے تھے۔

اقبالؔ کے نزدیک مغربی فکر و دانش ایک ذہنی بازی گری اور لفظی شعبدہ بازی کے سوا کچھ نہ تھا، چناں چہ ایک طرف آپ اِن بیرونی اثرات کو اپنے مغرب پسند طبقہ کے دماغوں سے دور کرنے کے لیے کوشاں تھے اور پُر مغز مقالات لکھنے کا سلسلہ جاری تھا، دوسری طرف منظوم

خیالات نہ صرف اپنی قوم کے سامنے پیش کر رہے تھے، بلکہ شعری محاذ پر پورے مغرب کو للکار رہے تھے، یہ ۱۹۲۷ء ہے کہ آپ کی شعری تخلیق زبورِ عجم مع گلشنِ راز جدید منظرِ عام پر آتی ہے، اس کے ساتھ ہی آپ نے ایک اور اہم منظومہ تخلیق کرنا شروع کیا، یہ منظوم تمثیلی سفرنامہ آگے چل کر "جاوید نامہ" کے عنوان سے شائع ہوا۔

☆☆

maablib.org

یہ تو آپ کی مصروفیات کی جھلکیاں تھیں۔ تخلیقی کوائف یہ ہیں کہ اِنہی دنوں آپ جرمن شاعر اور ڈراما نگار گوئٹے کے ''دیوانِ غربی'' کا جواب ''پیامِ مشرق'' کے نام سے لکھ رہے تھے۔ یاد رہے، علامہ اقبالؔ گوئٹے کی اسلام دوستی کی وجہ سے اُسے پسند بھی کرتے تھے اور اُس کی تخلیقات سے متاثر بھی تھے اور اس عظیم تخلیق کار کو سمجھنے میں اقبالؔ کی اُستانی ایما کا بہت بڑا کردار ہے۔

''پیامِ مشرق'' ۱۹۲۳ء اپریل کے مہینے میں اشاعت پذیر ہوئی۔

اِنہی ایام میں جو دیگر نظمیں لکھی گئیں، اُن میں ''خضرِ راہ'' اور ''طلوعِ اسلام'' بہت اہم اور قابلِ ذکر ہیں۔ یہ دونوں نظمیں، انجمن حمایت الاسلام کے جلسوں میں پڑھی گئیں اور عوام کے سامنے آئیں۔ ''خضرِ راہ'' ایک تمثیلی نظم ہے جس میں اقبالؔ کی ملاقات خضرؑ سے ہوتی ہے اور دونوں کے درمیان مکالمہ ہوتا ہے، اقبالؔ، خضرؑ سے کچھ سوالات کرتے ہیں اور اِن مسائل کا حل چاہتے ہیں، اقبالؔ کے پوچھے گئے سوالات زندگی، سلطنت اور سرمایہ و محنت سے متعلق ہیں، اور ان سوالوں کی بازگشت میں مسلمانوں کا اخلاقی انحطاط بھی شامل ہے۔ کہتے ہیں:

آگ ہے، اولادِ ابراہیمؑ ہے، نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

جواب میں خضرؑ سب سے اوّل اپنے سائل (اقبالؔ) کو رازِ زندگی سے متعلق سمجھاتے ہیں:

پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی
ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی

زندگی کا جام مسلسل گردش میں رہنے کی وجہ سے ہی پختہ رہتا ہے یعنی اگر روز و شب کی گردشیں نہ ہوں تو زندگی بے حرکت اور جامد ہو کر رہ جائے، لہٰذا گردشِ ایام سے گھبرانا نہیں چاہیے کیوں کہ یہی گردشِ پیہم زندگی کی علامت ہے اور اسی گردشِ مسلسل میں ابدی زندگی کا راز پوشیدہ ہے۔"

اس کے بعد زندگی کیا ہے؟ خضر اس کو بڑی تفصیل اور تسلسل کے ساتھ بیان کرتے ہیں:

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم رواں، ہر دم جواں ہے زندگی
اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِ آدم ہے، ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی

یعنی زندگی نفع و نقصان کے خیال سے بالاتر چیز کا نام ہے، کبھی خود جان نظر آتی ہے اور کبھی جان آفریں دکھائی دیتی ہے، اور یہ کہ زندگی کو آج اور کل یعنی وقت اور زمانے کے حساب سے نہیں دیکھنا چاہیے، یہ ہمیشہ اور مسلسل رہنے والی چیز ہے۔ یہ نہ کبھی پرانی ہوتی ہے اور نہ ختم ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایک نسل ختم ہوتی ہے تو دوسری نسل پیدا ہو جاتی ہے، جیسا کہ ایک فصل کٹنے کے بعد دوسری فصل تیار ہونا شروع ہو جاتی ہے، وغیرہ وغیرہ:

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اک انبار تو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیرِ بے زنہار تو

اے انسان! جب تک تو خام یعنی ناتجربہ کار ہے یعنی زندگی کے اعلیٰ مقاصد سے بے بہرہ ہے تو تیری حیثیت مٹی کے ڈھیر جیسی ہے اور جب تو زندگی کی حقیقتوں سے آگاہ ہو جائے، ان مدارج سے گزر جائے، جہاں آدمی سوالوں میں اُلجھتا رہتا ہے اور عین الیقین کی منزل سے گزر کر حق الیقین کی منزل پر پہنچ جاتا ہے تو پھر وہ ایک تیغِ براں کی مانند ہو جاتا ہے کہ ہر شک و شبہ کو کاٹتا چلا جاتا ہے۔

اس کے بعد خضرؑ ، اقبالؔ کے دوسرے سوال، سلطنت کیا ہے؟ کا جواب دیتے ہیں:

آ بتاؤں تجھ کو رمز آیۂ اِنَّ المُلوک
سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اک جادوگری

سلطنت، دراصل اُن لوگوں کی ایک سحرکاری ہے جو بازورِ شمشیر عام انسانوں پر قابض ہو جاتے ہیں اور ایسی غاصب اقوام کی حقیقت اور ملوکیت کی خرابیوں کی طرف قرآن نے آیۂ انّ الملوک میں واضح اشارہ فرمادیا ہے۔

علامہ صاحب نے خضرؑ کی زبانی (خلافت کے مقابل ملوکیت) آمرانہ حکومتوں اور نام نہاد جمہوریتوں کا اصل چہرہ بے نقاب کیا ہے اور بہت تفصیل سے اُن کے دوغلے پن کو بیان کیا ہے، ایک جگہ کہتے ہیں:

دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

دراصل ظلم و جبر اور آمریت کو جمہوری لباس پہنا رکھا ہے، جو اپنے مفاد کی خاطر عوام کے حقوق کچلنا اور انسانیت کو پامال کرنا ہی اس کا طرزِ حکومت ہے اور سادہ لوح عوام اِس (جمہوریت) کے ظاہری چہرے کو دیکھ کر دھوکا کھا رہے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ یہ ان کی ترجمان و مہربان ہیں:

گرمیٔ گفتار اعضائے مجالس الاماں
یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگِ زرگری

اور یہ جو دنیا کی برسرِ اقتدار (قابض) قومیں دنیا میں امن وامان اور عامۃ الناس کی بھلائی اور خیر خواہی کے لیے یک جا ہو کر گرم جوشی دکھاتی ہیں تو یہ بھی ایک نمائشی کھیل ہے۔ دراصل یہ بھی زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کرنے کا ایک مقابلہ ہے کہ کس طرح مادی فائدہ اُٹھانے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جائی جائے۔

اقبالؔ نے خضرؑ سے تیسرا سوال ''سرمایہ و محنت'' سے متعلق کیا کہ اس کی تعریف کیا ہے؟ اس کو خضرؑ نے بہت تفصیل سے اور اس طرح سمجھایا کہ سرمایہ دار کس طرح مزدور کے تن سے اُس

کے لہو کا آخری قطرہ تک کشید کر کے خود کو توانا بنا رہا ہے اور مزدور ہے کہ اپنی سادگی اور ''بے زبانی'' کی وجہ سے سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں کھلونا بنا ہوا ہے۔ محنت کش اپنی ہڈیاں پیستا ہے، روز و شب محنت و مشقت کی چکی میں پستا رہتا ہے اور سرمایہ دار ان غریبوں کے خون پسینے سے حاصل کردہ دولت کو اپنی تجوریوں میں بھرتا رہتا ہے، اور بہ ظاہر مزدوروں سے ہم دردی جتاتا اور اُن کے حق میں زبانی جمع خرچ بھی کرتا ہے، لیکن مزدور ہے کہ اُس کی چالاکیوں کو سمجھے بغیر دن رات کولھو کا بیل بنا ہوا ہے، اپنے حقوق کے لیے آواز بلند نہیں کرتا۔ خضرؑ اُسے اِس فریب خوردگی سے ہوشیار کرتے ہوتے کہتے ہیں:

اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

اب سرمایہ داری کی چالاکی کھلنے لگی ہے، ان کی عیاری کا پردہ فاش ہو رہا ہے، دنیا میں بڑی تیزی سے تبدیلی آ رہی ہے، لوگ ان مہاجنوں اور شاہی لاکوں کی ہوسِ دولت اور ہوسِ ملک گیری کو پہچان گئے ہیں، عام لوگوں میں احساسِ خودی بیدار ہو رہا ہے، لوگ اپنے حقوق کے لیے کھڑے ہونا شروع ہو گئے ہیں تو اے محنت کشو! تم بھی اُٹھو اور اپنے حق کے لیے آواز بلند کرو کہ دراصل مشرق و مغرب میں ہر جگہ محنت کا بول بالا ہونے والا ہے۔''

آخر میں خضرؑ، اقبالؔ کے اِس درد کا جواب دیتے ہیں جو، اُن کے دل میں اپنی قوم کے لیے ہے یعنی عالمِ اسلام کی بگڑی ہوئی صورتِ حال کا رونا جو استفسار بن کر اُن کے ہونٹوں پر آ گیا ہے۔ خضرؑ کہتے ہیں:

کیا سناتا ہے مجھے ترک و عرب کی داستاں
مجھ سے کچھ پنہاں نہیں اسلامیوں کا سوز و ساز
لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل
خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز
ہو گئی رسوا زمانے میں کلاہِ لالہ رنگ
جو سراپا ناز تھے، ہیں آج مجبورِ نیاز

اے سائل تو مجھے ترک اور عرب کے زوال اور خراب صورتِ حال کی داستاں کیا سناتا ہے، میں اُن کی زبوں حالی سے اچھی طرح واقف ہوں، اِس کا سبب یہ ہے کہ وہ اوصاف اور وہ خوبیاں جو مسلمانوں کو رسولِ اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معرفت سنتِ ابراہیمی کی شکل میں عطا ہوئی تھیں یعنی جن اعلیٰ صفات کے یہ وارث تھے، وہ علم و عمل کا جذبہ اور دنیا میں سر اُٹھا کر چلنے اور کام یاب زندگی برتنے کا ڈھنگ، ان سب چیزوں کو مغرب کے تثلیث پرستوں نے ان سے چھین لیا ہے اور وہ خاکِ حجاز جس نے انسان کی تعمیر کی تھی، مسلمان کے پیکر کو جہد و عمل سے مرکب کیا تھا، اب اِن خوبیوں سے اہلِ صلیب فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ آج مسلمان اقتدار سے محروم ہیں اور زمانے میں رسوائی اور ذلت کی تصویر بنے ہوئے ہیں۔ افسوس جو کبھی اوروں سے ناز اُٹھوایا کرتے تھے، آج خود دوسروں کی ناز برداریاں کرنے پر مجبور ہیں۔''

خضر مسلمانوں کی حالتِ زار کا نقشہ کھینچتے ہیں اور آخر انہیں پھر سے سرخ رو ہونے اور اپنے کھوئے ہوئے وقار و اقتدار کو حاصل کرنے کا نسخہ بتاتے ہیں کہ جس دین کو فراموش کر کے وہ اس خرابی کا شکار ہوئے ہیں اور اِس حال پر پہنچے ہیں، اُنہیں چاہیے کہ وہ اِس بے دین سیاست سے دامن چھڑا کر اسی خالص دین و ایمان سے رشتہ جوڑ لیں تو آج بھی اُن کی ناقدری دور ہو سکتی ہے:

پھر سیاست چھوڑ کر داخلِ حصارِ دیں میں ہوں
ملک و ملت ہے فقط حفظِ حرم کا اک ثمر

یہ ملک اور اقتدار اصل میں دین کی حفاظت کا صلہ اور ثمرہ ہے۔ یعنی آج بھی اگر پہلے کی طرح مسلمان، صحیح معنی میں مسلمان بن جائیں تو دولت و اقتدار اُسی طرح آج بھی اُن کی ٹھوکروں میں نظر آئے گا کیوں کہ خدا تعالیٰ نے انہیں یہ عظمت و مرتبہ، اقتدار و شہریاری اُسی دین کی خدمت کے صلہ میں عطا فرمائی تھی اور اِس بحالیٔ اقتدار کے لیے انہیں جو دوسرا کام کرنا ہوگا، وہ آپس میں اتفاق و اتحاد پیدا کرنا ہے:

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابہ خاکِ کاشغر

اِس کے بعد خضر اِن جزئیات کو بیان کرتے ہیں جو مسلم اتحاد کے لیے ضروری ہیں، اور اُن

برائیوں کی نشان دہی کرتے ہیں جنہیں ترک کیے بغیر مسلمانوں کا متحد ہونا ممکن نہیں اور اس کے ساتھ ہی جنابِ خضر مسلمانوں کو اللہ کا وعدہ یاد دلا رہے ہیں کہ، ناامید ہونے کی ضرورت نہیں، اگر تم نے ان باتوں پر عمل کر لیا تو اللہ بھی اپنے وعدے سے نہیں پھرتا، تم اُس سے اپنا عہد نبھاؤ، وہ اپنا وعدہ ضرور پورا کرے گا، تم اگر اُس کے ہو گئے تو وہ تمہیں پھر ذرّے سے آفتاب بنا دے گا۔"

☆☆

طلوعِ اسلام:

شروع سے ہی ہم علامہ صاحب سے متعلق یہ بات سنتے آ رہے ہیں کہ مغرب میں رہ کر مغرب کو آپ نے خوب پہچانا، مغرب کی مادی ترقی کو آپ نے محض شکم پروری کا سامان پایا، تہذیبِ مغرب کے جسدِ رنگین کو روح سے خالی دیکھا، اپنے گہرے مشاہدے اور مطالعے کے بعد آپ اس نتیجے پر پہنچے کہ مغرب کی تہذیب و تمدن سحرکاری اور جادوگری ہیں، مشرقی اقوام ان کی اصل کیفیت اور حقیقت سے ناآشنا ہیں اور اس کے طلسمِ ہوشربا کا شکار ہو رہی ہیں۔ پھر جب اقبال نے مغربی فلسفہ اور اسلام کی فکر اور نظریہ کا تقابل کیا تو مغربی افکار کا چراغ، خورشیدِ اسلام کے آگے بالکل پھیکا بلکہ ماند نظر آیا۔ تب مردِ مومن کی زبان سے نعرۂ صد افتخار نکلا:

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی

یہ نظم "طلوعِ اسلام" جو "خضرِ راہ" کے دورانیہ میں ہی لکھی گئی ہے، اُنھی خیالات کی دستاویز ہے جو انگلستان میں قیام کے دوران آپ کے ذہن و دل میں پرورش پا رہے تھے، آپ نے محسوس کر لیا تھا کہ مسلمانوں کے گناہ بخشے جانے والے ہیں۔ مسلمانوں میں آہستہ آہستہ زندگی کے آثار پیدا ہونا شروع ہو گئے ہیں اور اب لگتا ہے خود اقبال عزم کر چکے ہیں کہ وہ اُمتِ اسلامیہ کے اندر احساسِ خودی کو بیدار کرنے کے لیے سرگرمِ عمل ہونا چاہتے ہیں۔ انگلستان میں قیام کے دوران ہی آپ نے ایک طرف مغرب کی تہذیب کے لیے پیشین گوئی کر دی تھی کہ اگر یہی حال رہا، تو یہ بے روح اور تیرہ ضمیر تہذیب خودکشی کر کے رہے گی، کیوں کہ شاخِ نازک پر بننے والا آشیانہ زیادہ دیر

اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکتا۔ دوسری طرف آپ نے وقت کو مسلمان کے بارے میں یہ الہامی مژدہ سنا دیا تھا کہ۔

سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے
وہ شیر پھر ہوشیار ہو گا

نکل کے صحراسے جس نے روما کی سلطنت کو اُلٹ دیا تھا۔ چناں چہ صرف ڈیڑھ عشرے کے بعد آپ نے دیکھا کہ آسمانِ اسلام پر سے مطلع صاف ہونا شروع ہو گیا۔ اسلام کے سورج پر سے سیاہ بادل چھٹنے لگے۔ اسی منظر اور اسی خوش کن احساس کو آپ نے اپنی اِس نظم "طلوعِ اسلام" میں سمو دیا ہے۔ یہ نظم بھی "خضرِ راہ" کی طرح طویل ہے، ظاہر ہے، ہم یہاں اِن صفحات میں اِن سب کو نقل نہیں کر سکتے، صرف چند شعر نظر گزار کرتے ہیں تا کہ فکرِ اقبال کی روشنی سے ذہن و دل کچھ تو آشنا ہو سکیں۔ نظم کی ابتدا اِس طرح ہوتی ہے:

دلیلِ صبحِ روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
اُفق سے آفتاب اُبھرا، گیا دورِ گراں خوابی

ستاروں کا آنکھیں جھپکنا، یعنی ٹمٹمانا اِس بات کا ثبوت ہے کہ صبح اپنا روشن چہرہ دکھانے والی ہے۔ یہ لو، اُفق پر آفتاب طلوع ہونے کے آثار روشن ہو گئے ہیں۔ گہری نیند کا دور ختم ہوا چاہتا ہے۔ یعنی عالمِ اسلام سوئے ہوئے شیر کی طرح ایک بار پھر انگڑائی لے کر اُٹھنے والا ہے۔"

اِس کے بعد علامہ بڑی تفصیل سے اِس نمودِ صبح اور بیداریٔ ملت کا نقشہ بیان کرتے، اور اُمید افزا لہجے میں آنے والے وقت کی نوید سناتے ہیں:

عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
شکوہِ ترکمانی، ذہنِ ہندی، نطقِ اعرابی

یعنی خدائے بزرگ و برتر کی جناب سے مسلمانوں کو اِن کی گم شدہ میراث ملنے والی ہے، زمانہ دیکھے گا کہ مسلمان کو پھر ترکمان حکمرانوں کا سا پُر شکوہ اقتدار حاصل ہو گا اور جس طرح ہندوستانی فہم و فراست اُن کی شناخت تھی، وہ دوبارہ پھر اُس سے مالا مال ہونے والے ہیں اور عربی کی فصاحت و بلاغت سے متصف ہوا چاہتے ہیں۔

کئی مثال دینے کے بعد علامہ اپنی زندہ تمنا کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

سرشکِ چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
خلیل اللہ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا

مسلمانوں کی آہ وزاری رنگ لانے والی ہے۔ اُمید ہے اُن کی ندامت میں ڈوبی ہوئی آنکھوں سے بہنے والے آنسو زور باراں کا سا اثر پیدا کریں گے اور اُس کا اثر یہ ہوگا کہ ملتِ ابراہیمؑ کے اندر جو قومِ رسولِ ہاشمی کہلاتی ہے، ایسی ایسی گوہر نایاب شخصیات آنکھیں کھولیں گی جنھیں دیکھ کر وقت کی آنکھیں خیرہ ہو جائیں گی۔

اس کے بعد حکیم الامت اقبالؔ، مسلمانوں کے عروج وزوال کی الم ناک داستانوں کے حوالے دے کر فرماتے ہیں کہ اگر یہ الیے رونما ہوئے کہ انہیں اپنے اقتدار سے ہاتھ دھونا پڑا تو کیا ہوا:

کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا
جگر خوں ہو تو چشمِ دل میں ہوتی ہے نظر پیدا

یعنی نہ جانے کتنے ستاروں کا خون ہوتا ہے جب سحر نمودار ہوتی ہے۔

اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ جب جگر کا خون ہو جاتا ہے تو دل کی نظر جاگ پڑتی ہے، یعنی فرد ہو کہ قوم، زخم کھانے کے بعد رقیق القلب ہو جاتی ہے، گر کر سنبھلتی ہے، اپنی گزشتہ غلطیوں پر نظر کر کے، نئے سرے سے خود کو سنبھالتی ہے اور تازہ دم ہو کر اپنی بقا کے لیے جدوجہد کرتی ہے، اور ظاہر ہے دوبارہ سنبھلنے اور اپنی غلطیوں کا ازالہ کرنے میں برسوں بیت جاتے ہیں:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اس کے بعد حضرت علامہ نہایت حکیمانہ لہجے میں اپنے مخاطب (یعنی خود) سے کہتے ہیں:

ترے سینے میں ہے پوشیدہ رازِ زندگی کہہ دے
مسلماں سے حدیثِ سوز وسازِ زندگی کہہ دے

لیکن وہ رازِ زندگی اور حدیثِ سوز وسازِ زندگی کیا ہے؟ اس کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ مسلماں کو خود مسلمان سے متعارف کراتے ہیں، اُسے یاد دلاتے ہیں کہ وہ کیا ہے، اُس کی حیثیت کیا ہے:

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تُو، زباں تُو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تُو ہے
پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تُو ہے

اے مسلمان تو معمولی مخلوق نہیں بلکہ تیرے ہاتھ اور تیری زبان قدرت کے اشاروں کی پابند ہے، تو وہی کرتا اور وہی کہتا ہے جو قدرت چاہتی ہے، مسلمان اِس خاکستان تک محدود نہیں بلکہ اِس کی رسائی آسمانوں تک ہے اور یہ ستارے جو اپنی بلندی اور رفعت میں ایک مثال رکھتے ہیں، اصل میں انسانی سفر کے دوران یہ مہ وانجم اس کی گردِ راہ نظر آتے ہیں:

مکاں فانی، مکیں فانی، ازل تیرا، ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام تُو ہے، جاوداں تُو ہے

''یہ جہان، فانی اور ختم ہونے والا ہے اور اِس کی ہر چیز آنی جانی ہے، لیکن تو ازل وابد سے ماورا ہے، خدا نے تجھے اپنا آخری پیغام، آخری تخلیق وشاہ کار بنا کر اِس عالمِ امکاں میں بھیجا ہے اور ہست وبود کی قید وپابند سے بے نیاز رکھ کر تجھے ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی عطا فرمادی ہے''۔

آگے جا کر اقبالؔ، رازِ زندگی اور حدیثِ سوز وسازِ زندگی کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اے مسلم!:

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

لیکن اِس کے لیے ضروری ہے کہ تُو

بتانِ رنگ و بو کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی، نہ افغانی

یہ کس طرح ممکن ہو اِس کے لیے حکیم الامت علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؔ کی فکر و بیاں گویا گوہر باری کرتی چلی جاتی ہے، بہت سی تاریخی مثالیں دے کر مسلماں کو اُس کا منصب یاد دلاتے اور ایک خاص منزل پر پہنچ کر فرماتے ہیں:

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

"یعنی اس خاک کے پتلے میں جب یقین وایمان کی حرارت پیدا ہو جاتی ہے، یہ پیکرِ گل اپنے خالق ومالک پر کامل توکل کر لیتا ہے تو پھر اس خاکی میں افلاکی اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں۔ سید الملائکہ جبرئیل کی سی پرواز کا حامل بن جاتا ہے۔"

ترجمانِ حقیقت اقبال اسی فہرست میں اپنے مخاطب کو حکیمانہ نکات سے نواز رہے ہیں، فرماتے ہیں:

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں، نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

"یعنی غلامی انسان کو بے عمل اور بے توقیر بنا دیتی ہے، وہ مایوس ہو کر حالات سے مغلوب ہو کر رہ جاتا ہے، اگر کوئی تدبیر بھی کرتا ہے تو بے حکمت اور غلامی سے نکلنے کے لیے زور بھی بھرتا ہے تو عرصۂ غلامی اُسے اس قدر پژمردہ کر چکا ہوتا ہے کہ دستۂ شمشیر پر پوری طرح گرفت بھی نہیں کر پاتا، البتہ ایک یقین ایسی طاقت ہے کہ یہ زنجیرِ غلامی کو پگھلا کر رکھ دیتا ہے۔"

شاعرِ اسلام اپنے حکیمانہ ارشادات سے مسلسل اس طرح نواز رہے ہیں گویا چھاجوں پانی برس رہا ہے، فرماتے ہیں:

ولایت، پادشاہی، علمِ اشیا کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں؟ فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں

"یہ ملک واقتدار اور یہ گوناگوں چیزوں سے بھری کائنات کا علم، صرف اس ایک نکتہ میں پوشیدہ ہیں جو ایمان کہلاتا ہے، کہ اگر انسان صاحبِ ایمان ہے تو پھر دولتِ دنیا اور شاہی و پادشاہی سب اس کے آگے سرنگوں ہونے کو تیار ہیں۔"

مزید حوالے دینے کے بعد علامہ پھر ایک منزل پر پہنچ کر اہم ترین نکات سے اپنے مخاطب و سامع کو آگاہ فرماتے ہیں:

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم

جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

یہی وہ چیزیں ہیں جن کے ذریعہ زندگی کی جنگ لڑی اور جیتی جاسکتی ہے۔"

ایک بار پھر حضرت اقبالؔ اسی طرح کے بے بہا موتیوں سے اپنے دل ودماغ کو بھرنے کے بعد، اس بات کی طرف توجہ دلا رہے ہیں کہ "اگر آج مسلمان درماندہ ہیں، ناکامی وذلت کا شکار ہیں تو اسے ہمت نہیں ہارنی چاہیے، اہلِ ایمان پر ایسے وقت آتے ہیں، عروج وزوال کی داستانیں اپنے آپ کو دہراتی رہتی ہیں، مسلمانوں کی زندگی میں یہ مدوجزر آتے رہے ہیں، حالات کے تغیرات سے ان کا واسطہ پڑتا رہتا ہے لیکن ہمت نہیں ہارتے بلکہ:

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں

اِدھر ڈوبے، اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے، اِدھر نکلے

لہٰذا مایوسی کی ضرورت نہیں، البتہ یقیں محکم، عمل پیہم اور محبت سے گرم جوش رہو، فتح آخر تمہاری ہی ہوگی۔

علامہ صاحب نے اپنی اس شاہ کار اور علم وحکمت سے لبریز نظم کو اسی جگہ ختم نہیں کردیا، اور بھی بہت سے حکیمانہ نکات بیان کیے ہیں اور اس حکم کو بجالانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی کہ:

ترے سینے میں ہے پوشیدہ رازِ زندگی کہہ دے

مسلماں سے حدیثِ سوز وسازِ زندگی کہہ دے

☆☆

maablib.org

گو اقبالؔ کی ذات و شخصیت اِس طرح کے انتخابات اور اسمبلیوں سے بہت بالاتر اور اعلیٰ و ارفع تھی۔ اور آپ کا مزاج بھی کہاں ایسا تھا کہ اِن سیاسی گھروں میں بیٹھ کر جھوٹی سچی باتیں کی جائیں، لیکن لاہور آپ کا مسکن تھا، اور اہلِ لاہور آپ کو والہانہ چاہتے اور سمجھتے تھے کہ اُن کے درمیان آپ سے بہتر اور مناسب دوسری کوئی شخصیت نہیں جو اُن کی ترجمانی اور نمائندگی کر سکے۔ لہٰذا آپ نے اپنے ہم شہریوں کی خوشنودی اور رضا کی خاطر اِس جھمیلے میں پڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ اِس فیصلے سے متعلق خود آپ نے فرمایا:

"مسلمانوں کو معلوم ہے کہ میں اب تک اِس قسم کے مشاغل سے بالکل علیحدہ رہا، محض اِس لیے کہ دوسرے لوگ یہ کام سرانجام دے رہے تھے اور میں نے اپنے لیے دوسرا دائرہ کار منتخب کر لیا تھا، لیکن اب قوم کی مصیبتیں مجبور کر رہی ہیں کہ میں اپنا حلقۂ عمل قدرے وسیع کروں، شاید میرا ناچیز وجود اِس طرح اِس ملت کے لیے زیادہ مفید ہو سکے۔"

لیکن آپ کا معلوم ہوا کہ اسی حلقے سے آپ کے قریبی دوست میاں عبدالعزیز بھی امیدوار ہیں تو آپ نے معذرت کر لی۔

پھر ۱۹۲۶ء میں ایک بار اہلیانِ لاہور محبانِ اقبال نے آپ سے پنجاب قانون ساز اسمبلی کے انتخابات میں حصہ لینے کی درخواست کی۔ آپ کے علاوہ دو شخصیات اور بھی تھیں جو اِس انتخاب میں حصہ لے رہی تھیں، ایک لاہور بلدیہ کے صدر ملک محمد حسین اور دوسرے آرائیں برادری کے بہت ہی بااثر شخص خان بہادر ملک محمد دین تھے۔ اِن میں اوّل لذکر تو اقبالؔ کے حق میں

دست بردار ہو گئے، لیکن دوسرے صاحب مقابلے میں کھڑے رہے۔ اس عمل کے پس پردہ دو وجوہ تھیں، ایک تو یہ کہ ملک صاحب کو اپنی برادری کا زعم تھا جیسا کہ آج بھی محض ذات برادری کے نام پر ووٹ لیے اور دیئے جاتے ہیں اور دوسری بات یہ بھی سننے میں آئی کہ چیف کورٹ لاہور کے جج شادی لال کی آشیر باد انہیں حاصل تھی، یہ شادی لال، علامہ اقبالؔ کے متعلق اور بھی کئی موقعوں پر اپنی ناشادی دکھا چکا تھا، لیکن گِدھوں کی دعا سے ڈنگر نہیں مرا کرتے، نیاز مندانِ اقبالؔ نے بڑے زور وشور سے آپ کی انتخابی مہم چلائی، آپ کی حمایت میں جلسے کیے جلوس نکالے جن میں عام لوگوں کے ساتھ ساتھ طلبا، اساتذہ اور شہر کے معززین بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ آپ کے حامی، گروہ کی صورت مختلف علاقوں کا گشت کرتے، آپ کے حق میں اردو اور پنجابی میں گیت گاتے، کئی موقعوں پر علامہ صاحب کو بھی اپنے اس جشن میں شریک کیا گیا، علاقے کے لوگ آپ کو دیکھ کر آپ کے حق میں نعرے لگاتے، اور آپ پر گل پاشی کرتے، علامہ صاحب خود بھی اہلِ علاقہ سے خطاب فرماتے، ایک جلسہ میں مشہور قومی رہنما ڈاکٹر سیف الدین کچلو نے بھی شرکت کی اور خطاب کرتے ہوئے نہایت دردمندی سے اس حقیقت کا اظہار کیا:

> "یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب انتخاب میں اِدھر اُدھر گھوم رہے ہیں، چاہیے تو یہ تھا کہ ہم ڈاکٹر صاحب سے اپنی درخواست پر دستخط کراتے اور پھر بلا مقابلہ آپ کو ہار پہنا کر کونسل ہال میں چھوڑ آتے، میں سخت رنج اور شرم کے ساتھ کہہ سکتا ہوں، کیسی بدنصیب ہے وہ قوم جس کے بعض افراد اقبالؔ جیسی شخصیت کا مقابلہ کرنے سے باز نہیں آتے۔"

وہ دور تو گزر گیا۔ لیکن آج بھی کچھ عقل فراموش اقبال کو ایرے غیرے شاعروں سے مقابلہ کر کے اپنے جہل کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں اور کچھ دریدہ دہن ایسے بھی ہیں جو فلم کے کسی اناڑی ایکٹر کی طرح ٹی وی پر بیٹھے علامہ اقبال ایسی شخص پر لب کشائی کرنے میں بے باک نظر آتے ہیں، حالانکہ یہ آسمان پر تھوکنے کا جاہلانہ عمل ہے۔ جس نے خود ان کے مکروہ چہرے آپ اپنی ہی غلاظت میں آلودہ ہو کر مزید مکروہ ہوتے جا رہے ہیں۔

اس جگہ ہم تشنگی محسوس کریں گے اگر یہ نہ معلوم ہو کہ آپ نے اپنی انتخابی مہم کے دوران جو

کوئی بیس جلسوں میں شرکت کی اور تقریریں کیں تو اُن میں کیا فرمایا، آپ نے فرمایا:

""میں نے مسلمانوں کو زندگی کے صحیح مفہوم سے آشنا کرنے، اسلاف کے نقشِ قدم پر چلانے اور نا اُمیدی، بزدلی اور کم ہمتی سے باز رکھنے کے لیے نظم کا ذریعہ استعمال کیا۔ میں نے پچیس سال تک اپنے بھائیوں کی مقدور بھر ذہنی خدمت کی، اب میں اُن کی بہ طرزِ خاص عملی خدمت کے لیے اپنے آپ کو پیش کر رہا ہوں۔""

یہ تھیں اقبالؔ کی صاف ستھری باتیں جو حقائق پر مبنی تھیں، اور دوسری طرف آپ کے مدِ مقابل کا طرزِ عمل دیکھیے کہ وہ ذات برادری کی باتیں کر کے عصبیت کو ہوا دے رہے تھے۔ آپ کے خلاف گھناؤنا پروپیگنڈا پھیلایا گیا۔ کئی اخبارات کے ذریعہ الزام لگائے کہ اقبالؔ "وہابی" ہے، "نجدی" ہے۔ بدعقیدہ اور کذاب ہے۔ یہ ایک روایتی انتخاب لڑنے والے کی ہرزہ سرائی تھی، دوسری طرف اقبالؔ تھے، جو اپنی ذات میں خود متقدر تھے، ایسے ہزار انتخاب اور ایسی ہزار اسمبلیاں آپ کے حقہ کی چلم کی راکھ سے بھی کم تر تھیں۔ اقبالؔ تہذیب و شائستگی کا پیکر تھے، یہی طرزِ عمل، زبان اور اندازِ بیان آپ کے حامیوں کے تھے، اگر کسی نے برداشت سے باہر ہو کر، حریف کے لہجے میں اُسے جواب دینے کی کوشش کی بھی، تو آپ نے فوراً اُسے روک دیا۔ ظاہر ہے اقبالؔ گفتار کے غازی نہیں، کردار کے غازی تھے۔ انتخابی مہم کے دوران طوفانِ بدتمیزی میں اکثر لوگ بہہ جاتے ہیں، لیکن اقبالؔ اپنے اخلاق اور کردار کے ساتھ پہاڑ کی طرح جمے رہے، کہ یہی تو وقت ہوتا ہے جب انسان کا ضمیر و ظرف آزمایا جاتا ہے، آپ کی انتخابی مہم کیا تھی، سامعین و حاضرین کے لیے درسِ علم و حکمت کا ایک سنہری موقع تھا، قدم قدم آپ نے اِس سے قطعِ نظر کہ کون آپ کا حامی ہے اور کون مخالف، اپنی حکیمانہ گفتگو سے لوگوں کو فیض یاب کیا۔ ایک جگہ نہایت دردمندی اور ہمدردی کے ساتھ اِس حقیقت کا اظہار کیا:

""مسلمانوں کی زندگی کا راز اتحاد میں مضمر ہے، میں نے برسوں مطالعہ کیا، راتیں غور و فکر میں گزار دیں تاکہ وہ حقیقت معلوم کروں جس پر کاربند ہو کر عرب، حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی صحبت میں تیئس سال کے

اندر اندر دنیا کے امام بن گئے، وہ حقیقت اتحاد و اتفاق میں ہے۔ اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو متحد ہو جاؤ، اختلاف بھی کرو تو اپنے آبا کی طرح، تنگ نظری چھوڑ دو، مسلمانانِ ہند کے لیے دوسری ضرور چیز یہ ہے کہ وہ ہندوستان کی سیاسیات کے ساتھ گہری وابستگی پیدا کریں، جو لوگ خود اخبار نہ پڑھ سکتے ہوں، وہ دوسروں سے سنیں، اس وقت جو قوتیں دنیا میں کارفرما ہیں، ان میں سے اکثر اسلام کے خلاف کام کر رہی ہیں، لیکن "ودین الحق لیظھرہٗ علی الدین کلہٖ" کے وعدے پر میرا ایمان ہے۔ ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین

یعنی ہزار مخالفتوں کے باوجود اللہ تعالیٰ اپنے دین کا مظاہرہ کر کے رہے گا، اور یہ کہ (اے مسلمانو!) نہ غم کرو، نہ خوف کھاؤ، ایک دن تم ہی اعلیٰ اولا ہو کر رہو گے، بشرطیکہ تم سچے مومن بن جاؤ۔

ایک سبق جو میں نے تاریخ سے سیکھا ہے یہ ہے کہ صرف اسلام تھا جس نے آڑے وقتوں میں مسلمانوں کی زندگی کو قائم رکھا، اگر آج آپ اپنی نگاہیں پھر اسلام پر جما دیں اور اس کی زندگی بخش تخیل سے متاثر ہوں تو آپ کی منتشر اور پراگندہ قوتیں از سرِ نو جمع ہو جائیں گی، اور آپ کا وجود ہلاکت و بربادی سے محفوظ ہو جائے گا۔"

انتخابی مہم پیسے کا کھیل ہے۔ اقبالؔ ایسے درویش خدامست کا زر سے کیا وابستہ! آپ کے حامی اپنی اپنی استطاعت کے مطابق جان و مال سے آپ کو کامیاب کرانے کے لیے سرگرم تھے؛ جب کہ آپ کے حریف اُمیدوار کے پاس وہ سب کچھ تھا جس کے ذریعہ یہ مراعات یافتہ طبقہ الیکشن لڑتا اور جیتتا ہے۔ ملک محمد دین کی طرف سے ایک قدِ آدم اشتہار دیواروں پر چسپاں کیا گیا جو اس بات کی دلیل تھا کہ یہ صاحبِ زر کس طرح دولت کے زور پر الیکشن اپنے نام کرنا چاہتا ہے۔ لیکن اقبالؔ کی ذات بجائے خود ایک ایسا اشتہار تھا جو آپ کے حامیوں کے دلوں پر آویزاں تھا۔ تاہم قدرت ظاہری اسباب بھی پیدا کر رہی تھی۔

کاتب کُن فیکون:

ملک دین محمد کی طرف سے لگائے گئے اشتہار کو ایک اور دین محمد نے دیکھا، جو حاجی بھی تھے اور کاتب بھی، انھوں نے ایک دوسرے اقبال کے حوالے ملک لال دین قیصر سے مشورہ کیا اور راتوں رات علامہ صاحب کا ایسا ہی قد آدم پوسٹر تیار کر لیا گیا اور جب صبح لوگوں نے دیکھا تو حیران رہ گئے۔ خود حضرت علامہ کو بھی اس کارنامہ کو دیکھ خوش گوار حیرت ہوئی بے ساختہ فرمایا:

"حاجی صاحب تو کاتب کُن فیکون ہیں، اشتہار سے کہا کُن اور وہ اسی وقت ہو گیا۔"

اللہ اللہ، شاعرِ اسلام کا تکلم، خواہ شعری ہو کہ نثری، اثر دکھائے بغیر نہیں رہتا۔ آپ نے حاجی صاحب موصوف کی تعریف میں صرف ایک بار فرمایا تھا اور بعد میں وہ ہمیشہ کے لیے "کاتب کن فیکون" مشہور ہو گئے۔

انتخاب ہوا اور خوب ہوا، لوگوں نے اپنی رائے کا بھرپور استعمال کیا۔ لاہور کی کئی برادریوں نے بھی علامہ اقبال کی حمایت کا اعلان کر دیا، جس سے دورانِ انتخاب خاصی گہما گہمی دیکھنے میں آئی۔

انتخاب کا نتیجہ ضلع کچہری میں ۶ دسمبر ۱۹۲۶ء کو سنایا گیا۔ رائے دہندگی کا تناسب ۶۸ فی صد رہا۔ علامہ اقبال کے حق میں ۵۶۷۵ آئے اور مقابل اُمیدوار کو ۲۴۹۸ ووٹ ملے۔ اس طرح بھاری اکثریت سے آپ کام یاب ہو گئے۔ اس موقعے پر یقیناً حضرت اقبال کے ہونٹوں سے "الحمد للہ" کے کلمات ہی نکلے ہوں گے، لیکن آپ کے حامی کچھ اور بھی اظہار کرنا چاہتے تھے، اُنھوں نے اپنے محبوب شاعر کی کام یابی پر روایتی اظہارِ مسرت کرنا ضروری سمجھا۔ علامہ کو ساتھ لے کر جلوس کی شکل میں نکلے۔ جلوس حلقۂ انتخاب کے مختلف محلوں اور گلیوں سے گزرتا ہوا "چوک جھنڈا" میں پہنچا۔ یہاں آپ کے ایک پرستار نے آپ کے اور رکنِ بلدیہ خواجہ فیروز الدین بیرسٹر کے سروں پر پگڑیاں باندھیں، پھر آپ کو ایک فٹن (ایک قسم کی بگھی) میں سوار کیا گیا اور جلوس روانہ ہو کر مختلف راستوں سے گزرتا ہوا "چوہٹا مفتی باقر" پہنچا تو فضا نغمانیت میں ڈھل گئی۔ کئی خوش آواز نوجوانوں نے نظمیں پڑھیں، اور آخر کوئی رات دس بجے یہ جشنِ مسرت اختتام

پزیر ہو گیا۔

اس کے بعد کئی روز تک زبانی اور خطوط کے ذریعے مبارک باد کا سلسلہ جاری رہا اور کئی تقریبات بھی آپ کے اعزاز میں منعقد کی گئیں۔

حضرت علامہ کے لیے یہ خیال کرنا مناسب نہیں کہ سیاسی اور سماجی مصروفیات نے آپ کو فکری عمل سے روک دیا ہوگا، نہیں بلکہ انتخابی گہما گہمی کے دوران بھی آپ اپنا فکری سفر جاری کیے رہے۔ ''زبورِ عجم'' نامی شعری مجموعہ جو ۱۹۲۲ء سے آپ کے زیرِ قلم تھا، وہ انہی دنوں اختتام پذیر ہوا۔ پنجاب کی قانون ساز اسمبلی کے افتتاحی اجلاس سے تین روز قبل آپ نے مولانا عبدالقادر گرامی کو مکتوب میں یہ خبر دی کہ ''زبورِ عجم'' اپنے اختتام کو پہنچ گئی ہے، بس ایک دو روز میں کاتب کے حوالے کر دی جائے گی۔

☆☆

maablib.org

ڈاکٹر محمد اقبالؔ نے اسمبلی میں جا کر اپنے رائے دہندگان کو مایوس نہیں کیا۔ سب سے زیادہ توجہ آپ نے عام لوگوں کے مسائل پر دی۔ گاؤں دیہاتوں میں بنیادی ضرورتوں کو پیش نظر رکھا۔ صحت وصفائی کے مسائل پر توجہ دی۔ عورتوں کی طبی امداد میں خصوصی دل چسپی لی اور ایلو پیتھی کی جگہ یونانی اور آیورویدک طریقہ علاج کو رائج کرنے اور لازمی تعلیم کے نفاذ پر زور دیا۔ دست کاری، ہنرمندی کی طرف بھی توجہ دلائی، اس دوران انگریز حکومت کی تعلیمی پالیسی پر بھی آپ کڑی تنقید کرتے رہے۔ تعلیمی اداروں اور دیگر سرکاری شعبہ جات میں مسلمانوں کی ملازمتوں کی شرح کیا ہے، حکومت کی توجہ اس طرف بھی کرائی کہ مسلمانوں کی آبادی کے لحاظ سے ملازمتوں کا تناسب غیر منصفانہ ہے۔ ظاہر ہے یہ بے لاگ تبصرے وہی شخص کر سکتا ہے جو بے غرض، بے لوث اور کھرا سچا ہوگا، جو اپنے دل میں خدمت خلق کا پُرخلوص اور سچا جذبہ رکھتا ہوگا۔ اس اعتبار سے کہ علامہ اقبالؔ کو بہر صورت مسلمانوں کا مفاد عزیز تھا، لیکن آپ نے ہمیشہ کوشش کی کہ مسلمان ہی نہیں غیر مسلموں کے ساتھ بھی غیر انصافی نہ ہو۔ اسمبلی کے تمام عرصہ میں آپ صوبے کے عوام کی بلاامتیاز فلاح و بہبود کے لیے آواز بلند کرتے رہے۔ تاہم آپ کو احساس ہوگیا تھا کہ آپ کے مطالبات وجذبات پر کماحقہٗ توجہ نہیں دی جارہی، اور یہ بھی تجربہ ہوگیا کہ یہ اسمبلیاں محض دکھاوا ہیں، یہ انگریزوں کے قائم کردہ کھلونے ہیں جو برطانیہ میں بیٹھے چالاک حاکموں نے مقامی آبادی کو بہلانے اور بے وقوف بنانے کے لیے اُن کے حوالے کردیے ہیں اور ہندوستانی سیاست کار اور عوامی نمائندے اُن کی ان نمائشی باتوں میں آگئے ہیں، بلکہ بہت سے ''عوام کے سچے خادم''

حقیقت میں انگریزوں کے پٹھو اور گماشتے ہیں جو در پردہ اپنے ان آقاؤں کے مفادات کے لیے سرگرم رہتے ہیں اور اس خدمت اور وفاداری کے صلہ میں بڑی بڑی جاگیروں سے نوازے جاتے ہیں، لہٰذا اس صورت حال میں اقبال ایسا بحرِ شفاف کا شناور اس گندے جوہڑ میں کیوں کر خوش اور مطمئن رہ سکتا تھا۔ دنیاداری، موقع پرستی اور خوشامدی و چاپلوسی آپ کے مزاج کے قریب سے بھی نہیں گزری تھیں۔ چناں چہ احباب کے زور دینے کے باوجود آپ نے آئندہ انتخابات میں حصہ لینے سے مطلقاً انکار کر دیا۔

لیکن اس جگہ ہم چاہیں گے کہ علامہ صاحب کی رکنیت کے عرصے میں پیدا ہونے والی کچھ سرگرمیوں کو اپنی معلومات کا حصہ بنالیا جائے۔ پہلی بات تو یہ کہ اسمبلی میں رکنیت کا پہلا سال تھا کہ مئی ۱۹۲۷ء کو لاہور میں ہندو مسلم فسادات کی آگ بھڑک اٹھی۔ گو یہ فسادات نئے نہیں تھے، ہندوستان میں سب سے زیادہ خطرناک، ہول ناک فسادات رہے ہیں، حالانکہ ایک جگہ رہتے ہوئے اس طرح کے واقعات کسی بھی ایک قوم کے حق میں کبھی بہتر نہیں ہو سکتے۔ خوں ریزی، تباہی، بے چینی، بدامنی اور بے یقینی دونوں کے حصے میں آتی ہے، بلکہ سات سمندر پار سے آنے والے غاصبوں کی آمد کے بعد سے برصغیر کی تاریخ کا بہ غور مطالعہ کیا جائے تو اس عیار اور چالاک قوم کے اس سرزمین پر پاؤں جمانے کے اصل اسباب ہی یہاں عوام کے آپس کے جھگڑے، باہمی رنجشیں اور عدم برداشت اور عدم رواداری رہے ہیں، مقامی لوگ جتنا جتنا ایک دوسرے کے خلاف محاذ آرائی کرتے رہے، انگریز حکومت کو نہ صرف استحکام ملا بلکہ اس کی مدتِ حکمرانی طویل ہوتی چلی گئی۔ اس بات کو اقبال سے زیادہ کون جانتا تھا، چناں چہ جیسے ہی لاہور میں یہ پرانا مرض عود کر آیا، آپ مسیحا بن کر فوراً فعال ہو گئے۔ آپ نے عملاً اس آگ کو بجھانے کے لیے وہ اقدامات کیے کہ آپ کے مزاج سے واقف لوگوں کو یہ دیکھ کر حیرانی ہو رہی تھی کہ بڑی بڑی اور اہم تقریبات میں بھی جانے سے پرہیز کرنے والے اقبال آج کل صبح سے شام اور شام سے صبح تک خدمتِ ملک و ملت میں مصروف نظر آتے ہیں۔ بلاشبہ علامہ اقبال نے مسلمانانِ لاہور کی نمائندگی کا حق ادا کر دیا۔ جیسا کہ بعد میں لاہور کے اخبار روزنامہ انقلاب نے بھی لکھا۔ "سچ تو یہ ہے کہ فسادات کی مشتعل آگ کو فرو کرنے کے نیک کام میں سب سے پیش پیش علامہ ڈاکٹر محمد اقبال تھے۔"

جیسا کہ کہا گیا ہندو مسلم فساد کوئی نئی بات نہ تھی، ہندوستان کی سرزمین پر اگر کوئی فوری اور جلدی پودا اُگ سکتا اور نمو پا سکتا تھا تو وہ یہی فرقہ وارانہ فساد تھا اور اس کے لیے کسی بہت بڑی وجہ پیدا کرنے کی کبھی ضرورت نہیں رہی، کسی بھی بات پر یہ ہنگامہ جلاؤ، گھیراؤ اور خوں ریزی میں بدلنے پر تیار رہتا اور بعض مرتبہ تو کسی بہانے کی بھی ضرورت پیش نہ آتی، پہلے ہی سے دلوں میں پلنے والی عصبیت کا پھوڑا پھوٹ نکلتا اور لوگ تفتیش ہی کرتے رہ جاتے کہ ٹھیس کس طرف سے پہنچی؟ آخر ہوا کیا کہ یہ گند بہہ نکلی؟ اس بار بھی جو کچھ ہوا، وہ اِن فسادات کا تسلسل تھا جو گزشتہ تین سالوں سے ہندوستان بھر میں ہوتے آ رہے تھے۔

اِن فسادات کا آغاز اُس وقت ہوا جب مسلم اور ہندو راہ نماؤں کی طرف سے تحریک خلافت اور ترکِ موالات کے خاتمہ کا اعلان کیا گیا۔ دراصل جیسا کہ ہم یہ جان آئے ہیں کہ تحریک خلافت میں گاندھی اور دوسرے کچھ ہندو نیتا بھی مسلمانوں کے ساتھ ہو گئے تھے۔ لیکن جیسے ہی دونوں کی راہیں جدا ہوئیں، بغض و عناد کا زہر پھوٹ نکلا۔ ۱۹۲۲ء کو ملتان میں ایک بڑے فساد نے جنم لیا۔ اِس کے بعد ہندوستان کے کئی بڑے بڑے شہروں میں فسادات اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ان میں دہلی، الہ آباد، ناگ پور، لکھنو، جبل پور، شاہ جہان پور، گلبرگہ اور کوہاٹ وغیرہ شامل ہیں۔ اِن ہنگاموں اور خوں ریز واقعات میں کوئی ڈھائی سو ہلاکتیں ہوئیں۔ فسادات کی اصل وجہ کا سراغ لگانا تو مشکل ہے۔ مسلمان تو پہلے بھی ہندوؤں کی آنکھوں میں کھٹکتے رہے ہیں، لیکن جب سے متعصب ہندو نیتاؤں کی بے وفائی سے تنگ آ کر مسلم راہ نماؤں نے اپنی سیاسی جماعت مسلم لیگ کے نام سے قائم کی، اِن متعصب نیتاؤں کو مسلمان ایک آنکھ نہیں بھا رہے تھے۔ اُنہیں یہ بات کھائے جا رہی تھی کہ مسلمان ایک کم زور اقلیت کے بجائے انگریز کے سامنے خود کو ایک قوم کی حیثیت سے باور کرا رہے ہیں، جب کہ ہندو ذہن صرف خود کو قوم اور ہندوستان کا اصل اور بلاشرکت غیرے مالک سمجھے ہوئے تھا اور اس انتظار میں تھا کہ جیسے ہی انگریز یہاں سے جاتا ہے، وہ اقتدار سنبھال کر مسلمانوں کو ایک حقیر اقلیت میں بدل دیں گے۔

اِدھر انگریز بھی اُن کی باہمی چپقلش سے فائدہ اُٹھا رہا تھا، لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی پر عمل پیرا تھا، لہٰذا یہ بات بھی ثابت ہو چکی تھی کہ کوئی تیسرا خفیہ ہاتھ ہے جو دو اکائیوں کو آپس میں بھڑاتا

رہتا ہے، مثلاً نماز با جماعت کے وقت مسجد کے قریب گھنٹیاں اور سنکھ بجانا، مساجد کے عین سامنے بارات روک کر پٹاخے چھوڑنا، ہولی کے تہوار پر مسلمانوں کو بھی رنگ میں نہلا دیا جانا، اُن پر کیچڑ پھینکنا اور گوبر مل دینا، بقر عید پر مسلمانوں کو گائے ذبح کرنے سے روکنا۔ ظاہر ہے، اِن باتوں سے مسلمانوں میں اشتعال کا پیدا ہونا فطری بات تھی، ردِعمل سامنے آتا اور پھر آگ بھڑک اٹھتی، خون بہتا اور حکمران طبقہ اس آگ پر ہاتھ تاپتا۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ ہندوؤں کی کئی فاشسٹ تحریکیں اِس خونی کھیل کو روا رکھے ہوئے تھیں۔ مثلاً آریا سماج، ہندو مہا سبھا، شدھی، سنگھٹن، یہ ایسے دَل تھے جنھوں نے ہندو مت کے کٹر لوگوں کو عسکری تربیت پر اُبھارا۔ سوامی شردھا نند نامی ایک ہندو، شدھی اور سنگھٹن گروہوں کا سردار تھا اور سارے ہندوستان میں رام راج یعنی ہندو راج پاٹ کا پرچارک تھا، اِن شر پسندوں کا کہنا یہ تھا کہ یا تو مسلمان اپنا مذہب چھوڑ کر ہندو دھرم اختیار کرلیں، ورنہ ہندوستان چھوڑ کر چلے جائیں۔ یعنی ان وحشیوں کو حلال گوشت خور، ہم زبان مسلمانوں سے زیادہ سور کھانے والے گورے پسند تھے جو انھیں اپنی جوتیوں میں رکھے ہوئے تھے۔ ان دھوتی پرشادوں میں سب سے زیادہ گندہ ذہن اور غلیظ زبان والا شر پسند یہی شردھا نند تھا جو اسلام اور مسلمان اکابرین کے خلاف بد بوُ گفتار رہتا تھا، یہاں تک کہ یہ گستاخ بدنہاد نے پیغمبرِ اسلام رحمتِ عالم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ اقدس میں بھی ہرزہ سرائی سے خود کو باز نہ رکھ سکا۔ ظاہر ہے، مسلمان کے لیے یہ بات ناقابلِ برداشت ہے، حرمتِ رسول پر جان قربان کرنا مسلمان کے ایمان کا حصہ ہے، چناں چہ ایک پُر جوش مسلمان نے اس دریدہ ذہن سگِ دنیا کو جہنم رسید کردیا۔

یہ بھی درست ہے کہ پوری ہندو قوم اِس قماش کی نہیں تھی، اِن میں ایک بڑا طبقہ معتدل مزاج بھی تھا۔ جنھوں نے مسلمانوں کے ساتھ مل کر ایک تنظیم "نیشنل لبرل لیگ" کے نام سے قائم کی۔ اقبالؔ بھی کچھ عرصے اِس میں شامل رہے لیکن پھر آپ نے محسوس کیا کہ یہ اتحاد بھی مصلحتوں کا شکار ہو رہا ہے، تو اِس سے الگ ہوگئے۔ تاہم ہندو مسلم فسادات نے آپ کو ہمیشہ آزردہ رکھا۔ اپریل ۱۹۲۳ء کو ایک بیان میں آپ نے فرمایا:

"میں دل سے چاہتا ہوں کہ ہندو اور مسلمان اپنے اختلافات کو دور

کر کے، ملک میں بھائیوں کی طرح سے رہیں اور بات بات پر ایک دوسرے کا سر نہ پھوڑتے پھریں۔ میں اب تک تمام سیاسی جماعتوں سے علیحدہ رہا ہوں۔ البتہ میری خواہش یہ رہی ہے اور ہے کہ ہندوستان کی تمام سیاسی جماعتوں کے باہمی تعلقات بہتر ہو جائیں۔ کسی سیاسی جماعت سے میرا کوئی تعلق نہیں۔"

اِدھر اقبالؔ اس اعلیٰ ظرفی، امن پسندی اور انسانی بھلائی کا مظاہرہ فرما رہے ہیں کہ اس بیان کے بعد مہینے کے تیس دن پورے نہیں ہوئے تھے کہ لاہور میں ہندو غنڈوں اور سکھ بدمعاشوں نے نہتے مسلمانوں کو جو خدا کی عبادت کر کے مسجد سے نکل رہے تھے، خون میں نہلا دیا۔ اس کی روداد یہ ہے کہ یہ اطلاع ملتے ہی ڈاکٹر علامہ اقبالؔ نے فوراً کچھ دوستوں سے رابطہ کیا۔ اُن میں خواجہ فیروز الدین احمد اور مولوی غلام محی الدین قصوری شامل تھے، اُنھیں ساتھ لے کر نکلے اور کوئی بارہ بجے شب موقع واردات پر پہنچے اور فجر کے وقت تک وہاں رہے، پھر مسلم اکابرین کے ساتھ مشاورت میں شرکت کی جو اس صورتِ حال پر غور کرنے کے لیے جمع ہوئے تھے۔ دوپہر کے بعد شہدا کے جنازے جلوس کی شکل میں اُٹھائے گئے۔ شرکا خصوصاً نوجوانوں میں بہت زیادہ اشتعال پایا جاتا تھا، علامہ اقبالؔ بھی جلوس میں شریک تھے، آپ نے نہایت حکیمانہ انداز میں انھیں سمجھانے اور صبر سے کام لینے کی تلقین کی اور آپ کسی حد تک کامیاب بھی رہے۔

مسلمان نمازِ عشاء سے فارغ ہو کر مسجد سے باہر نکلنے لگے کہ کوئی ڈھائی سو کی تعداد میں ہندو اور سکھ نمازیوں پر لاٹھیاں اور کرپانیں لیے ٹوٹ پڑے۔ تین مسلمان موقع پر ہی شہید اور چار زخمی ہو گئے۔ اس اندوہ ناک واقعے سے شہر میں کشیدگی پھیل گئی اور خطرہ پیدا ہو چلا کہ کسی بھی وقت بڑے پیمانے پر فسادات پھیل سکتے ہیں۔ شہیدوں کی نماز جنازہ یونیورسٹی گراؤنڈ میں ادا کی گئی۔ کوئی پچاس ہزار افراد نے شرکت کی۔ نمازیوں میں علامہ صاحب کے ساتھ سر عبدالقادر، سر محمد شفیع قابلِ ذکر ہیں۔

شہر میں دہشت اور خوف پھیلا ہوا تھا۔ علامہ صاحب کئی دیگر اکابرین کو ساتھ لے کر دوسرے اور تیسرے روز بھی شہر کا دورہ کرتے رہے۔ مختلف علاقوں میں جا کر مسلمانوں کے حوصلے

بحال کیے۔ اُنھیں اپنا کاروبار کھولنے کے لیے کہا اور فرمایا:

"عقل والا وہ ہے جو جوش کے وقت ہوش سے کام لے، خواہ مخواہ بے قابو نہ ہوتا پھرے۔" مزید فرمایا...... "جو قوم اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکتی، اُسے ہتھیار رکھنے کا حق حاصل نہیں۔"

انگریز حکومت کی عجب منطق تھی کہ سکھوں کو کرپان رکھنے کی اجازت دے رکھی تھی اور سبب یہ بیان کیا گیا تھا کہ یہ اُن کی مذہبی علامات میں سے ہے، جب کہ مسلمانوں پر تلوار نہ رکھنے کی پابندی تھی۔

لہٰذا فسادات کا ایک سبب یہ بھی تھا، کیوں کہ مسلمان، حکومت کے اِس جانب دارانہ فیصلے پر سخت برہم تھے۔ علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؔ نے بھی اِس غیر منصفانہ حکومتی اقدام کے خلاف احتجاج کیا اور اسمبلی میں آواز اُٹھائی، حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ اِس فیصلے پر نظرِ ثانی کرے اور تلوار کو بھی، کرپان کی طرح اسلحہ ایکٹ انڈیا سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ آپ نے اِس مطالبہ کو بار بار دہرایا، اِس مسلسل احتجاج اور کوششوں نے حکومت کو مجبور کر دیا اور پنجاب کے نو ضلعوں میں مسلمانوں پر سے تلوار رکھنے کی پابندی اُٹھالی گئی۔ لیکن اِس کے بعد بھی احتجاج اور مطالبہ جاری رہا اور آخر مزید آٹھ ضلعوں میں بھی مسلمانوں کو تلوار رکھنے کی اجازت دے دی گئی۔

اِس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کرنا چاہیے کہ ڈاکٹر محمد اقبالؔ اسمبلی میں صرف مسلمانوں کے ترجمان تھے اور اُنھی کے حقوق کی بات کرتے تھے، نہیں، بلکہ مسلمانوں کا تو یہ چھنا ہوا حق تھا جو آپ نے اپنی کوششوں سے دلوا دیا۔ انصاف کے حصول میں آپ دوسروں کے لیے بھی اِس طرح فعال اور سرگرم رہتے تھے اِس کا ایک عملاً ثبوت اُس واقعے سے ملتا ہے کہ کچھ درد مند مسلمان اور امن پسند ہندو باہم سر جوڑ کر بیٹھے اور فسادات فرو کرنے کے لیے ایک کمیٹی بنائی، اُس کا پہلا اجلاس ایک بااثر شخصیت رائے بہادر موتی ساگر کی کوٹھی پر منعقد ہوا۔ علامہ اقبالؔ نے خلوص کے ساتھ اِس میں شرکت فرمائی۔ لیکن شاید دیگر شرکاء کے اخلاص میں کم زوری تھی کہ وہ پوری توجہ اور فعالیت نہ دکھا سکے۔ لہٰذا یہ بیٹھک بے نتیجہ رہی۔

☆☆

پنجاب آئین ساز اسمبلی میں حضرت علامہ کی رکنیت کے دنوں میں ہی، یعنی ۱۹۲۷ء کو

حکومت برطانیہ نے ہندوستان کے اندر سیاسی بے چینی کو محسوس کرتے ہوئے، آئینی اصلاحات کی غرض کے لئے ایک سات رکنی کمیشن اپنے ایک ہم قوم جان سائمن کی سربراہی میں قائم کیا۔ اس کے ذمے یہ کام ہوا گیا کہ وہ حالات کا جائزہ لے ہندوستان کی نمائندہ جماعتوں اور ہندو مسلم قومی رہنماؤں سے بات چیت کر کے اپنی سفارشات حکومت کو پیش کرے کہ دستور میں کیا اصلاحات کی جا سکتی ہیں۔ لیکن سائمن کمیشن کے ساتوں ارکان کیونکہ انگریز تھے، ایک بھی مقامی شخص کو شامل نہیں کیا گیا تھا، اس لئے اکثر سیاسی رہنماؤں نے کمیشن کا مقاطعہ کر دیا۔ ادھر دہلی میں رہنماؤں نے بمبئی میں جلسہ کر کے ہندو مسلم مسئلہ کے حل کے لئے تجاویز مرتب کیں جو ہندو مہاسبھا کی طرف سے سخت تنقید کا نشانہ بنیں۔ اس کے جواب میں سر محمد شفیع نے ایک جامع تقریر کی۔

مقاطعہ کے معاملہ پر مسلم لیگ دو دھڑوں میں بٹ گئی۔ ایک حصے کے صدر محمد علی جناح اور دوسرے کے سر محمد شفیع تھے۔ علامہ اقبال شفیع لیگ کے سیکریٹری ہوئے۔ اختلاف کا سبب یہ تھا کہ شفیع لیگ مقاطعہ چاہتی تھی جبکہ جناح لیگ مقاطعہ کے حق میں نہیں تھی۔ اس طرح مخلوط اور جداگانہ انتخاب پر بھی دونوں کا سخت اختلاف تھا۔ علامہ صاحب سر شفیع کے ساتھ رہے کیونکہ وہ ان کے موقف کے حامی تھے۔

خالص گوروں پر مشتمل یہ کمیشن جب لاہور کے دورے پر آیا تو عام لوگوں نے اس کے خلاف پر زور احتجاج کیا۔ تاہم شفیع لیگ نے ایک وفد کی شکل میں کمیشن سے ملاقات کی اور اسے اپنا موقف پیش کیا۔ اس وفد میں سر ڈاکٹر محمد اقبال بھی شریک تھے۔

اقبال شروع سے ہی مسلم قومیت کے حامی و پرستار تھے، اسی لئے جداگانہ طریق انتخاب آپ کے عقیدے مطابق مسلمانوں کے ملی تشخص کو برقرار رکھنے کے لئے از حد ضروری تھا۔ چنانچہ آپ کسی بھی صورت اپنے اس موقف سے سر مو ہٹنے کو تیار نہ تھے۔ لیکن کانگریس اور کٹر ہندو جماعت خصوصاً مہاسبھا پارٹی جو "سوراج" (آزادی) کے بعد ہندوستان میں سام راج اور رام راج کے سپنے دیکھ رہی تھی وہ مسلمانوں کے اس اصولی مطالبہ کی سخت مخالف تھی۔ اس کے نزدیک اگر مسلمانوں کو الگ قوم کی حیثیت سے انتخاب لڑنے کا حق دے دیا گیا تو ان بت پرستوں کی "جاگیر" (ہندوستان) میں مسلمانوں کو بھی بے پارٹنر اور حصہ دار ماننا پڑ جائے گا۔ اس صورت

حال میں خود سر محمد علی جناح کا بھی نقطہ نظر یہ تھا کہ یہ تنازعہ فساد اور شر کی صورت سیاسی پیش قدمی کو ست کرنے کا باعث بنے گا، اگر مسلمانوں کے دوسرے حقوق تسلیم کر لئے جاتے ہیں اور مسلمانوں کے دل و دماغ سے اکثریت کی بالادستی کا خوف دور کر دیا جاتا ہے تو مخلوط انتخاب کو تسلیم کر لینا چاہئے۔ لیکن اقبال اپنے مضبوط موقف پر قائم رہے۔ کیوں نہ ہوتے کہ:

ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

دراصل یہ جھلکیاں ہم اس لئے تازہ کر رہے ہیں کہ شاعر اسلام اقبال کے سیاسی کردار سے بھی ہمیں کسی قدر آگاہی ہو سکے۔

اس سے قبل کہ ہم اقبال کے سیاسی کردار پر کچھ اور روشنی ڈالیں نہرو کی شر انگیز رپورٹ جو ''نہرو رپورٹ'' کہلاتی ہے ان صفحات میں شامل کر لیں جس کا جواب قائدِ اعظم محمد علی جناح نے بھرپور طریقے پر دیا جو قائدِ اعظم کے چودہ نکات کے نام سے مشہور ہے۔ تو پہلے نہرو رپورٹ کی شر انگیزی ملاحظہ کرتے ہیں۔

☆ جداگانہ انتخابات قومی روح اور اس کی نشو نما کے منافی ہوں گے۔

☆ مخلوط انتخابات کے تحت کسی بھی فرقے کے لیے نشستوں کی تخصیص نہ ہوگی۔

☆ پنجاب اور بنگال میں آبادی کی بنیاد پر مسلمانوں کے لئے نشستوں کی تخصیص کا مطالبہ رد کر دیا گیا (ان دو صوبوں میں مسلمانوں کی آبادی علی الترتیب ۵۶ اور ۵۵ فیصد تھی۔ مسلمان ان صوبوں میں تعلیمی، اقتصادی اور سیاسی اعتبار سے پسماندہ تھے۔ صوبائی کونسلوں میں ان کی نمائندگی بہت کم تھی اور انہیں اندیشہ تھا کہ آئندہ اس میں مزید کمی واقع ہو جائے گی۔)

☆ صرف ہندو اکثریتی صوبوں میں مسلمان اقلیتوں کے لئے آبادی کی بنیاد پر اور مخلوط انتخابات کے تحت نشستوں کی تخصیص کی جائے گی۔

☆ معاہدہ لکھنؤ اور مونٹیگ چمسفورڈ اصلاحات کے تحت مسلمانوں کو جو توازن (Weightage) دیا گیا تھا وہ حاصل نہ ہوگا۔

☆ مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کے لئے ایک تہائی نمائندگی کا مطالبہ مسترد کر دیا

گیا اور آبادی کے اعتبار سے ۲۵ فیصد نشستوں کی تخصیص اور مزید نشستوں کے لئے مقابلہ کا حق دینے کی سفارش۔

☆ مرکز کے لئے وحدانی شکل تجویز کی گئی۔

☆ صوبہ سرحد اور بلوچستان کے لئے دوسرے صوبوں کے برابر آئینی درجہ کا مطالبہ مسترد کر دیا گیا۔

☆ سندھ کو بمبئی سے الگ کرنے کا مطالبہ بھی تسلیم نہیں کیا گیا۔

اس سلسلہ میں یہ بڑا عجیب و غریب موقف اختیار کیا گیا کہ سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کر کے ایک الگ صوبہ بنا دیا جائے بشرطیکہ تحقیقات کے بعد یہ ثابت ہو جائے کہ:

سندھ مالی اعتبار سے خود کفیل ہے۔

اگر یہ ثابت ہو جائے کہ سندھ مالی اعتبار سے خود کفیل نہیں تو سندھ کے عوام کے سامنے تمام مالی اور انتظامی پہلوؤں کو رکھا جائے اور اگر ان کی اکثریت سندھ کی علیحدگی کے حق میں رائے دے اور اس امر پر آمادہ ہو کہ وہ نئے صوبے کی تشکیل کی صورت میں تمام مالی ذمہ داریاں قبول کرے گی تو سندھ کو علیحدہ صوبہ بنا دیا جائے۔

سندھ کی غیر مسلم اقلیت کو صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں میں نمائندگی کے لیئے وہی مراعات دی جائیں جو نہرو رپورٹ کے تحت مسلمان اقلیتوں کو دی گئیں۔

سندھ کے بارے میں اس کمیٹی نے جن خیالات کا اظہار کیا اس کی منطق بہت دلچسپ تھی:

''مسلمان ہندوستان میں ہندوؤں کے مقابلہ میں کم ہونے کی وجہ سے ڈرتے ہیں کہ ہندو اکثریت ان پر غلبہ حاصل کرے گی یا ان کو سراسیمہ کرے گی۔

لہٰذا مسلمانوں نے یہ نئی تجویز پیش کی کہ مسلمانوں کو کم از کم ہندوستان کے کچھ صوبوں میں غلبہ حاصل ہونا چاہئے۔ ہم اس مطالبے پر اس لئے تنقید نہیں کرتے کہ اس میں کافی حد تک اور موجودہ فرقہ وارانہ ماحول کے تحت سچائی موجود ہے۔ دوسری طرف 'گو ہندو پورے ہندوستان میں اکثریت کے حامل ہیں لیکن وہ پنجاب، بنگال، سندھ، بلوچستان اور سرحد میں اپنی اقلیت اور پورے ہندوستان میں اکثریت کے باوجود مذکورہ بالا صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت کے

باعث ان کے غلبہ سے خوف زدہ ہیں۔"

ہندو کی پست ذہنیت اور تنگ دلی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے؟ ایک طرف تو وہ پورے ہندوستان میں ہندوؤں کی واضح اکثریت کے باوجود صرف پانچ صوبوں میں مسلمانوں سے ان کی اکثریت کے باعث خائف نظر آتا ہے لیکن سات صوبوں میں اپنی اکثریت کے باوجود مسلمانوں کے اندیشوں کو خاطر میں نہیں لانا چاہتا۔

لیکن محمد علی جناح ایسے ہوش مند سیاسی لیڈر سے نہرو کی چالاکی کیوں کر پوشیدہ رہ سکتی ہے چناں چہ انھوں نے نہرو رپورٹ کے جواب میں جو کچھ فرمایا وہ قاطع برہان کی حیثیت رکھتا ہے۔

جواہر لعل نہرو رپورٹ کے بعد حالات کیا سنبھلتے تعطل برقرار رہا اور وقت گزرتا رہا۔ آخر کار مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے مسٹر محمد علی جناح کے چودہ نکات پیش کیے گئے۔ وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ آئندہ آئین وفاقی حیثیت کا حامل ہو اور صوبوں کو ماباقی اختیارات حاصل ہوں۔

۲۔ تمام صوبوں کو مساوی سطح پر خود مختاری حاصل ہو۔

۳۔ ملک کی تمام اسمبلیوں اور دوسرے منتخب اداروں کی تشکیل، ہر صوبے میں اقلیتوں کے لئے موثر اور مناسب نمائندگی کے اصولوں پر کی جائے اور کسی اکثریت کیصوبے کو نہ تو اقلیت میں تبدیل کیا جائے اور نہ ہی اس کا توازن اقلیت کے ساتھ قائم کیا جائے۔

۴۔ مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کو ایک تہائی نمائندگی دی جائے۔

۵۔ فرقہ وارانہ گروہوں کے لئے علیحدہ انتخابات کا موجودہ طریقہ جاری رہے۔ ہر فرقے کو اس امر کی اجازت ہو کہ وہ جب چاہے، علیحدہ انتخاب کے طریقے سے کنارہ کش ہو کر مخلوط انتخاب کے طریق کار کو اپنا لے۔

۶۔ اگر کبھی علاقائی تبدیلیوں کی ضرورت محسوس کی جائے تو اس صورت میں کسی قیمت پر بھی پنجاب، بنگال اور صوبہ سرحد کے مسلمان متاثر نہ ہوں۔

۷۔ تمام گروہوں کے لئے عقیدت، عبادات، اجتماع، انجمن سازی، تعلیم اور پراپیگنڈہ کی ضمانت دی جائے۔

۸۔ کوئی ایسا بل یا کسی بل کا کوئی حصہ کسی اسمبلی یا کسی دوسرے منتخب ادارے میں منظور نہ کیا

جائے، بشرطیکہ یہ بل جس فرقے سے متعلق ہو، وہ فرقہ اسے اپنے لئے مفید خیال نہ کرتا ہو اور ایسے بل کا مخالف ہو۔ نیز اس متعلقہ گروہ کے تین چوتھائی نمائندوں نے اس کی مخالفت کی ہو اور نہ ہی کوئی ایسا بالواسطہ طریق اختیار کیا جائے جس کے ذریعے ایسے کسی بل کی منظوری کے اسباب پیدا ہوتے ہیں۔

۹۔ سندھ کو بمبئی سے الگ کر دیا جائے۔

۱۰۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں دوسرے صوبوں کی سطح پر اصلاحات نافذ کی جائیں۔

۱۱۔ آئین میں یہ گنجائش پیدا کی جائے کہ دوسرے ہندوستانیوں کی طرح مسلمانوں کو بھی سول ملازمتوں اور مقامی خودمختار اداروں میں ان کا مناسب حصہ مل سکے۔

۱۲۔ آئین میں مسلمانوں کی ثقافت، تعلیم، زبان، مذہب، قوانین اور مسلمانوں کے فلاحی اداروں کے تحفظ کی ضمانت دی جائے۔

۱۳۔ مرکز یا اسمبلی ایسی کوئی کابینہ نہ بنائی جائے، جس میں مسلمان ایک تہائی سے کم تعداد میں ہوں۔

۱۴۔ ہندوستانی وفاق میں شامل ریاستوں کی مرضی کے بغیر مرکزی اسمبلی آئین میں کوئی تبدیلی نہ کرے۔

جناح صاحب کے ان نکات پر بھی انڈین نیشنل کانگریس والے کئی برس تک صرف بات چیت کرتے رہے۔ کسی حتمی نتیجے پر نہ پہنچے۔ یہ ماہ و سال تھے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس الٰہ آباد میں ہوا۔"

سوئے مدارس:

جیسا کہ ہمارے علم میں آچکا ہے، علامہ ڈاکٹر محمد اقبال کا فکر و فلسفہ پورے برصغیر کے اہلِ علم و دانش کو متاثر کر چکا تھا اور آپ مسلمانوں کے محبوب شاعر بن چکے تھے۔ ایشیائی عوام اور مغرب کے خواص اور دانش کدوں میں فکرِ اقبال ایک موثر آواز بن کر بازگشت کر رہی تھی۔ اکثر علمی حلقوں اور تعلیمی اداروں کی خواہش ہوتی تھی کہ آپ اُن کے درمیان آئیں۔ اپنے خیالات و افکار عالیہ سے انھیں نوازیں، تاکہ وہ اُن سے فیض حاصل کر سکیں۔ اُن کے علم و عمل میں تازگی و توانائی پیدا

ہو۔ چناں چہ دسمبر ۱۹۲۸ء کا آخر تھا کہ آپ کو مدراس میں مدعو کیا گیا۔ اس دورۂ مدراس پر آپ لاہور سے روانہ ہوئے، لیکن پہلے کچھ روز کے لیے دہلی میں ٹھہرے، جہاں کُل جماعتی مسلم کانفرنس کے اجلاس میں شرکت کی۔ کانفرنس کی طرف سے مسلمانوں کے جو مطالبات متعدد حلقے کی طرف سے کیے گئے تھے، آپ نے اُن کی پُر زور حمایت و تائید کی۔ اجلاس کے اختتام کے بعد آپ ۲ جنوری کو مدراس کے لیے روانہ ہو گئے۔ اہلِ مدراس کے لیے علامہ اقبال کی آمد بہت بڑا اعزاز تھا۔ مختلف تنظیموں کی طرف سے آپ کو استقبالیے پیش کیے گئے۔ ان تقریبات میں آپ نے حاضرین سے خطاب کیا اور ۵ تا ۸ جنوری مسلسل آپ نے تین پُر مغز خطبات دیئے۔ ۷ جنوری کو ایک تنظیم "انجمن خواتین اسلام" کے سپاس نامے کے جواب میں آپ نے شریعت اسلامی میں عورت و مرد کے حقوق و مرتبہ پر بھرپور روشنی ڈالی۔

در شہید پر:

حضرت علامہ خودی کے پیامبر تھے، خودی کے عارف مردانِ حق سے آپ کو عقیدت کی حد تک محبت تھی، تاریخ اسلام کے ہیرو تو آپ کے ممدوح تھے ہی، تاریخ ہند کی دو شخصیات، مغل شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر اور سلطان ٹیپو شہید سے آپ کو گہری عقیدت اور روحانی وابستگی تھی۔ آپ مدراس تشریف لے گئے، تو وہاں کی مصروفیات کے بعد، واپسی پر میسور کے مرکزی شہر سرنگا پٹم میں سلطان شہید کے مزار پر حاضری کو اپنے اوپر واجب کر لیا۔ جیسے ہی مزار میں داخل ہوئے آپ پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو گئی۔ دراصل آپ کے سامنے وہ شہید محوِ خواب تھا جو اس مردِ مومن کی روشن مثال تھا جس کو آپ اپنے تصور میں زندہ رکھے ہوئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ نے اس جری اور غیرت مند جواں مرد کا اپنی منفرد تخلیق جاوید نامہ میں روح کی گہرائیوں سے ذکرِ خیر کیا ہے۔ ایک اور نظم: "سلطان شہید ٹیپو کی وصیت" کے عنوان سے بھی اپنی عقیدت کا ثبوت دیا ہے۔

تو رہ نورد شوق ہے منزل نہ کر قبول
لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول

اے رہِ شوق کے مسافر! تیرا کام آگے، بہت آگے بڑھنا ہے۔ تجھے اس منزل پر پہنچنا ہے جہاں قلب مطمئنہ حاصل ہوتا ہے، اور قلب مطمئنہ وہ ہے جسے مرضی خالق حاصل ہو جائے تو پھر

راستے میں آنے والے ٹھکانے فریب ہیں، انہیں ہرگز قبول نہ کر۔

جیسا کہ علامہ نے ایک اور جگہ فرمایا ہے:

پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی

پوری نظم "سلطان ٹیپو کی وصیت" میں آپ راہِ حق کے مسافر کو نہایت پُرزور انداز اور موثر لہجے میں تاکید کر رہے ہیں کہ یہ دنیا اور کائنات تیرے لیے بنائی گئی ہے، تیرے دم سے اس بزمِ کائنات کی رونق ہے، تو کائنات کے لیے نہیں بنایا گیا، لہٰذا تو اس کی عارضی رونقوں میں الجھ کر نہ رہ جا، اپنے گردوپیش پھیلی ہوئی رنگینوں کو دیکھ کر ان سے جی بہلانے نہ بیٹھ جا! بلکہ اپنے مقام کو پہچان اور اپنے اعلیٰ ذوق کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس منزل کی طرف اپنا سفر جاری رکھ جو مسلمان کی اصل منزلِ مقصود ہے"۔

اس جگہ ہم اپنے قارئین سے کہیں گے کہ وہ اس نظم کو اپنے لبوں سے ہم آہنگ کریں اور اس وجد آور نغمہ سے اپنے قلب و نظر کو ایک توانا آسودگی بخشیں۔

حضرت علامہ نے اِسی دورہ میں میسور کے علاوہ بنگلور اور پھر حیدر آباد دکن میں بھی اپنے اِن خطبات کو دہرایا جو مدراس میں دیئے تھے۔

اُمید افزا:

اِسی سالِ رواں کے گیارھویں مہینے کے تیسرے ہفتے میں، حضرت علامہ علی گڑھ یونی ورسٹی میں مدعو کیے گئے اور مدراس میں دیئے گئے خطابات میں سے تین یہاں پیش کیے۔ اِن مصروفیات سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مفکرِ اسلام اپنی فکر سے عالمِ اسلام، بالخصوص مسلمانانِ برصغیر کے ذہنوں کو روشن کرنے اور اُن کے خیالات کو جگمگانے کا کیسا عظیم الشان کارنامہ انجام دے رہے تھے۔ آپ کی یہ مساعیٔ جلیلہ اور خدماتِ جلیلہ جہاں برصغیر کے مسلمانوں اور اُن کے حوالے سے پوری ملتِ اسلامیہ کے لیے نہایت اہمیت کی حامل تھیں، وہیں خود آپ کے اپنے لیے بھی روحانی خوشی اور دلی طمانیت کا باعث تھیں، واضح طور پر محسوس کر رہے تھے کہ آپ کی کوششیں رائیگاں نہیں جا رہیں بلکہ بار آور ثابت ہو رہی ہیں، اِس دورے میں آپ کوئی ایسی شخصیات سے ملاقات موقع

علما، جنہیں آپ نے محسوس کیا کہ وہ آپ کے مشن میں معاون و مددگار ہو سکتے ہیں، اس بات کا اظہار آپ نے اپنے دورے کے اختتام پر، لاہور واپس آ کر اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے فرمایا۔ مشہور اسلامی اسکالر اور مفسرِ قرآن مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے نام ایک مکتوب میں جو درج ذیل مکتوب لکھا گیا فرماتے ہیں۔

"میں بھی کچھ دنوں کے لیے علی گڑھ گیا تھا، وہاں ایک نئی زندگی کا آغاز معلوم ہوتا ہے۔ سید راس مسعود بہت مستعد آدمی ہیں اور مجھے یقین ہے کہ ان کی مساعی سے یونیورسٹی کی زندگی میں ایک خوشگوار تبدیلی ہوگی۔ آپ بھی کبھی کبھی وہاں جایا کریں اور مذہبی مضامین پر طلبہ سے گفتگو کریں تو نتیجہ بہت اچھے ہوں گے۔ باوجود بہت مخالف قوتوں کے جو ہندوستان میں مذہب کے خلاف (بالخصوص اسلام کے خلاف) عمل کر رہی ہیں مسلمان نوجوانوں کے دلوں میں اسلام کے لیے تڑپ ہے۔ لیکن افسوس کہ کوئی آدمی ہم میں نہیں جس کی زندگی قلوب پر موثر ہو۔"

اس بات سے ہم محسوس کرتے ہیں کہ اقبالؔ کے دل میں احیائے اسلام کے لیے کیسی تڑپ ہے۔ قوم کے نوجوانوں کے اندر دین و ایمان سے وابستگی دیکھنے کی کیسی تمنا رکھتے ہیں۔ جہاں بھی یہ منظر نظر آتا ہے کہ نوجوان اسلام کو گلے لگائے ہوئے ہیں، اظہارِ اطمینان و مسرت کیے بغیر نہیں رہتے، بلکہ اپنے اس یقین کو زبان پر لے آتے ہیں:

نہیں ہے نا اُمید اقبالؔ اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

علی گڑھ یونیورسٹی کے اس وقت کے شیخ الجامع سید راس مسعود کا ابھی آپ نے ذکر کیا ہے یہ سر سید کے پوتے ہیں جو خود بھی علامہ صاحب سے متاثر تھے اور بعد میں تو آپ کے بہت قدردان اور ہمدم ثابت ہوئے۔

اور جیسا کہ ہم نے پہلے کہا "اسرارِ خودی" کی اشاعت کے فوری بعد ہی لندن یونیورسٹی کے ایک پروفیسر مسٹر نکلسن نے اس کا ترجمہ بھی کر ڈالا اور دنیا کے دیگر ادبی و علمی حلقوں میں اس مثنوی کو حیرت ناک پذیرائی ملی اور اس طرح اقبالؔ کا فلسفۂ خودی آپ کی شناخت بن گیا۔

☆☆

درویش خدا مست:

اس زمانہ میں سیاسی سرگرمیوں کے علاوہ آپ کی دیگر مصروفیات انتہا کو پہنچی ہوئی تھیں۔ ایک طرف وکالت جو آپ کے معاش کا ذریعہ تھی، دوسری طرف قانون ساز اسمبلی میں اپنے حلقہ انتخاب کے لوگوں کے مسائل کی ترجمانی، سیاسی اور سماجی اجتماعات میں آپ کی شرکت، قومی رہنماؤں کے ساتھ باہمی مشاورت اور تبادلہ خیالات، اور شعری تخلیقات کے ساتھ ساتھ، اہم ترین موضوعات پر خطبات کی تیاری جو آپ کو مدراس میں پیش کرنے تھے جہاں آپ مختلف اداروں اور انجمنوں کی طرف سے مدعو تھے۔ اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کے حقوق اور مفادات سے متعلق اخباری بیانات اور کچھ معاملات پر خود قوم سے اپیلیں کرنا۔ اندرون اور بیرون شہر بلکہ لاہور کے علاوہ ہندوستان کے دیگر شہروں سے آنے والے ملاقاتیوں سے ملنا۔ اس پر کئی جسمانی عوارض کا سامنا، تاہم درد گردہ اور نقرس جیسے مرض کے باوجود بستر کے ہو کر نہیں رہ گئے۔ اس حالت میں بھی اپنے معمولات جاری رکھے ہوئے تھے۔ ملاقاتیوں کا تانتا بندھا رہتا۔ ملاقاتیوں کو پیشگی اجازت لینے کی ضرورت تھی اور نہ ہی ملاقات کے لئے وقت مقرر تھا، جو بھی جس حیثیت کا جب بھی کوئی چلا آتا تو آپ کا دل اور دروازہ کھلا پاتا، اور جتنی دیر بھی آپ کی صحبت میں گزارتا آپ کی خندہ پیشانی اس کا استقبال کرتی رہتی۔

قائد اور اقبال:

یاد رہے جداگانہ اور مخلوط انتخابات کے معاملہ پر یہاں کسی کے دل میں یہ خیال نہ آنا چاہیے کہ اقبال اور محمد علی جناح صاحب کے درمیان اختلاف کی کوئی بہت بڑی خلیج پیدا ہو گئی تھی، نہیں، بلکہ دونوں رہنما اپنے اپنے طریقہ پر مسلمانوں کے وجود کو منوانے کی پر خلوص اور یکسانہ سوچ رکھتے تھے، فرق تھا تو یہ کہ مسٹر جناح خالص سیاسی نقطہ نظر کے حامل تھے، جبکہ اقبال فکرِ اسلامی سے مغلوب تھے، آپ کے نزدیک مسلمانوں کی بقا اس میں تھی کہ پہلے انہیں بحیثیت ایک الگ قوم تسلیم کرلیا جائے، اور اس کے لئے اولاً اور بنیادی قدم یہی ہو سکتا ہے کہ انتخاب کے وقت، ہندوستان میں موجود یہ دونوں اکائیاں واضح طور پر الگ نظر آئیں، ورنہ مخلوط انتخاب کی آندھی مسلمانوں کی الگ پہچان اور شناخت کو اڑا کر لے جائے گی۔ ادھر یہ نہیں کہہ سکتے کہ مسٹر محمد علی جناح کو اس بات کا احساس نہیں تھا بلکہ وہ بتدریج سیاسی عمل کو آگے بڑھانا چاہتے تھے اگر مسلمانوں کے تشخص کو انہوں نے بالکل ہی خارج از ذہن کر دیا ہوتا تو آگے چل کر دو قومی نظریہ پر پاکستان کا مقدمہ نہ لڑتے۔ چنانچہ جب نہرو رپورٹ میں مسلمانوں کی جداگانہ حیثیت نفی کر دی گئی تو اس کے جواب میں؛ مسٹر جناح نے جو چودہ نکات پیش کئے تو اس میں آپ نے جداگانہ طریق انتخاب کو بھی شامل کرلیا۔

متفقہ رہنما جناح:

اس طرح تمام مسلم رہنما یکجا ہو گئے اور دو دھڑوں میں بٹی ہوئی مسلم لیگ بھی متحد ہو گئی اور جناب محمد علی جناح مسلم لیگ کے بلکہ ہندوستان میں مسلم اکثریت کے بالا اتفاق سب سے بڑے رہنما تسلیم کر لئے گئے۔ چنانچہ یہ شاندار کامیابی دراصل اس مکتب خیال کی کامیابی تھی جو مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخاب کرنا مسلم تشخص کے جسم میں روح کے مترادف سمجھتا تھا اور اس مکتب کے سرخیل اور روحِ رواں علامہ محمد اقبال تھے۔

زندہ رہنا ہے تو:

یکم جنوری ۱۹۲۹ء کو دہلی میں کل جماعتی مسلم کانفرنس منعقد ہوئی، علامہ اقبال نے اس میں شرکت فرمائی اور جب سر محمد شفیع نے کانفرنس کے اختتام پر ایک قرارداد پیش کی جس میں جداگانہ

انتخاب، سندھ کی بمبئی انتظامیہ سے علیحدگی، سرحد اور بلوچستان میں بھی دیگر صوبوں کے مساوی آئینی اصلاحات، وفاقی طرزِ حکومت، صوبوں کو تفویض کردہ اختیارات اور مرکزی اسمبلی میں مسلم نمائندگی کی ایک تہائی نیابت کا مطالبہ کیا گیا، تو علامہ صاحب نے اس قرارداد کی پرزور تائید کرتے ہوئے اس کے حق میں فرمایا۔ ''اگر مسلمانوں کو ہندوستان میں بحیثیت مسلمان زندہ رہنا ہے تو..... جلد از جلد ایک پولیٹیکل پروگرام بنانا چاہیے۔''

دراصل علامہ اقبال اپنی تقریروں اور دیگر ارشادات میں گاہے گاہے اس طرح کے اشارے دیتے رہے تھے کہ ہندوستان میں مسلم اکثریت کے علاقے اس بات کے متقاضی ہیں کہ ان پر مشتمل ایک منظم اسلامی ریاست تشکیل دی جانی چاہیے۔ سو آگے چل کر خطبہ الہ آباد میں آخر آپ نے ان اشارات کو ایک مجموعی تجویز ہی نہیں بلکہ ایک واضح اور اصولی مطالبہ کی شکل میں پیش کر دیا۔

استادِ مکتب کی رحلت:

ذکر اقبال میں آپ کے استادِ محترم شمس العلماء مولوی میر حسن کا ذکر بھی لازم رہا ہے تو پھر ان کے ارتحال رحلت کی خبر بھی لازم ہے۔

۲۵ ستمبر ۱۹۲۹ء کو علامہ اقبال کو ان کے وصال کی خبر ہوئی تو اس وقت آپ میکوڈ روڈ والے مکان میں مقیم تھے۔ خبر سنتے ہی آپ ریلوے اسٹیشن کی طرح چل دیے۔ لیکن سوئے اتفاق اس وقت کوئی گاڑی سیالکوٹ جانے والی نہ تھی۔ البتہ ایک مال گاڑی وزیرآباد جا رہی تھی۔ علامہ صاحب پر استادِ محترم کی محبت غالب تھی آپ اسی مال گاڑی میں بیٹھ گئے اور اس طرح فرید آباد پہنچ کر دوسرے ذریعہ سے سیالکوٹ کے لیے روانہ ہوئے۔

اس جگہ اس تاریخ وفات کا ذکر کرتا چلوں کہ علامہ صاحب نے اپنے استاد کے انتقال پر جو مادۂ تاریخ ۱۳۴۷ نکالا۔ وہ اس آیہ قرآنی میں مضمر ہے۔ وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین

☆☆

دو مردانِ خدا:

افغانستان کے نئے حکمران نادر شاہ ہندوستان کا دورہ کر کے، کابل جانے کے لئے لاہور سے گزرنے لگے تو علامہ صاحب اسٹیشن پر ان سے ملنے گئے۔ غالباً تعارف اور شناسائی تو علامہ کی ان سے اس وقت سے تھی جب وہ جنرل کی حیثیت سے افغانستان کے سفیر تھے۔ لیکن بالشافہ ملاقات پہلی بار ہو رہی تھی۔ نادر شاہ کی والدہ لاہور میں پیدا ہوئی تھیں اور یہیں پلی بڑھی تھیں، اس وجہ سے اقبال ان کو "نصف پنجابی" کہتے تھے۔ موصوف نے ڈیرہ دون میں تعلیم حاصل کی تھی اور اسی وجہ سے وہ بہت اچھی اور رواں اردو بولتے تھے۔ علامہ سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے اردو میں ہی گفتگو کی۔ وہ اپنے نام کے برعکس کوئی زیادہ لمبے چوڑے نہیں بلکہ درمیانہ قد کے پتلے دبلے شخص تھے۔ بالشافہ ملاقات کے وقت نادر شاہ نے اقبال کو غیر یقینی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں تو سمجھتا تھا آپ ایک لمبی چوڑی داڑھی والے بزرگ ہوں گے۔" تو اس پر اقبال برجستہ بولے۔ "اور میرا خیال بھی یہ تھا کہ آپ کوئی قوی ہیکل قسم کے پہلوان ہوں گے۔"

گویا نہ تو شاعر اسلام، نادر شاہ کی توقع کے مطابق نکلے اور نہ ہی غازی اسلام کی صورت اس ذہنی تصور سے مطابقت رکھتی تھی جو اقبال نے بنا رکھی تھی۔ لیکن دونوں کے سینے ایمان کی حرارت سے پُر جوش تھے۔ یہ ان دونوں کی بات ہے جب نادر شاہ نے افغانستان کی تباہ حالی کے پیش نظر ہندوستانیوں سے ہر قسم کی امداد و اعانت کی اپیل کر رکھی تھی۔ چنانچہ اقبال نے گاڑی کی روانگی سے کچھ دیر پہلے، نادر شاہ کو الگ میں لے جا کر کہا۔

دل و جاں نذر:

"تم ایک بڑی مہم سر کرنے جا رہے ہو، میں ایک فقیر آدمی ہوں، صرف دعاؤں سے تمہاری مدد کر سکتا ہوں، لیکن کچھ پونجی جو میں نے برسہا برس میں پس انداز کی ہے، وہ یہ پانچ ہزار کی رقم اتفاق سے اس وقت میرے پاس ہے، اگر یہ حقیری رقم تمہارے کسی کام آ سکے تو مجھے خوشی ہو گی۔"

علامہ کی اس اخلاص بھری پیشکش پر نادر شاہ آبدیدہ ہو گئے۔ اور محض ایک فقیر کی اس اعانت کو نیک نامی سمجھ کر قبول کر لیا۔

اس واقعہ میں کئی روایات گڈمڈ ہو گئی ہیں۔ جس میں رقم کی تعداد پانچ ہزار کی بجائے دس ہزار ہے اور یہ کہ نادر شاہ نے، اشد ضرورت کے باوجود یہ رقم قبول نہیں کی، لیکن جب اقبال نے بہت زیادہ اصرار کیا تو انہوں نے یہ کہہ کر معاملہ طے کر دیا کہ فی الحال اس رقم کو اپنے پاس رکھیں، جب ضرورت ہوئی تو منگوا لیں گے۔ لیکن ہمیں جو روایت قابل قبول لگتی ہے، وہ یہ کہ اقبال نے اپنی جیب خاص سے پانچ سو روپے دینے کی پیشکش کی تھی کہ "میں ایک فقیر ہوں، میرے پاس اتفاق سے اس وقت یہی رقم ہے۔ اگر یہ حقیری رقم تمہارے کسی کام آ سکے تو مجھے خوشی ہو گی۔" ظاہر ہے اقبال کے اس جذبہ ایثار کو دیکھ کر، نادر شاہ کا جی بھر آیا ہو گا اور ان کا دل رکھنے کے لئے کہا ہو گا کہ اس وقت آپ اس کو اپنے پاس ہی رکھئے، اشد ضرورت ہوئی تو میں خود طلب کر لوں گا۔"

بہر حال اصل کیا معاملہ رہا، وہ الگ بات لیکن علامہ کے نزدیک افغانستان کی آزادی اور سالمیت، مسلمانان ہند اور وسطی ایشیا کی بقا کے لئے نہایت ضروری تھی۔ آثار بتاتے ہیں کہ اس طرح کی بھی کوئی بات دونوں کے درمیان ضرور ہوئی ہو گی۔

اقبال نے کئی اور طریقوں سے برادر ملک کی امداد جاری رکھی۔ جلسے کئے، امدادی کیمپ لگائے۔ دراصل افغانستان انگریز استعمار سے جنگ میں اسے شکست دینے کے بعد معاشی اور اقتصادی طور پر جس بدحالی کا شکار تھا، اقبال اس کو شدت سے محسوس کر رہے تھے۔

☆☆

اینٹ کا جواب پتھر:

مسلم لیگ کا پہلے کی طرح ایک ہو جانا، مسلمانانِ ہند، خصوصاً اقبال کے لئے خوش آیند اقدام تھا۔ آپ کی نہ صرف شروع سے ہی خواہش رہی تھی کہ مسلمان ایک ہو کر اپنے مقصد کے لیے جدوجہد کریں بلکہ بار بار آپ اس بات کو دہراتے رہے تھے کہ مسلمانوں کی پریشانی کا باعث ان کا آپس کا انتشار و خلفشار ہے، لہٰذا مسلمان متحد ہو کر ہی اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کر سکتے ہیں۔

جیسا کہ ہمیں معلوم ہوا، جناب محمد علی جناح (قائداعظم) نے چودہ نکات دراصل، ہندو لیڈر جواہر لعل نہرو کی اس سیاسی چال کے جواب میں پیش کئے تھے، جو نہرو رپورٹ کے نام سے بدنام ہوئی، جس میں مسلمانوں کی بحیثیت قوم یکسر نفی کر دی گئی تھی۔ چنانچہ جناح صاحب (قائداعظم) کے چودہ نکات، اینٹ کا جواب پتھر کی طرح تھے جس کی ضرب سے ہندو نیتا بلبلا اٹھے اور مخالفت کا ایک نیا طوفان کھڑا کر دیا۔ اس واویلا کا سارا مقصد یہ تھا کہ آزادی ملتے ہی، یعنی انگریز کے جانے کے بعد، لالہ جی کا بلا شرکت غیرے ہندوستان کے سنگھاسن پر براجمان ہونا تھا، تاکہ مسلمان ان کے زیرِ تسلط ایک بے بس اقلیت بن کر رہنے پر مجبور ہو جائیں۔ رہے گورے بہادر تو ان کی حکومت کا استحکام ہی اس میں مضمر تھا کہ ان کے یہ کالے غلام آپس میں الجھے رہیں اور یہ بانسری بجاتے رہیں۔ یہ عیار شروع سے ہی لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی پر کاربند رہے تھے۔ چنانچہ ہندو مسلم تنازعات ان کے لئے بڑی تقویت کا باعث تھے۔ تاہم اس کھیل سے لاتعلق بھی

نہیں رہنا چاہتے تھے، کیونکہ اس طرح خود ان کے اقتدار کی رٹ کو صدمہ پہنچ سکتا تھا کہ ان کی رعایا کھلے عام سیاسی دنگل کرتی پھرے اور وہ کوئی ایکشن نہ لیں؟

ترقی یافتہ غلام:

ڈانٹ ڈپٹ کا زمانہ بھی گزر چکا تھا، اہل ہند اب اٹھارویں صدی سے نکل آئے تھے، غلام تو اب بھی تھے لیکن انیسویں صدی کے "ترقی یافتہ غلام" تھے، کسی قدر سیاسی شعور ان کے اندر پیدا ہو چلا تھا، اپنی غلامی اور انگریز کی جابرانہ پالیسیوں، عیاریوں، مکاریوں کو جاننے لگے تھے۔

گول میز کا ڈرامہ:

سات سمندر پار بیٹھا شیطانی ذہن دوربین لگائے ہندوستان کی بدلتی ہوئی صورت حال پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ جب بھی اس کی رعایا کے یہ دو فریق سیاسی تنازعات کا شکار ہوتے تو یہ انہیں بچوں کی طرح پچکار کے بہلانے اور سمجھانے لگتا۔ "ایسا کرو، ایسا نہ کرو۔" چنانچہ اس بار اس نے ہند کے دستوری مسئلہ اور اہل ہند کے مستقبل کے بارے میں غور وخوض اور بات چیت کے لئے فریقین کو لندن طلب کیا، اور گول میز کانفرنس کے نام پر ایک ڈرامہ پلے کرنے کا اعلان کر دیا۔

گوروں کا کالا ایجنٹ:

پس پردہ تیار کردہ اسکرپٹ میں جن لوگوں کو اداکاری کرنی تھی ان میں زیادہ تر اپنے ان زرخرید اور پٹھوؤں کو نامزد کیا گیا تھا جن سے وہ اپنے مفاد میں کام لیتا آ رہا تھا۔ مسلمانوں میں خصوصاً سر فضل حسین کا نام سرفہرست تھا جو جناح صاحب کا سیاسی حریف تھا، یہ اپنے آقا کے حکم اور ہدایت پر اپنی سرکاری حیثیت سے فائدہ اٹھا کر کانفرنس میں شرکت کے لیے اپنے ایسے مہروں کو مندوب نامزد کرانے کوشش میں لگ گیا جو کٹھ پتلی کی طرح ہوں، اور اوپر والوں کی ہاں میں ہاں ملانے کا فریضہ انجام دے سکیں۔ قومی معاملات کے لئے جس غیرت وحمیت کی ضرورت ہوتی ہے اسے وہ اپنے ضمیر کے ساتھ ہی دریا برد کر چکے ہوں۔ ظاہر ہے اقبال ایسا مرد مومن اس بے ضمیر معیار پر کہاں پورا اترتا تھا، لہٰذا آپ کو سرے سے نظر انداز کر دیا گیا۔

قائد کی جوہر شناسی:

مسٹر محمد علی جناح (قائد اعظم) نے سر فضل حسین کی شاطرانہ چال کو بھانپ لیا کہ انگریز کا یہ گماشتہ کیا چاہتا ہے، لہٰذا آپ نے اس کی سازش کو اس طرح ناکام بنایا کہ لکھنؤ میں مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت کے لئے ڈاکٹر اقبال کا نام تجویز کیا جو اتفاق رائے سے منظور کرلیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے بھی دعوت نامہ ملنے پر انکار نہیں کیا۔

اقبال مند اقبال:

علامہ صاحب کے لئے یہ وہ دور تھا کہ آپ ایک مفکر، دانشور اور شاعر اسلام کے ساتھ ساتھ ایک فعال سیاسی شخصیت بھی بن چکے تھے۔ آپ نے محسوس کرلیا تھا کہ مسلمان جو ایک مدت سے خواب غفلت میں پڑے ہوئے ہیں، اب آہستہ آہستہ آنکھیں کھول رہے ہیں۔ خصوصاً مسلم لیگ کے قیام کے بعد سے مسلمانانِ ہند کے جسد مردہ میں زندگی کے آثار نظر آگئے ہیں۔ آپ اپنی ولولہ انگیز شاعری اور فکر انگیز خطابات کے ذریعہ خواص و عوام، خصوصاً تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ میں نہ صرف احساس خودی و خودداری بلکہ ایک قومی سیاسی شعور اور حمیت ملی پیدا کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ جیسا کہ آپ نے "خود اعتراف" کرتے ہوئے فرمایا:

اک ولولہ تازہ دیا میں نے دلوں کو
لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند

میرِ کارواں جناح:

آپ واضح طور پر دیکھ رہے تھے کہ مسلم نشاۃ ثانیہ کے لئے راہ ہموار ہونے لگی ہے، اور یہ بھی نہایت خوش آئند اور اطمینان بخش بات تھی کہ خوش قسمتی سے مسلمانوں کو محمد علی جناح کی شکل میں ایک ایسا عظیم قائد میسر آ گیا تھا جس کی شخصیت اقبال کے اس شعر کی مکمل تشریح پیش کر رہی تھی۔

نگہ بلند، سخن دل نواز جاں پُر سوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے

مشیت ایزدی:

اس کے ساتھ ہی اقبال کی اپنی کرشماتی شخصیت، خود ان کے اپنے تصور مرد مومن کی تصویر بن کر عالم اسلام کو اپنے سحر میں لے چکی تھی۔ مغرب آپ کو ایک مفکر اور فلسفی کے طور پر دیکھ رہا تھا، اور مشرق میں آپ کے گوناگوں اوصاف میں سیاسی رنگ بھی نمایاں تھے۔ خصوصاً برصغیر میں سیاسی رہنماؤں کے درمیان آپ کی شخصیت نہایت ممتاز اور منفرد نظر آتی تھی۔ محمد علی جناح ایسے عظیم اور صاحب بصیرت رہنما بھی اپنی سیاسی جدوجہد کو موثر و فعال بنانے میں اقبال کے نظریات سے ہم آہنگ دکھائی دیتے تھے۔ قائد جناح صاحب کی اقبال شناسی کا یہ بین ثبوت ہے کہ آپ نے الٰہ آباد میں ہونے والے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی صدارت کے لئے ڈاکٹر اقبال کا نام تجویز کیا۔ جبکہ توقع کی جا رہی تھی کہ لندن کی مجوزہ گول میز کانفرنس میں ڈاکٹر اقبال کو ضرور مدعو کیا جائے گا، لیکن ایسا نہیں ہوا تو، جناح صاحب نے آپ کو لیگ کے سالانہ اجلاس کی صدارت کے لئے تجویز کر دیا۔ یہ مشیت ایزدی تھی کہ آپ لندن نہ جا سکے اور الٰہ آباد میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس آپ کی صدارت میں منعقد ہوا اور آپ نے اپنے صدارتی خطاب کے ذریعہ اس گھڑی کو تاریخی اور یادگار بنا دیا۔

تاریخ ساز خطبہ:

یہ ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کا وہی یادگار جلسہ ہے جس میں علامہ ڈاکٹر محمد اقبال نے وہ تاریخ ساز خطبہ ارشاد فرمایا جس میں نہ صرف آپ نے ہندوستان کو درپیش مسائل کا جائزہ لیا، بلکہ ہندو اور مسلم قومیت کا ایک مدلل اور عالمانہ تجزیہ کرنے کے بعد سرزمین ہند پر ایک آزاد اسلامی ریاست کے ممکنہ قیام کا تصور پیش کیا۔

دراصل یہ وقت کہ آپ مسلم لیگ کے جلسہ کی صدارت فرما رہے ہیں۔ ہندوستان میں سیاسی تاریخ کا اہم موڑ سمجھا جاتا ہے۔

سائمن کمیشن اپنی سفارشات مرتب کر کے حکومت کو دے چکا تھا۔ لندن میں پہلی گول میز کانفرنس ہونے جا رہی تھی۔ ہندوؤں کی مقتدر سیاسی جماعت کانگریس (گو، اس میں کچھ عاقبت

باانديش مسلمان بھی تھے، اور مولانا آزاد ایسے عقل وفہم کے بادشاہ بھی تھے) اپنے ایک لیڈر جواہر لعل نہرو کی عصبیت سے بھری مسلمان گریز "نہرو رپورٹ" منظور کر چکی تھی۔ اس کے برعکس مسلمانوں کی تمام جماعتوں نے "مسلم نیشنلسٹ پارٹی" کے سوا "نہرو رپورٹ" کو مسترد کر دیا تھا۔ اس صورت حال میں قدرت نے اقبال ایسے ہی صاحب بصیرت شخص کو مسلمانوں کی ترجمانی کے لئے منتخب کر رکھا تھا۔ چنانچہ آپ نے جو صدارتی خطبہ ارشاد فرمایا، اس پر تاریخ گواہ ہے کہ اس سے پہلے ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں اپنے حسن بیان، سلاست اور خیال آفرینی کے اعتبار سے کوئی تقریر سننے میں نہیں آئی تھی، یہ اپنے معنوی اور دلائل کے لحاظ سے بھی یہ ایک ایسا ناقابل تردید خطبہ ہے جس کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ حضرت علامہ نے اپنے اس تاریخی خطبہ میں جس نکتہ کو مرکز و بنیاد بنا کر پیش کیا، وہ برصغیر میں ایک منظم اسلامی ریاست کا تصور ہے کہ یہی خواب، بعد میں، پاکستان کی صورت تعبیر پذیر ہوا۔

آؤ نظارہ کریں:

خطبہ الٰہ آباد جس تاریخی اہمیت کا حامل ہے، اسی قدر اگر علامہ اقبال کی الٰہ آباد روانگی کا حال تفصیل سے معلوم نہ کیا جائے تو اقبال فہمی کے ساتھ انصاف نہ ہوگا۔ تو آیئے آپ کی الٰہ آباد روانگی کے منظر کو تازہ کرتے ہیں۔

عاشقانِ اقبال:

اس کی کیفیت یہ ہے کہ حضرت اقبال ۲۸ دسمبر ۱۹۳۰ء کو لاہور سے الٰہ آباد روانہ ہوئے۔ سر شیخ عبدالقادر اور ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی بھی آپ کے شریک سفر تھے۔ حضرت علامہ چونکہ جلسے جلوسوں میں ہونے والے شور و ہنگاموں سے پریشان خاطر ہو جاتے تھے اس لئے آپ کی کوشش ہوتی کہ ان سے دور ہی رہا جائے، چنانچہ الٰہ آباد کے دورے کے موقع پر بھی آپ نے منتظمین کو پہلے ہی اطلاع کرا دی تھی کہ میرے استقبال کے لئے اس طرح کا کوئی اہتمام نہ کیا جائے، لیکن اقبال کی محبت لوگوں کے دلوں میں عقیدت کا رنگ اختیار کر چکی تھی، وہ اپنے ممدوح کے کلام پہ جاں نثاری تو دکھا سکتے تھے، لیکن یہ بات ہرگز قبول نہیں تھی کہ اقبال کسی شہر میں آئیں اور اس شہر

کے اقبال پسند اور آپ سے عقیدت و محبت رکھنے والے آپ کے استقبال کو نہ نکلیں، وہ تو اپنے اس محبوب شاعر کی ایک جھلک دیکھنے کے جانے کب سے متمنی تھے، اور اب اگر انہیں موقع مل رہا ہے تو کیونکر وہ اپنے شوق کو تشنہ رکھ سکتے ہیں۔ چنانچہ یہ خبر ملتے ہی کہ حضرت علامہ اقبال الٰہ آباد تشریف لا رہے ہیں، عاشقوں کا ایک جم غفیر استقبال کے لئے ریلوے اسٹیشن پہنچ گیا۔ لوگ والہانہ انداز میں آپ کی ایک جھلک دیکھنے گاڑی کی طرف ٹوٹ پڑے، یہاں تک کہ استقبالیہ رضا کاروں کو بھی نظم وضبط برقرار رکھنا دشوار ہو گیا۔

الٰہ آباد یونیورسٹی کے مسلم طلبا ایک خیر مقدمی نظم گا رہے تھے اور اسلامیہ اسکول کے بچے "علی" ترانہ پڑھنا چاہتے تھے لیکن لوگوں کے جوش وخروش اور اس "ہنگامی صورت حال" میں ان ...ں کو موقع نہیں مل رہا تھا۔ جذباتی ہجوم اس قدر بے قابو ہو گیا کہ دھکم پیل میں دو طلباء کے بازو ٹوٹ گئے۔

مردانِ حُر:

لیکن دوسری طرف الٰہ آباد کی قصاب برادری کے افراد پُر جوش ہونے کے باوجود نہایت منظم انداز میں شاعر اسلام کے استقبال میں شریک تھے۔ ان کا انداز یہ تھا کہ وہ اپنی روایتی شان کے مطابق بڑی بڑی لاٹھیاں لئے، دستے کی صورت میں، قدم بڑھاتے اور وقفہ وقفہ سے سب مل کر نعرہ تکبیر بلند کرتے اور اس زور سے زمین پر لاٹھی مارتے کہ آوازیں سن کر لوگ سہم جاتے، بلکہ کئی لوگ جنہیں علم نہ تھا کہ یہ آوازیں اور شور کیسا ہے وہ خوفزدہ سے ہو کر ادھر ادھر بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس وقت ریل گاڑی کی چھت پر بیٹھا ہوا ایک نوجوان جو دوربین آنکھوں سے لگائے، ان سارے مناظر کا حال بیان کر رہا تھا، بلند آواز میں بولا:

"حضرات اس وقت شاعر اعظم مسکرا رہے ہیں۔" لوگوں کے چہروں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اللہ اللہ کیا جوش، کیا محبت اور کیا جذبۂ حریت تھا ان لوگوں میں جنہوں نے صدیوں کی غلامی سے گردنیں چھڑانے کے لئے یہ بے مثال جدوجہد کی، لیکن، یہ جوش وجذبہ ایسے ہی نہیں پیدا ہو گیا تھا یہ بیداری اور انقلاب اسی مرد مجاہد کا پیدا کردہ تھا اسی نے مُردوں میں جان ڈال دی تھی۔

بجا ہے، بجا ہے، اے شاعرِ اسلام، آپ کا یہ ارشاد بجا ہے:

مری نوا سے ہوئے زندہ عارف و عامی
دیا ہے میں نے انہیں ذوقِ آتش آشامی

ستاروں کا جھرمٹ:

الٰہ آباد میں آپ کا قیام نواب سر محمد یعقوب کے ہاں قرار پایا۔ اجلاس ۲۹ دسمبر کو صبح گیارہ بجے کے قریب شروع ہونے والا تھا۔ اس وقت تک ملک بھر سے مسلم لیگی زعماء بھی پہنچ چکے تھے، ان میں سندھ سے مولانا عبدالمجید سندھی، کراچی سے سیٹھ عبداللہ ہارون، میرٹھ یو پی سے نواب محمد اسماعیل اور بدایوں سے مولانا عبدالحامد تشریف لائے تھے۔ استقبالیہ کلمات محمد حسین صاحب نے ادا کئے اور اس کے بعد ہی علامہ محمد اقبال نے انگریزی میں خطبہ ارشاد فرمایا۔ خطبہ کی مطبوعہ کاپیاں پہلے ہی سامعین میں تقسیم کر دی گئی تھیں۔

بانگ بلند:

آپ نے خطبہ کے شروع میں مسلم لیگ کے سامنے وہ بصیرت افروز لائحہ عمل رکھا جس کو اپنانا قوم کے لئے ناگزیر تھا۔ ایک تفصیلی تمہید کے بعد فرمایا:

"مجھے امید ہے کہ آپ حضرات اس خاص عملی بحث کے لئے مجھے معاف فرمائیں گے، لیکن آپ نے آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کے لئے ایسے شخص کو منتخب کیا ہے جو اس امر سے مایوس نہیں کہ اسلام اب بھی ایک زندہ قوت ہے جو ذہن انسانی کو نسل و وطن کی قیود سے آزاد کر سکتی ہے۔ اور جس کا یہ عقیدہ ہے کہ مذہب کو فرد اور ریاست دونوں کی زندگی میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے، اور جسے یقین ہے کہ اسلام کی تقدیر خود اس کے ہاتھ میں ہے، اسے کسی دوسری تقدیر کے حوالے نہیں کیا جا سکتا۔"

ضربِ حق:

اس کے بعد آپ کی گفتگو میں اب وہ اہم نکتہ زیر بحث آتا ہے جو دو قومی نظریہ کی بنیاد بنا۔ آپ نے غیر مبہم اور واضح طور پر فرمایا۔

''مغربی ممالک کی طرح ہندوستان کی یہ حالت نہیں کہ اس میں ایک ہی قوم آباد ہو، وہ ایک ہی نسل سے تعلق رکھتی ہو، اور اس کی زبان بھی ایک ہی ہو۔ ہندوستان مختلف اقوام کا وطن ہے۔ جن کی نسل، زبان، مذہب، سب ایک دوسرے سے الگ ہے۔ ان کے اعمال و افعال میں وہ احساس پیدا ہی نہیں ہو سکتا جو ایک ہی نسل کے مختلف افراد میں موجود رہتا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو ہندو بھی تو کوئی واحد الجنس قوم نہیں، پس یہ امر کسی بھی طرح مناسب نہیں کہ مختلف ملتوں کے وجود کا خیال کئے بغیر، ہندوستان میں مغربی طرز کی جمہوریت کا نفاذ کیا جائے، لہٰذا مسلمانوں کا مطالبہ ہے کہ ہندوستان میں ایک، اسلامی ہندوستان قائم کیا جائے، جو بالکل حق بجانب ہے، اور میری رائے میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی قراردادوں سے اسی بلند نصب العین کا اظہار ہوتا ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ مختلف ملتوں کے وجود کو فنا کئے بغیر، ان سے ایک متوافق اور ہم آہنگ قوم تیار کی جائے تاکہ وہ آسانی کے ساتھ اپنے ان ممکنات کو جوان کے اندر مضمر رہیں، عمل میں لاسکیں۔''

علامہ صاحب کا حقیقت افروز بیان اب اس نکتہ خاص کی طرف مرکوز ہوتا ہے جہاں ہمیں پاکستان طلوع ہوتا نظر آتا ہے۔ آپ نے فرمایا:

نقشہ گری:

ذاتی طور پر تو میری خواہش ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ایک ہی ریاست میں ملا دیا جائے، خواہ یہ ریاست، سلطنت برطانیہ کے اندر حکومت خود اختیاری حاصل کرے، خواہ اس کے باہر، مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ اور نہیں تو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو آخر ایک منظم اسلامی ریاست قائم کرنی پڑے گی۔ ہندوستان دنیا میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے، اور اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے زندہ رہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک مخصوص علاقہ میں اپنی مرکزیت قائم کرے۔''

اس جگہ خصوصیت کے ساتھ یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ علامہ اقبال نے مسلمانوں کے لئے محض ایک الگ ریاست کا تصور پیش نہیں کیا بلکہ ایک اسلامی ریاست کے قیام پر زور دیا ہے۔

پ نے فرمایا:

عکسِ مدینہ:

''میں صرف ہندوستان اور اسلام کی فلاح و بہبود کے خیال سے ایک منظم اسلامی ریاست کا مطالبہ کر رہا ہوں، اس سے ہندوستان کے اندر توازن قوت کی بدولت امن قائم ہو جائے گا اور اسلام کو اس امر کا موقع ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی شہنشاہیت کی وجہ سے اب تک اس پر قائم ہیں، اس جمود کو توڑ ڈالے جو اس کی تہذیب و تمدن، شریعت و تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے، اس سے نہ صرف ان کے صحیح معانی کی تجدید ہو سکے گی بلکہ وہ زمانہ حال کی روح سے بھی قریب تر ہو جائیں گے۔''

خواہش نامبارک:

اس جگہ ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ آج پاکستان میں کچھ نام نہاد دانشور اور ''نامبارک'' قسم کے مورخین، پاکستان اور بانی پاکستان کے حوالے سے ''سیکولرازم'' کی باتیں کرتے رہتے ہیں تو یا تو وہ ان حقائق سے ناواقف ہیں، یا پھر پردہ پاک میں یہ وہ ناپاک عناصر ہیں جو نئی نسل میں ''کنفیوژن'' پھیلانے کے اس ''ٹاسک'' کو پورا کرنے کی مذموم کوشش کرتے رہتے ہیں جو کوئی دشمن دین و وطن ہی انہیں سونپ سکتا ہے۔''

☆

تصور کامل:

اس جگہ ہم ضروری خیال کرتے ہیں کہ خطبہ الٰہ آباد کا مکمل متن پیش کر دیا جائے تا کہ پاکستان کی نئی نسل واضح طور پر علامہ اقبال کے اس ''ویژن'' اور خواب سے آگاہ ہو سکے جو قیام پاکستان کی بنیاد بنا۔

میں نے قارئین کے مطالعہ کی روانی کو برقرار رکھنے اور اس خیال کے پیش نظر کہ طوالت ان کے ذوق مطالعہ پر گراں نہ گزرے پورا خطبہ، کتاب کے آخر میں دینا چاہا تھا۔ تا کہ تازہ دم ہو کر ایک ہی نشست میں اس تاریخی خطبہ کا مطالعہ کریں اور اس روح کو محسوس کریں جو پاکستان کے قیام کا سبب بنی۔ لیکن جہاں اسے آنا چاہیے وہیں دیا ہے کہ ہم نے اگر اپنے وطن کے قیام کے لیے

عملاً حصہ نہیں لیا، جیسا کہ بانیانِ پاکستان نے ہزاروں جانوں کی قربانی دے کر ہمیں یہ خوبصورت وطن عطا کر دیا ہے تو کم سے کم اتنی زحمت تو اٹھا لیں کہ اس تحریک کی جھلکیاں ہی پڑھنا گوارا کر لیں۔

"علامہ اقبال کا خطبہ الٰہ آباد"

۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس الٰہ آباد میں ہوا۔ ڈاکٹر محمد اقبال نے اپنے صدارتی خطبے میں درج ذیل خیالات کا اظہار فرمایا:

"اس حقیقت سے انکار کیسے ہو کہ ایک اخلاقی نصب العین اور نظامِ سیاست کے اعتبار سے اسلام ہی کے باعث ہندوستان کے مسلمانوں کی زندگی کی تاریخ ایک مخصوص سانچے میں ڈھلی۔ نظامِ سیاست سے میری مراد وہ جماعت ہے، جس کا نظم و ضبط ایک نظامِ قانون کے تحت قائم ہوتا ہے اور اس کے اندر ایک اخلاقی روح کارفرما ہوتی ہے۔ یہ اسلام ہی تھا جس کے باعث ہندوستانی مسلمانوں کے سینوں میں وہ روح پیدا ہوئی جس روح پر جماعتوں کی زندگی منحصر ہوتی ہے۔ اس روح کی بیداری کے باعث بکھرے ہوئے افراد تسبیح کے دانوں کی طرح ایک لڑی بن جاتے ہیں اور پھر جب یہ منتشر افراد ایک قوم کی صورت اختیار کر جاتے ہیں تو وہ ایک مخصوص اخلاقی نظام، اخلاقی شعور کو ہمراہ لیکر چلتے ہیں۔ اگر میں مبالغہ آمیزی سے کام نہیں لے رہا تو یہ کہوں گا کہ شاید اس خطہ ارضی میں صرف ہندوستان ہی وہ ملک ہے، جس میں اسلامی وحدت کی بے پناہ طاقت ایک نمونہ بن کر سامنے آئی ہے۔ جمعیت اسلام کی ترکیب اسی اسلام کی روح کا نتیجہ ہے۔ اس لئے ہمارے تمدن، اسلامی تمدن، وہی مخصوص اخلاقی شعور اور روح موجود ہے، جس کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں۔ اس وقت افکارِ مغرب تمام دنیائے اسلام، بشمول ہندوستان پر چھائے ہوئے ہیں۔ یہ ایک انقلابی کیفیت ہے۔ اور ہماری نوجوان نسل ان افکارِ سیاسی کی طرف پوری دلچسپی کے ساتھ کھنچی چلی جارہی ہے۔ لیکن ان نوجوانوں نے اس کے پس منظر پر غور کرنے کی سعی کبھی نہیں کی۔ انہوں نے اس بات کو فراموش کر دیا کہ آخر ان افکار کے مغرب میں پروان چڑھنے کی وجوہات کیا تھیں؟ نوجوان نسل نے اس حقیقت کو بالائے طاق رکھ دیا کہ مغرب میں مسیحیت محض ایک رہبانی

نظام کے وجود کا نام تھا، پھر کلیسائی حکومتوں کا قیام عمل میں آیا۔ یہی وہ کلیسائی حکومت تھی، جس کے خلاف لوتھر نے احتجاج کیا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ لوتھر کا یہ احتجاج بالکل درست تھا۔ ممکن ہے اس وقت لوتھر کو بھی اس بات کا احساس نہ ہوا ہو کہ اس نے جن حالات میں اپنی تحریک کا آغاز کیا ہے، وہ تحریک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عالمی نظام اخلاق نہیں بلکہ مغرب کے لاتعداد اخلاقی نظاموں پر منتج ہوگا۔ ہر اخلاقی نظام ایک مخصوص قوم سے متعلق ہوگا۔ اس طرح مختلف محدود دائرے پیدا ہو جائیں گے۔ کیا اسی لئے لوتھر اور روسو کی تحاریک نے عیسائیت کی دنیا کی وحدت کو پارہ پارہ کر کے تقسیم در تقسیم پر نہیں پہنچایا۔ اسی لئے نوع انسانی کے مجموعی مرکز سے مغرب کی نظریں پلٹ گئیں اور مختلف اقوام کے تنگ بھنور میں پھنس کر رہ گئیں۔ لوتھر اور روسو نے انہیں جو تخیل حیات دینا چاہا تھا مغرب اس سے الگ ہو کر ایک مادی احساس وطنیت کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ اس وطنیت کے احساس کی نشو ونما ہوئی تو مختلف سیاسی نظام سامنے آئے یہ سب قومی جذبات کی گود میں پروان چڑھے اور یہ عقیدہ راسخ ہو گیا کہ اتحاد سیاسی، وطنیت کے عقیدے کی اساس پر ہی ممکن ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اگر مذہب کا تصور یہ ہے تو وہ اس دنیا کے لئے نہیں بلکہ آخرت کیلئے ہے۔ مسیحی دنیا میں انقلاب ایک قدرتی بات تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جو عالمگیر نظام اخلاق تھا، اب اس کا وجود نہیں۔ اب جو بھی نظام ہے وہ یا تو اخلاقی اساس پر ہے یا سیاسی اساس پر، اور ہر نظام ایک "قومی نظام" ہے لہٰذا اگر مغرب کے لوگ مذہب کو فرد کی ذات تک محدود کر دیں اور فرد کی دنیاوی زندگی کو مذہب سے الگ کر دیں تو اور بات ہے لیکن اسلام ایک فرد کو ایک وحدت قرار دیتا ہے۔ اسلام روح اور مادہ کو یکجا کرتا ہے۔ اسلام کی روح کے تحت تو خدا کی ذات اور پوری کائنات، ریاست ہے اور کلیسا اور مادہ روح ایک چیز کے اجزائے ترکیبی ہیں۔

اسلام کے تحت انسان کسی الگ تھلگ اور غیر پاکیزہ دنیا کا باشندہ نہیں۔ اسلام اس دنیا سے علیحدگی کا سبق بھی نہیں دیتا۔ اسلام تو مادہ کو بھی روح کی ایک شکل قرار دیتا ہے۔

روح جس کا اظہار مکان وزماں کی قید میں ہوتا ہے مگر مغرب نے ان دونوں میں حد فاصل قائم کر دی ہے۔ مگر آج پھر مغرب کا مفکر اس دنیاوی غلطی پر ماتم کناں ہے لیکن وہ مجبور ہے کہ سیاست دان اس اصول سے چمٹے ہوئے ہیں۔ یہ سب نتائج روحانی اور دنیاوی زندگی کے درمیان

حد فاصل قائم کرنے کی وجہ سے برآمد ہو رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ کی ریاست تو مسیحی ہے مگر عملی طور پر وہ مذہب کو خیر باد کہہ چکی ہے۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ تھا کہ چند بے ربط ریاستوں کا قیام عمل میں آتا، سو آیا۔ اب ان بے ربط ریاستوں میں کیا ہے۔ وہاں قومی جذبہ موجود اور انسانی جذبہ ندارد ہے۔ چنانچہ اگر آج یہی ریاستیں چاہتی ہیں کہ یورپ متحد ہو جائے تو یہ ایک ناممکن سی بات ہوگی۔

جب مذہبی عقائد اور اخلاقی اقدار کی بنیاد ہی نہیں تو اتحاد کس اساس پر قائم ہوگا؟ قومی اساس پر......؟ یعنی اب مغرب کے لوگ اپنے ہی ہاتھوں تباہ کردہ عمارت کی تعمیرِ نو کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ یہ عمارت انہیں کلیسا نے دی تھی۔ مگر مغرب نے اس کی تعمیر ایک عالمی تصور، یعنی اخوتِ انسانی کی بنیاد پر کرنے کی جگہ لوتھر کے فلسفے کی بنیاد پر کی۔

بہرکیف عالمِ اسلام میں کوئی لوتھر پیدا نہیں ہوگا کیونکہ اسلام میں کلیساء کی طرح کوئی نظام نہیں جو از منہ وسطیٰ کے مسیحی نظام کی طرح ہو۔ اسلام کا نظامِ سیاست عالمگیر ہے۔ اس کی بنیاد وہی ہے، ضرورت صرف اتنی ہے کہ ہم اس عمارت کی تعمیر کریں۔

ہمارے فقیہ عملی زندگی سے دور ہیں، نئے دور کے تقاضوں سے بیگانہ ہیں۔ یہ کام ہمیں خود کرنا ہے تاکہ ہم ایک مضبوط اور خوبصورت عمارت تعمیر کر سکیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اس وقت نوجوان نسل مغرب کے نظریہ قومیت کو جس تیزی کے ساتھ ذہنوں میں جگہ دے رہی ہے اس کا انجام آخر کیا ہو؟ ہمارے سامنے دو چیزیں ہیں۔ اول تو یہ کہ فکرِ مغرب یعنی قومیت کا تصور خود اسلام میں جذب ہو کر نئی صورت اختیار کرے گا، جیسے قبل ازیں مختلف النوع تصورات اسلام میں جذب ہو گئے اور ان کی ہیئت بدل گئی یا اسلام میں کوئی تبدیلی آجائے گی۔ چند روز کی بات ہے ہالینڈ کے پروفیسر ونسنک نے ایک خط میں مجھے لکھا کہ اسلام آج اس نازک موڑ پر ہے جہاں مسیحیت سو سال پہلے موجود تھی۔ لیکن سو سال سے زائد گزر جانے کے بعد بھی یہ کہنا ممکن نہیں ہے کہ مسیحیت آخر کیا رخ اختیار کرے گی۔ اسلام تو ابھی اس نازک موڑ پر پہنچا ہے، لہٰذا اس کے بارے میں کچھ کیسے کہا جا سکتا ہے۔ مسلمان بھی قوم اور نسل، وطن اور خون کے تصورات میں الجھے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زندگی سے عمل کا تعلق ختم ہوتا جا رہا

ہے۔ اگر ایسا ہوتا رہا تو شاید اسلام کی صورت ہی بدل جائے۔"

خطبہ الہ آباد نے فرقہ پرست اور متعصب ہندوؤں میں جیسے آگ لگا دی، یہ گروہ ایک مدت سے مسلمانوں کے خلاف نفرت کا زہر چھپائے بیٹھا تھا، اقبال کا اصولی موقف سن کر انہیں اٹھیاں لگ گئیں، دل میں چھپا ہوا زہریلا مواد منہ سے نکلنے لگا۔ ہندی، اردو اور انگریزی تمام اخبارات میں علامہ کے خلاف، دریدہ دہنی، ہرزہ سرائی پر اتر آئے ایسے ایسے بے ہودہ، گندے اور غلیظ الفاظ آپ کے لئے استعمال کئے گئے جو ہنومان پرستوں کی کمینگی کا اشتہار بن گئے۔ ہندو اخبار "پرتاپ" نے اپنے مضمون میں لکھا: "شمالی ہند کا ایک خوفناک مسلمان۔"

حیوان کی پوجا کرنے والے کو کیا پتا تھا کہ انسان کیا ہوتا ہے اور مسلمان کی شان کیا ہے، مسلمان خوفناک نہیں، خوف دور کرنے کا داعی ہے، مسلم ہے سر تسلیم خم کرنے والا ہے، اسلام یعنی سلامتی کے دین کا پیروکار ہے، اس کی ذات تو امن کا روشن چراغ ہے۔

☆

یہ تو اندرون ملک کی بات ہے، ملک سے باہر، پڑوسی ملک سے بھی نظریہ پاکستان پر الٹے سیدھے بلکہ جاہلانہ تبصرے سننے میں آتے ہیں، مثلاً ابھی حال ہی میں ہندوستان کے ایک ڈاکٹر نے جو خود کو مسلمان کہتا ہے لیکن گنگا جمنا کا نمک حلال کرنے کی غرض سے ایک کتاب لکھ ڈالی ہے، "اقبال اور خطبہ الہ آباد" جس میں وہ ذہنی بدہضمی کا شکار نظر آتا ہے۔ لکھتا ہے کہ "اقبال نے خطبہ الہ آباد میں پاکستان کا کوئی خواب وواب نہیں دیکھا، یہ فقط پاکستانیوں کی ذہنی اختراع ہے۔"

ظاہر ہے اس کی بابری مسجد کے قاتلوں سے کوئی غرض وابستہ ہوگی سو اضطراری حالت میں اس نے حرام کھانے کو بھی حلال جان لیا، لیکن اس کو کوئی کیا کرے کہ یہی دریدہ دہن یہاں پاکستان آتا ہے اور جو لوگ "اردو کی انجمن" سجائے بیٹھے ہیں، وہ اس کے اعزاز میں استقبالیہ دیتے ہیں، اسے گلے لگاتے ہیں گویا اس پر یہ ثابت کرتے ہیں کہ "تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔" نہ جانے کونسی لغت ان کے زیر مطالعہ ہے جس میں شرم، غیرت، حمیت اور ضمیر کے الفاظ شامل ہونے سے رہ گئے ہیں، یا جان بوجھ کر نکال دیئے گئے ہیں۔

اقبال کا ترانہ:

اقبال کی دور رس نظریں دیکھ رہی تھیں کہ مسلمان اور ہندو اب زیادہ دیر تک ساتھ نہیں رہ سکیں گے۔ ہندی مسلمانوں کو ایک الگ قوم کی حیثیت سے اپنا الگ آشیانہ بنانا ہوگا، اس بصیرت کا اندازہ آپ کی اس نظم سے لگایا جاسکتا ہے جو آپ نے "ہندی ترانہ":

"سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا"

کے بعد تحریر فرمائی، آپ کو واضح طور پر احساس ہو گیا تھا کہ وہ ہندوستان ہمارا نہیں ہوسکتا جس میں ہمارے وجود ہی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا گیا ہے۔ بحیثیت قوم ہماری نفی کی جارہی ہے، چنانچہ اپنے اس وجدانی احساس کا اظہار آپ نے اس دوسری نظم "ملی ترانہ" میں کیا جو آپ کے نظریہ قومیت میں تبدیلی کا واضح ثبوت ہے، بلکہ اگر غور کریں تو مذکورہ نظم "ملی ترانہ" میں آپ کا ویژن وسیع تر ہوتا نظر آتا ہے۔ آپ، مسلم کو کسی ایک خطہ اور جغرافیائی حدود میں محدود و مقید نہیں سمجھتے، بلکہ باآواز بلند اور کشادہ دلی سے کہتے ہیں:

"چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا"

اس منظومے سے جو انداز بیان کی سادگی کے اعتبار سے نہایت عوامی ہے، سرسری نہیں گزرنا چاہئے، بلکہ اس سادگی میں شاعر کی پرکاری کا اندازہ لگانے کے لئے بہت ٹھہر کر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اندازہ ہوگا کہ اقبال سر کے بال سے لے کر پاؤں کے ناخن تک سراپا "مسلم" کی تصویر بے نغمہ خوانی کرتے نظر آرہے ہیں: "مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا"۔

محسوس ہوتا ہے، شاعر اسلام کسی ناقہ سوار کی صورت، کائنات کی وسعتوں میں سفر کرتے ہوئے حدی خوانی کر رہا ہے۔

"توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے
آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا"

وہ عناصر جو ہندوستان میں مسلمانوں کے تشخص کو تسلیم نہ کر کے ان کی وجودی حیثیت کو ہی محو کرنا چاہتے تھے، اقبال ان کے سامنے سینہ سپر ہو کر کہہ رہے ہیں۔ ''ہم ایک خدا کو ماننے والے ہیں، ہم فرزندانِ توحید ہیں، اور اللہ کے شیروں کو یوں زیرِ دام کرنا آسان نہیں ہے۔''

آپ اپنے قومی تشخص کا مزید تعارف کراتے ہیں۔

''دنیا کے بت کدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا
ہم اس کے پاسباں ہیں، وہ پاسباں ہمارا''

شاعر اسلام صرف اپنے دفاع پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ اپنے حریفوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انہیں خبردار کرتے ہیں کہ ہم امن والے گھر کے پاسدار ہیں، اور ہمارا نگہدار بھی وہی بلد الامین ہے، لیکن کوئی ہمیں للکارتا اور مبارزت کے لئے پکارتا ہے تو ہم بزدلوں کی طرح اپنے گلے دشمن کی تلواروں پر نہیں رکھ دیتے بلکہ ہم اینٹ کا جواب اینٹ سے دینے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ ہماری تاریخ ہے کہ ہماری زندگیاں خدا کے باغیوں سے لڑتے، تلواروں کے سائے میں گزری ہیں۔ تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا۔

اقبال، اس قوم کے سامنے جس کے سامنے دھرم میں ہندوستان کی دھرتی سے باہر قدم رکھنا پاپ سمجھا جاتا تھا، اپنی تاریخ کے فاتحانہ کارنامے دہراتے ہوئے کہتے ہیں۔

''مشرق ہی نہیں، مغرب میں بھی ہم فتح کے پرچم اڑاتے داخل ہوئے تھے، اور یہ بھی ہماری پہچان ہے کہ ہماری اس پیش قدمی کا مقصد کوئی غارت گری یا جابرانہ تشدد نہیں تھا، بلکہ جہاں بھی گئے فاتحانہ پرچم لہراتے ہوئے ہی نہیں امن کا نغمہ بھی گاتے اور آوازِ حق بلند کرتے ہوئے گئے۔''

''مغرب کی وادیوں میں گونجی اذاں ہماری
تھمتا نہ تھا کسی سے سیلِ رواں ہمارا''

ایک بار پھر اسلام کے حریفوں کو متنبہ کر رہے ہیں:

''باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم
سو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا''

"ہمارے لئے یہ نئی بات نہیں کہ جب بھی باطل نے ہماری غیرت ایمانی کو للکارا اور نعرہ حق کو دبانے کی کوشش کی، ہم نے پوری قوت کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا اور اس کے عزائم کو پاش پاش کر کے رکھ دیا۔"

نظم کے اس حصے میں آ کر اقبال تاریخ کی شاہراہ پر دور تک نکل جاتے ہیں۔ اس خطے میں پہنچ جاتے ہیں۔ جہاں مسلمانوں نے تاریخ عالم کا زریں ترین دور حکومت گزارا، جہاں آج بھی مسلم اقتدار کے آثار دیکھنے والوں کو ورطہ حیرت میں ڈال دیتے ہیں، جہاں دنیا کی عظیم ترین مسجد، مسجد قرطبہ، اپنی طرز تعمیر سے دیکھنے والوں کو متحیر کر کے رکھ دیتی ہے اور جہاں الحمرا کے محلات اپنے شاندار ماضی کی داستان بیان کرتے سنائی دیتے ہیں۔

"اے گلستان اندلس، وہ دن ہیں یاد تجھ کو
تھا تیری ڈالیوں میں جب آشیاں ہمارا"

تاریخ کے اوراق الٹتے ہوئے، اقبال، اندلس کے بعد بغداد کا رخ کرتے ہیں اور دریائے دجلہ کو مخاطب کر کے اپنی عظمت رفتہ کی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"اے موج دجلہ تو بھی پہچانتی ہے ہم کو
اب تک ہے تیرا دریا افسانہ خواں ہمارا"

اقبال کا خطاب بپھرے ہوئے دریا کی طرح رواں تھا کہ یکا یک لہجہ دھیما ہو جاتا ہے اور وہ سراپا ادب بن کر اپنا رخ زمین حرم کی طرف کر دیتے ہیں۔

"اے ارض پاک تیری حرمت پہ کٹ مرے ہم
ہے خوں تری رگوں میں اب تک رواں ہمارا"

اپنی تاریخ کے اوراق زریں، دنیا کو دکھانے کے بعد اقبال اپنی قوم کے خصوصی تشخص اور اس نسبت کا ذکر کرتے ہیں جس کے دم سے اس قوم کا دم ہے، یہی نسبت اس کا فخر اور یہی اس کا امتیاز اور عظیم شناخت ہے، کہتے ہیں۔ "میری قوم کوئی عام اور معمولی قوم نہیں، یہ وہ ملت اور جیش رواں ہے جس کا میر کارواں وہ سالار اعظم ہے جس کی عظمت کا ایک زمانہ مداح و معترف ہے۔"

"سالار کارواں ہے میر حجاز اپنا
اس نام سے ہے باقی آرام جاں ہمارا"

شاعر اسلام آخر میں اپنی ملت کو ہوشیار، خبردار کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"میری صدا نے پیر و جواں میں وہ روح پھونک دی ہے کہ اب غفلت میں پڑے رہنا ان کے لیے ممکن نہیں رہا ہے۔ اے میری قوم کے لوگو! اٹھو! آگے بڑھو! اور اس منزل کو چھو لو جہاں سے بھٹک کر تم کسی اور طرف نکل گئے تھے۔ اسی کجروی نے تمہیں غلامی کی لعنت میں گرفتار کرادیا۔"

"اقبال کا ترانہ بانگ درا ہے گویا
ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا"

فیض کلام الٰہ:

یہ ہے اس شاعر اسلام کی آواز جو ہم نے سنی اور جس کی بازگشت آج بھی ہمارے ذہن و دل میں محسوس ہوتی رہتی ہے۔ لیکن غور طلب یہ ہے کہ اس آواز کو "بانگ درا" کس چیز نے بنادیا؟ تو اس جواب کے لئے ہمیں پھر گردش ایام کو پیچھے کی طرف لوٹنا ہوگا۔ اسی منظر کو تازہ کرنا ہوگا کہ کس طرح اقبال اپنی دور معصومیت میں کلام الٰہی کی تلاوت میں مصروف ہیں کہ والد بزرگوار اپنے لائق و ہونہار فرزند کو اس راز سے آگاہ کرتے ہیں۔ "قرآن حکیم کی تلاوت اس طرح کرو جیسے یہ آج ہی اور ایسے نازل ہو رہا ہے جیسا کہ رسول اللہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر پر نازل ہوا تھا۔"

بس یہی وہ نکتہ ہدایت تھا جس نے اقبال کو اقبال بنادیا۔ اپنے تمام فکر و نظر کا مرکزی نکتہ کلام الٰہی کے اسی انداز فہم قرآن کو بنالیا۔ پھر جب وہ فکر و تصور کے ارتقا کو چھونے لگے تو والد گرامی کے اس گوہر تابناک کی تابناکیوں کو دوسروں میں اس طرح بانٹا کہ قدم قدم رازہائے دروں پر سے حجاب اٹھاتے چلے گئے۔ کھل کر کہہ دیا:

"ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف"

اُٹھ گیا سائبان:

علامہ ڈاکٹر محمد اقبال کے والد بزرگوار کی یاد اس وقت ہمیں بہت ہی اہم حوالے سے آتی ہے، یہ ۱۹۳۰ء کا زمانہ ہے، کہ شیخ نور محمد عرف تھو، المعروف ''ان پڑھ'' فلسفی، سو سال سے زیادہ کی مدت گزار کر دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اقبال کے لئے والدہ کے بعد یہ دوسرا بڑا صدمہ ہے، بلکہ یوں تو سیانی سوانی بیٹی اور نہایت وفادار اور صابرہ شریک حیات بھی دیکھتے دیکھتے اس دنیا سے کوچ کر چکی ہیں، ماں کی جدائی سے تو آپ کا دنیا سے جی اٹھ گیا تھا، کافی دنوں تک خانہ نشیں ہو کر رہ گئے تھے، دنیا کی بے ثباتی نے آپ کو بہت سی مصروفیات سے روک دیا تھا۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ سنبھلے اور ہوش وحواس بحال ہوئے، اب اس برس چھتنار درخت کا سایہ بھی آپ کے سر سے اٹھ گیا جو آپ کی پہلی درس گاہ تھی، جس نے اقبال کو الکتاب سے صحیح معنوں میں روشناس کرایا تھا۔ لیکن لگتا ہے اب وہ یونیورسٹی اپنا نصاب مکمل کرا چکی تھی تو قدرت نے اس کا باب بند کر دیا۔ اب'' ان پڑھ'' فلسفی کے پڑھے لکھے فلسفی بیٹے کی ذات میں ہزار ہزار جامعات کے ان گنت اور روشن باب مکمل چکے ہیں۔ شیخ نور محمد کا فرزند دل بند، شاعر اسلام اقبال کا نام بے شمار ذہنوں کی لوحوں پر لکھا جا چکا ہے، اور کلام اقبال لاتعداد دلوں پر دستک دے رہا ہے۔

عجیب اتفاق ہے کہ اقبال کو اکثر غم اور خوشی ایک ساتھ پیش آئے، والد بزرگوار کے چند ماہ بعد ہی سردار بیگم سے آپ کی دوسری اولاد ہوئی، جو بیٹی کی صورت میں منیرہ کہلائی۔

موت وحیات کیا ہے؟:

نہ زندگی نئی چیز ہے اور نہ موت۔ ازل سے سلسلہ جاری ہے اور تا ابد یونہی چلتا رہے گا۔ اقبال زندگی اور موت کے متعلق کیا نظریہ رکھتے ہیں، یعنی اقبال کا فلسفہ حیات وموت کیا ہے؟ تو ہم یہ جاننے سے قبل اس بات کو واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ آدمی کون ہوتا ہے حیات موت کا فلسفہ ایجاد کرنے والا! بلکہ اقبال کے لئے تو یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ آپ کی فکر ''اپنی'' اور آپ کی فکر کا نتیجہ کوئی آپ کا ''اپنا'' ہوگا۔ بلکہ جو افکار بھی آپ کے ہیں وہ قرآن حکیم سے اخذ کردہ ہیں، اس سے ہٹ کر نہ آپ سوچ سکتے ہیں اور نہ ہی وہ کسی کے لئے قابل قبول ہو سکتے ہیں، اس لئے کہ

فلسفہ، انسانی سوچ کا نتیجہ ہے، اور انسان کا ذہن غلط بھی سوچ سکتا ہے اور اکثر ہی غلط سوچتا ہے۔ یعنی انسانی فکر کا پیدا کردہ کوئی بھی نتیجہ محض ظن اور گمان پر مبنی ہوتا ہے۔ اسی لئے اس کو دوام نہیں۔ کسی بھی فلسفی کے ذرائع فکر اور اس کی رسائی ایک حد تک ہے، فیثا غورث کا آنے والا، پہلے والے کے خیالات کی یکسر تردید یا ترمیم کر دیتا ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ اہل فلسفہ خود ہی اپنے نظریات سے رجوع کرتے رہے ہیں، اور یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ ایک ہی وقت میں مختلف ذہن رکھنے والے صاحب فکر حضرات نے ایک دوسرے خیالات کی سختی سے تردید کی اور پورے فلسفہ اور نظریہ پر ہی خط تنسیخ پھیر دیا۔ اس وجہ سے خود مفکر اسلام انسانی فلسفہ پر ضرب شدید لگاتے ہوئے کہتے ہیں۔

الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا
غواص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے
جس معنی پیچیدہ کی تصدیق کرے دل
قیمت میں بہت بڑھ کے ہے تابندہ گہر سے
یا مردہ ہے یا نزع کی حالت میں گرفتار
جو فلسفہ لکھا نہ گیا خونِ جگر سے

اقبال پسندی کیوں؟:

ہم اقبال کے افکار کو "ذہنی اختراع" کہہ کر آپ کی تعریف و تحسین کا حق ادا نہیں کر سکتے، بلکہ آپ کو لائق تحسین اور آپ کی فکر و نظر کے نتائج کو اس لئے قابل قبول سمجھتے ہیں کہ وہ کتاب الٰہی ،اور فرمان رسول سے ذرہ برابر متصادم نظر نہیں آتے۔ چنانچہ اقبال زندگی کو کسی شاعر کے خیال کی طرح "فرصت گناہ" نہیں، فرصت امتحان خیال کرتے ہیں، اور موت کو ایک نئی زندگی میں داخل ہونے کا عمل قرار دیتے ہیں۔ تاہم، موت اپنے حوالے سے، جدائی کا عنوان ہے، اور اپنوں کی جدائی کا غم محسوس کرنا بشری تقاضا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پہلے والدہ اور پھر والد کی جدائی نے موت کی حقیقت آپ کے ذہن میں تازہ کر دی۔ تاہم خوف مرگ آپ کے مسلک میں حرام ہے لیکن موت ٹل نہیں سکتی، اور زندگی خود کو بچا نہیں سکتی، یہ احساس بھی فطری ہے اور اقبال اصولی فطرت سے

کیونکر اغماض کر سکتے تھے۔ غالباً اسی احساس کے زیرِ اثر آپ نے ۳۱ جنوری ۱۹۲۷ء میں اپنے بہت ہی قریبی دوست اور ہمدم و ہمراز عبدالقادر گرامی کو ایک مکتوب میں تحریر کیا تھا۔

"زندگی کا کوئی اعتبار نہیں۔ دیرینہ ہم خیالوں کی صحبت میں جو دم گزر جائے غنیمت ہے۔"

آپ کے اس حقیقت افروز احساس کی تصدیق اس طرح ہوگئی کہ اس مکتوب کو لکھے چار ماہ گزرے تھے کہ یہ دیرینہ اور درویش صفت دوست اس جہانِ فانی سے رخصت ہوگیا۔ جی کرتا ہے اقبال کے اس ہم قرب کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کر دیا جائے۔

زندگی اپنے تمام امکانات کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی۔ جیسا کہ اقبال فرماتے ہیں:

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی
تُو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی

☆☆

maablib.org

سانحاتِ کشمیر:

صاحب زندگی، رازدار حیات اقبال کی تخلیقی صلاحیتوں اور فکری مصروفیات میں کوئی فرق نہ آیا، بلکہ روز افزوں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ خصوصاً سیاسی مصروفیات نے آپ کے روز و شب کو مختلف شہروں اور جگہوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ آپ کو ایک اور اہم تنظیم کل ہند مسلم کانفرنس اپر انڈیا کے اجلاس میں شرکت کرنی تھی جو مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ الٰہ آباد کی وجہ سے جنوری ۱۹۳۱ء کے آخری ہفتہ تک موخر کر دیا گیا تھا، لیکن وہ التوا میں پڑ گیا۔ سیاسی حالات بہت تیزی سے بدل رہے تھے۔ انہی دنوں کشمیر میں ایک سانحہ پیش آیا جس نے کشمیری مسلمانوں کو سراپا احتجاج کر دیا، بلکہ پورے ہندوستان کے مسلمان ہی اس صدمہ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ظاہر ہے علامہ اقبال اس سے کیونکر الگ رہ سکتے تھے۔ اس وجہ سے نہیں کہ آپ کے آباؤ اجداد کشمیری تھے، بلکہ اپنے مطالعہ کی بنیاد پر کشمیر کی ایک تخصیص و انفرادیت کا ذکر اپنی شعری کتاب جاوید نامہ میں پہلے ہی کر چکے تھے۔ جس میں آپ نے کہا ہے کہ ''ہندوستانیوں کو آزادی کی دعوت سب سے پہلے کشمیریوں نے دی۔'' چنانچہ اب اس سال یعنی ۱۹۳۱ء میں تحریک حریت کشمیر شروع ہوئی تو اقبال نے اپنی پوری توجہ اس تحریک پر مرکوز کر دی۔ تحریک نے احتجاجی صورت اختیار کی تو آپ نے اسے سراہتے ہوئے فرمایا۔

''یہ جو کچھ ہو رہا ہے توقع کے خلاف نہیں۔ ممکن ہے کبھی اس سے بھی زیادہ انقلاب کشمیر میں آئے۔''

یاد رہے، مسلم اکثریت کے اس علاقہ پر ڈوگرا خاندان کا ہندو راجہ قابض تھا۔ اور یہ کیا دھرا انگریز کا تھا جو اس وقت دنیا کا سب سے بڑا ''قبضہ مافیا'' کہلاتا تھا۔ اسی کی شہ پر کشمیر کو ڈوگروں نے اپنے قبضہ میں اس طرح لے رکھا تھا، جیسا کہ اس نے مغرب کی دوسری ہم مذہب طاقتوں کے ساتھ مل کر سرزمین عرب پر مسلمانوں کے قلب میں یہودی ریاست کا زہریلا بیج بو دیا ہے۔

کشمیر میں ایک نہیں، یکے بعد دیگرے دو سانحات رونما ہوئے۔ ہوا یہ کہ کچھ مسلمان، نماز جمعہ کے لئے جمع تھے، اور امام صاحب ابھی خطبہ شروع نہیں کر پائے تھے کہ پولیس کے ایک ہندو سب انسپکٹر نے امام کو خطبہ پڑھنے سے روک دیا۔ دوسرا واقعہ یہ پیش آیا کہ جموں سینٹرل جیل کے اندر، ایک ہندو پولیس کانسٹیبل، قرآن مقدس کی بے حرمتی کا مرتکب ہوا۔ یہ خبر جیل کے باہر پہنچی تو ایک شخص مشتعل ہو کر احتجاجی تقریر کرنے لگا، جس پر پولیس نے اسے گرفتار کر لیا اور ۳۱ جولائی ۱۹۳۱ء کو جب مقدمہ عدالت میں پیش کیا تو وہاں مسلمان ایک کثیر تعداد میں جمع ہو گئے۔ پولیس نے ہجوم پر گولی چلا کر کوئی بارہ مسلمان شہید کر دیئے۔ اس سے مسلمانوں میں اور زیادہ اشتعال پھیل گیا۔ کشمیر کے مختلف علاقوں میں مظاہرے ہونے لگے۔ جنہیں پولیس نے اسے اپنے روایتی انداز میں سختی سے دبانے کی کوشش کی، اس میں ہندو غنڈے بھی شامل ہو گئے اور یوں پوری وادی میں فرقہ وارانہ فسادات پھیل گئے۔ یہاں تک کہ حالات، ریاست انتظامیہ کے قابو سے باہر ہو گئے اور اس کو دہلی سرکار سے فوج طلب کرنی پڑی۔ انگریز تو مسلم کشی کے لئے بہانے کا منتظر رہتا تھا، فوراً فوج نے آکر کنٹرول سنبھال لیا اور مزید تشدد اور سخت گیری کا بازار گرم ہو گیا۔ اندھا دھند مسلمان گرفتار کئے جانے لگے۔ جیلیں بھر دی گئیں۔

غریب کشمیریوں کی تعلیمی حالت پہلے ہی دگرگوں تھی، غربت نے الگ برا حال کر رکھا تھا، سرکاری ملازمتوں کے دروازے ان پر بند تھے، مذہبی آزادی بھی غصب کر لی گئی تھی، پریس اور کوئی پلیٹ فارم جس پر وہ اپنی آواز اٹھا سکتے، ان پر بھی پابندی تھی، کئی عبادت گاہوں پر بھی حکومت نے قبضہ کر رکھا تھا۔ غرض ظلم و جبر کی جو صورت بھی ہو سکتی ہے، ان پر روا تھی۔ ان بدترین حالات میں کشمیر مسلم کانفرنس کی بنیاد رکھی گئی، جس نے آگے چل کر مسلمانوں میں سیاسی شعور اور جذبہ حریت پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ لیکن ڈوگرا غاصب حکومت نے اس پر بھی قدغن

لگادی۔ مظلوم کشمیریوں کی اس بے بسی اور بے چارگی کو دیکھ کر پنجاب کے مسلمانوں میں غم وافسوس کی شدت اور بڑھ گئی۔ چنانچہ ایک طرف تو ایک تنظیم "مجلس احرار" نے کشمیر میں ہونے والے ان مظالم کے خلاف آواز اٹھائی اور مظاہرے کیے، ہزاروں کی تعداد میں جتھے کے جتھے کشمیر بھیج کر وہاں جیلیں بھر دیں۔ دوسری طرف کشمیر کمیٹی نے برادران کشمیر کی حمایت وہمدردی میں ایک پُرامن تحریک شروع کی اور آئینی ذرائع سے ان کے جائز حقوق کی عملاً جدوجہد کا آغاز کیا۔ علامہ ڈاکٹر محمد اقبال، جیسا کہ پہلے تذکرہ ہو چکا ہے، کشمیر کمیٹی کے رکن تھے۔ ان حالات میں آپ نے نہایت فعال کردار ادا کرنا شروع کیا، بلکہ احمدیہ جماعت قادیان کے امیر مرزا بشیر الدین محمود کی کمیٹی سے علیحدگی کے بعد، ڈاکٹر اقبال کو کمیٹی کا صدر منتخب کر لیا گیا۔ کمیٹی نے کشمیر کی ناگفتہ بہ صورتحال کو دیکھتے ہوئے پہلا کام یہ کیا کہ کشمیر کی جیلوں میں جو مسلمان کشمیری قید وبند کی صعوبتیں جھیل رہے تھے، انہیں فوری اور ہر ممکن امداد پہنچانے کا انتظام کیا گیا۔ اس سلسلہ میں، کمیٹی کے صدر ڈاکٹر اقبال نے اپنے ذاتی اثر ورسوخ سے کچھ نامور وکلاء نہایت سرعت کے ساتھ کشمیر روانہ کیے۔ ان میں خصوصی طور پر صوبہ بہار پٹنہ کے مشہور قانون دان مولوی نعیم الحق، محض اقبال سے تعلق خاطر کے سبب کشمیریوں کی مدد کو آئے۔ ادھر لاہور سے کئی وکلاء کشمیر پہنچ چکے تھے، جنہوں نے اسیروں کے مقدمات کی پیروی شروع کر دی۔ لیکن کشمیر میں اندھا راج تھا، ظلم سر چڑھ کر بول رہا تھا، ڈوگرا حکومت نے جبر کی انتہا کر دی، باہر سے آئے ہوئے وکلا کو ریاست سے بے دخل کر دیا اور بعض کو ریاست میں قدم رکھنے سے پہلے ہی روک دیا گیا۔ اس طرح مسلمان سیاسی قیدی، مدافعت کے بنیادی حق اور حصول انصاف سے ہی محروم کر دیے گئے۔

روحِ مضطرب:

اس دوران ڈاکٹر اقبال ایک لمحہ کے لئے بھی چین سے نہیں بیٹھے، اپنی تحریروں اور پبلک جلسوں میں تقریروں کے ذریعہ اپنی آواز حکومت کے ایوانوں تک پہنچاتے رہے، اور آخر آپ کی مساعی رنگ لائیں، کشمیر انتظامیہ نے ایک سرکردہ شخصیت مسٹر گلانسی کی سربراہی میں ایک کمیشن قائم کیا جس نے تحقیقات کے بعد اپنی رپورٹ میں سفارش کی:

کشمیر میں مکمل آزادی ہونی چاہیے، مذہبی عبادت گاہوں پر سے سرکاری قبضہ ختم کر کے انہیں متعلقین کے سپرد کیا جائے، تعلیم کی اشاعت عام ہونی چاہیے، زیادہ تر ابتدائی مدارس کھولے جائیں، مسلم اساتذہ میں اضافہ کیا جائے، نیز ایک خصوصی عہدیدار تقرر کیا جائے جو مسلمانوں کے تعلیم نظام کی نگرانی کا ذمہ دار ہو، ملازمتوں کے لئے تمام اسامیوں کی باقاعدہ تشہیر کی جانی چاہیے، اور ہر فرقہ کے لوگوں کو اس کے تناسب کے اعتبار سے حصہ دیا جائے۔"

گویا یہ رپورٹ نہیں، اقبال کے سوزِ دل کا نتیجہ تھا، اس کامیابی کے فوراً بعد ہی، آپ کو مسلمانوں کی ایک اور بااثر تنظیم آل انڈیا مسلم کانفرنس کا بھی صدر منتخب کر لیا گیا۔ اس پلیٹ فارم سے بھی آپ نے کشمیر کی ترجمانی کی اور اپنے خطبہ صدارت میں فرمایا۔

"جہاں تک کشمیر کا تعلق ہے، میرے لئے یہ ضروری نہیں کہ اس ملک میں جو واقعات ابھی حال ہی میں رونما ہوئے ہیں، ان کا تاریخی پس منظر بیان کروں، ایسے لوگوں کی بظاہر بیداری، جن کی خودی کا شعلہ تقریباً بجھ چکا تھا، ان تمام اشخاص کے لئے، جنہیں موجودہ ایشیائی عوام کی اندرونی کشمکش کے متعلق بصیرت حاصل ہے، ایک مژدہ جاں فزا ہونا چاہیے، کشمیری عوام کے مقاصد بالکل درست ہیں، اور مجھے اس کے معاملہ میں کوئی شک نہیں کہ اس ذہین اور ہوشیار قوم میں اپنی شخصیت کے احساس کا احیانہ صرف ریاست کی تقویت کا باعث ہوگا بلکہ پورے ہندوستان کے عوام کے لئے ایک ذریعہ قوت بنے گا۔"

اقبال کے ضمن میں کشمیر کے اس حوالے کو ممکن ہے آپ طوالت بے جا خیال کر رہے ہوں، لیکن یہ بہت اہمیت کا حامل ہے، اس لئے کہ یہ آج ایک صدی کے بعد بھی جوں کا توں ہے۔ آج بھی کشمیری ظلم کا شکار ہیں، آج بھی کشمیری مسلمان آگ اور خون میں نہلائے جا رہے ہیں، آج بھی کشمیری عفت مآب بیٹیوں کی چادر عصمت تار تار کی جا رہی ہے۔ آج بھی کشمیری آزادی کو ترس رہے ہیں، آج بھی تحریک حریت جاری ہے، بس اگر فرق ہے تو یہ کہ ڈوگرا راج کی جگہ رام راج والوں کا قبضہ ہے، ڈوگرا فوج کی جگہ را کھشش بھارت کی بہادر سینا نہتے مسلمانوں پر گولیاں برسا کر بزدلی کو شرما رہی ہے، اور امن و آزادی اور انسانی حقوق کے ٹھیکیدار خاموش تماشائی بنے ہوئے ہیں۔

کشمیر میں آزادی:

اس جملہ معترضہ کے بعد، اس جگہ ہم کشمیر کے اس بھرپور حوالے کی وجہ بیان کرتے ہیں وہ یہ کہ حضرت علامہ نے کشمیری مسلمانوں کے بارے میں جو باتیں ارشاد فرمائی ہیں وہ اس اعتبار سے نہایت اہمیت کی حامل ہیں کہ ایک طرف تو اس سے اقبال کی اس آرزو اور تڑپ کا اندازہ ہوتا ہے جو وہ برصغیر کے مسلمانوں کی آزادی کے لئے اپنے دل میں رکھتے تھے۔ دوسری طرف کشمیری مسلمانوں کی تحریک حریت کے حوالے سے مسلمانانِ ہند کو اس بات پر انگیخت کر رہے ہیں کہ وہ بھی اہل کشمیر کی طرح حصولِ آزادی کے لئے اٹھ کھڑے ہوں، اور غلامی کی زنجیر کاٹ پھینکیں۔ اسی لیے آپ نے ایک بار فرمایا...... "ہندوستانیوں کو آزادی کی دعوت سب سے پہلے کشمیریوں نے دی۔"

کشمیر ہندوستان نہیں:

اس بیان سے یہ نکتہ بھی مترشح ہے کہ علامہ اقبال، "کشمیریوں" اور "ہندوستانیوں" کا الگ الگ ذکر کر کے یہ حقیقت واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ کشمیر اور ہندوستان دو الگ الگ خطے ہیں، مملکت ہندوستان اور ریاست کشمیر دونوں علاقوں کو ہمسایہ تو کہہ سکتے ہیں، ان کو ایک گھر اور ایک آنگن نہیں کہا جا سکتا۔ دوسری بات آپ نے یہ فرمائی کہ "ان تمام اشخاص کے لئے جنہیں موجودہ ایشیائی عوام کی اندرونی کشمکش کے متعلق بصیرت حاصل ہے، ایک مژدہ جاں فزا ہونا چاہئے۔ مجھے اس معاملہ میں کوئی شک نہیں کہ اس ذہین اور ہوشیار قوم میں اپنی شخصیت کے احساس کا احیا نہ صرف ریاست کی تقویت کا باعث ہوگا، بلکہ پورے ہندوستان کے عوام کے لئے ایک ذریعہ قوت بنے گا۔"

آپ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ کشمیری عوام کی تحریک حریت سے نہ صرف ہندوستان بلکہ پورے ایشیا کو سبق لینا چاہئے، انہیں کشمیریوں کی تقلید میں اور انہیں "رول ماڈل" بنا کر اپنی آزادی کی راہ استوار کرنی چاہئے۔

انصاف پسند گلانسی:

علامہ ڈاکٹر محمد اقبال کی کوششوں نے کشمیر پر قابض طاقت کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ کشمیر کے مسئلہ کو سنجیدگی سے لے، لہٰذا جیسا کہ ہم معلوم کر چکے ہیں، اسے ایک کمیشن بنانا پڑا، جس نے کشمیر میں

ہونے والے تنازعات کی حقیقت پر سے پردہ اٹھایا اور اسی گلانسی کمیشن کی حق و انصاف پر مبنی سفارشات کے نتیجے میں حکومت کشمیر کو بالآخر اعلان کرنا پڑا کہ ریاست میں مکمل مذہبی آزادی ہوگی، سرکاری قبضہ میں لی گئی مساجد کو واگزار کیا گیا۔ نیز اذان میں مداخلت کو جرم قرار دیا گیا، اور وعدہ کیا گیا کہ وہ گلانسی کمیشن کی دیگر سفارشات پر بھی جلد عملدرآمد کرے گی۔

☆

گول میز کانفرنس:

ہندوستان میں روز بروز بڑھتی ہوئی سیاسی بے چینی کو انگریز ارباب اختیار نے، پورے ہوش وحواس کے ساتھ محسوس کر لیا تھا۔ اسی لئے اپنی شاطرانہ چالوں کے ذریعہ اس کو "نارمل" کرنے کی کوششیں جاری رکھیں۔ اپنے ہندوستانی غلاموں، ہندو مسلم دونوں کو طرح طرح کی لولی پاپ سے بہلانا ان کی پرانی عادت تھی اور یہ فن ان کو خوب آتا تھا۔ انگلستان میں بیٹھ کر، ہندوستان سمیت دنیا کے بیشتر حصوں پر فرماں روائی کرنے والوں نے ہندوستان کے اصل وارثوں سے پوچھنا شروع کر دیا کہ "کیا تکلیف ہے؟" پھر انہیں اپنے حضور "آپریشن روم" لندن میں طلب کر لیا، جہاں سے وہ اپنی ساری کالونیوں کو کنٹرول کرتے تھے۔ چنانچہ پہلے کی طرح پھر ایک اور گول میز کانفرنس کا ڈرامہ رچایا گیا۔ اس دوسری گول میز کانفرنس کے باقاعدہ دعوت نامے اگست ۱۹۳۱ء کے شروع میں جاری کر دیئے گئے۔ شرکاء کو تاکیداً اطلاع دے دی گئی کہ وہ ۲۶ ستمبر تک لندن پہنچ جائیں جو در اصل برطانوی استعمار کی "عالمی سازش گاہ" تھا۔ مندوبین میں ڈاکٹر سر محمد اقبال کا نام بھی شامل تھا۔ ان دنوں آپ علیل تھے، اس وجہ سے آپ کو روانگی میں تاخیر ہوگئی اور یکم ستمبر کی بجائے ستمبر کی آٹھ تاریخ کو لندن جانے کے لئے لاہور سے دہلی روانہ ہوئے۔ دہلی ریلوے اسٹیشن پر ہزاروں افراد آپ کے استقبال کے لئے موجود تھے۔ جنہوں نے والہانہ آپ کا خیر مقدم کیا۔ ان حضرات میں وہ بھی تھے جن کے دلوں کو اذان اقبال جگا چکی تھی اور ان کی بھی ایک بڑی تعداد تھی جو یہ سمجھتے تھے بلکہ امید رکھتے تھے کہ لندن میں آپ ان کی بہتر ترجمانی کر سکیں گے۔ چنانچہ دہلی میں قیام کے دوران آپ نے ان کے کئی سپاس ناموں کے جواب میں اپنے موقف کا

اعادہ ان الفاظ میں کیا۔

''میرے پاس حق وصداقت کی ایک جامع کتاب قرآن مجید ہے، جس کی روشنی میں مسلمانانِ ہند کے حقوق کی ترجمانی کرنے کی کوشش کروں گا۔''

بزمِ ناروا:

مردِ حق اقبال یہاں سے روانہ ہوکر ۱۰ ستمبر کو بمبئی پہنچے، آپ کو خلافت ہاؤس میں ٹھہرایا گیا۔ شام کو عطیہ فیضی اوران کے شوہر فیضی رحیمن نے اپنی قیام گاہ ایوان رفعت میں آپ کے اعزاز میں استقبالیہ دیا۔

تقریب میں بمبئی کے زعماء وعمائدین بھی شریک تھے، استقبالیہ اقبال کے اعزاز میں تھا لیکن تقریب کا ماحول اقبال کے مزاج سے تعلق نہیں رکھتا تھا۔ یعنی یہ محفل رامش ورنگ کی صورت تھی جو یقیناً عطیہ بیگم کے ''ذوقِ جمالیات'' کا مظہر تھی، بیگم صاحبہ اب شادی کے بعد عطیہ فیضی کہلانے لگی تھیں، شوہر فیضی رحیمن پارسی کمیونٹی سے تعلق رکھتے تھے، نہیں معلوم اس مصور میں عطیہ ایسی اعلیٰ ذہن کی خاتون نے کیا دیکھا تھا جو اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ کئی اہم شخصیات کے اس طرح کے معاملات میں پارسی کے حوالے ملتے ہیں، مثلاً ہندو رہنما پنڈت جواہر لعل نہرو کی بیٹی نے جس فیروز نامی شخص سے خود ساختہ رشتہ جوڑا وہ پارسی تھا، محمد علی جناح نے بھی جس نوعمر خاتون کو رفیقہ حیات بنایا وہ بھی پارسی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں، خود قائداعظم محمد علی جناح کی صاحبزادی دینا نے جس شخص کو اپنی عائلی زندگی کے لیے پسند کیا وہ بھی پارسی تھا اور یہ عطیہ صاحبہ جس کا ذکر ہورہا ہے، یہ بھی ایک پارسی مصور فیضی رحیمن کو اپنی زندگی کا ساتھی بنا چکی ہیں۔

علامہ اقبال لندن جانے کے لئے بمبئی تشریف لائے تو، مناسب خیال نہیں فرمایا کہ اس دیرینہ تعلق رکھنے والی خاتون سے نہ ملیں۔ بلکہ خود عطیہ کو آپ کو آنے کا انتظار تھا، لہٰذا پہلے ہی اپنے شوہر کے ساتھ مل کر آپ کے لئے ایک ''شاندار'' استقبالیہ کا اہتمام کر رکھا تھا۔ گو عطیہ اقبال کے مزاج سے آشنا تھی، لیکن پھر بھی وہ اپنے شاہانہ مزاج کا اظہار کئے بغیر نہ رہ سکی۔ اس درویش خداست کے استقبالیہ میں رقص وسرور کو بھی شامل کرلیا گیا۔ علامہ صاحب کے مختصر سے انگریزی خطاب کے بعد ایک چھریرے بدن کی سانولی سی رقاصہ اپنے فن کا مظاہرہ کرنے لگی لیکن ایک دنیا

کو وجد میں لانے والا اقبال اپنی مستی میں ڈوبا کسی اور ہی منظر کو رقصاں دیکھ رہا تھا۔ رقص میں نغمہ بھی شامل ہوا، تب بھی حضرت علامہ کاغذ کے ایک پرزے پر کچھ تحریر فرماتے رہے۔ یہ فارسی کے تین شعر تھے جو لکھ کر عطیہ کی طرف بڑھا دیئے۔ کچھ دیر بعد، ایک اور پرچہ اس کی "نذر" کر دیا، اس پر اردو میں شعر درج کیا گیا تھا۔

عالم جوش جنوں میں ہے روا کیا کیا کچھ
کہئے کیا حکم ہے دیوانہ بنوں یا نہ بنوں

سربرآوردہ شرکاء کی اکثریت محض اقبال کے دیدار کرنے اور گفتار سننے کی شائق تھی، آپ سے اصرار کیا گیا "ڈاکٹر صاحب ہم آپ کے خیالات سے مستفیض ہونے آئے ہیں، کچھ عطا کیجئے۔"

"جی ہاں علامہ صاحب! کوئی ایسا پیغام عنایت ہو جو ہمارے کام آ سکے۔"

آپ نے فرمایا۔ "میں نے جو کہنا تھا وہ ابھی اپنے خطاب میں کہہ چکا ہوں۔"

"پھر بھی، کوئی شعر ہی عطا ہو۔"

بصد اصرار پر آپ نے فرمایا۔ "معذرت خواہ ہوں حضرات میں اس طرح شعر نہیں سنایا کرتا۔"

لیکن عطیہ صاحبہ بضد ہیں۔ اپنے مہمانوں کی طرف سے سفارش کرنے لگیں۔

"ڈاکٹر صاحب، لوگوں کا اصرار ہے براہ کرم کچھ منظوم خیال ضرور عنایت کیجیے۔"

"اچھا، ایک شعر پیش کر رہا ہوں۔" میزبان کا خیال کرتے ہوئے علامہ صاحب نے فرمایا:

چناں بزی کہ گر مرگ تست مرگ دوام
خدا ز کردہ، خود شرمسار تر گردد

حاضرین میں سے آوازیں آئیں۔ "ڈاکٹر صاحب ہمیں فارسی نہیں آتی، انگریزی میں فرمایئے اس کا کیا مطلب ہے؟"

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا:

Life is beautifully-That if Death is the end of all-God himself may be put to shame for having ended they careeb.

قدر دانِ اقبال:

دو روزہ قیام کے دوران آپ کی ملاقات بمبئی میں افغان قونصل خانے کے ناظم سردار صلاح الدین سے ہوئی جو آپ سے دوستانہ تعلقات قائم کر چکے تھے۔ سردار صاحب، صاحب علم اور انتہائی باذوق شخصیت کے حامل اور فکر اقبال کے قدر دان تھے۔

بدگمانِ اسلام:

ہم جس زمانے کی تاریخ دہرا رہے ہیں، اس وقت بھی آج کی طرح "پان اسلام ازم" سے متعلق غلط پروپیگنڈا عام کیا جا رہا تھا۔

متعصب مخالفین کا خیال تھا: "اسلام اپنے پیروکاروں کو انسانیت اور بین المذاہب سے قطع نظر ایک الگ گروہ تصور کرتا ہے۔" وغیرہ وغیرہ۔ اسی سلسلہ میں جریدہ کرانیکل کے نمائندے نے ڈاکٹر اقبال سے انٹرویو کیا جس میں اس نے آپ سے اسی خیال کی وضاحت چاہی۔ آپ نے فرمایا۔ "پان اسلام ازم" اصطلاح کی بنیاد قرآنی تعلیمات پر ہے اور یہ کوئی سیاسی منصوبہ نہیں بلکہ ایک سماجی تجربہ ہے۔ اسلام، رنگ، نسل اور ذات پات کے امتیاز کو قبول نہیں کرتا۔ (بلکہ) یہ صرف اسلام ہے جس نے رنگ کے مسئلہ کو خوش اسلوبی سے حل کر دیا ہے، جسے یورپی تہذیب، فلسفے اور سائنس کے شعبوں میں ترقی کے باوجود حل نہ کر پائی تھی۔"

آپ نے ملاحظہ کیا، یہ ہے اقبال، مفکر اسلام جو اپنے دین وعقیدے کے لئے ہر محاذ پر سینہ سپر نظر آتا ہے۔ اپنی فکر قرآنی سے مخالفت کی ہر آندھی کا رخ موڑنے کی صلاحیت وجرأت رکھتا ہے۔ باطل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کلمہ حق بلند کرتا ہے۔

گوروں کے کالے کرتوت:

اقبال انگریز کے مزاج، اس کی سیاست اور اس کی انداز حکمرانی کا بخوبی ادراک رکھتے تھے، آپ جانتے تھے کہ ان گول میز کانفرنسوں کا اصل مقصد کیا ہے۔ یہ محض وقت گزاری کی باتیں ہیں، ان کا حاصل وصول کچھ نہیں، تاہم آپ نے محض اتمام حجت کے لئے اس "پروگرام" میں شرکت

قبول کی تھی۔

لنگر اٹھتا ہے:

یہ ۱۲؍ستمبر کی تاریخ ہے کہ آپ عازم لندن ہونے کے لئے، بمبئی کی بندرگاہ سے "ملوجا" نامی جہاز میں سوار ہوئے، اس جہاز میں کئی دیگر معروف شخصیات سید علی امام، نواب صاحب چھتاری، جسٹس سہروردی، مشیر حسین قدوائی، اور خان بہادر حافظ ہدایت حسین بھی آپ کی ہم سفر تھیں۔ ظاہر ہے اتنی دور دراز کے طویل آبی سفر کی کوفت کو خوشگوار بنانے کے لئے علم وفن کی حامل ان شخصیات نے اہم کردار ادا کیا۔ سیاسی، سماجی اور مذہبی موضوعات پر گفتگو چھڑتی رہی، شعرو شاعری بھی ہوئی اور کچھ تلخ کے واقعات وتجربات بھی بیان کئے گئے۔ دراصل یہ حضرات اپنی ذات میں خود انجمن تھے۔ پورے پورے ادارے تھے یہ علم وادب کے، اس محفل رواں کی کیفیت اور روداد کو اقبال اپنے ذہن ودل پر رقم کرتے رہے، بعد میں اپنے ایک مکتوب میں اس کا یوں ذکر کیا۔

عشقِ رسول:

"جب ہمارا جہاز ساحل مدینہ سے گزر رہا تھا تو سید علی امام پر رقت طاری ہوگئی۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور وہ بے اختیار ہو کر بولے:۔

"بلغ سلامی روضۃً فیھا النبی المحترم"

اقبال خود قلب سوز وساز کے حامل تھے، عشق رسول کی کیفیت سے سرشار تھے۔ فرماتے ہیں۔"ان (علی امام) کے قلب کی کیفیت نے مجھے بے انتہا متاثر کیا۔"

غالباً اقبال کو سر علی امام کی پہلے ہی یہ ادا بھا گئی تھی کہ اپنی اہم ترین تصنیف مثنوی "اسرار خودی" کو انہی کے نام منسوب کیا۔ اسی مکتوب میں اقبال نے اپنے اس مداح سید علی امام کی نیک ذاتی اور اعلیٰ صفاتی کی تعریف کے ساتھ ان کی اہلیہ کی جو اس سفر میں ان کے ساتھ تھیں، میزبانی کی بھی تحسین کی۔ لکھتے ہیں۔

"ان کی عنایت سے غیر مشتبہ ذبیحہ اور مغلئی کھانا تقریباً ہر روز ہماری میز تک پہنچ جاتا تھا۔"

اس سفر کی مزید روداد یہ ہے کہ "ملوجا" نامی یہ جہاز ۱۶؍ دسمبر کو عدن سے گزرتا ہوا ۲۰؍ ستمبر کو مصر

کے ساحل پورٹ سعید پہنچا تو مسلم نوجوانوں کی ایک تنظیم، "انجمن شبابُ المسلمین" کے کچھ اراکین علامہ محمد اقبال سے ملاقات کرنے آئے۔ علامہ صاحب نے مسلم نوجوانوں سے مل کر اپنے اندر ایک طرح کی خوشی اور طمانیت محسوس کی۔ اسی ملاقات میں قاہرہ کے ایک مشہور قانون دان بیرسٹر لطفی بے نے آپ سے درخواست کی کہ واپسی پر قاہرہ میں کچھ دیر قیام کیجئے۔ اسی نشست میں نوجوانوں نے آپ سے کچھ استفسار کیا، جس کے آپ نے نہایت عالمانہ انداز میں جواب دیئے۔ آپ نے ہندوستان کے سیاسی مسائل اور مسلمانانِ ہند کے موضوع پر ایک مبسوط لیکچر بھی دیا۔ مصری نوجوانوں کے لیے یہ باتیں بہت معلومات افزا تھیں جن سے وہ بہت زیادہ متاثر ہوئے۔

☆☆

ماضی و حال کا سنگم:

ماہ ستمبر کی ۲۰ تاریخ تھی کہ اقبال نے دوسری بار لندن کی سرزمین پر قدم رکھا۔ یقیناً اس وقت ۲۷ سال پہلے کے بہت سے مناظر آپ کی آنکھوں میں پھر گئے ہوں گے۔ اب سے ۲۷ سال قبل جب آپ یہاں آئے تھے، وہ "طالب علمی" کا زمانہ تھا، خود کو، خدا کو اور اس کی خدائی کو جاننے اور سمجھنے کا دور تھا۔ آپ کی بیدار مغزی آپ کو اپنے گرد و پیش سے متعارف کرا رہی تھی، عالمی سیاسی حالات، معاشرتی مسائل، مشرق و مغرب کی تہذیبوں کا تضاد اور خصوصاً مسلمانوں کی حالت زار، ان سب پر غور و فکر کا دور تھا۔ یورپ کی تہذیب و تمدن کی حقیقت اور مغرب کی سیاسی بازی گری سے تو آپ اسی زمانے میں واقف ہو چکے تھے، یہیں رہتے ہوئے تہذیب فرنگ پر تنقید کر چکے تھے، اور اب تو اقبال مغرب کی سیاسی دہشت گردی کے سب سے بڑے نقاد بن کر آئے ہیں، لیکن اس وقت آپ ۲۷ سال قبل یہاں گزارے ہوئے تین سال کے تعلیمی زمانے کی سیر کر رہے ہیں۔ انہی یادوں کو تازہ کرنے کے لیے آپ کیمرج بھی گئے۔ ادھر لندن کی مختلف ادبی انجمنوں کی طرف سے آپ کے اعزاز میں تقریبات منعقد کی گئیں۔ ان میں لندن انڈیا سوسائٹی اور نیشنل لیگ آف انگلینڈ خصوصاً قابل ذکر ہیں۔ آپ نے ان تقریبات میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ان مصروفیات میں آپ نے اس بات کو فراموش نہیں کیا کہ آپ ہندوستان کے غاصب فرنگیوں کی دعوت پر یہاں پہنچے ہیں، بظاہر انہوں نے اپنی "رعایا" کے دو فریق ہندو مسلم کے باہمی سیاسی تنازعات کو حل کرنے کے لیے دونوں گروہوں کے رہنماؤں کو یہاں طلب کیا ہے کہ وہ باہمی

گفت و شنید کے ذریعہ کوئی حل نکالیں جبکہ اقبال اس کو محض انگریز کا تاخیری حربہ سمجھتے ہیں، آپ جانتے ہیں کہ گول میز کانفرنس قسم کی باتیں، سیاسی کھلونے ہیں جن کے ذریعہ انگریز سیاسی شاطر ایک طرف اپنی لارڈ شپ کو برقرار رکھنا چاہتا ہے اور دوسری طرف آئندہ "آزاد ہندوستان" میں اپنے غلاموں کا ایک ٹولا تیار کرنے اور اپنے مفادات کے تحفظ کو یقینی بنانے کے لئے کوشاں ہیں تو ان کے مدعوئین میں ان کے "سر" اور مسلمانوں کے شاعر اسلام، اقبال مسلمانوں کے ترجمان بن کر آئے۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال کو سینٹ جیمز کورٹ میں ٹھہرایا گیا۔

رونقِ انجمن:

گول میز کانفرنس کا نتیجہ تو اقبال کے لیے پہلے ہی سے کوئی امید افزا نہیں بلکہ امید فرسا تھا یعنی کانفرنس میں ہونے والی بحث و تکرار سے بھرپور کارروائی نتیجہ خیز ثابت ہوتی نظر نہ آتی تھی۔ بہر حال آپ کی شخصیت گول میز کانفرنس کے تمام مندوبین پر بھاری تھی۔ مختلف ادبی انجمنوں اور علمی اداروں اور دیگر اہم شخصیات کی توجہ آپ کی طرف تھی، آپ کے مداح اور چاہنے والے آپ کے گرد جمع ہو گئے۔ ۱۰ اکتوبر کو ہندوستانی معززین کے ہمراہ ایک ضیافت میں شریک ہوئے تو مرکز نگاہ آپ ہی تھے۔ ۱۱ اکتوبر کو ووکنگ کی شاہجہاں مسجد کے ملاحظہ کے لئے گئے۔ اسی تاریخ کو البانیہ کے سفیر پنکھرڈ اور مسز پنکھرڈ نے آپ کو مدعو کیا۔ ۱۲ اکتوبر ایک سرکردہ شخصیت سر ڈینی سن راس آپ سے ملاقات کے لیے آئے، ۱۴ اکتوبر کو رنز ہوٹل میں ہندوستانی وفد کے اعزاز میں دیے گئے کھانے میں شریک ہوئے، ۱۶ اکتوبر کو افغان قونصل خانے میں، افغانستان کے نئے شاہ نادر شاہ کی رسم تاج پوشی کی سالانہ تقریب میں شرکت فرمائی۔ مصر کے ایک بے باک قومی رہنما غازی رؤف بے اور ایک دوسرے مصری رہنما سعید سے ملاقات ہوئی۔ ۱۷ اکتوبر ایران کے سابق وزیر اعظم سید ضیاالدین طباطبائی کی طرف سے منعقدہ ظہرانے میں شریک ہوئے۔

۲۳ اکتوبر کو لندن میں مقیم، ہندوستان کی ایک ریاست چھتاری کے نواب صاحب کی طرف سے دیے گئے عشائیے میں شرکت فرمائی۔ ۲۷ اکتوبر کو نیشنل لیگ آف انگلینڈ کی صدر مس گریٹ فارقوہرسن کی دعوت میں تشریف لے گئے۔

۴ نومبر کو انڈیا سوسائٹی کے زیر اہتمام ایک علمی اجلاس سے آپ نے خطاب فرمایا۔ ۱۸ نومبر کو کیمرج یونیورسٹی گئے اور اپنے سینئر اساتذہ، پروفیسر ڈکسن، اور پروفیسر سارے سے ملاقات کی اور یونیورسٹی میں کچھ دیر گزار کر یہاں گزارے ہوئے لمحات کو تازہ کیا اور اپنے اعزاز میں دیئے گئے استقبالیہ میں شریک ہوئے۔

☆☆

maablib.org

شہرِ رنگ و بو کی طرف:

یہاں اس تفصیل میں نہیں جائیں گے کہ گول میز کانفرنس کے ڈرامہ کا کیا ڈراپ سین ہوا اس کی کامیابی اور ناکامی یا افادیت کا اندازہ آپ اس سے لگا سکتے ہیں کہ حضرت علامہ کانفرنس سے عملاً علیحدہ ہو کر ۲۱ نومبر کو مولانا غلام رسول مہر کے ساتھ پیرس کے لئے روانہ ہو گئے۔

چراغِ جرأت گل ہوا:

اس دور کے حوالے سے ایک غمناک خبر یہ شامل کرتے ہیں کہ مولانا محمد علی جوہر جو اس گول میز کانفرنس میں شریک تھے اور اپنی علالت کے باوجود مسلمانوں کی اس جذباتی انداز میں ترجمانی کی کہ اس بادشاہ خطابت کی یہ تقریر تاریخ کا حصہ بن گئی اور آخری الفاظ جو ان کے منہ سے نکلے وہ الہامی ثابت ہوئے۔ انہوں نے کہا: ''یا تو یہاں سے ہندوستان کا پروانہ آزادی لے کر جاؤں گا ورنہ اس غلام ملک میں جانا مجھے ہرگز گوارا نہیں۔'' لہٰذا یہیں لندن میں ۴ جنوری کو انہوں نے اپنی آخری سانس اپنے خالقِ حقیقی کو پیش کر دیں اور اس مردِ مومن کو انبیا کی سرزمین المقدس میں آخری آرام گاہ نصیب ہوئی۔

مردِ حُر:

محمد علی جوہر ایک ذہین و فطین، نکتہ سنج اور حاضر جواب شخص تھے، دینی و قومی حمیت سے سرشار تھے، عشقِ محمد ان کی روح میں ایمان کی طرح موجزن تھا۔ انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں میں ے

نکان، برجستہ اور پر جوش خطاب کرتے تھے، انگریز حکومت ان سے خوفزدہ رہتی تھی۔ مولانا موصوف کو اقبالؒ کے سیاسی فکر و فلسفہ سے کسی حد تک اختلاف رہا لیکن وہ حضرت علامہ کی شاعری کی عظمت کے سامنے سرِ تسلیم خم کیے بغیر نہ رہ سکے اور کھلے دل سے کہا: ''اقبال کی شاعری کی ایک جھلک جب میں نے دیکھی تھی، اس سے سالہا سال پہلے، دوسروں کو اقبال کے نابغۂ عصر ہونے کا احساس ہو چلا تھا، لیکن اتنا دعویٰ تو میں بھی کر سکتا ہوں کہ اس کے افسوں کے زیرِ اثر آنے کے بعد میں تلافیٔ مافات میں دل و جان کے ساتھ تو لگ گیا۔ اقبال بیسویں صدی کے ہندوستان میں بیداریٔ اسلام کا شاعر ہے۔ اسلامی ہند کسی اور انسان کا اس حد تک رہینِ منت نہیں، جس قدر وہ مرہونِ احسان ہے لاہور کے اس منکسر المزاج، شرمیلے اور عزت گزیں بیرسٹر کا۔''

ایک موقع پر کہا: ''میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا یہ فلسفی شاعر اپنے انوکھے انداز میں اسلام کے ان ہی بنیادی حقائق کو پیش کرتا ہے جن کا خود میں نے بہ تمام مشکل ادراک کیا تھا۔''

تحریکِ خلافت کے سلسلے میں ایک بار مولانا محمد علی جوہر لاہور آئے تو علامہ سے بھی ملاقات کرنے گئے۔ اس وقت علامہ صاحب بیٹھک میں دھسا اوڑھے بیٹھے حقے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ مولانا جوہر جو اس وقت تک علامہ سے خاصے بے تکلف ہو چکے تھے بولے: ''ظالم! ہم تو تیرے شعر پڑھ کر جیلوں میں چلے جاتے ہیں لیکن تو ہے کہ دھسا اوڑھے حقے کے کش لگاتا رہتا ہے۔''

حضرت علامہ اقبال نے برجستہ فرمایا: ''میں تو قوم کا قوال ہوں، اگر قوال خود ہی ''حال'' میں شریک ہو کر ''ہوحق'' میں تہہ و بالا ہونے لگے تو قوالی ہی ختم ہو جائے گی۔''

اس ملاقات کے دوران، علامہ اقبال کسی کام سے، پلنگ پر سے اٹھنے لگے تو پاؤں نیچے لٹکا کر جوتا تلاش کیا جو پلنگ کے بہت نیچے چلا گیا تھا۔ مولانا جوہر نے جھک کر جوتا پلنگ کے نیچے سے نکالا اور علامہ صاحب کے پاؤں کے پاس رکھ دیا اور کہا: ''فخر کر کہ محمد علی تیرا جوتا سیدھا کرتا ہے۔'' حضرت اقبال نے برجستہ جواب دیا۔ ''محمد علی سچ تو یہ ہے کہ تم میرا جوتا سیدھا کرنے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتے۔'' اور یوں دونوں عظیم ہستیاں قہقہہ مار کر ہنس پڑیں۔ اللہ اللہ یہ تھا اس وقت کے مسلم رہنماؤں کا آپس میں پیار اور خلوص۔

روم میں دلی:

بات کر رہے تھے ہم گول میز کانفرنس کی ناکامی کے بعد علامہ اقبال کے پیرس جانے کی۔ یہاں آپ کے ایک شیدائی امراؤ سنگھ نے اپنی یورپی بیوی کے ساتھ آپ کا استقبال کیا۔ اقبال کے ایک اور مداح ڈاکٹر اسکارپا نے جو برصغیر میں اٹلی کے قونصل جنرل رہ چکے تھے، رائل اکیڈمی کی طرف سے آپ کو اٹلی میں مدعو کیا ہوا تھا۔ لہٰذا اقبال ۲۲ نومبر کو ہی بذریعہ ریل اٹلی کے لئے روانہ ہو گئے۔ اٹلی میں ۲۸ نومبر کو آپ کوئی پلو پہنچنے کے بعد یونی آئی کے کھنڈر دیکھنے گئے۔ یقیناً اس وقت آپ کے تصور میں، روما کی عظیم الشان سلطنت کا ماضی اپنے تمام خدوخال کے ساتھ آموجود ہوا ہو گا۔ لیکن اقبال دوسروں کی عبرت میں کھو جانے والے کہاں تھے۔ روما کے آثار پریشاں میں رہ کر آپ کا خیال اپنے ماضی کی طرف چلا گیا اور پکار اٹھے۔

"سوادِ رومۃ الکبریٰ میں دلی یاد آتی ہے۔"

جس طرح روم کی عظیم الشان سلطنت آج فقط اپنی چھوڑی ہوئی فلک بوس شاندار عمارتوں کے آثار میں کتبہ قبر کی طرح بن کر رہ گئی ہے، اسی طرح دیارِ ہند میں کئی صدیوں پر محیط مسلمانوں کا اقتدار بھی ان کی چھوڑی ہوئی عظیم الشان عمارتوں میں نقشِ عبرت بنا نظر آتا ہے۔ آگرہ کا تاج محل اور دلی کا لال قلعہ اپنے معماروں کی داستان اپنے تعمیر کرانے والوں کی داستانِ عبرت سناتے رہتے ہیں۔

شاہین بمقابلہ کرگس:

ان دنوں افغانستان کے سابق حکمران شاہ امان اللہ خان یہاں جلاوطن زندگی گزار رہے تھے۔ ۲۵ نومبر کو ڈاکٹر اقبال نے ان کی ملاقات ہوئی جو تین گھنٹے جاری رہی۔ دوسرے روز رائل اکیڈمی میں آپ کو مدعو کیا گیا تھا جہاں آپ نے ایک پُرمغز لیکچر دیا۔ اس کے دوسرے دن شاہ امان اللہ خان دوبارہ آپ سے ملاقات کرنے آئے اور کوئی دو گھنٹے تک آپ کے ساتھ رہے۔ اسی دن مسولینی سے آپ کی ملاقات ہوئی۔ یہ مشہور زمانہ ڈکٹیٹر اس وقت اٹلی میں برسرِ اقتدار تھا۔ اسے معلوم ہوا کہ انڈیا سے شاعرِ مشرق اقبال آج کل روما آئے ہوئے ہیں تو اپنے خصوصی نمائندے

کے ذریعہ آپ سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا۔ اس کی دعوت پر آپ اس سے ملنے گئے۔ جس وقت علامہ صاحب کو اس کے پاس لے جایا گیا تو اٹلی کا یہ مرد آہن ایک وسیع کمرے میں میز کے سامنے بیٹھا تھا اور میز کاغذوں سے اٹی پڑی تھی۔ علامہ صاحب جیسے ہی کمرے میں داخل ہوئے یہ اپنی جگہ سے اٹھ کر آپ کی پیشوائی کے لئے بڑھا۔ یہ کوئی دراز قد نہ تھا، لیکن بازو بھرے بھرے اور سینہ کشادہ تھا، اور آنکھوں میں کسی شکاری شکرے کی طرح تیز چمک تھی۔

اٹلی کا شکرا مسولینی:

یہ اٹلی کے ایک قصبہ میں لوہار کے گھر پیدا ہوا تھا، اس کی سیاسی داستان بڑی عجیب ہے، بہت سے سیاسی اتار چڑھاؤ آئے، آخر اس نے اپنی ایک فاشٹ جماعت تشکیل دی اور بڑی تگ و دو اور مشکل ترین نشیب و فراز کے بعد آخر اٹلی کا بلاشرکت غیرے حکمران بن گیا۔

رسما مزاج پرسی کے بعد اس نے علامہ سے دریافت کیا۔

''میری فاشٹ تحریک کے لئے آپ کیا رائے رکھتے ہیں؟''

آپ نے ارشاد فرمایا...... ''دراصل آپ نے ڈسپلن کے اس اصول کا بڑا حصہ اپنا لیا ہے جس کو اسلام نظام حیات کے لئے بہت ضروری سمجھتا ہے...... تاہم اگر آپ اسلام کا نظریہ حیات پوری طرح اپنا لیں تو سارا یورپ آپ کے تابع ہو جائے گا۔''

دانش پیغمبر صحرا:

اس جگہ اپنے قارئین سے گزارش کروں گا کہ وہ اس واقعہ پر سے سرسری نہ گزر جائیں، بلکہ توقف کر کے غور کریں کہ یہ مرد مومن ایک ڈکٹیٹر سے کس لب و لہجہ میں مخاطب ہے، اور اسے کیا حق پسندانہ مشورہ دے رہا ہے۔ دراصل یہ فہم و فراست اور حوصلہ مندانہ انداز حق گوئی ہر اک کو نہیں آتی۔ اسی لئے تو آپ نے فرمایا ہے: ''قبول حق ہیں فقط مرد حر کی تکبیریں۔''

دوران گفتگو مسولینی نے ڈاکٹر صاحب سے مزید دریافت کیا:

''اٹلی کے متعلق بھی اپنے کچھ تاثرات بیان کیجئے!''

آپ نے پہلے کچھ پس و پیش کیا پھر فرمایا:

میری رائے میں اطالوی لوگ ایرانیوں سے بہت مشابہت رکھتے ہیں۔ یہ بڑے خوب رو، فن پرست ذہین اور فطین لوگ ہیں، اور ان کا عظیم الشان ماضی تہذیب و تمدن کی کئی صدیوں کو احاطہ کئے ہوئے ہے، مگر ان میں خون نہیں ہے۔''

مسولینی یہ سن کر کہ اقبال کی نظر میں اطالوی قوم جوش و جذبہ سے خالی ہے حیرت سی کرنے لگا۔ دانشِ اقبال نے صرف اسی پر بس نہیں کیا بلکہ اپنے اس دعوے کی دلیل میں مزید فرمایا:

''ایرانیوں کو ایک فائدہ حاصل ہے جو بدقسمتی سے اطالویوں کو نہیں ہے، وہ یہ کہ ایرانیوں کے اردگرد توانا قومیں ترک، افغان اور کرد آباد ہیں جن سے تازہ خون حاصل کیا جاسکتا ہے، لیکن اطالویوں کے لئے ایسی صورت موجود نہیں۔''

''پھر اطالویوں کو کیا کرنا چاہئے۔''؟ مسولینی نے پوچھا اور ڈاکٹر اقبال نے جواب میں کہا۔ ''یورپ سے منہ موڑ کر مشرق کا رخ کرلو، یورپ کا اخلاق روبزوال ہے، لیکن مشرق کی ہوا تازہ ہے، اس میں سانس لینا چاہئے۔''

مسولینی نے دورانِ گفتگو کہا۔ ''اچھا آپ مجھے کوئی منفرد مشورہ دیجئے!''

آپ نے فرمایا۔ ''ہر شہر کی آبادی متعین کردیں اور اسے حد سے آگے نہ بڑھنے دیں، بلکہ مقررہ آبادی سے تجاوز کرنے والوں کو نئی بستیاں مہیا کی جائیں۔''

مسولینی آپ کے اس مشورے پر اظہارِ حیرت کرتے ہوئے بولا۔

''آخر اس میں کیا مصلحت ہے؟''

علامہ صاحب نے فرمایا۔ ''شہر کی آبادی جس قدر بڑھتی جاتی ہے، اس کی تہذیب و اقتصادی توانائی کم ہوتی جاتی ہے اور ثقافتی توانائی کی جگہ شر کے محرکات پیدا ہوجاتے ہیں۔'' آپ نے ایک لمحہ خاموش رہ کر دوبارہ فرمایا۔ ''یہ میرا ذاتی نظریہ نہیں بلکہ میرے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے آج سے تیرہ سو سال قبل یہ ہدایت فرمائی تھی کہ مدینہ کی آبادی ایک حد سے تجاوز کرجائے تو مزید لوگوں کو آباد ہونے کی اجازت دینے کی بجائے دوسرا شہر آباد کیا جائے۔''

یہ حدیثِ نبویؐ سنتے ہی مسولینی کرسی سے کھڑا ہوگیا اور دونوں ہاتھ میز پر زور سے مار کر بولا۔ ''کتنا شاندار خیال ہے، کتنا شاندار خیال ہے۔''

ظاہر ہے، پیغمبر آخرالزماں کے خیال مبارک سے بڑھ کر اور کس کا خیال شاندار ہو سکتا ہے
محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کی دانش و فراست کے تو آپ کے مخالفین بھی قائل ہیں تو مسولینی جیسا
مفکر کیونکر نہ رسول اعظمؐ کے خیال سے پگھلتا۔

حضرت اقبال، مسولینی سے ملاقات ختم کر کے باہر تشریف لائے تو اخبار والوں نے گھیر لیا
اور پوچھنے لگے۔ "ہمارے لیڈر کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

پہلے تو ڈاکٹر صاحب نے خاموشی اختیار کی پھر ان کے اصرار پر جو تبصرہ کیا وہ نہایت مختصر مگر
انتہائی جامع ہے۔ فرمایا۔

"مسولینی بغیر بائبل کے لوتھر ہے۔"

اس جملے کو اطالوی زبان میں ترجمہ کر کے لوگوں کے ہجوم میں تکرار کے ساتھ دہرایا گیا اور
لوگ خوش ہو کر ناچنے لگے۔ یاد رہے ڈاکٹر اقبال نے مسولینی کو جس شخصیت سے مشروط تشبیہ دی،
وہ سیاہ فام عوام کا بہت بڑا اور بے باک قائد گزرا ہے یعنی لوتھر کنگ جس کو ایک سازش کے ذریعہ
سفید فام نسل پرستوں نے قتل کرا دیا۔

☆☆

مصر میں مصروفیات:

۲۹ نومبر تاریخ کو اقبال اطالیہ (اٹلی) سے مصر کے لئے روانہ ہوگئے اور ٹرین کے ذریعہ قاہرہ پہنچے۔ یہاں میٹروپولیٹن ہوٹل میں قیام کیا۔ دسمبر کی ۲ تاریخ کو مصر کے علماء اور معززین سے ملاقاتیں کیں۔ اہرام مصر دیکھنے گئے ۳ دسمبر کو معروف تاریخ دان اور الاہرام جریدہ کے مدیر محمد حسین ہیکل اور کئی دوسرے معززین سے ملے اور دعوتوں میں شریک ہوئے۔ ۴ دسمبر کو مصر کی مسجد میں تاریخی آثار اور عجائب گھر دیکھا، ۵ دسمبر کو قاہرہ سے ریل کے ذریعہ بیت المقدس روانہ ہوئے اور دو روز میں وہاں پہنچے یہاں گرینڈ ہوٹل میں قیام کیا مقدس مقامات کی زیارت کی۔

اقبال کی آواز مصر میں پہنچ چکی تھی اور آپ ان کے لئے اجنبی نہیں تھے، لہٰذا مصری اکابرین نے آپ کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا۔ آپ کا یہاں ایک ہفتہ قیام رہا۔ مختلف اہل فکر و نظر سے تبادلہ خیال کا موقع ملا۔ ۵ دسمبر کو مصر کے دارالحکومت قاہرہ سے روانہ ہوئے اور دوسرے ہی روز فلسطین پہنچ گئے۔ یہاں ۷ دسمبر سے تنظیم موتمر عالم اسلامی کا اجلاس شروع ہوا۔ علامہ اقبال نے ۱۴ دسمبر کو خطاب کیا اور دوسرے دن بیت المقدس سے وطن کے لئے روانہ ہوگئے۔

یوں آپ کا یہ تاریخی سفر ۳۰ دسمبر کو لاہور پہنچ کر اختتام پذیر ہوگیا۔

خیر و شر کی مرکب شخصیت:

علامہ نے وطن واپسی پر مسولینی کے لئے نظم بھی کہی جو بادی النظر میں آپ کے خیالات سے مناسبت نہیں رکھتی اور تنقید کی زد میں آگئی، تاہم آپ نے اپنے ایک ہم عصر ادبی شخصیت پروفیسر آل احمد سرور کے نام مکتوب میں جو وضاحت کی وہ قاطع برہان ہے۔ پہلے نظم سنتے ہیں، پھر

اعتراض اور پھر آپ کی وضاحت ملاحظہ کریں گے۔

ندرت فکر و عمل کیا شے ہے؟ ذوق انقلاب
ندرت فکر و عمل کیا شے ہے؟ ملت کا شباب
رومتہ الکبریٰ دگرگوں ہوگیا تیرا ضمیر
ایں کہ می بینم بہ بیداری است یارب بخواب
فیض یہ کس کی نظر کا ہے؟ کرامت کس کی ہے؟
وہ کہ ہے جس کی نگہ مثل شعاع آفتاب

پروفیسر آل احمد سرور نے اس نظم پر اعتراض کرتے ہوئے اقبال کو لکھا۔ آپ کی یہ نظم آپ کے عمومی نظریات کے خلاف معلوم ہوتی ہے۔" اس پر اقبال نے اپنے آخری ایام میں انہیں مکتوب تحریر کیا جس میں آپ نے وضاحت کی۔

"مسولینی کے متعلق جو کچھ میں نے لکھا ہے اس میں آپ کو تناقص نظر آتا ہے، آپ درست فرماتے ہیں، لیکن اگر اس بندہ خدا میں ڈیول (شیطان) اور سینٹ (ولی) دونوں کی خصوصیات جمع ہوں تو اس کا میں کیا علاج کروں؟ مسولینی کی نگاہ میں ایک ناممکن البیان تیزی ہے جس کو شعاع آفتاب ہی سے تعبیر کر سکتے ہیں، کم از کم مجھے اسی قسم کا احساس ہوا۔"

بعد میں جب مسولینی نے ایک چھوٹے سے نادار افریقی ملک ابے سینیا پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کرلیا تو وہ اقبال کی نظروں میں گر گیا، بلکہ آپ اسے ایک بھیڑیے کی قسم کا درندہ تصور کرنے لگے، یعنی مسولینی کے اس بزدلانہ عمل نے اقبال کے اس خیال کو یکسر بدل دیا کہ وہ "نگہ مثل شعاع آفتاب"، رکھتا ہے بلکہ وہ چمک جو اس کی آنکھوں میں دکھائی دیتی ہے، ایک خونی بھیڑیے کی شکاری آنکھ کے جیسی چمک ہے۔ اقبال اپنی نظم "ابے سینیا" میں فرماتے ہیں:

اے وائے آبروئے کلیسا کا آئینہ
روما نے کر دیا سر بازار پاش پاش
پیر کلیسا! یہ حقیقت ہے دل خراش

☆☆

بدن کی تلاش:

دراصل جب ہم کسی شخصیت کے بارے میں لکھتے ہیں یا اندازہ لگاتے ہیں تو بعض اوقات اس بات کو فراموش کر جاتے ہیں کہ وہ خواہ کیسی ہی صاحب عظمت شخصیت ہے لیکن بہرحال انسان ہے اور انسان عقل کُل نہیں اور نہ ہی اس کی بات اور خیالات حرف آخر ہوتے ہیں۔ اقبال کے سینے میں ایک مومن کا دل تھا، جب کسی سے ملتے، اخلاص کے ساتھ ملتے، بدخوئی، بدخواہی اور بدگمانی آپ کے مزاج سے بہت دور تھی۔ کسی بھی چیز کے بارے میں پہلا تاثر ان کا مثبت ہوتا تھا، یہی وجہ ہے کہ کئی سیاسی شخصیات ایسی ہیں جن کے بارے میں اقبال نے اچھا تاثر لیا تھا، ان میں مسولینی بھی تھا، بلکہ ترکی کے مصطفےٰ کمال پاشا اور ایران کے رضا شاہ پہلوی سے بھی اقبال شروع میں خاصے متاثر ہوئے، لیکن بعد میں جب ان کے معاملات سے حقیقت آشنائی ملی تو ان دونوں سے ناامید اور مایوس ہو گئے اور نہایت ہی یاس انگیز لہجہ میں فرمایا:

مری نوا سے گریبان لالہ چاک ہوا
نسیم صبح، چمن کی تلاش میں ہے ابھی
نہ مصطفےٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی
کہ روح شرق، بدن کی تلاش میں ہے ابھی
مری خودی بھی سزا کی ہے مستحق لیکن
زمانہ دار و رسن کی تلاش میں ہے ابھی

کمال کا زوال:

ترکی کے مصطفےٰ کمال نے خلافت عثمانیہ کو قدامت پرستی کا نام دے کر جدیدیت کا تمغہ کارکردگی اپنے سینے پر سجالیا تو اقبال کے دل سے جیسے آہ بلند ہوئی فرمایا:

بیچتا ہے ہاشمی ناموسِ دینِ مصطفےٰ
آگ ہے اولادِ ابراہیم ہے نمرود ہے
خاک و خوں میں مل رہا ہے ترکمانِ سخت کوش
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

یورپی کرگس:

مسولینی اور سامراجیت کی مذمت میں بھی آپ کے اشعار چنگاریاں بن کر پھوٹے:

یورپ کے کرگسوں کو نہیں ہے ابھی خبر
ہے کتنی زہر ناک ابی سینیا کی لاش
ہونے کو ہے پژمردۂ دیرینہ قاش قاش
تہذیب کا کمال شرافت کا ہے زوال
غارت گری جہاں میں ہے اقوام کی معاش
ہر گرگ کو ہے برۂ معصوم کی تلاش

☆

جاوید نامہ:

ہم حضرت علامہ کی ایک کتاب "جاوید نامہ" کا پہلے تذکرہ کر چکے ہیں جس کی تخلیق آپ نے شروع کر دی تھی، وہ ۱۹۳۱ کے اختتام تک مکمل کر لی گئی، اور اب فروری ۱۹۳۲ء میں اشاعت پذیر ہوئی ہے۔ دراصل اس کا خاکہ آپ کے ذہن میں ۱۹۲۷ء میں ہی مرتب ہو چکا تھا۔ کیونکہ یہ اپنے موضوعات کے اعتبار سے بہت اہم ہے، جس میں علمی، فکری، دینی، انفرادی اور اجتماعی معاملات کے ساتھ سیاسی حقائق بھی پیش نظر رکھے گئے ہیں۔ اس وجہ سے حضرت علامہ کو کتاب کی

بے نظیر حیثیت کا احساس تھا، چنانچہ آپ نے خود فرمایا:

''جہاں تک میرا علم ہے، کسی زبان میں اس قسم کی کتاب اس سے پہلے نہیں لکھی گئی۔''

آپ کا یہ دعویٰ واقعی سچا تھا، ''جاوید نامہ'' شائع ہوتے ہیں اہل علم و دانش کی طرف سے تعریف و تحسین کے خطوط آنا شروع ہو گئے۔ اس کی پسندیدگی ہند سے نکل کر یورپ تک جا پہنچی اور دوسری زبانوں میں ترجمے ہونے لگے۔ ایک مشرقی پروفیسر ہیل نے اس کا ترجمہ جرمن زبان میں کیا۔ علامہ کو اپنی اس تخلیق پر ناز تھا اور آپ بجا طور پر اس کے حقدار تھے۔

''جاوید نامہ'' دراصل ایک تمثیلی تخلیق ہے، جس میں تصورات کو اس کے خالق نے ''قُم باذنی'' کہہ کر زندہ کر دیا ہے۔ کتاب کا آغاز مناجات سے ہوتا ہے۔ جس میں شاعر کو کائنات سے اپنی تنہائی کا شکوہ کرتے دکھایا گیا ہے۔ وہ شکوہ یہ ہے کہ ''میں اس بحر و بر اور مہر و ماہ کے درمیان اکیلا ہوں مجھے کوئی ہم زبان و ہم نوا نہیں ملتا۔ ایک میں کیا، خود ستارے ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہیں، اور تنہائی کا شکار ہیں''۔ شاعر کائنات کا مشاہدہ کرتے ہوئے کہتا ہے۔

''اس فضائے نیلگوں پر سکوت کا عالم طاری ہے۔''

وہ جیسے جیسے کائنات کی لامتناہی وسعتوں پر نظر دوڑاتا ہے، اسے اپنی تنہائی کا احساس شدید تر ہوتا جاتا ہے۔ اس گہرے سکوت اور بیکراں وسعتوں، میں اسے اپنا (یعنی فرزند آدم کا) کوئی ہم نفس میسر نہیں آتا۔ اور نہ ہی اس پر اس کی شخصیت کا راز کھلتا ہے کہ وہ کیا ہے؟ چنانچہ اسی عالم بے چارگی میں پکار اٹھتا ہے۔

ایں جہاں صید است و صیادیم ما
یا اسیر رفتہ از یادیم ما

''یہ جہاں شکار ہے اور میں شکاری ہوں یا میری یادوں کی قید سے بھاگا ہوا کوئی قیدی ہے؟'' وہ ابھی اسی تذبذب اور الجھن میں پڑا ہوا ہے کہ زمان و مکان کی ان وسعتوں میں اسے جلد ہی فرزند آدم کی عظمت کا احساس ہو جاتا ہے، اس کے علم میں یہ بات آجاتی ہے کہ قدرت نے عالم شش جہات کی تسخیر کا فریضہ اس کے سپرد کیا ہے۔ (یعنی وہ کوئی معمولی مخلوق نہیں) علم الاسماء کا رازدان ہے یہ وہ ہستی ہے جو رازہائے کائنات کی محرم ہے اور جسے خالق کائنات کا مخاطب ہونے کا

شرف حاصل ہے۔

علامہ اسی تناظر میں یہ بات بھی واضح کرتے ہیں کہ "شاعر کے دل میں حسن ازل کو دیکھنے کی آرزو پیدا ہوتی ہے اور وہ سراپا التجا بن جاتا ہے۔

وہ رازِ حیات کو بے نقاب دیکھنے کی خواہش کرتا ہے، عقل اور جنوں دونوں کا متمنی ہے، اس کے نزدیک علم کی صلاحیتیں محدود ہیں، منزل مقصود کے لئے جو تجلی درکار ہے، علم اس سے محروم ہے، علم و خرد محض "خبر" فراہم کرتے ہیں، جبکہ وہ حسن ازل کی ضیا پاشیوں کا ملتجی و متمنی ہے اور "نظر" کا آرزومند ہے۔

مختصر یہ کہ شاعر "خبر" کے ساتھ "نظر" اور "علم" کے ساتھ ساتھ "لذتِ حضوری" کی تڑپ بھی دل میں لئے ہوئے ہے۔

مناجات کے بعد تمہید ہے جس میں روز آفرینش آسمان کو زمین کی عظمت کا اعتراف کرتے دکھایا گیا ہے اور زمین کی اس عظمت کا راز اس کا مکین انسان ہے جو علم کی قوت سے تسخیر کائنات کو ممکن بنا سکتا ہے اور عشق کی قوت سے لامکاں تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ حضرت اقبال انسانی صفات کا تذکرہ کرتے ہوئے اس تمہید کو پیر رومی کے اس شعر پر ختم کرتے ہیں۔

ہر کہ عاشق شد جمال ذات را

اوست سید جملہ موجودات را

"جمال ذات کے عاشق کی حیثیت موجودات کے سردار کی سی ہے۔"

تمہید کے خاتمے کے بعد نغمہ ملائک ہے۔ یعنی فرشتے (مخلوقات میں) انسان کی برتری کا گیت گاتے سنائی دیتے ہیں۔ اس کے بعد شاعر پیر رومی سے اپنی ملاقات کا حال بیان کرتا ہے۔

اب ناظرین دیکھ سکتے ہیں کہ شاعر کو محرم راز میسر نہیں آسکا ہے اور وہ احساس محرومی لیے ساحل سمندر پر کھڑا ہے، پس منظر میں آفتاب ڈوب رہا ہے، شفق نے سمندر کی نیلگوں لہروں پر اپنے رنگ بکھرا دیے ہیں۔ شاعر پر اضطراب کی شدت غالب آنے لگتی ہے، اور وہ اپنی اس خلش کو گیت میں ڈھال دیتا ہے۔

وہ ابھی نغمہ سرا ہے کہ آفتاب غروب ہو جاتا ہے، سمندر کی موجیں تھک کر سو جاتی ہیں اور

گھپ اندھیرے میں نظر آتا ہے کہ پہاڑ کے اس پار سے روحِ رومی نمودار ہو رہی ہے۔ شاعر ایک اس نورانی پیکر سے مخاطب ہوتا ہے موجود و ناموجود اور خوب و ناخوب کی حیثیت معلوم کرتا ہے۔ روحِ رومی اس کے سوالوں کا بلیغ انداز میں جواب دیتی ہے۔ وہ شاعر کو بتاتی ہے کہ شعراء کے مدارج کیا ہیں۔ انسان کس طرح اپنی خودی کو پہچانتا ہے اور کس طرح وہ ذاتِ حق کو بے پردہ دیکھے بغیر اپنی منزلِ مقصود پر نہیں پہنچ سکتا۔"

اس مقام پر علامہ صاحب نے بطور حوالہ معراج کا فلسفہ بیان کیا ہے۔

"رسولِ محترم محمد صلی اللہ علیہ وسلم صرف صفاتِ حق جاننے کی حد تک مطمئن نہ تھے، بلکہ ذاتِ باری تعالیٰ کو بے حجاب دیکھنے کے آرزومند تھے۔"

اس کے بعد پیرِ رومی نہایت خرد افروز باتیں شاعر کو بتاتے ہیں۔ خصوصاً عقل و عشق کا تفصیل سے موازنہ کر کے عشق کی بے پناہ قدرت اور جہادِ زندگی میں اس کی ناگزیریت کو ثابت کرتے ہیں، اور اس کے بعد کچھ ایسی سوز و ساز میں ڈوبی ہوئی گفتگو کرتے ہیں کہ شاعر ان کے ایک ایک لفظ پر تڑپ اٹھتا ہے۔

اس کے بعد بہت سی شخصیات سے شاعر کی ملاقات ہوتی ہے، ان سے مکالمہ ہوتا ہے اور وہ شخصیات اپنے اپنے خیالات و نظریات بیان کرتی ہیں۔ روحِ رومی شاعر کو افلاک کی سیر کراتی ہے اور اپنی حکیمانہ باتوں سے شاعر کی ذات کو علم و آگہی سے لبریز کرتی جاتی ہے۔

اس سحر انگیز اور عدیم النظیر شعری کتاب کے آخر میں علامہ نے اپنے فرزند جاوید سے خطاب کیا ہے۔ جس کے ذریعہ آپ انہیں اور ان کی معرفت پوری نسلِ نو کو زندگی کے حقائق سے آگاہ کرتے ہیں۔ (یاد رہے "جاوید" اقبال کا صلبی و نسبی فرزند بھی ہے اور ہر وہ نوجوان بھی جاوید ہے جو آپ کا روحانی خلف ہے۔) اولاً یہ تلقین کی گئی ہے کہ اپنے اندر ذوقِ نگاہ پیدا کرو اور لا الہ کو قلب کی گہرائیوں میں محسوس کرو، ہشیار! کہ "مادیت کا سیلِ بے پناہ" دین، سیاست، علم و فن اور عقل و دل کو بہا لے گیا ہے، ایشیا جو روشنی کا منبع تھا، اب دوسروں کی طرف تک رہا ہے، یہ ذوقِ عمل سے محروم ہو گیا ہے۔ اس کی عقل، دین و دانش ناموس و ننگ سب مغرب کی غلام ہیں۔ آج کے نوجوان کی روح تاریک ہے، وہ کم نگاہ، بے یقین اور ناامید ہے، مکتب اپنے مقصد کو بھول چکا ہے،

جذب اندرون تک اس کی رسائی نہیں، اس نے شاہین میں خوئے بط پیدا کردی ہے۔ علم، سوزِ حیات سے خالی اور دل لذتِ واردات سے محروم ہے، حفظ جان وتن کے بغیر حاکمیت ممکن نہیں۔ خودی کا احساس وشعور زندگی کی بنیادی شرط ہے، خودی کا منکر، منکرِ حق سے بڑا کافر ہے، صدقِ مقال، اکلِ حلال اور جفاکشی زندگی میں حسن اور پاکیزگی پیدا کرنے کے لئے ضروری ہیں۔ دین راہ طلب میں سوز وگداز کا نام ہے، اس کی ابتدا ادب اور انتہا عشق ہے، انسانیت زندگی کا جوہر ہے۔ اس سے مراد انسان کا احترام ہے۔ دردِ دل دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے، مال و دولت کی افراط بے نیازی کا وجود کھودیتی ہے اور اس کی جگہ نخوت کو وجود میں لاتی ہے۔"

شاعرِ اسلام اپنے دور کے مسلمانوں سے شاکی ہیں کہ ذوق وشوق اور ایمان سے محروم نظر آتے ہیں۔ عالم وصوفی کی روح دین سے عاری ہوچکی ہے، مغرب زدہ مسلمان رموزِ دین سے ناواقف ہے اور خواص کے ہاں خیر وخوبی کا فقدان ہے، البتہ عوام میں صدق وصفا کی دولت موجود ہے۔ مشرق ومغرب کو ہلا دینے والا مردِ حق ناپید ہوچکا ہے۔"

آخر میں علامہ نے پیروی کو رفیقِ راہ بنانے کی تلقین فرمائی ہے، تاکہ دل سوز وگداز کی دولت سے معمور ہوسکے۔ اسی نصیحت کے ساتھ "جاوید نامہ" اپنے اختتام کو پہنچ جاتا ہے۔

☆☆

maablib.org

پیغامِ عمل:

اقبال دوسری گول میز کانفرنس سے واپس آئے تو آپ کے پاس ایسی کوئی امید افزا بات کہنے کو نہیں تھی جسے مسلمان سن کر خوش ہو سکتے۔ تاہم ۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء کو بیرونی دروازہ لاہور میں ہونے والی آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے سالانہ جلسہ میں جس کی صدارت بھی آپ ہی کے حصے میں آئی۔ آپ نے ایک ایسا خطاب کیا جو نہایت اہمیت کا حامل تھا، بلکہ خطبہ الہ آباد میں مسلمانوں کے مستقبل کے لئے محض ایک دعوت فکر دعوت دی گئی تھی، جبکہ اس جلسہ میں آپ نے جو خطبہ صدارت پیش کیا اس میں صرف غور وفکر کرنے اور حالات کو سمجھنے اور عبرت پکڑنے اور افسوس کرنے کا ہی درس نہیں بلکہ ایک پُر زور تحریک عمل کا پیغام تھا جس کا خلاصہ سادہ لفظوں میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے:

اٹھو ورنہ حشر نہیں ہو گا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

یا پھر بقول خود علامہ اقبال:

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

اعترافِ کمال:

اقبال نے اپنے دل میں ملت کا درد بسا لیا تھا اور خود ملت کے دلوں میں بس چکے تھے، ملت

اسلامیہ خصوصاً ہندوستان کے مسلمان آپ کو والہانہ چاہتے تھے۔قوم کی آپ سے محبت اور چاہت کا یہ عالم تھا کہ آپ غالباً پہلی شخصیت ہیں کہ کسی کی زندگی میں اس کا یوم منایا گیا ہو۔ پہلا "یوم اقبال" دکن حیدرآباد میں منایا گیا اور یہ سلسلہ ہندوستان کے مختلف شہروں میں پھیل گیا۔ ۶ مارچ ۱۹۳۲ء کو لاہور میں اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام وائی ایم سی ہال میں منعقد کیا گیا۔ یہ پنجاب میں ہونے والے یوم اقبال کی پہلی تقریب تھی، جس کے دو اجلاس ہوئے، ایک کے صدر نشی جسٹس آغا حیدر تھے اور دوسرے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹنا گرنے کی۔ اجلاس میں اقبال کے فکروفن پر مقالے پڑھے گئے۔شام کو اجلاس کے اختتام پر ہوٹل نئی فلز میں ضیافت کا اہتمام کیا گیا۔جس میں علامہ اقبال بھی شریک ہوئے۔یہ حضرت اقبال کی اہل اسلام اور اصلاحیوں سے دلی اور سچی محبت کا اثر تھا کہ آپ کے وقار اور آپ سے محبت وعقیدت میں روز افزوں اضافہ ہوتا چلا گیا، لیکن یہ مرد قلندران چیزوں سے بے نیاز راتوں کی تنہائی میں اپنی قوم کے لئے گریہ وزاری کرتا اور اپنی اس بات پر سختی سے قائم تھا کہ " کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحرگاہی۔"

علاجِ جسم وروح:

یہی سال رواں ہے کہ اکتوبر کے مہینے میں ماہنامہ "نیرنگ خیال" کا خصوصی شمارہ اقبال نمبر شائع ہوا۔

بھوپال میں علاج کے لئے آپ کا ارادہ مئی میں جانے کا تھا، لیکن جو حالات پیش آئے، غالباً یہی وجہ بنی کہ آپ ۱۶ جولائی کو دوبارہ بھوپال تشریف لے گئے جہاں آپ نے ۲۸ اگست تک قیام کیا۔ زیر تالیف اردو شعری مجموعہ "صور اسرافیل" کے بعض حصے جس کا نام بعد میں ضرب کلیم رکھا، بھوپال میں ہی تخلیق کئے۔ لکھنے کے علاوہ پڑھنے کا بھی سلسلہ جاری رہا۔ کتب بینی کے حوالے سے آپ نے ۲۰ اگست کو سید سلیمان ندوی کے نام ایک مکتوب میں لکھا۔

"میں بھی یہاں حمیدیہ لائبریری اور بعض پرائیویٹ احباب سے کتابیں منگوا کر دیکھتا رہا۔ الحمدللہ، بہت سی باتیں مل گئیں،، اس مطالعہ سے مجھے بے انتہا فائدہ ہوا اور آپ کے خط نے تو اور بھی راہیں کھول دی ہیں۔ میں نے کبھی اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھا، اس واسطے میرا کوئی رقیب نہیں

اور نہ میں کسی کو اپنا رقیب تصور کرتا ہوں۔ فن شاعری سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی، ہاں بعض مقاصد خاص رکھتا ہوں جن کے بیان کے لئے اس ملک کے حالات و روایات کی رو سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار کیا ہے۔"

محرمِ راز:

یقیناً علامہ اقبال کی تمام علمی اور فکری کاوشوں کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ حقیقت واضح طور پر ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ اقبال ان معروف معانی میں شاعر نہیں رہے، جو شاعروں کے لئے مخصوص ہیں، نہ ہی آپ نے خود کو شاعر کہلانا پسند کیا، بلکہ آپ روایتی شاعر اور روایتی شاعری پر ہمیشہ اپنے تحفظات کا اظہار فرماتے رہے، البتہ شاعری کو آپ نے اپنے افکار کا ذریعہ ضرور خیال کیا جیسا کہ منقولہ بالا مکتوب اور اس شعر سے عیاں ہے۔

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ

اس کے باوجود آپ کا انکسار اس درجہ پر ہے کہ آپ کو درویش نہ ماننا خود سے انکار کرنے کے مترادف ہے۔ فرماتے ہیں:

خوش آگئی ہے جہاں کو قلندری میری
وگرنہ شعر مرا کیا ہے، شاعری کیا ہے

آپ بہ غرض علاج ابھی بھوپال ہی میں مقیم تھے کہ لاہور میں مسجد شہید گنج کے انہدام کا سانحہ پیش آگیا۔

پھر وہی گول مول:

جیسا کہ گزشتہ سطور میں ہم نے ہندوستان میں پیدا ہونے والی سیاسی بے چینی کا حوالہ دیا، اس میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔ مسلم لیگ اور کانگریس کے لیڈروں کے اپنے اپنے موقف کے حق میں پرزور و پرجوش بیانات شائع ہو رہے تھے، انگریز انتظامیہ بھی سخت تنقید کی زد میں آرہی تھی، انہی حالات کو دیکھتے ہوئے انگلستان کے ناخداؤں نے ایک بار پھر گول میز کا ڈھونگ رچایا

مسلمانوں کی طرف سے وفد میں اس بار بھی ڈاکٹر اقبال کو شامل کیا گیا اور آپ نے اتمام حجت کے بطور اس دعوت کو قبول کیا۔

یہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۲ء کا دن ہے کہ آپ گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے انگلستان روانہ ہوئے۔

آپ کا قیام لندن میں ۳۰ دسمبر تک رہا۔

افکار فروزاں:

ظاہر ہے اقبال ایسی دانشور شخصیت کو لوگ اپنے درمیان پائیں اور آپ کے افکار عالیہ سے فیض یاب نہ ہوں، یہ کیسے ممکن ہو سکتا تھا۔ لندن کی رسٹولین سوسائٹی نے آپ کو مدعو کیا اور آپ سے درخواست کی کہ اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں۔ آپ نے نہایت اہم موضوع پر لیکچر دیا، عنوان تھا، IS RELIGION POSSIBLES? "کیا مذہب کا امکان ہے؟" یقیناً اس سوال کا اقبال ایسا دین شناس مفکر ہی جواب دے سکتا تھا، آپ نے نہایت مدلل انداز میں بیان فرمایا کہ دین کی ممکنہ ضرورت فطرت انسانی کا تقاضا ہے۔"

دل برداشتہ مسیحا:

ان دنوں مسٹر محمد علی جناح لندن میں ہی مقیم تھے بلکہ ہندی مسلمان رہنماؤں کی بے شعوری سے دل برداشتہ ہو کر یہاں مستقل سکونت کا ارادہ کر چکے تھے۔ دونوں رہنماؤں کی کئی تفصیلی ملاقاتیں ہوئیں۔ حضرت علامہ نے ہندوستان میں مسلم جماعتوں کی ابتری اور ان کے رہنماؤں کی غیر ذمہ دارانہ لیڈر شپ بلکہ نااہلی سے متعلق انہیں آگاہ کیا اور یہی وہ موقع تھا جب ڈاکٹر اقبال نے ان کو وطن واپس آ کر مسلمانوں کی قیادت کا نہ صرف مشورہ دیا بلکہ مجبور کیا کہ اس وقت مسلمانوں کو آپ ہی جیسے لیڈر کی ضرورت ہے۔ اس جگہ بھی حضرت علامہ کی فہم و فراست اور اپنے عصری سیاسی مزاج اور خصوصاً مسلمان لیڈروں کی کمزوریوں سے مکمل آگاہی کا ثبوت ملتا ہے۔ نیز کہ آپ محمد علی جناح کی سیاسی بصیرت اور شخصیت و کردار کو کسی عبقری انداز میں سمجھ چکے تھے، غالباً اقبال کے اس شعر پر پورا اترتے تھے:

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے

☆

آسمانی مخلوق:

انہی دنوں نواب بھوپال حمید اللہ خان صاحب بھی لندن آئے ہوئے تھے۔ علامہ صاحب کو مشورہ دیا:

''ڈاکٹر صاحب موقع مناسب ہے آپ اسپین بھی ہو آیئے۔''

آپ نے ان کے مشورہ پر برجستہ فرمایا:

''ضرور ہو آتا اگر میں نواب ہوتا۔''

نواب صاحب نے اس کو حسنِ طلب خیال کیا اور اس وقت نہ صرف زادِ راہ کا بندوبست کیا، بلکہ ایک مناسب سی خاتون بطور سیکرٹری بھی مختص کر دی۔ چنانچہ آپ نے وہ رقم جو نواب صاحب نے دورۂ اسپین کے لیے آپ کی نذر کی تھی اس خاتون کے حوالے کر دی اور اسے اپنا پروگرام سمجھا دیا۔ ڈاکٹر صاحب ۳۰ دسمبر کو لندن سے پیرس روانہ ہوئے اور دوسرے ہی روز فرانس کے مرکز اور دنیا کے حسین ترین شہر پیرس کی فضا میں سانس لے رہے تھے، لیکن یہ اقبال تھے، اپنے مقصد اور نظریے سے زیادہ حسن آپ کو کسی اور چیز میں کہاں نظر آ سکتا تھا۔ اس خاتون نے جو آپ کے ساتھ گئی تھی، ظاہر ہے شروع میں تو رسماً اور پیشہ ورانہ اپنے فرائض انجام دیے لیکن جلد ہی یہ نوعمر سیکریٹری آپ کی شخصیت سے اس قدر متاثر ہوئی کہ گویا آپ کی مرید ہو گئی ہو۔ خود ڈاکٹر صاحب نے بھی محسوس کیا اور اس سے پوچھا کہ ''یکا یک یہ جو تمہارا طرزِ عمل تبدیل ہوا ہے جو میں محسوس کرتا ہوں، تو اس کا سبب کیا ہے، کیونکہ تم میری خدمت میں کچھ زیادہ ہی سنجیدہ نظر آنے لگی ہو۔''

اس نے کہا۔ آپ نے درست پہچانا، دراصل مجھ پر کچھ ایسا انکشاف ہوا ہے، گویا آپ ایک آسمانی مخلوق ہیں۔

☆☆

افکار ہم آہنگ:

یہاں قیام کے دوران اہم مصروفیت مشہور فلسفی برگساں سے ملاقات ہے۔ برگساں ان دنوں اپنی علالت اور ضعیفی کے باعث ملنا ملانا ترک کر چکے تھے، لیکن بقول اقبال:

''انہوں نے ازارہ عنایت مجھے اس قدغن سے مستثنیٰ رکھا۔''

یاد رہے کہ کوئی بڑا آدمی بغیر علت کوئی عمل نہیں کرتا، برگساں سے آپ کی ملاقات کا مقصد محض یہ نہ تھا کہ وہ ایک بڑا فلسفی تھا اور مغرب کے فلاسفہ میں نطشے سے بھی زیادہ شہرت کا حامل تھا، حالانکہ اس وقت خود اقبال اپنے فلسفے اور شاعرانہ کمال کی وجہ سے مشرق کا روشن ستارہ بنے ہوئے تھے، اقبال کا برگساں سے ملاقات کا اصل مقصد برگساں کے وہ افکار ہیں جو اسلام اور مسلم فلاسفہ کے بہت زیادہ قریب تر ہیں۔ اس کے فکر و فلسفہ میں نطشے کی طرح الحاد، جبریت اور بہت سی کائناتی حقیقتوں کی نفی اور حق گریزی نہیں بلکہ الحاد کی جگہ روحانی گہرائی، اور جبریت کی بجائے زادی پسندی کے مثبت خیالات پائے جاتے ہیں۔ اقبال کے لئے ہمیشہ وہی فکر اور صاحب فکر دلچسپی اور پسندیدگی کا باعث رہے جنہیں آپ نے اسلامی فکر کے قریب تر محسوس کیا، تاہم نطشے کے لحادی خیالات سے قطع نظر حضرت علامہ اس کے اظہار جرأت مندی کی بھی قدر کرتے تھے۔ لیکن گساں کے لیے آپ کی ''گڈ بک'' میں اس لئے جگہ بنی کہ جب آپ نے اس کے فلسفہ کا مطالعہ کیا تو اس میں آپ کو مشرقی روحانیت کی خوبو محسوس ہوئی۔ حقیقت بھی یہ ہے کہ اس وقت یورپ میں انسان اور کائنات سے متعلق کچھ ایسے مادی نظریات جنم لے رہے تھے جو ذہنوں کو مذہب سے راو رالحاد کے قریب کر رہے تھے، برگساں کے فلسفے اور نظریات نے یورپ کی فضا میں تیزی سے پھیلنے والی اس ملحدانہ آلودگی کو روکنے میں اہم کردار ادا کیا، گو کائنات اور ارتقائے حیات سے متعلق گساں کا نظریہ اور فلسفہ نیا اور اپنا نہ تھا بلکہ اس سے قبل کئی مسلم فلاسفر اس اہم موضوع یعنی حیات و ئنات کی مختلف توجیہات پیش کر چکے تھے، جو محض ان کے انسانی دماغ کی اختراع نہیں بلکہ حذات کلام الٰہی ہیں، جیسا کہ قرآن ایک طرف کائنات پر غور و فکر کرنے کی دعوت دیتا ہے اور دسری طرف کائنات کی میکانیت کی طرف اشارے کرتا ہے، مثلاً فرمایا گیا۔ ''بے شک واللہ ہی

ہے جو جیسے چاہتا ہے اپنی تخلیق میں اضافہ کرتا ہے۔"

یا یہ کہ۔ "بے شک زمین و آسمان کی تخلیق میں اور دن رات کے تسلسل میں عقل و فہم رکھنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔" اور یہ کہ "رات اور دن کا تغیر اسی کے لئے ہے۔"

گویا قرآن حکیم کائنات کا ایک حرکی اور تخلیقی تصور پیش کرتا ہے۔ یعنی کائنات ہر لحظہ اپنے اندر تبدیلی پیدا کرتی رہتی ہے اور وہ اپنی ارتقائی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔ جیسا کہ اسی حقیقت کو شاعر اسلام حضرت علامہ نے اپنے اس شعر میں بیان کیا ہے:

یہ کائنات ابھی نا تمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

جبکہ آپ کے نزدیک خود مومن کی زندگی بھی کائنات کی طرح ارتقا پذیر ہے، فرمایا:

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
کردار میں گفتار میں اللہ کی برہان

برگساں کے حوالے سے ان باتوں کا تذکرہ ہم نے اس لئے ضروری سمجھا کہ شاعر اسلام پیرس پہنچ کر اس یورپی فلسفی سے کیوں ملے؟ صاف ظاہر ہے کہ آپ برگساں کے نظریہ ارتقا کو قرآنی فلسفہ کے قریب سمجھتے ہیں، اسی لئے آپ نے اپنے کئی انگریزی خطبات میں اس کے نظریات کی تعریف کی ہے جو قرآن سے مطابقت رکھتے ہیں۔ البتہ بعض جگہوں پر آپ نے برگساں کی "اصلاح" بھی فرمائی ہے، یعنی اس کے فکری نتائج کو یا تو یکسر رد کر دیا ہے یا پھر کچھ ترمیم و اضافہ کیا ہے۔ اس جگہ ہم چاہیں گے کہ علامہ کے وہ اشعار یہاں درج کر دیئے جائیں جن میں پیش کردہ خیالات برگساں کے نظریات سے ہم آغوش نظر آتے ہیں۔ پیام مشرق میں فرمایا:

زندگی رہرواں در تگ و تاز است و بس
قافلہ موج را جادہ و منزل کجاست

یعنی مسافر کی زندگی کا دارومدار اس کی تگ و دو میں ہے، جس طرح موجوں کا قافلہ راستہ اور منزل سے بے نیاز آگے بڑھتا اور گزرتا رہتا ہے۔ گویا زندگی ایک سیل رواں ہے۔

اسی کیفیت کا اظہار علامہ صاحب کی پہلی شعری کتاب بانگ درا کی ایک نظم "فلسفۂ غم" میں ملتا ہے۔ فرماتے ہیں:

آتی ہے ندی جبین کوہ سے گاتی ہوئی
آسماں کے طائروں کو نغمہ سکھلاتی ہوئی

آئینہ روشن ہے اس کا صورت رخسار حور
گر کے وادی کی چٹانوں پر یہ ہو جاتا ہے چور

نہر جو تھی اس کے گوہر پیارے پیارے بن گئے
یعنی اس افتاد سے پانی کے تارے بن گئے

جوئے سیماب رواں پھٹ کر پریشاں ہو گئی
مضطرب بوندوں کی اک دنیا نمایاں ہو گئی

ہجر ان قطروں کو لیکن وصل کی تعلیم ہے
دو قدم پر پھر وہی جو مثل تار سیم ہے

ایک اصلیت میں ہے نہر روان زندگی
گر کے رفعت سے ہجوم نوع انساں بن گئی

زمان و مکان کے حوالے سے بھی اقبال اور برگساں کے خیالات میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ اقبال فرماتے ہیں:

کھو نہ جا اس سحر و شام میں اے صاحب ہوش
اک جہاں اور بھی ہے جس میں فردا ہے نہ دوش

تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا
ایک زمانے کی رو جس میں دن ہے نہ رات

حضرت علامہ کی شاہکار نظم ''مسجد قرطبہ'' کے یہ اشعار بھی برگساں کے پڑھنے والوں کو محسوس کرا سکتے ہیں کہ برگساں اور اقبال کے نظریات اس ضمن میں مشترک ہیں۔ فرماتے ہیں:

فریب نظر ہے سکون و ثبات
تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات

ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود
کہ ہر لحظہ تازہ ہے شانِ وجود

سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی
فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی

بہت دیکھے ہیں اس نے پست و بلند
سفر اس کو منزل سے بڑھ کر پسند

سفر زندگی کے لئے برگ و ساز
سفر ہے حقیقت، حضر ہے مجاز

دما دم رواں ہے یم زندگی
ہر اک شے سے پیدا رم زندگی

قارئین اس کو جملۂ معترضہ سمجھیں یا توضیح جس کا پیش کرنا ہمارے نزدیک اس اعتبار سے بہت ضروری تھا کہ اقبال نے ملاقات کے لئے برگساں کو کیوں منتخب اور پسند کیا؟ تو ایک بار پھر ہم

اس حقیقت کو تازہ کرتے ہیں کہ اسلام کی حقانیت اور اس میں پوشیدہ روحانیت، اقبال کے رگ و ریشہ میں سمائی ہوئی تھی، لہٰذا جہاں آپ روح اسلام کی رمق بھی دیکھتے وہاں ٹھہرنا خود پر فرض کر لیتے۔

اثر قولِ رسولؐ:

اس ملاقات میں اقبال نے برگساں کے سامنے یہ حدیث قدسی بیان کی۔

اللہ کا فرمان ہے: ''زمانہ کو برا مت کہو کہ میں خود زمانہ ہوں'' (یعنی میں زمانہ کا خالق ہوں)

برگساں یہ سن کر حیران رہ گیا۔ شاید اس وجہ سے کہ یہ مختصر سا فقرہ دہریت کو بھک سے اُڑا دیتا ہے۔

عظمتِ رفتہ کا گورستان:

اس ''ہم خیال'' فلسفی سے بزم آرائی کے بعد، ڈاکٹر اقبال پیرس سے ہسپانیہ روانہ ہو گئے۔ یاد رہے اس دورے کا انتظام نواب بھوپال نے پہلے ہی کر دیا تھا اور ایک کم عمر لڑکی آپ کی سیکرٹری کے فرائض سرانجام دے رہی تھی جو آپ کی صحبت میں اب سیکریٹری کی بجائے آپ کی داسی بن چکی تھی۔

ہسپانیہ میں آپ نے تین ہفتے گزارے۔ لیکن یوں نہیں کہ یہ کہہ کر ہم آگے بڑھ جائیں، بلکہ اس عرصہ میں حضرت اقبال پر یہاں رہتے ہوئے کیا گزری یہ تو وہی محسوس کر سکتا ہے جو اقبال کے اس مزاج سے آشنا ہو گا جس میں اپنی تاریخ سے جذباتیت کی حد تک وابستگی اور اسلام کی عظمت رفتہ سے دل بستگی کی شدت رچی بسی ہوئی تھی۔ مشہور جرمن فلاسفر ہیگل تاریخ سے متعلق کہتا ہے۔

''تاریخ ایک نصب العین سے مربوط ہے۔''

لیکن اقبال اس سے بہت آگے شعور کی بلندیوں پر پہنچ کر کہتے ہیں۔ ''تاریخ قوموں کا ذہن ہوتی ہے۔ اگر کوئی قوم اپنا حافظہ بھلا دے تو وہ مردہ ہو جاتی ہے۔''

آپ نے اسلام کے شاندار ماضی کے اس گورستان (ہسپانیہ) میں رہ کر جو شب و روز

گزارے وہ اس کیفیت سے ہرگز خالی نہیں ہو سکتے جیسا کہ تعلیم کے بعد لندن سے وطن واپسی کے موقع پر صقلیہ کے قریب گزرتے ہوئے آپ مسلمانوں کے دورِ زریں کو یاد کر کے رو دیئے تھے، تو یہاں اس اجڑے دیار میں آہ و زاری کئے بغیر کیونکر رہے ہوں گے۔ یہاں کے کس کس آثار کو دیکھ کر دل نہ تھام لیا ہوگا۔ الحمرا کے محل، کہ وہ تو پہلے بھی روح سے خالی تھے، اس کے نقش و نگار، دل کی دھڑکنوں سے پہلے ہی محروم ہو چکے تھے، لیکن مسجد قرطبہ جس سے اقبال کا روحانی رشتہ نیا نہیں، دیرینہ تھا، تاریخ کا مطالعہ شروع کرتے ہی قلب کی گرمی اور روح کی تڑپ اس سے وابستہ ہو چکی تھی۔

اسپین کے دورے کو میں سیاحت نہیں، بلکہ ماضی کے مزار کی زیارت کہوں گا، اور اس ''سیاحت'' کو اقبال کی زندگی کا ''خوشگوار'' مرحلہ قرار نہیں دوں گا۔ اس لئے کہ گورستان عبرت کی جگہ ہے اس میں گزرے ہوئے لمحات سوگوار ہوتے ہیں، خوشگوار نہیں ہو سکتے۔ سو اقبال نے یہاں تین ہفتے یقیناً اسی کیفیت میں گزارے ہوں گے۔ اس کی ایک جھلک علامہ کے اس مکتوب میں محسوس کی جا سکتی ہے جو آپ نے اپنے فرزند جاوید کو لکھا۔

''میں خدا کا شکر گزار ہوں کہ میں اس مسجد (قرطبہ) کے دیکھنے کے لئے زندہ رہا، یہ مسجد تمام دنیا کی مساجد سے بہتر ہے، خدا کرے تم جوان ہو کر اس عمارت کے انوار سے اپنی آنکھیں روشن کرو۔''

اس عرصے میں آپ کو اسپین کے شہر میڈرڈ، قرطبہ، غرناطہ، اشبیلہ اور طیطلہ دیکھنے کا موقع ملا۔ خصوصاً قرطبہ میں تعمیر کردہ مسلم دور کی مسجد کا دلچسپی سے مشاہدہ، یہ مسجد جو اپنی طرزِ تعمیر میں عدیم النظیر اور شاہکار حیثیت رکھتی ہے، لیکن علامہ کے لیے یہ محض اس وجہ سے ہی خصوصی دلچسپی کا باعث نہ تھی، بلکہ وہ اس کے پس منظر میں مسلمانوں کے سنہری دور کو بھی محسوس کر رہے تھے اور اس سانحۂ عظیم پر افسردہ اور ملول تھے کہ آج اسپین میں مسلمان اس طرح مفقود ہے جیسا کہ خود مسلمان کے اندر سے احساسِ زیاں رخصت ہو چکا ہے۔

آوازِ زندہ:

اسپین کے قابضین نے خدائے واحد کی اس عبادت گاہ کو تثلیث پرستی کی آماجگاہ میں بدل کر صرف ایک مختصر سا حصہ محراب و منبر کی حد تک باقی رہنے دیا ہے۔ حضرت علامہ کی خواہش پر اور یقیناً کچھ دوسری کوششوں کے نتیجہ میں آپ کو اس کی زیارت کا موقع ملا، اور پھر یہ ہوا کہ اس مرحومہ کے درو دیوار نے صدیوں کے بعد آوازِ بلالی سنی اور موذن دورِ گزشتہ کا کوئی کلمہ گو نہیں، دورِ حاضر کا مردِ مومن تھا جو اس جابرانہ قانون کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے کہ یہاں اذان پر پابندی ہے، اپنی آواز کو نہ دبا سکا اور اللہ اکبر پکار اٹھا۔ لیکن اللہ اللہ، جب ''حی علی صلوٰۃ'' کے کلمات بلند کیے تو اس وقت دل کو پاش ہونے سے کون روک سکتا تھا کہ نمازی کہاں سے آتے، دور تک فضا پر قبرستان کی سی خاموشی پھیلی ہوئی تھی اور مسجد مرثیہ خواں تھی کہ ''نمازی نہ رہے''۔ اس احساس کے سبب اس غریب الوطن نے ''فرض کفایہ'' ادا کیا۔ اپنی وہ پیشانی جس میں ہزار سجدے تڑپ رہے تھے مسجد کے تشنہ لب فرش پر رکھ دی۔ دوگانہ ادا کر کے دعا کے لئے دامنِ دل پھیلا دیا۔ تو یقیناً دعا کے کلمات اس سے بہتر اس وقت اور کیا ہو سکتے تھے:

''یا رب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے
جو روح کو تڑپا دے جو قلب کو گرما دے''

ڈاکٹر اقبال نے مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کے اس عظیم الشان نشان اندلس میں تین ہفتے گزارے، جہاں مسلمانوں نے نو سو سال تک بلا شرکتِ غیرے ایک مثالی حکمرانی کی تھی، لیکن یہ دیرینہ دورِ اقتدار، یکایک نہایت قلیل عرصہ میں دیکھتے ہی دیکھتے زمیں بوس ہو گیا۔ سقوطِ غرناطہ (اندلس کا صدر مقام) کی یہ المناک داستان اپنے بیان کے لئے خاصے وقت کی متقاضی ہے، اس کے لیے یہ جگہ مناسب نہیں، اور نہ ہی اس وقت ہمارا یہ موضوع ہے، اس عبرت ناک کہانی کو جاننے اور اس کی تباہی پر رونے کے لیے تاریخ اندلس کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ البتہ اس وقت مناسب ہے کہ مسجد قرطبہ سے متعلق کچھ معلومات درج کر دی جائیں۔

خانۂ خدا کا مصور:

اندلس کا خلیفہ، عبدالرحمٰن اوّل اس مسجد کا بانی ہے۔ اسی نے اس کا نقشہ تیار کیا تھا۔ اپنی رہائش گاہ (قصر) کے قریب ہی ایک زمین منتخب کی، اور اس کی بنیاد میں پہلا پتھر بھی اسی باذوق شخص نے رکھا۔ تعمیر کے تمام عرصہ میں بذات خود اس کا جائزہ لیتا رہا۔ چاہتا تھا کہ یہ مسجد امویوں کی تعمیر کردہ جامع مسجد دمشق یا جامع مسجد بغداد سے کسی طور کم نہ ہو۔ نقشہ میں بنیادی خیال تو وہی رکھا گیا جو مسجد کی صورت کو واضح کرتا ہے۔ یعنی کھلا چوکور صحن، احاطہ کی ہوئی چاردیواری، اور قبلہ کی سمت محراب و منبر وغیرہ۔ اس کے علاوہ اسلام کے دور اول سے اب تک جو عمارتی صناعی اور کاریگری اپنے ارتقا کو پہنچ چکی تھی، عبدالرحمٰن اس کو بھی تعمیر کی طرز کا حصہ بنانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس کی تزئین میں سنگ مرمر اور دوسرے خوبصورت قیمتی پتھر استعمال کیے گئے۔ انیس (۱۹) بلند و بالا دروازے اور اڑتیس (۳۸) محرابیں بنائی گئیں۔ نقشہ میں مسجد کی مرکزی حیثیت قائم رکھ کر، اس کے گرد مکاتب و مدارس، شفاخانے اور سرائیں تجویز کی گئیں۔ گو اس کی زندگی میں اس پورے نقشہ کی تکمیل نہ ہو سکی، بلکہ کہا جاتا ہے کہ اس کے بانی نے زیر تعمیر مسجد میں شامیانہ لگا کر پہلا خطبہ پڑھا۔ اور ۱۷۲ھ میں اس کی نماز جنازہ بھی اسی مسجد میں ادا کی گئی۔

ڈاکٹر محمد اقبال اندلس میں تین ہفتے گزارنے کے بعد واپس ہوئے اور ۲۶ جنوری ۱۹۳۳ء کو پیرس پہنچے۔ دس فروری کو ساحلی شہر وینس سے چلنے والے "کانتے وردی" نامی بحری جہاز میں سوار ہو کر ہندوستان کے لیے روانہ ہو گئے اور بارہ روز تک سطح سمندر پر سفر کرنے کے بعد ۲۲ فروری کو بمبئی کی بندرگاہ پر اترے اور وہاں سے بذریعہ ریل، فرنٹیئر میل سے ۲۵ فروری کو لاہور پہنچ گئے۔

ظاہر ہے یہ ایک طویل سفر تھا جو آپ نے لندن سے فرانس کے شہر پیرس اور وہاں سے اندلس اور اندلس سے پھر پیرس اور پھر وینس سے بحری راستے کے ذریعہ بمبئی اور بمبئی سے لاہور تک کا فاصلہ طے کیا تھا۔ چنانچہ کچھ روز آرام کر کے سفر کی تکان دور کی تاہم احباب سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ لیکن اس سفر کے جو سب سے زیدہ اثر انگیز لمحات تھے وہ اندلس میں گزارے تھے اور وہاں بھی جس چیز نے آپ کو بے حد متاثر کیا تھا وہ مسجد قرطبہ تھی، لہٰذا واپسی پر جو فکری تحائف

آپ اپنے ساتھ لائے وہ آپ کی مشہور اور شاہکار نظم ''مسجد قرطبہ'' کے عنوان سے ہے، جیسا کہ آپ لاہور پہنچنے کے بعد ۲ مارچ کو شیخ اکرام کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

''میں اپنی سیاحت اندلس سے بے حد لذت گیر ہوا وہاں دوسری نظموں کے علاوہ ایک نظم مسجد قرطبہ پر لکھی، جو کسی وقت شائع ہوگی۔ الحمرا کا تو مجھ پر کوئی زیادہ اثر نہ ہوا لیکن مسجد کی زیارت نے مجھے جذبات کی ایسی رفعت پر پہنچا دیا جو مجھے پہلے کبھی نصیب نہ ہوئی تھی''

کیوں نہ اس موقع پر علامہ اقبال کی اس شاہکار نظم مسجد قرطبہ کی ایک جھلک ہم بھی ملاحظہ کریں:

قرطبہ کا نقشِ حسیں:

اے حرم قرطبہ! عشق سے تیرا وجود
عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

تیری بنا پائیدار، تیرے ستون بے شمار
شام کے صحرا میں ہو جیسے ہجوم نخیل

تیرے در و بام پر وادیِ ایمن کا نور
تیرا منار بلند جلوہ گہ جبرئیل

☆

گوروں کی کالی سیاست:

تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے بعد علامہ اقبال واپس ہوئے تو آپ نے پہلے کی طرح پھر فرمایا، ان کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں۔ یہ بیان اس بات کا غماز تھا کہ پہلے کی طرح

اس بار بھی کوئی نتیجہ نہیں نکل سکا۔ دراصل یہ گول میز کانفرنس جیسا کہ ہم نے پہلے کہا برطانوی استعماریت کا تاخیری حربہ تھا، گو دنیا میں اس گوری عفریت کا اقتدار دم توڑ رہا تھا لیکن ان کی کھوپڑی میں بیٹھا حکمرانی کا بھوت ان کے احساس بدتری کو مسلسل خوراک پہنچا کر زندہ رکھے ہوئے تھا۔ گورے اپنی گردن میں لگے سریا سے مجبور تھے، وہ اپنی کالونیوں کے ''کالے غلاموں'' کو یوں با آسانی آزاد کرنے کے حق میں بھی نہیں رہے۔ یہاں ہندوستان کے باسیوں کو بھی وہ تھکا دینا چاہتے تھے، ان کا منصوبہ تھا کہ جاتے جاتے انہیں گڑگڑانے پر مجبور کر دیا جائے اور ان کے ذہنوں میں یہ بات بٹھادی جائے کہ وہ کمزور، نااہل اور ناسمجھ لوگ ہیں، ان میں سیاسی شعور نہیں، مستقبل کے لیے فیصلہ کرنا نہیں آتا تو پھر آزاد اور خود مختار ہو کر حکمرانی کیونکر کر سکیں گے۔ لہٰذا بعد میں بھی انہیں معاشی، اقتصادی اور سیاسی طور پر اپنے ان ہی سابق آقاؤں کی مدد اور سرپرستی درکار ہو گی۔ اس سلسلہ میں گورے عیاروں نے ہندوستان میں بھی اپنے گماشتے تیار کر لیے تھے۔

کالے منافق:

غالباً یہی وجہ تھی کہ اس تیسری (اور آخری) گول میز کانفرنس کی ناکامی کے بعد حضرت اقبال کے لیے سیاسی جلسے جلوسوں میں کوئی کشش باقی نہیں رہی آپ نے دیکھا کہ کئی مفاد پرست سیاست داں جو انگریزوں کے ایجنٹ اور پٹھو ہیں، قوم کے نام پر اپنا الو سیدھا کر رہے ہیں، ڈاکٹر اقبال کے لیے ان کا کردار نہایت افسوسناک تھا۔ خصوصاً انگریزوں کے ایک گماشتے سر فضل حسین کی منافقت آپ پر پوری طرح بے نقاب ہو چکی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں رہا تھا کہ فضل حسین سیاست کے پردے میں انگریز کے لیے کام کر رہا ہے اور یہ بات بھی اب ڈھکی چھپی نہیں رہی تھی کہ اسے مسلمانوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ لہٰذا یہ گول میز کانفرنسیں گویا ایک طرح سے بہلاوا تھیں اور ہندو مسلمان دونوں ہی اس فریب کا شکار ہوتے رہے تھے۔ لیکن ان نام نہاد کانفرنسوں کی ناکامی کے زیادہ تر ذمہ دار وہ ہندو لیڈر تھے جو مسلمانوں کے مطالبات پر غالب آنا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے ان کی ہٹ دھرمی اور میاں سر فضل حسین جیسے انگریز کے گماشتے ان کے اقتدار کو طول دینے کے لیے ہندو مسلم چشمک زنی کو ہوا دینے میں پیش پیش رہتے تھے۔

سیاست سے بددلی:

علامہ صاحب کی سیاست سے بددلی کی دوسری وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں میں کوئی اس فہم و فراست کا پرزور رہنما نہیں تھا جو چالاک ہندوؤں کی شاطرانہ چالوں کو جنہیں انگریز کی آشیرباد حاصل تھی ناکام بنانے کی صلاحیت رکھتا۔ یہی وجہ تھی کہ اقبال نے لندن میں قیام کے دوران بیرسٹر محمد علی جناح سے درخواست کی بلکہ انہیں مجبور کیا تھا کہ وہ آئیں اور مسلمانوں کی رہنمائی کریں اس لیے کہ اس وقت انہی جیسے اہل اور صاحب فہم و فراست رہنما کی ضرورت ہے۔

تاہم مسلمانوں کا ایک اہم اور بنیادی مطالبہ جو ہندوؤں کو ہضم نہیں ہو رہا تھا وہ تھا جداگانہ انتخاب، جس میں مسلمانوں کی قومی بقا اور ان کا تشخص مضمر تھا۔ لیکن مسلمان رہنماؤں کی اکثریت اپنے مطالبات کو مدلل اور پراثر بنانے میں کامیاب نہیں ہو پا رہی تھی، بلکہ بعض رہنما سر فضل حسین جیسے گندم نما جوفروشوں کی باتوں میں آ کر اس کی چالاکی کا شکار ہو رہے تھے۔ ان باتوں نے اقبال کو موجودہ سیاسی ماحول سے کافی حد تک بیزار کر دیا تھا۔ اپنی اس کیفیت کا اظہار آپ نے مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے نام ایک مکتوب میں اس طرح کیا۔

قومی درد برقرار:

"گزشتہ چار پانچ سال کے تجربے نے مجھے بہت دردمند کر دیا ہے، اس لیے جلسوں میں میرے لیے کوئی کشش باقی نہیں رہی، میں کہیں نہیں جا رہا، نہ پٹنہ نہ کانپور......"

تاہم یہ نہیں کہ آپ قومی معاملات سے بالکل قطع تعلق ہو کر اور گوشہ نشیں ہو گئے تھے۔ یہ تو آپ کے لیے ممکن ہی نہ تھا، قوم کا درد جو آپ کے دل میں تھا اس میں روز افزوں شدت پیدا ہو رہی تھی، موقع موقع سے آپ اپنے بیان کے ذریعہ اپنی آرا اخبارات کی زینت بناتے رہتے تھے۔ خصوصاً کشمیر کا مسئلہ آپ کی گہری توجہ لیے ہوئے تھا۔ کشمیر کے معاملہ سے آپ کی دلچسپی کا اندازہ آپ کے ان بیانات سے لگایا جا سکتا ہے جو اس وقت تواتر کے ساتھ اخبارات میں شائع ہو رہے تھے۔ یہ بیانات "حرف اقبال" کے نام سے ایک کتاب میں جمع کر دیے گئے ہیں۔ ان میں سے ہم صرف ایک بیان کی جھلک دیکھنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ ۷ جون ۱۹۳۳ء کے ایک بیان

میں آپ نے کشمیری مسلمانوں کو مشورہ دیا۔

"وہ ان تحریکوں سے خبردار ہیں جو ان کے خلاف کام کر رہی ہیں۔ (یقیناً یہ اشارہ قادیان کے مرزا بشیر الدین محمود کی طرف ہو سکتا ہے)۔ اپنے اندر اتفاق و اتحاد پیدا کریں، کیونکہ جب تک کشمیر کو ایک سیاسی خیال پر متفق حمایت حاصل نہ ہوگی، ریاست کے لوگوں کے مفاد کی ترقی کے لیے لیڈروں کی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔"

کچھ وجوہ کی بنا پر کشمیر کمیٹی تحلیل کر دی گئی، تب بھی ڈاکٹر اقبال کی کشمیر سے دلچسپی اور اہل کشمیر سے ہمدردی بدستور قائم رہی۔ ۳۰ جون ۱۹۳۳ء کو آپ نے مسلمانانِ ہند سے اپیل کرتے ہوئے فرمایا۔

"گزشتہ چند سال سے مسلمانانِ خطہ جن مصائب و مشکلات میں مبتلا ہیں ان کے تذکرے کی چنداں ضرورت نہیں، اس لیے کہ یہ وہ مصائب و مشکلات ہیں جن کا چرچا نہ صرف آپ کے ہر شہر، ہر گاؤں اور ہر گھر میں ابتدا ہی سے رہا ہے اور اب تک موجود ہے، بلکہ ان کا قومی احساس اکثر مواقع پر افرادِ قوم کے سوئے ہوئے ملی جذبات کو بیدار کر کے انہیں اخوتِ اسلامیہ کے بھولے ہوئے سبق از سرِ نو یاد دلانے اور ملتِ مرحوم کے عناصر کو فعال بنانے کا موجب بن چکا ہے۔ موجودہ زمانے میں ہندوستان کے اندر تحریکِ خلافت کے بعد، تحریکِ کشمیر ہی ایک ایسی تحریک ہے جس سے خالص اسلامی جذبات کو عملی تشکیل کا موقع ملا اور اس نے قوم کے تنِ مردہ میں حیاتِ تازہ کی لہر ایک دفعہ پھر دوڑا دی۔"

☆☆

maablib.org

زمینِ افغان سے بلاوا:

پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے کہ اقبال، شاہ افغانستان کے دل میں گھر کر چکے تھے۔ خود علامہ صاحب کو بھی نادر شاہ، بلکہ خطہ افغان سے ایک دلی وابستگی تھی۔ یا اگر یوں کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ کونسا ملک اور خطہ ہے جو مسلمانوں سے منسوب ہو اور اقبال کا دل وہاں کے لیے نہ دھڑکتا ہو۔

افغانستان کے نئے حکمران نادر شاہ مختلف شعبوں میں اصلاحات کر رہے تھے۔ خصوصاً افغانوں میں تعلیم کو عام کرنے کا عزم رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں مشاورت اور رہنمائی کے لیے شاہ صاحب نے ہندوستان سے علامہ اقبال، سید سلیمان ندوی اور علی گڑھ یونیورسٹی کے روح رواں سر راس مسعود کو اپنے ہاں مدعو کیا۔

اور آپ سوچ رہے ہوں گے، سر راس مسعود کیا نام ہے تو اس کی وجہ تسمیہ ہے کہ ان کے والد یعنی سرسید کے فرزند محمود جو اپنے والد صاحب کے جانشین بن رہے تھے اور علی گڑھ کالج کے سربراہ تھے، حالانکہ سرسید اپنے اس فرزند کو ان کی بدمستی کے سبب ناخلف سمجھتے تھے بلکہ ان کی وجہ سے سرسید کے کئی قریبی ساتھیوں نے ان سے منہ موڑ لیا تھا۔ وہ محمود کو ان کی جگہ لینے کے سخت خلاف تھے، باپ بیٹے کے اس مزاجی اختلاف کی بازگشت عام ہو چکی تھی جو ابھی جاری تھی کہ سرسید انتقال کر گئے۔

یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا، ہمارا حاصل ذکر یہ ہے کہ محمود احمد کی علی گڑھ کالج کی انتظامیہ کے

ایک اہم رکن مسٹر بک سے بڑی یاری تھی، ان کی قربت اور ہم مشربی کا اندازہ اس سے لگایئے کہ جب ان کے ہاں بیٹے کی ولادت ہوئی تو انہوں نے اس کا نام اپنے اس انگریز دوست کے نام پر رکھا یعنی اس کے نام کا لاحقہ راس تھا، سو محمود احمد نے بیٹے کا نام مسعود رکھا لیکن اس نام سے پہلے راس کو اس نام کا حصہ بنادیا۔ تو یوں وہ راس مسعود کہلانے لگے۔

راس مسعود کے لئے کہا جاتا ہے کہ جب وہ لندن سے بیرسٹری کر کے آئے تو ان کی والدہ نے وکالت کے پیشے سے اچھا نہیں سمجھا، چنانچہ بیرسٹر ہو کر انہوں نے والدہ کی خوشنودی کی خاطر وکالت نہیں کی۔ یہی راس مسعود جب علی گڑھ کالج کے منتظم اعلیٰ ہوئے تو انہی دنوں ڈاکٹر اقبال کا کالج میں جانا ہوا اور پہلی ملاقات میں علامہ صاحب نے راس مسعود کو اپنے پسندیدہ لوگوں کی فہرست میں شامل کرلیا۔ بعد میں یہ دوستی بہت گہری ہوگئی اور خود راس مسعود علامہ صاحب کے گرویدہ ہوگئے اور آپ کے لیے کئی بھلے کام کئے۔ لیکن افسوس جوانی میں ہی ان کا انتقال ہوگیا۔

یہ تینوں شخصیات تعلیمی مقاصد کے لیے کس قدر موزوں تھیں، ان کا انتخاب بجائے خود نادر شاہ کی فہم و فراست اور معاملہ فہمی کے ساتھ جوہر شناسی کا بین ثبوت ہے۔ یعنی اس اتحاد ثلاثہ شخصیات میں ایک مفکر ہے یعنی حکیم الامت اقبال کہ ملت اسلامیہ کی فکر و نظر کی بلند پروازی کے لیے کس نصاب کی ضرورت ہے، آپ سے زیادہ اس وقت کون جانتا تھا، دوسرے سر راس مسعود کی تھے جو تعلیمی امور میں انتظام و انصرام کے حوالے سے اپنی شخصیت منوا چکے تھے اور تیسرے شخص سید سلیمان ندوی جو دین و تاریخ پر گہری نظر رکھتے تھے۔ سیرت نگار اور تاریخ داں تھے۔

ہندوستان میں افغان ناظم الامور نے دعوت نامہ پہنچانے کے ساتھ ہی اپنی اس خواہش کا بھی اظہار کیا کہ تینوں حضرات کی کابل میں تشریف آوری ۱۳ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو ہوتا کہ جشن استقلال میں بھی شریک ہوسکیں۔ لیکن اس قدر جلد پاسپورٹ تیار ہونے کا امکان نظر نہیں آتا تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ کچھ بیج کیاں تھیں یعنی انگریز انتظامیہ کو افغانستان کی طرف سے کچھ خدشات و تحفظات تھے۔

ڈاکٹر محمد اقبال اور راس مسعود کے پاسپورٹ ۱۷ اکتوبر کو مل گئے اور دونوں حضرات نے ۲۰ اکتوبر کو لاہور سے پشاور روانگی کا پروگرام بنالیا۔ روانہ ہونے سے ایک روز قبل علامہ اقبال نے

انگریز انتظامیہ کو خاطر جمع رکھنے کے لیے ایک اخباری بیان میں سفر افغانستان کے مقصد کی وضاحت کرنا ضروری سمجھا۔ فرمایا۔

"تعلیم یافتہ افغانستان، ہندوستان کا بہترین دوست ہو سکتا ہے۔ کابل میں ایک نئی یونیورسٹی کا قیام، اور ہندوستان اور افغانستان کی مغربی سرحد پر واقع پشاور میں اسلامیہ کالج کو دوسری یونیورسٹی میں منتقل کرنے کی اسکیم، ہندوستان اور افغانستان کے درمیان علاقہ میں آباد ہوشیار افغان قبائل کی فلاح و بہبود کے لیے بہت زیادہ ممد ثابت ہو گی۔ شاہ افغانستان نے ہمیں دعوت دی ہے کہ ہم وہاں وزیر تعلیم کو مشورہ دیں کہ وہ کابل میں یونیورسٹی کے قیام کو ممکن بنائیں۔ اس لیے ہم نے اس دعوت کو قبول کرنا اپنا فرض سمجھا ہے۔ پتا چلتا ہے کہ افغانوں کی نئی نسل، نئے علوم کی تحصیل اور انہیں اپنے دین و تمدن کے سانچے میں ڈھالنے کی بے حد خواہش مند ہے۔ افغان فطرتاً بہت خلیق لوگ ہیں، اور ہندوستانیوں کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کی ترقی میں ان کا ہاتھ بٹائیں۔ یہ امر بالکل واضح ہے کہ افغانوں میں ایک نئی بیداری پیدا ہو رہی ہے اور ہمیں امید ہے کہ ہندوستان کے اندر تعلیمی تجربہ کی روشنی میں ہم انہیں تعلیمی مسائل سے متعلق مفید مشورہ دے سکیں گے۔ میرے ذاتی خیال میں سیکولر تعلیم سے، خصوصاً مسلم ممالک میں اچھے نتائج برآمد نہیں ہوئے۔ بہر حال کسی نظام تعلیم کو قطعی نہیں کہا جا سکتا، ہر ملک کی اپنی ضروریات ہوتی ہیں، اور ان ضروریات کی روشنی میں اس کے نظام تعلیم کا تعین ہوتا ہے۔"

مصروفیات:

ڈاکٹر اقبال اور راس مسعود پشاور سے روانہ ہوئے اور ۲۳ اکتوبر کو کابل پہنچے۔ انہیں کابل کی نئی آبادی دارالامان کے شاہی مہمان خانے میں ٹھہرایا گیا۔ سید راس مسعود کے ساتھ پروفیسر ہادی حسن اور ڈاکٹر اقبال کے ساتھ بیرسٹر غلام رسول خان، سیکریٹری کے طور پر آئے تھے، علامہ صاحب اپنے ملازم خاص علی بخش کو لیے بغیر کہیں جانے کا تصور ہی نہیں کر سکتے تھے۔

دو تین روز تک تعلیمی معاملات کے بارے میں کئی اجلاس ہوئے۔ ان "ہندوستانی" مشیروں کے ساتھ حکومت افغانستان کے کئی سر کردہ نمائندوں نے بھی شرکت کی۔ کابل کی بلدیہ

نے ان کے اعزاز میں ایک دعوت چائے کا اہتمام کیا۔

نقوشِ ماضی:

اقبال کسی ملک میں اور خصوصاً اسلامی ملک میں جائیں اور وہاں آسودہ خاک مشاہیر کی سلامی کو حاضر ہوں، نا ممکن نہ تھا۔

افغان مہماندار سرور خان گویا کے ہمراہ مغل بادشاہ ظہیر الدین بابر کے مرقد پر گئے۔ یہ مقبرہ کابل کے بیرون ایک ویران سے دامن کوہ میں واقع ہے۔ مختصر سی عمارت ہے، جس پر چھت ہے لیکن ایسا کوئی روایتی گنبد نہیں جو عام طور پر مقبروں کے لیے مخصوص نظر آتا ہے۔

مردِ دلکشا:

نادر شاہ سے علامہ اقبال اور سید راس مسعود کی ملاقات ''قصر دلکشا'' میں ہوئی۔ ڈاکٹر اقبال نے شاہ کو قرآن حکیم کا تحفہ پیش کیا۔ اس سے اقبال کی قرآن سے محبت اور لگاؤ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، یہی اللہ کی کتاب ہے جسے آپ ہمیشہ اپنے ذہن و دل کے قریب محسوس کرتے رہے۔ چنانچہ آپ نے اس شخص کو وہ چیز تحفہ میں پیش کی جو خود آپ کی اپنی ذات کے اندر سموئی ہوئی تھی۔ ملاقات جاری تھی کہ نماز عصر کا وقت ہو گیا۔ نادر شاہ نے علامہ صاحب سے امامت کی درخواست کی، لیکن اس فقیر خدامست نے جواباً کہا۔

''نادر! میں نے اپنی عمر کسی شاہ عادل کی اقتداء میں نماز پڑھنے کی تمنا میں گزار دی، آج جبکہ اس فقیر کی اس مراد کو پورا کرنے کے اسباب مہیا کر دیئے ہیں تو کیا تو مجھے اس نعمت سے محروم کرنا چاہتا ہے۔ آج میں تیری امامت میں نماز پڑھوں گا۔ امامت تجھ ہی کو کرنی ہو گی۔''

☆☆

علم وفضل کی انجمن:

۲۷راکتوبر کی شب کو، سید سلیمان ندوی بھی ان سے آن ملے۔ آج کے عشائیے کا اہتمام صدر اعظم سردار ہاشم خاں کے ہاں کیا گیا تھا۔ ہاشم خان نے ہندوستانیوں کا استقبال کیا اور انہیں کھانے کے کمرے میں لے گئے، کھانا میز پر لگا تھا۔ ہر چیز یورپین طریقہ سے آراستہ تھی۔ کھانے کے دوران مختلف باتوں کا سلسلہ چھڑ گیا۔ دورانِ گفتگو سرور خان گویا نے سید سلیمان ندوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''مولانا پوچھ رہے ہیں کہ افغانستان کے ارباب کمال کے حالات تو رسالہ ''کابل'' میں شائع ہوتے رہتے ہیں، لیکن جس شخص نے سب سے پہلے اہل کابل کو دعوت اسلام دی، اس کا ذکر ابھی تک نہیں کیا گیا۔'' سب نے پوچھا، ''وہ کون بزرگ ہیں؟''۔ سید صاحب نے بتایا...... ''وہ مقاتل بن حیان ہیں''۔

اس تاریخی معلومات کے بعد وزیر خارجہ افغانستان سردار فیض محمد خان نے افغانستان کی تاریخ پر گفتگو شروع کی اور پنجاب کی قدیم سلطنتوں اور افغانستان کے تعلق کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا۔ سید راس مسعود نے اپنا حصہ اس طرح ڈالا کہ وہ جاپان کے کئی سفر کر چکے تھے، چنانچہ ان کی روئیداد سنائی، جبکہ ڈاکٹر اقبال نے فلسفہ اور سیاست کے مختلف پہلو اور گوشوں کو اجاگر کیا۔

کھانے سے فارغ ہو کر مہمان، دوبارہ ملاقات کے کمرے میں آ گئے۔ یہاں چائے، کوفی اور تمباکو نوشی وغیرہ سے تواضع کی گئی۔ میزبان سردار ہاشم خان نے دریافت کیا۔

''گانا سننے میں کوئی حرج تو نہیں؟''......

غالباً سب نے سید سلیمان ندوی کی طرف جواب طلب نظروں سے دیکھا۔سید صاحب نے فرمایا...... ''بلا ساز کوئی مضائقہ نہیں''۔

ہاشم خان غالباً لفظ ساز کو صحیح طور پر فہم نہیں کر پائے، فوراً بولے...... ''ہمارے یہاں رنڈی منڈی نہیں ہوتی، مرد لوگ گاتے ہیں''۔علامہ اقبال نے ان کی تائید کی۔''ایسا ہی ہے''۔

کچھ ہی دیر میں گویوں کا ایک دستہ آ گیا، آداب بجالا کر قالین پر بیٹھ گیا اور اجازت لے کر نغمہ سرائی شروع کر دی۔حافظ شیرازی اور بیدل کی غزلوں نے سماں باندھ دیا۔رات کوئی گیارہ بجے تک یہ محفل سماع گرم رہی۔

☆☆

maablib.org

اُخوت جاگ جائے گی:

ہم اقبال کے دورہ افغانستان کو اس لیے تفصیل سے بیان کر رہے ہیں کہ ہمیں معلوم ہو سکے، کہ آج اور کل کے افغانستان میں کیا فرق ہے؟ کیا آج کا افغانستان وہی ہے جس کی محبت میں اقبال ایسا مرد مومن سرشار تھا۔ اور جس کا مرد کوہستانی آپ کا آئیڈیل تھا، اور ہندی اہل ایمان افغان برادران اسلام کے ہر دکھ سکھ میں شریک تھے اور اسلام کے شیدائی اہل افغان بھی اپنے ہندی برادران اسلام سے ٹوٹ کر محبت کرتے تھے۔ لیکن آج جس افغانستان کا نقشہ ہمارے سامنے ہے وہ کچھ اور ہی داستان سنا رہا ہے۔ اپنے پڑوسی اسلامی برادر ملک پاکستان کے ساتھ رشتہ اخوت استوار کرنے کی بجائے بت پرستوں کے ساتھ برادری کا ناتا جوڑ رہا ہے، جہاد کے نام پر دہشت گردی نے جگہ لے لی ہے۔ جو پاکستان کے معصوم اور بے گناہ لوگوں پر آگ اور خون برسا رہی ہے۔ تو کیا یہ سب اسلام دشمن طاقتوں کی سازش نہیں؟ یقیناً یہ وہی ہیں جو اپنے مفادات کے لیے اس درندگی کو عام کیے ہوئے ہیں اور کلمہ گو بھائیوں کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کر کے ان میں نفاق اور اتحاد بین المسلمین میں دراڑیں ڈال رہے ہیں۔ لیکن ہمارا ایمان ہے کہ بہت جلد یہ غلط فہمی دور ہو جائے گی۔ یہ کن فیوژن ختم ہو جائے گا، پاک و افغان تعلقات ایسے ہی بغل گیر ہوں گے جیسے لاہور اسٹیشن پر اقبال اور نادر شاہ ایک دوسرے کو گلے لگائے ہوئے تھے۔

☆☆

صاحبِ مقصورہ:

اس وقت ہم ماضی کے جھروکوں میں جھانک کر دیکھ رہے ہیں کہ یہ ۱۹۳۳ کا ستائیسواں دن ہے، جمعۃ المبارک ہے، امیر افغانستان نادر شاہ جیسا کہ ان کا معمول ہے، مختلف مساجد میں جا کر جمعہ ادا کرتے ہیں۔ آج اتفاق ہے کہ شہر کی سب سے بڑی اور مرکزی مسجد "پُل خشتی" کی باری ہے۔" حضرت اقبال بھی اپنے رفقاء کے ساتھ اسی خانہ خدا میں حاضر ہو رہے ہیں۔ مسجد صدر دروازے سے تا محراب، نمازیوں سے بھری ہوئی ہے۔ حاضرین میں بڑی تعداد غریب عوام کی ہے۔ منبر پر خطیب فارسی میں وعظ فرما رہے ہیں، ہندی مہمانوں کو "مقصورہ"، یعنی مسجد کے اس حفاظتی حصہ میں لے جایا گیا ہے جو امیر ملک کی نماز کے لیے مخصوص ہے۔ کچھ ہی دیر جاتی ہے کہ بادشاہ افغانستان، حقیقی بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوتا ہے، نہایت سادگی سے اسی "مقصورہ" میں داخل ہو کر مہمانوں سے مصافحہ کرتا ہے اور ادب سے بیٹھ جاتا ہے۔

خطیب نے تقریر ختم کی اور اذان کی آواز تھمتے ہی حاضرین سنتوں کے لیے کھڑے ہو گئے۔ خطیب صاحب نے عربی میں خطبہ شروع کیا۔ اللہ اور رسول اور مسلمانوں کے اکابرین اور شیوخ اسلام کے اسمائے مبارک کے بعد آخر میں غازی و مجاہد شاہ نادر خان کا نام لیا تو نادر شاہ نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر تواضع کے انداز میں سر کو جھکا دیا۔

جمعہ کا دوگانہ ادا کیا گیا۔ پھر بقیہ سنتوں کی ادائی اور دعا کے بعد نادر شاہ مہمانوں سے مخاطب ہوئے۔

''میں نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا ہے۔ اگر آپ لوگ پسند فرمائیں تو میرے ساتھ چل کر کھانا تناول کریں۔''

مہمانوں نے دیگر مصروفیات کے سبب معذرت کر لی اور نادر شاہ ''فی امان اللہ'' کہہ کر رخصت ہو گئے۔

اقبال اور سی پیک:

مسجد سے واپسی پر کار میں علامہ اقبال اور سید سلیمان ندوی کے ساتھ ایک اور صاحب بھی بیٹھ گئے، ان سے تعارف کے بعد چینی ترکستان سے متعلق گفتگو چھڑ گئی، اس دوران علامہ صاحب کی فراست کا باب کھل گیا، آپ کی دور رس نگاہیں مستقبل کا منظر دکھانے لگیں، آپ نے بتایا۔

''یورپ نے اپنی اس نئی ترقی میں اپنا سارا زور بحری طاقت پر صرف کیا اور ہر قسم کی تجارتی آمدورفت اور سیر وسیاحت کے راستے دریائی کے رکھے اور اپنے انہی جہازوں کے ذریعہ سے مشرق کو مغرب سے ملا دیا ہے۔ لیکن اب یہ نظر آ رہا ہے کہ ان بحری راستوں کی یہ حیثیت جلد فنا ہو جائے گی۔ اب آئندہ مشرق وسطیٰ کا رستہ مشرق و مغرب کو ملائے گا اور تری کے بجائے خشکی کا راستہ اہمیت حاصل کرے گا۔ تجارتی قافلے اب موٹروں، لاریوں، ہوائی جہازوں اور ریلوں کے ذریعہ مشرق و مغرب میں آئیں جائیں گے۔ اور چونکہ یہ پورا رستہ اسلامی ملکوں سے گزرے گا اس لیے اس انقلاب سے ان اسلامی ملکوں میں عظیم الشان اقتصادی و سیاسی انقلاب رونما ہوگا اور اس وقت پہلے کی طرح پھر افغانستان کو دنیا کی شاہراہ بننے کا موقع ملے گا۔ اس لیے ابھی سے اس کی تیاری کرنی چاہیے۔''

ظہرانے کا اہتمام مہمانوں کی قیام گاہ دارالامان میں کیا گیا۔ ان کے ساتھ کھانے میں جو شخصیات شریک ہوئیں وہ سردار فیض محمد خان، اللہ نواز خان اور سرور گویا تھے۔

ملا شور بازار کا دھیما پن:

شام کو چار بجے، مجددی سلسلہ کے روحانی پیشوا ''ملا شور بازار'' نور المشائخ سے ملاقات کا وقت مقرر تھا۔ ملا شور بازار افغانستان کی بہت مشہور اور نہایت محترم شخصیت ہے، ان کا اصل نام

فضل عمر ہے، ان کے مریدین کی ایک کثیر تعداد نہ صرف شہر کابل اور قبائل میں بلکہ فوج میں بھی موجود ہے۔ ملا شور بازار ۱۹۱۸ء کی جنگ افغانستان میں جو برطانوی استعمار و مداخلت کاروں کے ساتھ لڑی گئی، جرنیل محمد نادر خان کے ساتھ شریک جہاد رہے، لیکن جب سربراہ افغانستان امان اللہ خان ملک میں اصلاحات کے اجراء میں اعتدال سے تجاوز کر گیا تو وہ وطن چھوڑ کر ہندوستان چلے گئے۔ پھر امان اللہ کے خلاف نادر خان کو کامیابی ملی اور وہ برسر اقتدار آ گئے تو ملا شور بازار بھی واپس آ گئے۔ نادر خان نے انہیں وزیر عدالت کا منصب تفویض کیا، لیکن وہ زیادہ عرصہ اس ذمہ داری کو نہ نبھا سکے اور اس کو اپنی درویشی اور صوفیانہ مسلک کےخلاف سمجھ کر اس عہدے سے دست بردار ہو گئے۔

حضرت علامہ اقبال کے ساتھ سید سلیمان ندوی بھی ان کی قیام گاہ پر گئے۔ ڈاکٹر اقبال کی موصوف سے یہ دوسری ملاقات تھی۔ لاہور میں ایک بار وہ خود آپ سے ملنے آئے تھے۔ اس مرد درویش کی رہائش گاہ کابل کی ایک تنگ گلی کے اندر پیچ کر تھی۔ مکان ہر قسم کے ظاہری آرائش سے پاک تھا، سادگی پوری طرح سایہ فگن تھی۔ ایک نظر میں ہی اندازہ ہو گیا کہ یہ واقعی کسی مرد قلندر کا ٹھکانا ہے، مکان کی عمارت میں کوئی نشست گاہ بھی نہیں، زنان خانے کی طرف پردہ گرا کر مہمانوں کو اندر بلا لیا گیا۔ یہ ایک کشادہ کمرہ تھا، جس میں ایک طرف پلنگ قسم کی چارپائی تھی، باقی حصے میں زمین پر سادہ سا فرش بچھا تھا، صاحب خانہ پلنگ پر تشریف فرما تھا۔ علامہ اور سید سلمان ندوی سلام دعا کے بعد فرش پر بیٹھ گئے۔ مگر ملا شور بازار اپنی ہی جگہ بیٹھے رہے، معلوم ہوا، پاؤں میں کوئی تکلیف ہے جس کے سبب آج کل چلنے پھرنے سے معذور ہیں۔ خیر و عافیت معلوم کرنے کے بعد گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا۔ ہندوستان کے حالات اور افغانستان میں "بچہ سقہ" کے ہنگامے سے متعلق باتیں ہوئیں، اس دوران چائے آ گئی۔

رخصت کے وقت مُلّا نے علامہ صاحب کو بادام اور انجیر تحفہ کے طور پر پیش کیے۔

محبت کا فوارہ:

یہاں سے دونوں مہمانوں کو اللہ نواز خان کے مکان پر لے جایا گیا۔ جہاں افغانستان میں مقیم برصغیر کے کوئی ڈیڑھ سو باشندوں نے ان کے اعزاز میں چائے کا انتظام کر رکھا تھا۔ سید راس

مسعود وہاں پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ یہ تقریب ایک باغ کے اندر منعقد کی گئی تھی۔ سردی اچھی خاصی تھی اور راس مسعود کو زکام تھا، اس پر کسی نے باغ کے درمیان لگا ہوا فوارہ کھول دیا، لیکن سید راس مسعود کی درخواست پر اسے بند کر دیا گیا، اسی وقت سردار فیض محمد خان نے برجستہ ایک شعر پڑھا۔ جس میں فوارہ کا ذکر تھا مگر اس طرح کہ پہلا مصرع کسی اور شاعر کا تھا اور دوسرا ان کا اپنا تھا، احباب کے اصرار پر ڈاکٹر اقبال نے پہلے مصرع میں تبدیلی کر دی۔

چائے وغیرہ سے فارغ ہوئے تصویریں اتاری گئیں اور تقریروں کا سلسلہ شروع ہوا۔ میزبانوں کی طرف سے مولانا محمد شبیر نے مہمانوں کے لیے خیر مقدمی الفاظ ادا کیے۔ اور حکومت افغانستان کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے ایسے لائق ترین مشاہیر کو اپنے ہاں مدعو کیا ہے۔ مولانا شبیر نے ہندوستان کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”حالات دگرگوں سہی تاہم مایوس نہیں ہونا چاہیے کہ مصیبت کے بعد راحت آتی ہے۔“ مہمانوں کی طرف سے سید سلیمان نے تقریر کی۔ کہا کہ ”تاریخ میں ہندوستان نے افغانستان کے معاملہ میں کئی دفعہ گناہ کا ارتکاب کیا ہے اور اب وقت ہے کہ ہمارے بھائی اپنے حسن خدمت سے اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کریں۔“

اس کے بعد علامہ اقبال نے نہایت عالمانہ اور فکر انگیز خطاب کیا اور اسی پر جلسہ برخاست ہو گیا۔

☆☆

حسنِ میزبانی:

افغان میزبان، ہندوستانی مہمانوں کی صحبت سے فائدہ اٹھانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کر رہے تھے۔ ۲۸ اکتوبر کو سردار محمد ہاشم خاں صدر اعظم، مہمانوں سے ملاقات کے لیے شاہی مہمان خانے میں آئے اور کافی دیر تک ان کی صحبت میں بیٹھے ان سے گفتگو و شنید کرتے رہے۔ تینوں مہمانوں نے اپنے اپنے طور سے انہیں افغانستان کی تعمیر و ترقی کے لیے مشورے دیے۔ خصوصاً افغانستان میں پائی جانے والی معدنیات کی طرف توجہ دلائی اور سڑکوں کی تعمیر پر زور دیا تاکہ وسطی ایشیا کا افغانستان کے ذریعہ تجارتی راستہ فعال ہو جس سے افغانستان کی اقتصادی ترقی

کو فروغ حاصل ہو سکے گا۔

مردِ کوہستانی:

وزیر خان فیض محمد خان اور دوسری حکومتی شخصیات اللہ نواز خان تقریباً روز ہی ان سے ملنے آتے اور افغانستان کے انتظامات اور تعلیمی امور پر مشورے طلب کرتے۔

ایک بار پھر یہ تینوں مہمان افغان سربراہ نادر شاہ سے ملاقات کے لیے "قصرِ دلکشا" گئے۔ اس ملاقات کی خصوصی قابل ذکر بات یہ ہے کہ نادر شاہ نے زیادہ تر گفتگو اردو میں کی۔ دوران گفتگو انہوں نے سید سلیمان ندوی سے ان کے ادارہ سے نکلنے والے رسالے "معارف" کا ذکر کیا کہ وہ باقاعدگی سے ان کے زیر مطالعہ رہتا ہے۔ ندوی صاحب نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ افغان نوجوانوں میں مذہبی شیفتگی کے فروغ اور اسلامی اقدار سے دلچسپی کے لیے کابل میں بھی دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنو جیسی درس گاہ قائم کریں۔

نادر شاہ نے آخر میں ان حضرات سے جو گزارش کی وہ ایک ایسے سچے اسلام پسند کے دل کی آواز ہے جو اتحاد بین المسلمین کے لیے اپنے اندر تڑپ رکھتا ہو۔ انہوں نے وفد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"آپ ہندوستان جا کر مسلمانوں کو یہ پیغام پہنچا دیں کہ آج ہم کو اور ان کو اتفاق و اتحاد کی سب سے زیادہ ضرورت ہے اور ایک دوسرے کی حالت کو درست کرنے میں معاونت کی جائے تو بہتر ہے"۔ مزید اپنے عزائم کا اظہار کیا:

"میری کوشش ہے کہ افغانستان میں دین و دنیا کو جمع کر دوں اور ایک ایسے اسلامی ملک کا نمونہ پیش کروں۔ جس میں قدیم اسلام اور جدید تمدن کے محاسن یک جا ہوں۔"

اس مردِ مجاہد کا لب ولہجہ اخلاص اور خاکساری کا نغمہ بن گیا۔ "میں دین وملت کا خادم ہوں اور افغانستان کو صرف افغانوں کا ملک نہیں بلکہ مسلمانوں کا ملک سمجھتا ہوں، اور چاہتا ہوں کہ ہمارے مسلمان بھائی بھی اس کو اپنا ملک سمجھیں...... میرے بھائیوں کو کہہ دیجیے گا کہ دنیا میں ایک نئے انقلاب کا مواد تیار ہو رہا ہے۔ ضرورت ہے کہ مسلمان اپنی اقتصادی اور تعلیمی استعداد اس کے

لیے پہلے سے تیار کرلیں۔"

مردِ غازی:

بقول سید سلمان ندوی، نادر شاہ نہایت شیریں اخلاق منکسر المزاج، پُرمحبت اور رقیق القلب انسان تھے، اور ان کی آنکھیں مولانا محمد علی جوہر کی طرح اشکباری کے لیے ہمہ وقت تیار رہتی تھیں۔"

ظاہر ہے انہیں مومنانہ صفات کے تو اقبال عاشق تھے۔ یہ نہ ہوتا تو اقبال اس مردِ غازی کو لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر گلے لگانے نہ جاتے۔ اور خود یہ غازی بھی اقبال کے مقام و مرتبہ سے واقف نہ ہوتا۔ آپ کو مشورے کے لیے زحمت نہ دیتا۔

حرفِ عرب:

یہ حضرات اسی روز یعنی ۲۸ اکتوبر کو شام چار بجے وزیرِ دفاع شاہ محمود خان کے ہاں چائے پر مدعو کیے گئے۔ اس ملاقات میں مخصوص اور چیدہ حضرات کو بلایا گیا تھا، چائے کے دوران مختلف موضوعات پر گفتگو ہوئی، سید سلیمان ندوی نے افغانستان میں مذہبی عربی تعلیم کے متعلق اپنے منصوبے کا تفصیل سے ذکر کیا۔

شبابِ قلم:

اسی روز ساڑھے سات بجے رات ادبی انجمن کابل کی طرف سے ان حضرات کے اعزاز میں عشائیہ کا انتظام تھا۔ انجمن سے وابستہ اہل علم و قلم اور تعلیم یافتہ نوجوان بھی یہاں آئے ہوئے تھے۔ انجمن کے سیکریٹری شہزادہ احمد علی درانی جو اسلامیہ کالج لاہور کے فارغ التحصیل تھے اور یہاں شاہی سیکریٹریٹ میں کوئی اہم ذمہ داری ان کے سپرد تھی۔

ملتِ کوہسار:

انجمن کے زیرِ اہتمام "ماہنامہ کابل" بہت اہتمام و پابندی سے شائع ہوتا تھا۔ حضرت علامہ کے یہاں دورانِ قیام "کابل" کے شمارے میں ایک نظم "پیامِ اقبال بہ ملتِ کوہسار" شائع ہوئی۔ صدرِ انجمن نے فارسی میں خطبہ استقبالیہ پیش کیا۔ جس میں ہندوستان کے شعراء اور اہل علم کی

تعریف وتوصیف کے بعد اقبال کی علمی وفکری خدمات کا پُر شکوہ الفاظ میں تذکرہ کیا۔ کہا۔

روحِ اقبال:

"شاعر اسلام ڈاکٹر محمد اقبال کے قیمتی آثار وتالیفات ہیں جن میں سے ہر ایک نے اخلاق، سعی وعمل، اجتماع جذبات شرقی ودوستی اور احساسات اسلام پرستی کی اہل ایشیا کے جسموں میں روح پھونکی ہے"۔

خطبہ استقبالیہ کے بعد، افغانستان کے معروف شاعر عبداللہ خان نے مہمانوں کے اعزاز میں ایک طویل نظم پڑھی، جس میں زیادہ اشعار اقبال کی تحسین میں کہے گئے تھے۔ مہمانوں کی طرف سے سید راس مسعود کے سیکریٹری پروفیسر ہادی حسن نے فارسی میں خطاب کیا۔

روح پرور معجون:

بعدازاں راس مسعود نے اپنی برجستہ تقریر میں سید سلیمان ندوی کا بحیثیت عالم تذکرہ کرنے کے بعد، حضرت علامہ اقبال کے متعلق کہا۔

"میرے معزز دوست علامہ اقبال اس گروہ کے نمائندے ہیں جس نے قدیم وجدید عناصر کو ملا کر ان سے ایک روح پرور معجون تیار کیا ہے، میں نہ تو علما کی جماعت سے ہوں اور نہ ہی شعراء کے فرقہ سے، بلکہ میں نے اپنی تعلیم کا دور زیادہ تر یورپ کے ممالک میں ختم کیا ہے، لیکن میرا دل ان دونوں گروہوں کی عظمت واحترام سے سرشار اور لبریز ہے، افغانستان کے نوجوانوں کو چاہیے کہ سفید بالوں کی عزت واحترام کا ہر وقت خیال رکھیں۔ ایسا نہ ہو کہ اختلاف رائے سے ان کی قومی وحدت میں رخنہ پیدا ہو جائے۔ تاریخ شہادت دیتی ہے کہ مسلمانوں کے تمام نقصانات آپس میں نفاق اور تفرقہ کا نتیجہ رہے ہیں۔"

قلم کی جاوداں ہے:

سید سلیمان ندوی نے اپنے خطاب میں کہا۔ "سیاسی حالات ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں، اور سیاسی تعلقات ٹوٹتے جڑتے رہتے ہیں، لیکن علمی وادبی تعلقات دائم اور برقرار رہتے ہیں۔ سلطان محمود کی تلوار عرصہ ہوا ٹوٹ گئی، اور ان کی فتوحات کے اوراق صدیاں ہوئیں بکھر گئے، لیکن

حکیم سنائی غزنوی کا قلم اب تک باقی اور موجود ہے، اوران کی ادبی فتوحات کے اوراق کا شیرازہ اب تک منتشر نہیں ہوا۔ اہلِ سیاست کو ان کی شعبدہ بازیوں میں مصروف رہنے دیجیے۔ اور آیئے کہ ہم قلم وفن کے نام سے محبت ودوستی کا تازہ وعدہ اور عہد رفاقت وآشنائی کو مستحکم کریں۔ اور ہم دونوں اپنے اپنے وطن کے اندر رہ کر علم وادب کے ایک جدید مشرق کی تعمیر میں دوش بدوش کام کریں۔"

آرٹ کی ایجادگری:

دراصل دونوں مقررین کی یہ تقریریں گو کہ بہت پُر مغز تھیں، تاہم سامعین کے لیے رسما اور تمہیداً تھیں، اصل خطاب شاعرِ اسلام علامہ ڈاکٹر محمد اقبال کا سننے آئے تھے، اقبال کا پیغام ان تک پہنچ چکا تھا، آپ کے افکار ونظریات کی بازگشت ان کے ذہنوں میں پڑ چکی تھی، لیکن یہ پہلا موقع تھا کہ وہ مسلمانوں کے اس دردمند اور پیامیِ حق کو اپنے درمیان پا رہے تھے اور اپنی آنکھوں سے آپ کی دید اور کانوں سے شنید کر رہے تھے۔ علامہ صاحب نے اپنے ان محبان کو خطاب کرتے ہوئے جو فرمایا وہ نہایت اثر انگیز اور حقیقت آموز ہے۔

"میرا عقیدہ ہے کہ آرٹ، یعنی ادبیات یا شاعری یا مصوری یا موسیقی یا معماری، ان میں سے ہر ایک زندگی کا معاون اور خدمت گار ہے۔ اسی بنا پر آرٹ کو ایجاد واختراع سمجھتا ہوں نہ کہ آلہ تفریح، شاعر قوم کی زندگی کی بنیاد کو آباد بھی کر سکتا ہے اور برباد بھی۔ اس وقت جبکہ حکومت یہ کوشش کر رہی ہے کہ موجودہ زمانہ میں افغانستان کی تاریخ میں ایک نئی زندگی کی عظمت اور بزرگی کی بجائے موت کو زیادہ بڑھا کر نہ دکھائیں، کیونکہ جب آرٹ موت کا نقشہ کھینچتا ہے اور اس کو بڑھا چڑھا کر دکھاتا ہے، اس وقت وہ سخت خوفناک اور بربادکن ہو جاتا ہے۔ اور جو حسن، قوت سے خالی ہو وہ محض پیامِ موت ہے:

دلبری بے قاہری جادوگری است
دلبری با قاہری پیغمبری است

شعر کی سحرکاری:

شعر کا کمال بعض اوقات لوگوں پر برا اثر مرتب کرتا ہے، کسی قوم کی زندگی کی موقوف علیہ چیزیں محض شکل و صورت میں نہیں ہیں، بلکہ جو چیز حقیقتاً قوم کی زندگی کے ساتھ تعلق رکھتی ہے، وہ تخیل ہے، جس کو شاعر قوم کے سامنے پیش کرتا ہے، اور وہ بلند نظریات ہیں جن کو وہ اپنی قوم میں پیدا کرنا چاہتا ہے۔ قومیں شعراء کی دستگیری سے پیدا ہوتی ہیں اور اہل سیاست کی پامردی سے نشو و نما پا کر مر جاتی ہیں۔ پس میری خواہش یہ ہے کہ افغانستان کے شعراء اور انشا پرداز اپنے ہم عصروں میں ایسی روح پھونکیں جس سے وہ اپنے آپ کو پہچان سکیں۔ جو قوم ترقی کے راستے پر چل رہی ہے اس کی انانیت خاص تربیت کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے مگر وہ تربیت جس کا ضمیر احتیاط کے ساتھ اٹھایا جائے۔ پیر ۱۲ ۱۱ انجمن کا کام یہ ہونا چاہیے کہ نوجوانوں کے افکار کو ادبیات کے ذریعہ سے منتقل کرے اور ان کو روحانی صحت بخشے۔ میں ایک نکتہ اور کہنا چاہتا ہوں۔ مسولینی نے ایک اچھا نظریہ قائم کیا ہے کہ اٹلی کو چاہیے وہ اپنی نجات حاصل کرنے کے لیے ایک کروڑ پتی کو پیدا کرے جو اس ملک کے گریبان کو اینگلوسکسن اقوام کے قرضہ سے نجات دلا سکے، یا کسی دوسرے دانتے کو پیدا کرے جو نئی جنت پیش کرے، یا کسی نئے کولمبس کو پیدا کرے جو ایک نئے براعظم کا پتا لگائے۔ اگر آپ مجھ سے دریافت کریں تو میں کہوں گا کہ افغانستان کو ایک ایسے مرد کی ضرورت ہے جو اس ملک کو قبائلی زندگی سے نکال کر وحدت ملی کی زندگی سے آشنا کر سکے۔"

اس روح کو گرمانے والی تقریر کے بعد کھانا ہوا۔ پھر چائے اور قہوے اور سوختہ بادام اور پستے سے بھی کام و دہن کو نوازا گیا۔ ڈاکٹر صاحب کا حقہ آپ کے رفیق سفر رہتا تھا، اس وقت بھی ساتھ تھا اور علی بخش ان کے اس شوق کا مہتمم تھا۔

قیامت کی گھڑی:

۲۹ ر اکتوبر کی شام کو علامہ صاحب، وزیر خارجہ فیض محمد خان کی معیت میں دوسری اور آخری بار نادر شاہ سے ملنے تشریف لے گئے۔ قصر دلکشا میں قدم رکھتے ہوئے اس وقت علامہ نے سوچا بھی نہ ہوگا کہ اس کے بعد پھر اس مرد مومن سے وہ کبھی نہ مل سکیں گے۔ اگر یہ سوچا ہوتا تو ضرور غالب کی زبان میں فرماتے:

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت میں ملیں گے
جیسے کہ قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

اس ملاقات میں دونوں اسلام کے شیدائیوں کے درمیان کیا راز و نیاز ہوئے، اس سے تاریخ ناواقف اور خاموش ہے۔ لیکن اتنا یقین ضرور ہے کہ اسلام کے فروغ اور مسلمانوں کے مستقبل کے لیے دونوں نے اپنے دلوں کی دھڑکنوں کا باہمی تبادلہ کیا ہوگا۔

☆☆

maablib.org

سوئے غزنیں:

اقبال کے رفقاء کابل سے اٹھارہ میل دور پغمان کی سیر کو چلے گئے اور اقبال اپنے مداحین میں گھرے رہے، رات کو کئی حضرات آپ سے الوداعی ملاقات کے لیے آئے۔ اس طرح صبح آٹھ بجے ہندوستانی مسافروں کا قافلہ سردار خان گویا کی معیت میں غزنیں روانہ ہو گیا۔ حکومت افغانستان نے مہمانوں کے قیام و انتظام کے لیے متوقع رہائش گاہوں میں احکام بھجوا دیے تھے۔ سواری اور بار برداری کے لیے دو موٹر گاڑیوں اور دو عدد لاریوں کا بندوبست کیا گیا تھا۔ ایک موٹر کار میں ڈاکٹر اقبال، سید سلیمان ندوی ڈاکٹر صاحب کے سیکرٹری غلام رسول بیرسٹر اور دوسری میں سید راس مسعود، ان کے سیکرٹری پروفیسر ہادی حسن، سردار خان گویا اور دہلی میں افغان سفارتخانہ کے نمائندے سوار تھے۔ ایک لاری کھانے کے سامان اور کھانا پکانے اور کھلانے والے عملے کے لیے تھی۔ اسی میں یقیناً علی بخش بھی ہوں گے۔ دوسری لاری میں مہمانوں کا سامان و اسباب رکھا گیا تھا۔ لاریوں میں مہمانوں کی حفاظت کے لیے دس بارہ سپاہی اور ان کے افسر بھی سوار تھے۔

کابل سے غزنیں ۹۲ میل کے فاصلے پر ہے، راستہ کسی قدر صاف اور سڑکیں بہتر حالت میں تھیں۔ زمین ہموار تھی تاہم دور دور پہاڑ بھی نظر آتے تھے۔

maqbool.org

خضرِ راہ:

دوپہر کا ایک بجا تھا کہ یہ قافلہ غزنیں پہنچ گیا۔ مسافروں کو سرکاری مہمان خانہ میں اتارا گیا۔ لیکن یہ قیام کرنے کی بجائے، بازار کی سیر کو نکل گئے۔ اور ہندو مسلم اور سکھ دکانداروں سے

ملے۔ واپس آئے، کھانا کھایا اور کچھ دیر آرام کر کے کوئی چار بجے غزنیں میں واقع مزارات اور دوسری عمارات کی زیارت کو چل دیے۔ ان آثار قدیمہ کی سیر اور مشاہدے کو معلومات افزا بنانے کے لیے، افسر مہمان دار سرور خان گویا نے ایک نوے سالہ بزرگ مُلّا قربان کو بلایا جو غزنیں کے گوشے گوشے سے واقفیت رکھتے تھے۔ قافلہ اس خضر کی رہنمائی میں قدیم غزنیں کے معائنہ کے لیے مستعد ہو گیا۔

سنائی کے حضور:

اقبال کو سب سے زیادہ اشتیاق، حکیم سنائی کے مزار کی زیارت کا تھا، اس لیے رفقاء سمیت مہمان خانہ سے پیدل ہی نکل کھڑے ہوئے۔ مقبرہ قریب ہی ایک چھوٹے سے احاطہ کے اندر تھا۔ گنبد والی چار دیواری میں جانے کے لیے ایک چھوٹا سا دروازہ تھا، اندر پہنچے اور پختہ قبر کے اندر سوئی ہوئی صاحب حکمت شخصیت کی بلندیٔ درجات کے لیے دست بدعا ہو گئے۔ حکیم سنائی کی شان جلالت سے کون واقف نہیں، حاضرین میں سے سب ہی اس وقت متاثر تھے لیکن اقبال کی کیفیت ہی اور تھی، اس حاضری کی اثر پذیری کا ان پر یہ عالم تھا کہ وہ اپنے ممدوح کے سرہانے کھڑے ہوئے تو جذبات پر قابو نہ رکھ سکے۔ زور سے رو دیے اور کافی دیر تک گریہ کرتے رہے۔ سنائی غزنوی عہد کے بلند پایا شاعر و عارف ہیں، علوم و فنون میں شعری کمال حاصل کر کے غزنوی بادشاہوں کی قصیدہ سرائی میں مشغول ہو گئے۔ لیکن ایک وقت ایسا آیا کہ مدح سرائی سے بیزار ہوئے اور حرص و طمع کا رستہ چھوڑ دیا۔ عرفانیت کے مطالعہ کی طرف راغب ہوئے اور صوفیا کے رشد و ہدایت کی طرف متوجہ ہوئے۔ خراسان کے شہروں میں سیاحت کرتے ہوئے، سوئے حجاز گئے اور حج کی سعادت حاصل کی۔ اس طرح ۵۱۸ھ میں وطن واپس آئے اور ابو یوسف ہمدانی کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔ خواجہ عمید احمد بن مسعود نے ان کی رہائش کے لیے ایک مکان دیے ، وہیں باقی زندگی گزار کر ۵۳۵ھ میں خالق حقیقی سے جا ملے۔ ان کی ادبیات میں غزلیات، قصائد، رباعیات اور قطعات وغیرہ شامل ہیں، مثنوی ان کے علاوہ ہیں، ان کے نام ہیں: حدیقۃ الحقیقۃ و شریعۃ الطریقۃ، سیر العباد الی المعاد، طریق التحقیق، کارنامہ بلخ، عشق نامہ اور تجریۃ العلم۔

اقبال کو مولانا رومی کے بعد حکیم سنائی سے ایک روحانی وابستگی تھی یعنی مولانا رومی کی عظمت تو اقبال کے دل پر نقش تھی لیکن حکیم سنائی کی عظمت کو بھی آپ نے شریکِ عقیدت کر لیا تھا اور کئی جگہ آپ نے ان سے استفادہ بھی کیا ہے، مثلاً اپنی مثنوی "مسافر" میں "روحِ حکیم سنائی جواب می گوید" کے عنوان سے لکھتے ہیں۔

دل زدیں سر چشمہ ہر قوت است
دیں ہمہ از معجزاتِ صحبت است

یعنی دین ہر قوت کا سرچشمہ ہے اور دین ہی سارے کا سارا صحبت کا معجزہ ہے۔ علامہ اقبال کی سنائی سے عقیدت کا یہ عالم تھا کہ ان کے لیے جو نظم لکھی اس میں نہایت درجہ جذباتیت اور عقیدت پائی جاتی ہے۔ دل کرتا ہے پوری نظم گنگنا کر روح و دل کو مستی سے آشنا کروں، لیکن اس وقت قارئین کا مرکزِ نگاہ اقبال ہے۔ لہٰذا ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ ہم جلد سے جلد اس مرکز کی طرف لوٹ جائیں۔

دانا کا حکمت خانہ:

واپسی پر علامہ صاحب نے اس قافلے کے خضر سے دریافت فرمایا۔

"حکیم سنائی کے مطب کی بھی کچھ خبر ہے آپ کو!"

کہنہ سال "گائڈ" نے بتایا..... "کیوں نہیں، معلوم ہے، حکیم سنائی کا مطب بہت تنگ و تاریک گلیوں کے اندر ہے۔"

اقبال جانے کے لیے آمادہ ہو گئے، البتہ سید سلیمان ندوی نے باوجوہ معذرت کر لی۔ بوڑھا افغان، علامہ صاحب کو مطب تک لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔

آپ نے کچھ دیر وہاں کھڑے ہو کر یقیناً ماضی کی سیر کی ہو گی، جب کہ حکیم سنائی یہاں طبابت کرتے اور اس کے ساتھ ہی وہ درد بھی بیچتے تھے۔ جس کے خریداروں میں صاحبانِ دل ہی نظر آتے ہوں گے۔

بت شکن کو سلام:

یہاں سے واپس ہوئے اور انہی تنگ و تاریک گلیوں میں سے نکل کر دوبارہ اس کشادہ مقام پر آ گئے، جہاں دیگر لوگوں کے ساتھ سید صاحب آپ کے منتظر تھے۔

اب وہ موٹروں میں بیٹھ کر بوڑھے ملا قربان کی رہنمائی میں سلطان محمود کے مزار کی طرف رخ کر رہے تھے کہ سید سلیمان نے غالباً زیر لب کہا۔ "تو گویا اب ہم فقیروں کے جھونپڑے سے نقل کر بادشاہوں کے محل کی طرف کوچ کر رہے ہیں۔"

رہنما ملا قربان راستے میں رک رک کر، مختلف ٹیلوں پر موجود قبور کے بارے میں بتانے لگا۔ "یہ بہلول دانا کا مرقد ہے، یہ سلطان ابراہیم اور سلطان محمود کے والد سلطان سبکتگین کے مزارات ہیں۔"

سلطان محمود کا مزار ایک چھوٹے سے باغ کے اندر ہے۔ مسافروں نے اندر پہنچ کر فاتح اور بت شکن کے حق میں فاتحہ پڑھی، خصوصاً اقبال نے تو کسی اور ہی انداز میں اسے خراج تحسین پیش کیا ہوگا، کیونکہ محمود و ایاز تو ان کی شاعری کے بہت ہی معنی خیز استعارے بن چکے تھے:

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

لیکن جب اپنے زمانے میں ان تصویروں کو دیکھا تو بحسرت و یاس پکار اٹھے۔

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں، نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلف ایاز میں

ایاز "لاہوری"

اور یقیناً انہیں اس وقت یہ بھی یاد آیا ہوگا کہ صاحب مزار، سلطان محمود کا وہ عزیز ترین غلام خود انہی کے اپنے شہر لاہور میں آرام فرما ہے۔ بلکہ سلطان غزنوی کے مرقد سے واپسی پر آپ کو لاہور میں استراحت پذیر عثمان علی ہجویری کے والد ماجد کی بھی یاد آ گئی، وہ بھی تو یہیں غزنیں میں ہی کسی جگہ آسودہ خاک ہیں۔ ملا قربان علی واقعی غزنیں کا انسائیکلو پیڈیا تھا۔ فوراً بولا...... "جی ہاں

صاحب مجھ کو ان کے مزار کا معلوم ہے“...... بوڑھا رہنما انہیں ایک قدیم اور ویران قبرستان لے گیا جہاں اس عظیم صوفی بزرگ کے والد محترم کی ڈھیری تھی جو داتا گنج بخش کے نام سے معروف ہے۔ اور لاہور میں میلہ لگائے ہوئے ہے۔اقبال نے اس باکمال روحانی پیشوا کے بزرگ کی قبر پر فاتحہ پڑھی اور واپس ہوئے۔

مجذوب کی دانائی:

لیکن مُلا قربان نے اپنی معلومات کا مزید کمال دکھایا، وہ زائرین کو بازار کی ایک گلی میں لے گیا۔ یہاں ایک مسجد کے اندر ایک تربت پر ان کی حاضری کروائی۔ یہ ایک مجذوب فقیر ”لالے خوار“ کی تربت ہے۔اس مجذوب کے بارے میں مشہور ہے کہ ایک بار اس نے حکیم سنائی کو دیکھ کر تحقیر کے انداز میں کہا تھا ”سنائی سے بڑھ کر بے وقوف کون ہوگا جو اپنے ہی جیسے انسانوں کی مدح و ستائش میں خرافات نظم کرتا ہے اور ان کو جا کر سناتا ہے۔“

فقیر کے اس ایک جملے نے حکیم سنائی کی دنیا ہی بدل ڈالی۔ ہمیشہ کے لیے اس بات سے توبہ کر لی جس کا اس مجذوب نے انہیں طعنہ دیا تھا۔

مقر سے بیہق کی طرف:

ان تمام زیارات سے فیض یاب ہو کر شام کو واپس مہمان خانے پہنچے تو سردی زور پکڑ چکی تھی۔ صبح ۳۱ اکتوبر کو آٹھ بجے سلطان محمود کے غزنیں سے یہ قافلہ آگے روانہ ہوا اور نوے میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد گیارہ بجے ”مقر“ کے مقام پر پہنچا۔ مقر کو افغان قدیم تاریخی شہر ”بیہق“ قرار دیتے ہیں۔ یہاں کی سرکاری انتظامیہ کو، مہمانوں کی آمد سے پہلے ہی آگاہ کر دیا گیا تھا۔ لہٰذا جیسے ہی گاڑیاں رکیں۔ مہمانوں کا روایتی انداز میں خیر مقدم کیا گیا، یعنی ہوائی فائرنگ کر کے انہیں سلامی پیش کی گئی۔

سرکاری مہمان خانہ کی دو منزلہ عمارت میں کھانے کا بندوبست تھا۔ کچھ دیر آرام کر کے ایک بجے موٹر گاڑیوں نے ”قلات غلزئی“ کی جانب حرکت کی اور چار بجے شام وہاں پہنچ گئے۔ تیز یخ بستہ ہوا چل رہی تھی۔ ”قلات غلزئی“ چونکہ کابل سے دو ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے، اس وجہ

سے یہ مقام سرد خانہ بنا ہوا تھا۔

ترانہ جنگ:

یکم نومبر کو صبح آٹھ بجے ناشتہ کے بعد پھر سفر شروع ہوا۔ سردی وہی غضب کی تھی۔ بارہ بجے کے قریب قندھار پہنچے۔ یہاں کی شدت موسم میں نسبتاً کمی تھی۔ مہمانوں کو شاہی قیام گاہ میں ٹھہرایا گیا۔ شہر کے کئی ممتاز افراد ان کی آمد کی خبر سن کر ملاقات کے لیے آئے۔ ان میں ہندوستان میں وزارت خارجہ افغانستان کے نمائندے عبدالحئی خاں اور مقامی ادبی انجمن کے ناظم اور پشتو زبان کے رسالے "طلوع افغان" کے مدیر قابل ذکر ہیں۔ افغانوں کی قومی زبان کو ترقی دے کر تعلیمی، علمی اور سرکاری بنانے کے حق میں تحریک کے بانی تھے۔ خان صاحب کراچی اور سندھ میں بھی رہ چکے تھے اس وجہ سے اردو میں خاصی بات چیت کر لیتے تھے۔ لیکن اقبال کے حضور پہنچتے ہی انہوں نے پشتو کے متعلق اپنی تحریک کا ذکر چھیڑ دیا۔ علامہ صاحب نے زبانوں کی نشوونما اور ترقی کے اصولوں پر اظہار خیال کیا اور اس بات پر زور دیتے ہوئے فرمایا کہ "زبان ایک قوم کے مختلف افراد کی باہم یوگنگی کے سبب سے ضروری اور موثر ذریعہ ہے لیکن اگر اس تحریک سے قوم میں اتحاد کی بجائے اختلاف رونما ہونے کا اندیشہ ہو تو یوگنگی کا پیغام ہونے کی جگہ نزاعات اور اختلافات کا ترانہ جنگ ہے"۔

ابھی لسانیات پر یہ بحث جاری تھی کہ قندھار کے گورنر اپنے عملے کے ہمراہ ملاقات کے لیے تشریف لے آئے۔ وہ دیر تک مختلف امور پر گفتگو کرتے رہے۔

شام کے چار بجے ملاقاتی رخصت ہوئے تو مہمانوں کا قافلہ قندھار کی سیر کو نکلا۔

لباسِ نور:

"خرقہ شریف" کی زیارت گاہ اور احمد شاہ ابدالی کا مقبرہ زیادہ دور نہ تھا، اس لیے پیدل ہی روانہ ہوئے۔ "خرقہ شریف" کے لیے مشہور ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خرقہ مبارک احمد شاہ ابدالی بخارا سے حاصل کر کے نہایت ادب و احترام کے ساتھ اپنے دارالحکومت لایا اور قصر شاہی کے قریب ہی اس مقدس ملبوس کے لیے اس نے خصوصی عمارت تعمیر کرائی۔

ہند کے مہمانوں نے اس مقدس جگہ کی زیارت سے آنکھیں ٹھنڈی کیں جو رسول محترم کے

فرقہ کی نسبت سے لائق تکریم سمجھی جاتی ہے، واپس ہوئے اور سلطان احمد شاہ ابدالی کے مقبرے کی طرف کوچ کیا۔

بابائے افغان:

یہ مرد غازی نہایت بہادر، دین دار انصاف پسند اور پرجوش مجاہد تھا۔ خطے کی تاریخ اسلام کے آخر میں اس کی شخصیت بہت نمایاں نظر آتی ہے۔ اصل نام احمد خان تھا، سدوزئی قبیلہ کے سردار اعلیٰ زمان خان کا دوسرا بیٹا تھا۔ اس کی پیدائش ۲۲ء۱۷ کو ملتان میں ہوئی۔ ابھی اس کی عمر ۱۶ سال تھی کہ نادر شاہ خان درانی نے اسے اپنے ذاتی محافظوں کے دستہ کا سالار مقرر کرلیا۔ جب قزلباشوں نے نادر شاہ خان درانی کو خراسان میں قتل کردیا تو احمد شاہ نے مختلف قبائل کے مشورے اور رضا مندی سے قندھار میں اپنی بادشاہی کا اعلان کردیا۔ اس طرح وہ ملت افغان کا موسس اور افغانستان کا اولین حکمران بنا اور اس کے نام کا سکہ جاری ہوا۔ اسی لیے اسے "بابائے افغان" کہا جاتا ہے۔

ہمہ اوصاف:

احمد شاہ کئی اعتبار سے اپنے عہد کے ممتاز حکمرانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کی صلاحیت جہاں بانی، تدبر، عسکری لیاقت کا اعتراف اس کے مخالفین نے بھی کیا ہے۔ اس کا ایک کارنامہ تو یہ ہے کہ اس نے اپنے زیر تسلط علاقوں کو جو چھوٹی چھوٹی اکائیوں میں بٹے ہوئے تھے ایک وحدت میں باندھ کر افغانستان کو ایک متحد، مضبوط اور مستحکم شکل دے دی۔ مذہب کی طرف اس کا رجحان بہت زیادہ تھا۔ علما اور مشائخ کا ایک ہجوم اس کے دربار سے منسلک رہتا۔ اس کے باوجود اس کے مزاج میں عصبیت نام کو نہیں تھی، غیر مذہب کے لوگ بھی اس کے ملک میں پوری مذہبی آزادی سے رہتے تھے۔ افغانستان کی تجارت ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی۔ ایران کے شمالی علاقہ سے نادر شاہ نے عیسائیوں کو لاکر کابل میں بسا دیا تھا۔ عیسائیوں کے علاوہ ہندو بھی نہایت امن و اطمینان کے ساتھ زندگی گزارتے تھے۔

اقبال کا شاہین:

حضرت علامہ اقبال کی پسندیدہ شخصیات کی فہرست میں احمد شاہ ابدالی کو بہت نمایاں مقام حاصل ہے۔ اپنی منظوم تمثیلی کتاب جاوید نامہ میں ابدالی، اقبال سے دریافت کرتا ہے۔

"وہ جوان افغان جو سلطنتیں قائم کر کے پھر اپنے پہاڑوں کی طرف چلا گیا، آج زندگی کے عجیب مزدوں میں اس کی کیا کیفیت ہے؟"

اقبال فرماتے ہیں:

افغان اندر اخوت گرم خیز
او برادر با برادر در ستیز

یعنی آج قومیں اتحاد اور اخوت کے پیمان باندھ رہی ہیں لیکن افغان اپنے دوسرے افغان بھائی کے خلاف برسرپیکار ہے۔ حالانکہ افغانستان کی زندگی سے مشرق کی زندگی ہے۔ اس کا دس سال کا بچہ سپہ سالار ہوتا ہے۔ افغان اپنے آپ سے بالکل غافل ہے اور اپنی صلاحیتوں سے ناآشنا ہے۔ وہ اپنی مادی صلاحیتوں کو جانتا ہے اور نہ معنوی استعداد کو پہچانتا ہے۔ اسے اپنی منزل کا کچھ پتا نہیں۔ چنانچہ زندگی کے مقاصد سے بالکل بے خبر ہے۔ اگر مال و دولت سے لدا ہوا اونٹ اسے مل جائے تو وہ اس مال و دولت کی بجائے اونٹ کے گلے میں گھنٹی حاصل کر کے خوش ہو جاتا ہے۔"

احمد شاہ ابدالی افغانستان کی سیاسی، جغرافیائی اور دینی اہمیت پر گفتگو کرتا ہوا پھر اقبال سے مخاطب ہوتا ہے:

آسیا یک پیکر آب و گل است
ملت افغاں در آں پیکر دل است
از فساد او، فساد آسیا
در کشاد او، کشاد آسیا

ایشیا آب و خاک کا محض ایک پیکر ہے، جبکہ ملت افغان اس پیکر میں دل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی تباہی سارے ایشیا کی تباہی ہے، اور اس کی اصلاح سارے ایشیا کی اصلاح ہے، اگر

دل صحت مند ہو تو جسم بھی صحت مند ہے، ورنہ یہ سارا نظام برباد ہے، دیکھا جائے تو دل بھی جسم کی طرح ضابطہ حیات کا پابند ہے۔ دل کینہ سے مرتا ہے، اور دین سے زندہ ہوتا ہے، دین کی قوت، وحدت سے حاصل ہوتی ہے۔ جب افراد میں قوت وحدت پیدا ہوتی ہے تو اس سے ملت معرض وجود میں آتی ہے۔"

اس کے علاوہ بھی علامہ کا احمد شاہ ابدالی سے مکالمہ ہوا۔ لیکن اس وقت ہم افغانستان میں ہیں اور علامہ اس مرد جری کے مرقد پر کھڑے اس کی بلندی درجات کے لیے دعا گو ہیں اور اپنے خیال میں اسے منظوم خراج عقیدت پیش کر رہے ہیں۔ ہم چاہیں گے کہ اقبال نے اپنے جذبات جو فارسی میں منظوم کیے ہیں وہ یہاں نثر میں بیان کر دیے جائیں۔ نظم کا عنوان آپ نے جو تجویز کیا وہ ہے۔ "بر مزار حضرت احمد شاہ ابدالی علیہ الرحمہ موسس ملت افغانیہ۔" فرماتے ہیں۔

"یہ اس روشن ضمیر کی قبر ہے جس کے باطن سے ایک ملت کا ظہور ہوا۔ آسمان اس کی قبر کے گنبد کو حرم کی طرح مقدس گردانتا ہے۔ اس گنبد کے طواف سے سورج کی پیشانی چمکتی ہے، اس مجاہد بادشاہ نے اقلیم سخن میں بھی اپنا سکہ رائج کیا اور ملت کو ذوق تجسس بخشا، فرشتے اس کی قبر پر تسبیح خوانی کرتے ہیں۔ اس کے دست و دل اس قدر فیاض اور بے نیاز تھے کہ اس نے کئی سلطنتیں حاصل کیں مگر انہیں واپس دے دیا۔ وہ نکتہ رنج تھا، عارف و شمشیر زن تھا، اس کی روح نے مجھ سے ہم کلام ہو کر کہا۔

"مجھے تیرے مقام کا علم ہے، تیرے نغمے اہل زمین کے لیے کیمیا کا اثر رکھتے ہیں، سنگ وخشت تیرے فیض سے زندہ ہو جاتے ہیں، تیری گفتار سے سینائے دل میں روشنی پھیلتی ہے، تُو حقیقت آشنا ہے، تیرے انفاس سے بوئے حق آتی ہے، تو کچھ عرصہ ہمارے وطن میں ٹھہر! تجھے اللہ نے بے تاب روح عطا کی ہے، جو ملک و دین کے اسرار سے واقف ہے، تو نادر کے بیٹے ظاہر شاہ پر اپنے باطن کا اظہار کر......"

دراصل افکار اقبال کا اہم ترین نکتہ جس نے اقبال کو حکیم الامت، مفکر اسلام اور شاعر قرآن بنایا، وہ ملک و دین یا دین و وطن کا ہی مسئلہ ہے، چنانچہ ابدالی نے اقبال سے اس مسئلہ کی وضاحت کا تقاضا کیا۔ ان دونوں مردان حق کا مکالمہ طویل ہے، اُن کی سماعت کے لیے کتاب "جاوید

نامہ" سے رجوع کرنا پڑے گا اس وقت معذرت، البتہ اگر ہم احمد شاہ کے بارے میں ہندوستان کے حوالے سے گفتگو نہ کریں تو ہماری یہ کوشش جو ہم اقبال اور اس کے حوالے سے کر رہے ہیں، تشنہ رہ جائے گی۔

مسلم ہند کا ناجی:

ایران کا نادر شاہ درانی جس کے قتل کے بعد ہی احمد شاہ ابدالی نے قندھار میں اپنی بادشاہت کا اعلان کیا تھا۔ وہی نادر شاہ ہے جس نے ۱۷۳۹ء میں ہندوستان پر تباہ کن یلغار کی تھی اور مغل سلطنت جو پہلے ہی اپنے بے ضمیر و بزدل حکمرانوں اور محلاتی سازشوں کی وجہ سے نحیف و نزار ہو چکی تھی، نادر شاہ درانی کے حملے کی تاب نہ لا سکی، اس نے نہ صرف اس خوابیدہ سرا تسم کی حکومت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی، بلکہ عام لوگوں کے خون کو بھی اپنے اوپر مباح کر لیا۔ نام نہاد مغل سلطنت کے مرکز دلّی میں بے گناہ مسلمانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا اور اپنی سفاکیت و درندگی کا مظاہرہ کرنے کے بعد یہاں کی دولت اور علمی خزانے سب لوٹ کر چلتا بنا۔ لیکن اس کے بعد بھی بے شرم مغل حکمرانوں کو عبرت نہ ہوئی، بادشاہوں کی عیاشی، امراء کی حرص و طمع اور شہزادوں کی آرام طلبی میں کوئی کمی نہ آسکی۔ اگر کوئی حکومتی طاقت تھی سو وہ کچھ مادہ پرست مسلمان سپہ سالاروں اور مرہٹہ جرنیلوں کے ہاتھ میں تھی۔ ان ناگفتہ بہ حالات کو دیکھ کر اس وقت کے ایک جید عالم دین اور امت مسلمہ کے خیر خواہ شاہ ولی اللہ نے اپنی اعلیٰ بصیرت کو بروئے کار لا کر احمد شاہ ابدالی کو مکتوب لکھا۔ ابدالی ہندوستان کے سیاسی ماحول، مذہبی فضا، معاشرتی، جغرافیائی، اقتصادی اور تاریخی حالات سے بخوبی واقف تھا، شاہ صاحب نے اپنے مکتوب میں اس کو دعوت دی کہ وہ آئے اور مرہٹوں کی خوفناک طاقت کو کچلنے کا مجاہدانہ فریضہ انجام دے ورنہ ہندوستان میں مسلمانوں کا استیصال ہو کر رہ جائے گا۔"

ہم اس جگہ بہت ضروری سمجھتے ہیں کہ شاہ ولی اللہ کے مکتوب کی کچھ جھلکیاں پیش کر دی جائیں جس سے اس وقت کے ہندوستان میں مسلمانوں کی بے وقعتی، بے توقیری اور بے چارگی کا اندازہ ہو سکے، شاہ صاحب لکھتے ہیں۔

''غیر مسلموں میں ایک قوم مرہٹہ نامی ہے کہ ان کا ایک سردار ہے، اس قوم نے کچھ مدت سے اطراف دکن میں سر اٹھایا ہے، اور تمام ملک ہندوستان پر اثر انداز ہے، شاہان مغلیہ میں سے بعد کے بادشاہوں نے عدم دوراندیشی، غفلت اور اختلاف فکر کی بنا پر، ملک گجرات مرہٹوں کو دے دیا۔ پھر اسی کوتاہ اندیشی اور غفلت کی وجہ سے ملک، مالوہ بھی ان کے سپرد کر دیا اور ان کو وہاں کا صوبہ دار بنادیا۔ رفتہ رفتہ قوم مرہٹہ قوی تر ہوگئی اور اکثر بلاد اسلام ان کے قبضہ میں آ گئے۔ المختصر سوائے دہلی اور دکن کے خاص طور پر مرہٹوں کا تسلط ہے۔ قوم مرہٹہ کو شکست دینا آسان کام ہے بشرطیکہ غازیان اسلام کمر باندھ لیں۔''

اس خط میں شاہ صاحب مزید لکھتے ہیں۔

''جماعت المسلمین قابل رحم ہے، اس وقت جو عمل ودخل سرکار بادشاہی میں ہے وہ ہنود کے ہاتھ میں ہے۔ ہر قسم کی دولت وثروت ان کے گھروں میں جمع ہے، افلاس ومصیبت کا بادل مسلمانوں پر چھا رہا ہے۔''

شاہ ولی اللہ اپنے اس مکتوب میں نہایت دردمندی کے ساتھ احمد شاہ ابدالی سے مخاطب ہیں۔

''اس زمانے میں ایسا بادشاہ جو صاحب اقتدار وشوکت ہو اور لشکر مخالفین کو شکست دے سکتا ہو، دوراندیش اور جنگ آزما ہو، سوائے آں جناب کے اور کوئی موجود نہیں، یقینی طور پر جناب عالی پر فرض عین ہے ہندوستان کا قصد کرنا اور مرہٹوں کا تسلط توڑنا اور مسلمین کو غیر مسلموں کے پنجے سے آزاد کرنا۔ اگر غلبہ کفر معاذ اللہ اسی انداز پر رہا تو مسلمان، اسلام کو فراموش کر دیں گے اور تھوڑا زمانہ گزرے گا کہ یہ ایسی قوم بن جائے گی کہ اسلام اور غیر اسلام میں تمیز نہ ہو سکے گی۔ یہ بھی ایک بلائے عظیم ہے۔ اس بلائے عظیم کے دفع کرنے کی قدرت بہ فضل خداوندی جناب کے علاوہ کسی کو میسر نہیں۔''

شاہ ولی اللہ علیہ الرحمہ آگے چل کر لکھتے ہیں۔

''ہم بندگان الٰہی، حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو شفیع گردانتے ہیں اور خدائے عزوجل کے نام پر التماس کرتے ہیں کہ ہمت مبارک کو اس جانب متوجہ فرما کر مخالفین سے مقابلہ

کریں تاکہ خدا تعالیٰ کے یہاں بڑا ثواب جناب کے نامہ اعمال میں لکھا جائے اور مجاہدین فی سبیل اللہ کی فہرست میں نام درج ہو جائے۔"

مزید لکھتے ہیں...... "خدا سے پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ نادر شاہ کی طرح عمل نہ ہو کہ وہ مسلمانوں کو زیر و زبر کر گیا اور مرہٹہ اور جٹ کو سالم و غانم چھوڑ کر چلتا بنا۔ نادر شاہ کے بعد سے مخالفین قوت پکڑ گئے اور لشکر اسلام کا شیرازہ بکھر گیا، سلطنت دہلی بچوں کا کھیل بن گئی۔ پناہ بخدا اگر قوم کفار اسی حال پر رہے اور مسلمان ضعیف ہو جائیں تو اسلام کا نام بھی باقی نہ رہے گا۔"

شاہ ولی اللہ کا مندرجہ بالا مکتوب اور دیگر درخواستیں احمد شاہ کو موصول ہوئیں تو اس نے حمیت اسلامی کے پیش نظر، پریشان حال مسلمانوں کو پنجہ کفر سے نجات دلانے کے لیے تیاری شروع کر دی۔ ادھر مرہٹہ سردار نے دلی کو خالی دیکھ کر اس پر قبضہ کرنے کی ٹھان لی، کیونکہ نادر شاہ حملے کے بعد دلی مسلمانوں کی عسکری قوت سے خالی ہو چکا تھا۔ ایک مرہٹہ سردار سداشیو ہاتھی پر بیٹھا فاتحانہ شان و شوکت کے ساتھ شاہی قلعہ میں داخل ہوا چاہتا تھا جہاں اس کی بادشاہت کا اعلان ہونا تھا کہ اسے افغانستان سے احمد شاہ ابدالی کی پیش قدمی کی خبر ملی اور وہ افغان مجاہدین سے مقابلہ کے لیے پانی پت کی طرف بڑھا، جہاں اس نے پانی پت کے گرد ایک وسیع خندق کھودی اور اس کے چاروں طرف فرنگی ساخت کی توپیں نصب کر دیں۔

بے ضمیر گاردی:

۱۷۶۱ء کو دونوں فوجوں کا ٹکراؤ ہوا۔ اس لڑائی میں ایک شرمناک بات یہ دیکھنے میں آئی کہ مرہٹہ فوج میں توپ خانے اور پیادہ فوج کا ابراہیم گاردی نام کا ایک مسلمان سالار تھا جس نے فرانسیسی ماہرین سے فن حرب کی تعلیم پا رکھی تھی اور صرف نقد کی خاطر مسلمانوں پر گولہ باری کر رہا تھا۔ لیکن احمد شاہ ابدالی کے ساتھ اللہ تھا، وہ اور اس کے بہادر، مجاہد اور اللہ کے سپاہی تھے، جنہوں نے بالآخر پانی پت کے میدان کو مرہٹوں کا شمشان گھاٹ بنا دیا۔ نہایت خونریز معرکہ کے بعد مرہٹوں کو شکست فاش ہوئی۔

فراخ دل فاتح:

جنگ کے خاتمہ پر ابدالی چاہتا تو با آسانی دہلی کے تاج وتخت کو اپنے نام کر سکتا تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا، بلکہ جس مقصد کو لے کر آیا تھا، وہ پورا کر کے اپنے وطن کی طرف لوٹ گیا، گویا ایک عظیم احسان اس نے ہند کے مسلمانوں پر کیا، ہندوستان میں مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی خوفناک طاقت کو تہس نہس کر کے ہندی مسلمانوں کو اس کے شر سے محفوظ کر دیا۔ یہ الگ بات کہ خود مسلمان حکمرانوں کو عبرت نہ ہوئی اور وہ آئندہ بھی اپنی بداعمالیوں سے باز نہ آئے، جس کے نتیجے میں سات سمندر سے آنے والے فرنگیوں نے انہیں اپنا غلام بنالیا۔

احترامِ مرقد:

ہم اس المناک قصہ کو یہیں چھوڑتے ہیں اور پھر وہیں لوٹتے ہیں جہاں مسافرانِ ہند کو ہم نے بابائے افغان احمد شاہ ابدالی کے مرقد پر محو دعا چھوڑا تھا۔

یہ عظیم الشان مقبرہ ابدالی کے بڑے فرزند تیمور شاہ نے تعمیر کرایا تھا۔ افغان اس مقبرے کا اس قدر احترام کرتے ہیں کہ خونی مجرم بھی اگر بھاگ کر اس میں پناہ گزیں ہو جائے تو اسے پناہ مل جاتی ہے۔ قبر کے سرہانے قدرے بلندی پر قرآن کریم کا وہ نسخہ رکھا تھا، جو اس مجاہد اسلام کے زیر تلاوت رہتا تھا۔

مقبرے کی عقیدت میں ڈوبی فضا سے نکل کر اقبال اور ان کے رفقا باہر آئے اور گاڑیوں میں سوار ہو کر اب اور دنیا کی طرف روانہ ہو گئے۔

حسنِ فراز:

افسر مہماندار اور کار خضر انجام دینے والا کہنہ سال مُلا قربان انہیں "ارغنداب" لے کر آ گیا۔ یہ جگہ قندھار کی سب سے خوبصورت منظر پیش کرتی ہے۔ گاڑیوں نے پہاڑی کے اوپر چڑھنے کی کچھ دور تک ہمت دکھائی، پھر وہ ایک تنگ جگہ پر پہنچ کر رک گئیں۔ یہاں مسافروں کو گاڑی سے اترنے کے لیے کہا گیا اور سب پیدل چلے، چند قدم کے فاصلے پر ہی کشادہ مقام آ گیا اور اس کے ساتھ ہی دل بھی کشادہ ہوتے چلے گئے۔ قندھار کے اس سب سے زیادہ بلند مقام پر

سے گرد و پیش کے حسین مناظر آنکھوں کے راستے دل میں اترنے لگے۔ نشیب میں دریائے "ارغنداب" بہہ رہا تھا۔ اس سے کچھ ہی فاصلے پر دو تین ندیاں بھی اس کے ساتھ سفر میں تھیں۔ اور ان کے کنارے کنارے تیس میل تک انار اور دیگر میوہ جات کے درخت بھی ان کے ہم سفر بنے ہوئے تھے۔ اس بلند مقام پر جہاں اس وقت یہ ہندی "سیاح" قدرت کے حسین مناظر سے لطف اندوز ہو رہے تھے، اس سے منسلک ہی بابا ولی قندھاری کی درگاہ ہے۔ لہٰذا سب حضرات نے ایصالِ ثواب کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے۔

فیلِ طویل اور چہل زینہ:

واپسی پر ایک بلند پہاڑی نظر آئی جو قدرتی طور پر اس شکل کی تھی جیسے سینکڑوں گز لمبا چوڑا کوئی ہاتھی بیٹھا ہو۔ پہاڑی سے نیچے اترنے کے بعد مُلّا قربان ان سیر بینوں کو ایک اور فراز پہاڑی پر لے گیا جس کی چوٹی پر بابر نے اپنی فتوحات کا کتبہ نصب کرایا تھا۔ اس تک پہنچنے کے لیے پتھروں کو تراش کر زینہ بنا دیا گیا ہے جو چالیس قدموں پر مشتمل ہے اسی لیے اسے "چہل زینہ" کہا جاتا ہے۔ اس کو صرف سید سلیمان ندوی اور پروفیسر ہادی حسن ہی "سر" کر پائے۔ باقی حضرات نیچے ہی کھڑے آس پاس کے نظاروں سے لطف اندوز ہوتے رہے۔

یہاں سے واپس ہوئے تو مغرب کا وقت ہو رہا تھا۔

سید راس مسعود کو عجلت تھی، وہ رات ہی کو قندھار سے رخصت ہو کر چمن پہنچنا چاہتے تھے تاکہ کوئٹہ سے دوپہر کی گاڑی مل سکے، انہیں جلد سے جلد علی گڑھ پہنچنا تھا۔ اتفاق سے قندھار میں انگریزی حکومت کی طرف سے قونصل سید صدیق حسن تھے، جو علامہ صاحب کے دیرینہ دوست غلام بھیک نیرنگ کے بھائی تھے۔ انہوں نے راس مسعود کے سفر کی مشکل کو آسان بنا دیا۔ اور اس طرح وہ اسی شب سفر پر روانہ ہو گئے اور باقی رفقا نے رات قندھار میں ہی گزاری۔

الوداع الوداع:

صبح آٹھ بجے ناشتہ سے فارغ ہو کر رختِ سفر باندھا، روانگی سے قبل گورنر قندھار کی طرف سے مہمانوں کے لیے خشک میوہ اور قندھاری انار کے ٹوکرے بطور تحفہ بھیجے گئے۔ 9 بجے دیارِ ہند

کے یہ مسافر اپنا دورہ تمام کر کے قندھار سے چمن کے لیے روانہ ہوئے اور بارہ بجے قلعہ جدید پہنچ گئے یہ افغانستان کی آخری چوکی تھی۔ ظہرانہ یہیں لیا اور اس کے ساتھ ہی افسر مہمانداری سرور خان گویا اور دیگر شاہی ملازمین نے حضرت اقبال اور ان کے رفقا کو الوداع کہا اور موٹریں کچھ ہی دیر میں افغانستان کی سرحد کو عبور کر کے انگریزی علاقہ میں داخل ہو گئیں، اس علاقہ میں جسے "انگریزی علاقہ" کہتے ہوئے دل دکھتا ہے۔

چمن در چمن:

افغانستان کی سرحد کے فوراً بعد انگریزی مقبوضہ ہندوستان کے علاقہ بلوچستان کا پہلا نمایاں شہر چمن آتا ہے، یہاں ان حضرات کے پہنچنے کی خبر پہلے ہی پہنچ چکی تھی۔ اقبال کے چاہنے والوں کی ایک بڑی تعداد نے شہر کے دروازے پر ہی ان کا استقبال کیا۔ اور انہیں ایک ریستوران میں لے گئے، جہاں کچھ سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والے مختلف الخیال حضرات نے ان سے قومی معاملات پر مختلف سوالات کیے اور تقاضا کیا کہ علامہ صاحب اپنے رفیق سید سلیمان ندوی کے ساتھ ایک شب چمن میں قیام کریں اور مسلمانوں سے خطاب فرما کر انہیں اپنے علم و دانش سے فیضیاب فرمائیں۔ لیکن باوجوہ دونوں ہی شخصیات نے معذرت کر لی۔

خوف کی وبے نیازی:

چمن سے ریل کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، لیکن "مسافروں" نے ایک دن بچانے کی خاطر چمن سے کوئٹہ تک کا راستہ موٹر گاڑیوں میں طے کیا۔ راستہ نشیب و فراز کے سبب نہایت دشوار گزار تھا، گاڑیوں کے پہیے خود بخود پھسلتے جاتے تھے لگتا تھا اب حادثہ ہوا کہ اب ہوا، لیکن ڈرائیور بلا خوف بے تکان گاڑیوں کو دوڑا رہے تھے۔ تاکہ رات ہونے سے قبل وہ راستے کے خطروں سے باہر ہو جائیں۔ سید سلیمان ندوی کسی قدر خوفزدہ نظر آنے لگے، جبکہ علامہ نے جان کر یا بے جانے ان چیزوں سے بے نیازی اختیار کر لی اور ذاتی مشاہدات و تجربات پر گفتگو چھیڑ دی، مختلف سلسلوں کے مشائخ و بزرگان دین کے حالات و آثار کو موضوع بنا لیا اور اپنی ایک دیرینہ خواہش کا بھی اظہار کیا کہ انہیں ایک سچے پیر کی تلاش ہے۔

خدا خدا کر کے پہاڑی راستہ ختم ہوا اور اب وہ میدان میں سے گزرنے لگے۔ تاریکی پھیل چکی تھی لیکن خطرے سے باہر نکل آئے تھے اس لیے سید صاحب بھی اب مطمئن ہو گئے، پھر دیکھتے ہی دیکھتے شہر کی روشنیاں نظر آنے لگیں، جو قطار اندر قطار دکھائی دے رہی تھیں۔ یاد رہے کوئٹہ انگریزی فوجوں کی ایک اہم چھاؤنی تھی، اور اس میں اس نے اپنی آسائی کے لیے تمام شہری سہولتیں مہیا کر رکھی تھیں جو خود بخود عوام کے لیے بھی فائدے کا سبب بن گئیں۔

جب یہ حضرات کوئٹہ میں داخل ہوئے، تو سب سے اول کوئٹہ کی سخت سردی نے ان کا استقبال کیا، منتظمین نے انہیں ڈاک بنگلہ میں ٹھہرایا، کھانا پیش کیا اور اس طرح ان دو اعلیٰ دماغ ہستیوں نے اپنے دیگر رفقا کے ساتھ یہاں سرد شب گزاری۔

بخیر آمد:

یہ ۳ نومبر کی صبح تھی کہ سب لوگ کوئٹہ ریلوے اسٹیشن پر پہنچے اور گیارہ بجے جانے والی گاڑی میں سوار ہو گئے۔ ریل دن بھر اور رات بھر چلتی رہی دوسرے روز بارہ بجے گاڑی نے ملتان میں دم لیا، سید سلیمان ندوی یہیں اتر گئے، جبکہ علامہ صاحب لاہور جانے والی گاڑی میں بیٹھے اور اسی روز رات کے وقت مع ان تحائف کے جو انہیں نادر شاہ اور دیگر افغان زعما نے پیش کیے تھے، اپنی قیام گاہ پر پہنچ گئے۔ تحائف میں سردے، انگور، انار اور خشک میوہ جات کی پیٹیوں کے علاوہ افغانی پتھر قیمتی قالین اور دیگر بہت سی چیزیں شامل تھیں، نادر شاہ نے علامہ کے فرزند جاوید کے لیے کلائی کی گھڑی دی تھی۔ کہتے ہیں بعد میں بھی اکثر پھلوں اور میوہ جات کے ٹوکرے آپ کے لیے افغانستان سے آتے رہے۔

مقصدِ دعوت:

علامہ اقبال نے ۶ نومبر کو اپنی اور اپنے دیگر دونوں رفقا کی طرف سے ایک تحریری بیان اخبار کو دیا اس کا متن یہ تھا۔

"حکومت افغانستان کا ارادہ ہے کہ ہمارے محکمہ تعلیم کو جدید طریقوں پر از سر نو ترتیب دیا جائے اور ساتھ ساتھ افغان ہمسایہ ممالک کے درمیان والی شاہراہ کی مرمت کی جائے۔ نئی

یونیورسٹی بتدریج ترقی کر رہی ہے، اور اس کے لیے پہلے ہی خوبصورت اور وسیع محل بھی مخصوص کر دیا گیا ہے۔ سب سے پہلے میڈیکل کالج قائم کیا گیا اور اس میں اعلیٰ تعلیم شروع ہو گئی ہے۔ دوسرا شعبہ جس کا قیام زیر غور ہے وہ سول انجینئرنگ کا ہو گا۔ افغانستان آج ایک متحد ملک ہے، جہاں ہر طرف بیداری کے آثار پائے جاتے ہیں۔ اور حکام کافی سوچ بچار کے بعد، نئے پروگرام بنا رہے ہیں، افغانستان سے ہم اس یقین کے ساتھ واپس ہوئے ہیں کہ اگر موجودہ حکام کو دس سال تک اپنا کام جاری رکھنے کا موقع مل جائے تو بلا شک وشبہ افغانستان کا مستقبل روشن ہے۔"

غالباً یہ ایک پالیسی بیان تھا جس کی ضرورت اس لیے محسوس کی گئی کہ ایک تو اپنے دورے کے مقاصد اور افغانستان کی موجودہ صورت حال سے اپنی قوم کو باخبر کیا جائے دوسری طرف انگریز انتظامیہ کو بھی اس بیان سے مطمئن کرنا تھا کہ وہ ان کے دورے سے کوئی ایسا تاثر نہ لے کہ وہاں ان کے مفادات کے خلاف کوئی "سازش" یا منصوبہ تیار کیا جا رہا ہے۔ (جیسا کہ انگریز حکمران اس طرح کے موقعوں پر اکثر بدگمان رہتے تھے)۔

ملی سانحہ:

افغان مسلمانوں کی بدنصیبی کہ ان کے ہندوستانی بہی خواہ برادران کے اس بیان کے دوسرے روز ہی یعنی ۷ نومبر کو یہ المناک خبر آئی کہ نادر شاہ کو کابل میں قتل کر دیا گیا ہے۔ یہ بھیانک جرم کسی بدبخت شخص نے ذاتی دشمنی کی بنا پر کیا تھا۔ تاہم افغانستان میں اس نازک موقع پر کوئی بدامنی اور انتشار پیدا نہ ہوا اور نادر شاہ شہید کے فرزند محمد ظاہر شاہ کو بالاتفاق اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا گیا۔

اقبال بہت مضبوط اعصاب کے انسان تھے، تاہم اس اچانک سانحہ سے انہیں گہرا صدمہ ہوا، کیونکہ شہادت سے سرفراز ہونے والے اس غازی سے آپ نہ صرف بے حد محبت کرتے تھے بلکہ اس سے بہت زیادہ آپ کی امیدیں وابستہ تھیں کہ وہ مستقبل میں افغانستان کو ایک ترقی یافتہ فلاحی اسلامی ریاست بنا سکتا ہے لیکن قدرت ومشیت انسانی خواہشات سے الگ پروگرام رکھتی ہے۔ آپ کی کتاب مثنوی "مسافر" اسی دورہ افغانستان کی یادگار ہے۔ لیکن ہم اس جگہ علامہ صاحب کے وہ اشعار ضرور دہرائیں گے جو آپ نے "نادر شاہ افغان" کے عنوان سے اس شہید کو

خراجِ تحسین پیش کی ہے:

حضورِ احق سے چلا لے کے لولوے لالہ
وہ ابر جس سے رگِ گل ہے مثلِ تارِ نفس
بہشت راہ میں دیکھا تو ہو گیا بے تاب
عجب مقام ہے، جی چاہتا ہے جاؤں برس
صدا بہشت سے آئی کہ منتظر ہے ترا
ہرات و کابل و غزنی کا سبزہ نورس
سر رشک دیدۂ نادر بہ داغ لالہ فشاں
چناں کہ آتش اورا دگر فرو نہ نشاں

☆☆

پہلے ہندوستانی:

اس سال کے اختتام پر پنجاب یونیورسٹی نے حضرت علامہ اقبال کو ڈی لٹ کی ڈگری دی۔ اس طرح اقبال پہلے ہندوستانی تھے جو اس ڈگری کے حامل ہوئے۔

حیاتِ اقبال کی روداد کو اگر ہم اسی طرح ترتیب و تسلسل کے ساتھ سماعت کریں تو ہمارے علم میں آتا ہے کہ ۴ دسمبر ۱۹۳۳ء کو پنجاب یونیورسٹی نے اپنی گولڈن جوبلی منائی اور کانووکیشن کے موقع پر ڈاکٹر سر محمد اقبال کو ڈی لٹ کی اعزازی سند پیش کی۔ اس کی انفرادیت یہ تھی کہ یونیورسٹی کی طرف سے یہ پہلا اعزاز تھا جو کسی ملکی اسکالر کو دیا گیا تھا۔ لیکن ہم یہ کہیں گے کہ خود یونیورسٹی کے لیے یہ بڑے اعزاز کی بات تھی کہ اقبال ایسی نابغہ روزگار شخصیت کا نام اس طرح اس کے ریکارڈ میں درج ہو رہا تھا، نیز یہ کہ یونیورسٹی ہال کے باہر آویزاں اقبال کی قدِ آدم تصویر، یونیورسٹی کے قد میں اضافے کا سبب بن رہی تھی۔

انہی دنوں آکسفورڈ یونیورسٹی نے اپنے ایک پروفیسر لارڈ لوتھین کی تحریک پر علامہ اقبال کے کئی لیکچرز کو لندن والے لیکچر Relegion Possible "کیا مذہب کا امکان ہے" کا

اضافہ کر کے شائع کرنے کا ارادہ ظاہر کیا، علامہ صاحب نے اجازت دے دی۔ لارڈ لوتھین کے توسط سے آپ کو آکسفورڈ یونیورسٹی میں مزید لیکچرز کی دعوت دی گئی، آپ نے اس کو بھی قبول کر لیا۔ اس لیکچر کا عنوان آپ نے تجویز فرمایا۔ "زمان و مکان اور فلسفہ اسلام کی تاریخ"۔ لیکچر کے لئے تاریخ ۱۹۳۴ء مقرر کی گئی۔ لیکن آپ نے لیکچر کی اہمیت اور اپنی دیگر مصروفیات کے پیش نظر مزید وقت طلب کیا اور ۱۹۳۵ء تاریخ ٹھہرائی گئی۔

☆☆

آدمی اور انسان:

بہت غور وفکر کرنے کے بعد یہ حقیقت پردہ اسراریت سے باہر آتی ہے کہ آدمی اور انسان میں بہرحال ایک نمایاں فرق اور امتیاز ہے، آدمی، آدم سے مشتق ہے جس کا ہیولہ خاک سے آفریدہ ہے اور انسان؟ یہ اس روح کا نام ہے جو امرالٰہی سے جلوہ پذیر ہوئی ہے۔ جس کو بعد میں خلقنا الانسان فی احسن تقویم کے لفظوں میں متعارف کرایا گیا ہے اور یہی وہ انسان ہے جس کو نیابت الٰہی کا اعزاز بخشا گیا۔ فرمایا۔ "انّی جاعل فی الارض خلیفہ۔" "ہم نے انسان کو زمین پر اپنا خلیفہ بنایا ہے۔" اور خلافت کی ذمہ داری ادا کرنے سے قبل اسے اسمائے کُل کی تعلیم سے بھی بہرہ ور کرایا گیا لیکن اپنی عقل ونظر، فکر وخیال، فہم وفراست اور علم وعمل کی طاقتوں کے باوصف، آدمی ہونے کے تعلق سے اس کے اندر بشری کمزوریاں موجود ہیں۔ اس حقیقت کی روشنی میں حضرت انسان پر تبصرہ کرتے وقت فطری تقاضوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ کمزوریاں جسم وجاں سے ظاہر ہوتی ہیں یہ ان عناصر سے تعلق رکھتی ہیں جن سے ہبوط آدم کی تخلیق وتعمیر کی گئی ہے۔ ان عناصر کے انتشار سے یا ان میں شکست وریخت یا بشری کمزوریوں کے ہاتھوں بداعتدالیوں کے سبب جسم انسانی میں ظہور پذیر ہوتی ہیں، انہیں عرف عام میں جسمانی امراض کہا جاتا ہے۔

شیخ محمد اقبال بھی انسان تھے اور آدمی بھی۔ انسانی فکر وعمل کی قوتیں انہیں انسانیت کے اس اعلیٰ مرتبہ پر لے گئیں جہاں وہ رود زندہ اور مفکر اسلام کہلائے اور بشری کمزوریوں اور مادی ٹوٹ پھوٹ نے انہیں مختلف امراض میں مبتلا کردیا۔ درد قولنج اور سانس جیسے تکلیف دہ امراض سے نبرد

آزما ہونا پڑا۔ جنوری ۱۹۳۴ء کا دوسرا ہفتہ تھا کہ آپ انفلوئنزا کا شکار ہوئے اور اس کا سبب وہی بے احتدالی تھی جو بشری کمزوری کے سبب عمل میں آتی ہے۔

کہا جاتا ہے موسم سرما میں عید الفطر کے موقع پر علامہ صاحب نے سوئیوں پر دہی ڈال کر کھایا اور پھر بادشاہی مسجد میں ٹھنڈے فرش پر نماز عید ادا کی، اس سے نزلہ کی شکایت ہوئی اور گلا بیٹھ گیا۔ شروع میں اسے معمولی نزلہ اور بخار سمجھا گیا۔ لیکن آہستہ آہستہ گلے کی تکلیف اور دمہ کے عارضہ نے مستقل علالت کی صورت اختیار کر لی۔ تاہم علالت کے دوران بھی آپ نے کاروبار فکر و تصنیف کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس دوران اُردو شعری مجموعہ "بالِ جبریل" کی ترتیب کے ساتھ، فارسی میں "مثنوی مسافر" کی تخلیق عمل میں آئی۔ انہی دنوں آکسفورڈ یونیورسٹی کی طرف سے آپ کے خطبات شائع ہو کر منصۂ شہود پر آ گئے۔

مریض بینا حکیم نابینا:

آپ کی علالت کے ساتھ ساتھ، بیگم صاحبہ بھی مریض چلی آ رہی تھیں۔ چنانچہ اسی سال ۷ مارچ کو آپ دہلی تشریف لے گئے اور دوسرے ہی روز یہاں کے مشہور ماہر طبیب حکیم نابینا کو نبض دکھائی اور بیگم کی بیماری کے بارے میں مشورہ طلب کیا۔

چہ عجب بوالعجیست:

۹ مارچ کو مکتب دیوبند کے عالم اور علمائے ہند کے مشہور سیاسی لیڈر کے بیان پر اپنے ردِ عمل کا بڑی شد و مد کے ساتھ اظہار فرمایا جو انہوں نے اسلام اور قومیت کی تعریف میں دیا تھا اور روزنامہ "احسان" لاہور میں شائع ہوا تھا۔

مولانا حسین احمد مدنی پر کانگریس کی فکر غالب تھی، وہ وطن کی بنیاد پر قومیت کے قائل تھے، جبکہ علامہ اقبال کے نزدیک یہ قطعی غیر اسلامی نظریہ تھا۔ آپ وطن کی جگہ دین کی بنیاد پر قومیت کی تشکیل کو جائز سمجھتے تھے۔ چنانچہ آپ نے دار العلوم دیوبند سے تعلق رکھنے والے عالم دین کے مسلمانوں کی جماعت مسلم لیگ کی بجائے ہندوؤں کی جماعت کانگریس کے ہم خیال و ہم آواز رہنے پر ازراہِ افسوس فرمایا:

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
سرود برسرِ منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر زمقامِ محمد عربی است
بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

دہلی میں تین روزہ قیام کے بعد، دس مارچ کو آپ لاہور واپس آ گئے۔

برقی مسیحائی:

۱۹۳۵ء کے شروع مہینہ میں آپ کی اُردو شعری تخلیق "بالِ جبریل" شائع ہوئی۔ اسی ماہ کے آخر میں آپ دہلی تشریف لے گئے۔ وہاں جامعہ ملیہ میں اس تقریب کی صدارت فرمائی جس میں نامور ترک خاتون خالدہ ادیب خانم نے لیکچر دیا۔ وہیں سے آپ برقی علاج کی غرض سے بھوپال روانہ ہوئے، ان دنوں اس مسلم ریاست میں آپ کے دوست اور خیرخواہ سید راس مسعود وزارتِ تعلیم کے عہدے پر فائز تھے۔ انہی کی دعوت اور مشورے پر آپ نے بھوپال کا رخ کیا تھا۔ یہاں کوئی ایک ماہ تک بذریعہ شعاع آپ کا علاج ہوتا رہا۔

معاشی ناآسودگی:

علالت اور خصوصاً گلا بیٹھ جانے کی وجہ سے وکالت ختم ہو چکی تھی اور معاشی ذرائع مسدود ہو کر رہ گئے تھے۔ ان حالات کا جناب راس مسعود کو علم تھا اور وہ شدت سے آپ کی پریشانی کو محسوس کر رہے تھے۔ خصوصاً انہیں فکر تھی کہ معاشی مسائل ڈاکٹر اقبال کی علمی و تخلیقی امور پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ خاموشی کے ساتھ کوشش کرنے لگے کہ کسی طرح ریاست بھوپال کی طرف سے ڈاکٹر صاحب کو علمی وظیفہ جاری کرا دیا جائے، تاکہ آپ اطمینان سے اپنے علمی و فکری امور انجام دیتے رہیں۔ جناب راس مسعود علامہ اقبال کی طبیعت شناس تھے۔ آپ کی خودی و خودداری سے واقف تھے اسی لیے انہوں نے اپنے اس ارادے کو آپ پر ظاہر نہیں کیا اور نہایت رازداری

کے ساتھ اپنی کوشش میں لگے رہے، لیکن علامہ صاحب کو کسی دوسرے ذریعہ سے علم ہو گیا۔ چنانچہ ۲۷ راپریل کو آپ نے راس مسعود کے نام ایک مکتوب میں لکھا۔

"میں ان شاء اللہ مئی کے آخر تک بھوپال آسکوں گا، میری بیوی گزشتہ دس سال سے بیمار ہے۔ اور تلی اور جگر کے عوارض میں مبتلا ہے اور اب بوجہ بخار اور زیادہ کمزور ہو گئی ہے۔ ہم لوگ، ان شاء اللہ اس سال کے وسط تک اپنے مکان میں چلے جائیں گے خدا کرے اس وقت تک میری بیوی میں چلنے پھرنے کی سکت پیدا ہو جائے۔ آپ نے میرے متعلق جس دلچسپی کا اظہار فرمایا ہے اس کے لیے آپ کا ممنون ہوں۔ اگرچہ مجھے آپ سے یہ کہنے میں کچھ تامل نہیں کہ مجھے اس سلسلے میں کامیابی کی کچھ زیادہ امید نہیں۔"

ردِ قادیانیت:

اسی ماہ کی ۱۴ تاریخ کو آپ کا مضمون جو قادیانیت کے دائرہ اسلام سے خارج کرنے کے سلسلہ میں تھا، ملک کے بیشتر اخبارات مثلاً ایسٹرن ٹائمز، ٹریبون، اسٹار آف انڈیا، دکن ٹائمز، اور اسٹیٹسمن میں شائع ہوا۔ اس کے ساتھ ہی اردو اخبارات نے بھی اس کے تراجم شائع کیے۔

زوالِ بدن کمالِ فن:

صحت مندروح کے مالک کو جسمانی مرض نے بری طرح گھیر رکھا تھا، مسلسل علاج معالجے کے بعد بھی تسلی بخش نتیجہ نہیں نکل رہا تھا، گلے کی تکلیف ایسے ہی موجود تھی، جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ برقی علاج کی غرض سے آپ بھوپال تشریف لے گئے تھے، اب اس کے دوسرے دور کے لیے ۱۵ جولائی کو دوبارہ بھوپال روانہ ہوئے۔ تقریباً ایک ماہ تک علاج ہوتا رہا، اور تخلیقات کا عمل بھی جاری رہا۔ بھوپال میں قیام کے دوران زیرِ تالیف اردو شعری مجموعہ (صورِ اسرافیل) کے بعض حصے مکمل کیے۔ بعد میں اس مجموعہ کا نام صورِ اسرافیل کی بجائے "ضربِ کلیم" رکھا گیا۔

یہاں بھوپال میں ہمیشہ کی طرح آپ سید راس مسعود کے مہمان تھے اور علاج کے ساتھ ساتھ آپ کو تمام تر سہولتیں میسر تھیں۔ مفکر و دانشور اقبال کی روحانی غذا کتب بنی تھی۔ اس دوران میں مطالعہ کے لیے بھی آسودگی میسر آئی۔ اس ذوق و شوق اور مشغلہ لطیف کا ذکر آپ نے سید

سلیمان ندوی کے نام ایک مکتوب میں بھی کیا، لکھتے ہیں۔

"میں بھی یہاں حمیدیہ لائبریری اور بعض پرائیویٹ احباب سے کتابیں منگوا کر دیکھتا رہا۔ الحمدللہ بہت سی باتیں مل گئیں۔ اس مطالعہ سے مجھے بے انتہا فائدہ ہوا۔ اور آپ کے خط نے تو اور بھی راہیں کھول دی ہیں۔ میں نے کبھی اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھا۔ اس واسطے کوئی میرا رقیب نہیں۔ اور نہ میں کسی کو اپنا رقیب تصور کرتا ہوں۔ فن شاعری سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ ہاں بعض مقاصد خاص رکھتا ہوں جن کے بیان کے لیے اس ملک کے حالات و روایات کی رو سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار کیا ہے۔"

آپ یہاں مقیم تھے کہ لاہور میں مسجد شہید گنج کا سانحہ پیش آیا۔

یہی سال ہے کہ آپ مولانا الطاف حسین حالی کی صد سالہ تقریبات میں شرکت کی غرض سے پانی پت تشریف لے گئے۔

☆☆

maablib.org

اپنا گھر:

سالہا سال سے ڈاکٹر صاحب لاہور میں کرائے پر رہائش پذیر چلے آ رہے تھے۔ بے نیازانہ طبیعت کے سبب آپ نے سوچا ہی نہ تھا کہ اپنا مکان بھی کیا جائے۔ اور اگر ایسا کوئی ارادہ رہا ہوگا بھی تو ذرائع کہاں تھے کہ اسے عملی صورت دے سکتے۔ لیکن عموماً دیکھا گیا ہے کہ گھر کی خواہش بہ مردوں نسبت عورت کو زیادہ ہوتی ہے۔ بلکہ آرزو رکھتی ہے کہ اس کا اپنا گھر ہو۔ سردار بیگم صاحبہ کی بھی یہ دیرینہ آرزو تھی کہ ڈاکٹر صاحب کرائے کی جگہ سے نکل کر اپنا کوئی مکان تعمیر کرلیں۔ وہ اپنی اس خواہش کا گاہے بگاہے شوہر کے سامنے اظہار بھی کرتی رہتی تھیں۔ آخر بیگم کی درخواست اور ان کی خواہش کے پیش نظر ڈاکٹر صاحب نے ایک قطعہ اراضی خریدا اور اس پر تعمیر شروع کرادی۔ مکان کا نقشہ آپ کے برادر کلاں شیخ عطا محمد صاحب نے بنایا اور تعمیر کا کام بھی انہی کی زیر نگرانی ہوتا رہا۔ مکمل ہونے پر اس کا نام "جاوید منزل" طے ہوا۔ جو آج ایک قومی ورثہ کے طور پر پہچانی جاتی ہے۔ لیکن اس عمارت کا ایک افسوسناک پہلو یہ ہے کہ جس "اپنے گھر" کی آرزو وہ خاتون کرتی رہیں جو کرائے کے مکان میں بھی شوہر کو گھر کا سا سکون مہیا کرنے میں کامیاب رہی تھیں، جب یہ ان کا "اپنا گھر" مکمل ہوا تو خود ان کی جسمانی عمارت مخدوش ہو چکی تھی۔ صحت نے اس قدر جواب دے دیا تھا کہ وہ اپنے پاؤں پر چل کر اس "اپنے گھر" میں داخل نہ ہو سکیں۔ چارپائی پر لٹا کر انہیں اندر لے جایا گیا۔

جاوید منزل:

جاوید منزل میں منتقل ہو جانے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے بیگم کو مشورہ دیا کہ وہ اس جگہ کو اپنے بیٹے جاوید کے نام ہبہ کر دیں۔ مکان اصل میں انہی کے نام تھا اور اس میں انہوں نے اپنے زیورات فروخت کر کے مالی معاونت کی تھی۔ جب شوہر نے یہ کہا تو عمر بھر میاں کی فرماں بردار بیوی اس وقت شوہر کے اس مشورے پر پس و پیش کرنے لگیں۔

"مجھے کیا معلوم یہ لڑکا بڑا ہو کر کیا نکلے گا میں جلد صحت یاب ہو جاؤں گی، آپ کسی طرح کی فکر نہ کریں۔"

ڈاکٹر صاحب نے انہیں یاد دلایا کہ زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ تب انہوں نے اس ہبہ نامہ پر دستخط کر دیے جو آپ نے پہلے ہی تیار کر رکھا تھا۔

مکین سہ روزہ:

علامہ صاحب غالباً اس سال مئی کی ۲۰ تاریخ کو میکلوڈ روڈ سے اپنی ذاتی نو تعمیر رہائش گاہ میں منتقل ہوئے تھے۔ لیکن آپ کی اہلیہ سردار بیگم جنہیں اپنے ذاتی گھر کی بڑی آرزو تھی، اپنے خواب کے اس تعبیر خانہ میں منتقل ہونے کے تین روز بعد، دوسرے جہاں منتقل ہو گئیں۔ اب آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ علامہ ڈاکٹر محمد اقبال کو ایک طرف یہ غم، دوسری طرف صحت کی مخدوشی، اس پر معاشی بدحالی، ان سب باتوں نے آپ کے ذہن و دل پر جو اثرات مرتب کیے ہوں گے یہ وہی جانتے ہوں گے۔

اس عالم میں بھی یہ مردِ درویش اپنے ذہن میں ایک اور بڑا فکری منصوبہ رکھتا تھا، وہ یہ کہ آپ اپنے ذہن میں مرتب کردہ قرآن کے متعلق اپنے افکار کو قلم بند کرنا چاہتے تھے۔ اس دیرینہ علمی منصوبے سے متعلق آپ راس مسعود کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں۔

آرزوئے قرآنی:

"چراغِ سحر ہوں، بجھا چاہتا ہوں، تمنا ہے کہ مرنے سے پہلے قرآن کریم سے متعلق اپنے افکار قلمبند کر جاؤں۔ جو تھوڑی سی ہمت اور طاقت مجھ میں باقی ہے اسے اسی خدمت کے لیے

وقف کر دینا چاہتا ہوں۔ تاکہ قیامت کے دن آپ کے جدِ امجد کی زیارت مجھے اس اطمینان کے ساتھ میسر ہو کہ اس عظیم الشان دین کی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم تک پہنچایا کوئی خدمت بجالا سکا۔"

شکریہ بھوپال:

ابھی آپ کا یہ مکتوب ڈاک کے حوالے ہوا تھا کہ آپ کو اطلاع موصول ہوئی کہ نواب صاحب بھوپال، حمید اللہ خان صاحب نے آپ کے لیے تاحیات پانچ صد روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا ہے۔ لہٰذا اسی روز علامہ صاحب نے دوسرا مکتوب تحریر کیا جس میں اظہارِ ممنونیت فرماتے ہوئے لکھا: "ایسے وقت میں میری دست گیری فرمائی جب کہ میں چاروں طرف آلام و مصائب میں محصور تھا۔ خدا تعالیٰ ان کی عمر و دولت میں برکت دے، ہندوستان کے شرفا میں سے کون ہے جو اعلیٰ حضرت اور ان کے دودمانِ عالی کا ممنونِ احسان نہیں ہے۔"

فکرِ اولاد:

بیگم اقبال، سردار بیگم صاحبہ کے انتقال سے ایک مسئلہ بچوں کی نگہداشت کا مسئلہ پیدا ہوا، جو ماں کی شفقت سے محروم ہو گئے تھے۔ اس وقت آپ کے بیٹے جاوید کی عمر گیارہ سال اور بیٹی منیرہ پانچ سال کی تھی۔ علامہ صاحب کو ان کی تعلیم اور دیکھ بھال کی طرف سے فکر مند ہو گئے۔ اور ضرورت محسوس ہونے لگی کہ کوئی ایسی خاتون مل جائے جو بیوہ اور بے اولاد ہو اور قرآن کریم اور اردو پڑھنا جانتی اور کھانا وغیرہ بنا سکتی ہو۔ اس سلسلے میں انھوں نے کئی افراد سے رابطہ کیا، رشید احمد صدیقی صاحب کو بھی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی خط لکھا۔ یونیورسٹی میں شعبۂ نباتیات کے استاد ڈاکٹر علی اصغر کی جرمن نژاد بیگم کی ایک بہن مس ڈورس بھی قیام پذیر تھی، رشید احمد صدیقی نے انھیں لاہور میں ڈاکٹر اقبال کے ہاں جانے پر رضامند کر لیا۔

آیا نہیں "خاتون"

اس طرح جاوید منزل کے مکینوں میں ایک خاتون کا اضافہ نہیں ہو گیا بلکہ ڈاکٹر اقبال کو بچوں کی نگہداشت کے لیے ایک ایسی سرپرست میسر آ گئی جو مسلم گھرانوں کے ماحول سے واقف تھی اور

یہاں کی عمومی زبان اُردو بھی بول سکتی تھی۔ ڈورس نے اپنے فرائض اس خوبی سے انجام دیے کہ علامہ اقبال کو اعتراف کرنا پڑا اور رشید احمد صدیقی کو لکھا کہ:

''خاتون کی آمد نے میرے تاریک گھر کو روشنی عطا کی ہے، میری بچی (بانو) کو مادرانہ شفقت کا بے بہا ذخیرہ خدائے کریم کی مہربانی سے عطا ہوا ہے۔ اللہ کریم آپ کو اس کا اجر دے گا۔''

اعتراف و تشکر:

خود ڈورس احمد نے جو کسی قدر غالباً بیوہ ہونے کے سبب دل شکستہ تھی۔ جاوید منزل میں پہنچ کر کسی اجنبیت کا نہیں بلکہ اپنائیت کی فضا محسوس کی، جیسا کہ اس نے رشید احمد صدیقی کو لکھا:

''میں تو ڈرتے ڈرتے اس گھر میں داخل ہوئی تھی، لیکن چوبیس گھنٹے کی مدت میں ایسا محسوس ہوا جیسے میرا کھویا ہوا وہ گھر جو میں برلن میں چھوڑ آئی تھی، مجھے واپس مل گیا۔ سر اقبال کی عالمانہ بصیرت اور شہرۂ آفاق قابلیت سے تو میں ناواقف ہوں لیکن ان کی شریفانہ دل نوازی اور مشفقانہ سرپرستی نے مجھے زندگی کی بہت سی ناانصافیاں اور محرومیاں بھلا دی ہیں۔''

مثالی آیا:

علامہ اقبال اس اعتبار سے بہت خوش نصیب ہیں کہ آپ کی علی بخش ایسا وفادار خادم اور ڈورس احمد ایسی بچوں کی اتالیق میسر آئی، دونوں نے خدمت اور وفاداروں کی اعلیٰ مثال قائم کی۔ میں چاہوں گا اس جگہ اس خاتون کے بارے میں مزید بتا دیا جائے، کہ ممکن ہے آگے چل کر موقع نہ مل سکے۔ اس کے لیے پہلے ہم خود ڈورس یا ڈورا صاحب کی اپنی یادداشتوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہایت محنتی اور جفاکش خاتون تھیں خلوص اور ایثار کا گھر یا ایک پیکر تھیں، انھوں نے نہایت ذمہ داری کے ساتھ بچوں کی نگہداشت کی اور وہ بہت جلد ان کی ''آیا'' بن گئیں۔ کیونکہ اردو اور انگریزی اچھی طرح بول سکتی تھیں جس سے انھیں دوسروں سے رابطہ کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی تھی۔

ڈورس صاحبہ، علامہ صاحب کی وفات کے بعد بھی کوئی اٹھائیس سال تک جاوید منزل کی مکین بن کر رہیں، یہاں تک کہ منیرہ اور جاوید دونوں کی شادیاں انھی کی موجودگی میں ہوئیں۔ اس عرصہ میں انھوں نے ایک جرمن کمپنی سی مینز میں ملازمت کر لی، تاہم ان کا مسکن جاوید منزل ہی رہا۔ ۱۹۶۶ء میں اپنے بھائیوں کے پاس جرمنی گئیں، ۱۹۶۳ء میں جاوید کی شادی کے وقت واپس آئی، لیکن تین ماہ بعد دوبارہ بھائیوں کے پاس چلی گئیں اور کئی سال کے بعد ۱۹۶۷ء میں پاکستان آئیں، مگر پھر ۱۹۷۷ء میں جرمنی لوٹ گئیں، لیکن اس سال صدرِ پاکستان نے انھیں خدمت ایوارڈ سے نوازا۔ وہ جرمنی گئیں لیکن ان کی مٹی نے اقبال کے شہر سے رشتہ نہ توڑا اور ۱۹۹۳ء میں لاہور میں ہی اپنی جان، جانِ آفریں کے سپرد کی اور یہیں سپردِ خاک ہوئیں۔

☆☆

maablib.org

قادیانیت اور اقبال:

حضرت اقبال اپنی ذاتی مشکلات و پریشانیوں کے باوجود خود کو قومی معاملات کے ساتھ جوڑے ہوئے تھے۔ کشمیر کمیٹی کا پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے۔ آپ مذکورہ کمیٹی کے معاملات میں قادیانیوں کے اصل کردار سے واقف ہو چکے تھے۔ یہ تفصیل طلب باتیں ہیں، ان کا اظہار اس جگہ سے مناسبت نہیں رکھتا تاہم اتنا یاد رہے کہ یہ فرقہ یعنی قادیانی، در پردہ انگریزوں سے ملا ہوا تھا اور اس کا سرپرست جو خود کو خدا کی طرف سے بھیجا ہوا ہادی و رہنما کی حیثیت سے متعارف کراتا تھا، دراصل انگریز مشینری کا پروردہ اور ان کی طرف سے تخلیق کردہ فتنہ تھا۔ قادیان کشمیر میں ہے اور یہ جھوٹا اور کذاب اسی قادیان سے تعلق رکھتا تھا۔ اسی نسبت سے اس کا فرقہ بھی اور اس کے گمراہ کردہ لوگ بھی "قادیانی" کہلاتے ہیں۔

کشمیری ہونے کی وجہ سے قادیانی فرقے کا یہ سرخیل، کشمیر کمیٹی کا سرپرست بنالیا گیا تھا۔ اس وقت تک لوگوں پر اس کی اصلیت ظاہر نہیں ہوئی تھی، لیکن جب اس کا پردہ فاش ہوا اور یہ بات ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ اس کی سرگرمیاں کشمیریوں کے حق میں نہیں بلکہ یہ فتنہ گر برطانوی استعمار کی چھتری تلے اپنے ناپاک مقاصد براری کے لیے نہایت ہی غلیظ اور خطرناک کھیل کھیلنا چاہتا ہے۔ یعنی مسلمانوں کے عقیدے میں آلودگی پھیلا کر انہیں فکری طور پر تقسیم کرنے اور ان کے اندر کن فیوژن پیدا کرنے کا گمراہ کن منصوبہ رکھتا ہے۔ علامہ اقبال اس کو نہایت ہی سنگین مسئلہ سمجھتے تھے۔ لہٰذا اپنی مسلسل علالت اور گرتی ہوئی صحت کے باوجود آپ نے مسلم امہ کو درپیش اس نہایت اہم

موجودہ مسئلہ کی حقیقت سے آگاہ کرنے کا عزم کیا اور "قادیانی اور راسخ العقیدہ مسلمان" کے عنوان سے ایک پُر مغز مضمون تحریر کر کے اردو اور انگریزی اخبارات میں شائع کرایا۔ جس کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔ اس مضمون کے لکھنے کا اصل مقصد برطانوی رائے عامہ کو اس سنگین مسئلہ کی طرف توجہ دلانا اور خبردار کرنا تھا کہ وہ اس کی سرپرستی سے باز آ جائیں۔

قادیانی فرقہ بلاشبہ انگریز کا پیدا کردہ تھا اور وہی سب سے زیادہ اس کی پشت پناہی کر رہے تھے، کیونکہ یہ مسلمانوں میں انتشار کا سبب بن سکتا تھا لہٰذا اس فتنہ کی رد میں مفکر اسلام کی تحریریں ۱۹۳۵ء کے علاوہ ۱۹۳۶ء میں بھی شائع ہوئیں۔

گو قادیانیت کے مذموم عزائم اور ان کے مضمرات کی نشاندہی ہمارے کئی علمائے دین نے بھی کی، وہ بجائے خود بہت قابلِ ستائش کام ہے، ان حضرات میں علامہ انور شاہ کاشمیری، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا ابوالکلام آزاد، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا ظفر علی خان، چوہدری افضل حق، سید ابوالحسن ندوی، جناب الیاس برنی اور سید ظفر علی وغیرہ خصوصاً قابلِ ذکر ہیں لیکن اس گمراہ اور اسلام دشمن گروہ کو جس طرح علامہ اقبال نے بے نقاب کیا وہ قاطع برہان کی حیثیت رکھتا ہے۔

تعصبانہ غلط فہمی:

اس جگہ میرے لیے لازم ہے کہ میں اس غلط فہمی کی وضاحت رقم کردوں جو ہمارے چند تعلیم یافتہ بے خبر افراد میں جہل کی حد تک پائی جاتی ہے، یعنی بعض لوگ نہایت بے باکانہ انداز میں (جیسا کہ نیم حکیم، نیم ملا اور کم تعلیم یافتہ لوگوں کی عادت رہی ہے) کہہ دیتے ہیں کہ اقبال قادیانی عقیدے کے حامی، یا قادیانیت کے قائل تھے یا دل میں اس کے لیے کوئی ایسا واسطہ رکھتے تھے جس کو نرم گوشہ کہہ سکتے ہیں۔ تو اس جہل پر کیا تبصرہ کیا جائے۔ ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت علامہ کو قادیانیت سے اس قدر نفرت تھی کہ آپ اس کو معاشرتی ناسور خیال فرماتے تھے۔ اس کا ثبوت آپ کے وہ متعدد مضامین ہیں جو قادیانیت اور اس کے بانی کے خلاف برصغیر کے بیشتر اخبارات میں شائع ہوتے رہے تھے۔ ختم نبوت پر اقبال کا یقین، ایمان کا سرنامہ ہے، اسی لیے تو اپنی سرمستی میں فرماتے ہیں:

وہ دانائے سُبل ختم الرُسل مولائے کُل جس نے
غبار راہ کو بخشا فروغ وادیٔ سینا
نگاہ عشق و مستی میں وہی اول، وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسیں، وہی طٰہٰ

دراصل یہ افواہیں جو علامہ صاحب اور آپ کے خاندان سے متعلق پھیلتی رہی ہیں، اس کا سبب یہ ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی اول اول سادہ لوح عوام کے سامنے نبی بن کر نہیں، ولی بن کر آیا تھا، اس نے ایک مذہبی مصلح کے طور پر خالص اسلامی تہذیب کو زندہ کرنے کا نعرہ لگایا اور مسلمانوں کو اسلامی اقدار اپنانے کا درس دیا۔ تو وہ لوگ جنہیں اپنے دین وایمان سے پیار اور لگاؤ ہے، اس بات کو اور اس بات کے کہنے والے کو کیوں نہ پسند کرتے، مزید یہ کہ مرزا کذاب نے اپنی شخصیت کو کسی قدر روحانیت کے رنگ میں بھی پیش کیا، لہٰذا اقبال سے متعلق جیسا کہ ہم دیکھتے آئے ہیں جس شخص کو بھی آپ دنیا کی تہذیبوں کے مقابل تہذیب اسلامی کا نقیب پاتے اس کی تعریف کیے بغیر نہ رہتے، لہٰذا مرزا غلام احمد کا شروع دور تھا، لوگ اس کو ایک روحانی شخصیت اور انگریزی تہذیب کا نقاد سمجھ کر اپنا رہے تھے، اس کی اس تصویر کو دیکھ کر ڈاکٹر اقبال کی زبان پر بھی اس کے لیے توصیفی کلمات آ گئے اور آپ نے فرما دیا: "یہ شخص خالص اسلامی تہذیب کا پرچارک ہے۔" بلکہ اسے آپ نے "جدید شہری مسلمانوں کا بہت بڑا دینی مفکر" قرار دیا۔ لیکن جب مرزا کا اصل چہرہ آپ کے سامنے آیا کہ وہ خالص اسلامی تہذیب کا "پرچارک" اور دینی مفکر نہیں، بلکہ خود ہی "جدید نبوت" کا دعویدار ہے تو آپ نے اس پر لاحول پڑھ دیا اور پھر اس عیار کی تحریک کا خرد بینی جائزہ لے کر اپنے مضامین کے ذریعہ اس کے تار و پود بکھیر کر رکھ دیئے۔

اب ہم علامہ صاحب کے خاندان میں قادیانیت کے شبہات پر نظر ڈالتے ہیں، تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ مرزا غلام احمد جن دنوں آریائیوں اور عیسائیوں کے ساتھ بڑے دھوئیں دار مناظرے کر رہا تھا، جنہیں دیکھ کر بیشتر مسلمانوں کی طرح شیخ اقبال کے والد شیخ نور محمد بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ انہوں نے بھی عام مسلمانوں کی طرح مرزا غلام احمد کو اسلام کا مخلص اور مسلمانوں کا بہی خواہ سمجھ لیا۔ یہی تاثر ڈاکٹر اقبال کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد نے لیا۔ یہاں تک

کہ شیخ نور محمد نے تو مرزا غلام سے باقاعدہ بیعت بھی کر لی۔ لیکن جیسے ہی اس کے خفیہ عزائم بے نقاب ہوئے، مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ اس سے الگ بلکہ متنفر ہو گیا۔ ان میں خود شیخ نور محمد اور ان کے بڑے فرزند عطا محمد بھی تھے۔

یہ تذکرہ جو ہم کر رہے ہیں، اگر کسی کی تشفی کے لیے کافی نہیں تو خود قادیانیوں کے ایک نہایت مستند ترجمان مرزا غلام بشیر کی اس تحریر کا بغور مطالعہ کر لیں تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ ان کی بے علمی اور غلط فہمی کس درجہ پر ہے۔ مرزا غلام بشیر رقمطراز ہے۔

''ڈاکٹر سر محمد اقبال جو سیالکوٹ کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد کا نام شیخ نور محمد تھا۔ شیخ نور محمد صاحب نے غالباً ۱۸۹۱ء تا ۱۸۹۲ء میں مولوی عبدالکریم صاحب مرحوم اور سید حامد شاہ صاحب مرحوم کی تحریک پر حضرت مسیح موعود علیہ السلام (مرزا غلام احمد قادیانی) کی بیعت کی تھی، ان دنوں سر محمد اقبال اسکول میں پڑھتے تھے۔ اپنے باپ کی بیعت کے بعد وہ بھی اپنے آپ کو احمدیت میں شمار کرتے تھے اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام (لعنت اللہ علیہ) کے معتقد تھے۔ چونکہ سر محمد اقبال کو بچپن سے شعر و شاعری کا شوق تھا اس لیے ان دنوں میں انہوں نے سعد اللہ لدھیانوی کے خلاف حضرت مسیح موعود علیہ السلام (لعنت اللہ علیہ) کی تائید میں ایک نظم بھی لکھی تھی مگر اس کے چند سال بعد جب سر اقبال کالج پہنچے تو ان کے خیالات میں تبدیلی آ گئی اور انہوں نے اپنے باپ کو سمجھا بجھا کر احمدیت سے منحرف کر دیا۔ چنانچہ شیخ نور محمد صاحب نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام (لعنت اللہ علیہ) کی خدمت میں ایک خط لکھا جس میں یہ تحریر کیا کہ...... ''آپ میرا نام اس جماعت سے الگ رکھیں۔'' اس پر حضرت صاحب کا جواب میر حامد شاہ صاحب مرحوم کے نام گیا۔ جس میں لکھا تھا کہ شیخ نور محمد کو کہہ دیں کہ وہ جماعت سے ہی الگ نہیں بلکہ اسلام سے بھی الگ ہیں۔'' مرزا غلام بشیر مزید لکھتا ہے۔ ''ڈاکٹر سر محمد اقبال اپنی زندگی کے آخری ایام میں (احمدیت کے) شدید مخالف رہے اور ملک کے نوتعلیم یافتہ طبقہ میں احمدیت کے خلاف جو زہر پھیلا ہوا ہے اس کی بڑی وجہ ڈاکٹر سر محمد کا مخالفانہ پروپیگنڈا تھا۔'' (''سیرت المہدی'' ج ۳، ص۔ ۲۴۹)

کیا اس بیان کے بعد بھی علامہ اقبال ایسے مرد مومن اور عاشق رسول کے لیے یہ خیال بھی کیا جا سکتا ہے کہ وہ قادیانیت کے لیے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتے تھے؟ اور جس کم سنی کے دور

میں آپ مرزا غلام احمد قادیانی لعنت اللہ علیہ سے متاثر تھے تو اس دور کو آپ خود ہی اپنا دورِ جہالت فرما چکے ہیں اور یہ بات بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ آپ کے والد بھی اگر دیگر سینکڑوں مسلمانوں کی طرح مرزا لعنتی سے بیعت ہوئے تھے تو اس وجہ سے نہیں کہ وہ اس کذاب کی نبوت کے قائل تھے، بلکہ ان سمیت عام لوگوں کو تو علم ہی نہ تھا کہ یہ مردود بزرگی اور پیری کے پردے میں یہ گھناؤنا کھیل کھیل رہا ہے، لوگ تو اسے ایک دینی اور روحانی شخصیت سمجھ کر اس کے مداح اور پیروکار بنے تھے، اس کے ساتھ ہی ایک اور بات بھی قابلِ غور ہے کہ اگر ایسا نہ تھا اور مرزا غلام کا شروع میں ہی پردہ فاش ہو گیا تھا اور شیخ نور محمد کو دیگر سادہ لوح مرزا کے "مریدوں" کے علم میں آ گیا تھا کہ مرزا عیار ختم نبوت کا قائل نہیں، یہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبی تسلیم نہیں کرتا بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد، اس دور میں اب خود کو نبی موعود بنا کر پیش کر رہا ہے تو اقبال کے استاد محترم مولوی میر حسن جیسی شخصیت نے جو اپنے شاگرد کے اتالیق بھی تھے، ایک بار بھی اپنے شاگرد کو اس فتنہ سے دور رہنے کی تلقین نہیں؟ اور یہ بھی قابلِ غور بات ہے کہ اگر مرزا کی عیاری کا پردہ چاک ہونے اور اس کذاب کا اصل چہرہ سامنے آنے کے بعد بھی اگر اقبال اسے اپنا "مرشد و پیشوا" مانتے رہتے تو سر کا خطاب حاصل کرتے وقت شمس العلماء کے خطاب کے لیے اپنے استاد مولوی میر حسن کی بجائے اپنے "مرشد" مرزا غلام احمد قادیانی کے لیے سفارش کرتے۔

دراصل جہالت کے بہت سے روپ ہیں، ایک یہ کہ بغیر تحقیق کیے، فقط سنی سنائی بات پر یقین کر لینا اور آگے بڑھا دینا، خصوصاً اس وقت جب دل میں عصبیت کی بیماری کا بیج بھی بو دیا گیا ہو۔

☆

غریب پروری:

قلندری و بے نیازی کے ساتھ ساتھ علامہ صاحب کی ایک اور بڑی انسانی خوبی آپ کی غریب نوازی و غریب پروری ہے۔ برصغیر میں سرسید سے لے کر اور دیگر مسلم رہنما جو عوام کی ترجمانی و رہنمائی کرنے کے دعویدار رہے ہیں، سوائے اقبال ایک بھی ایسا نظر نہیں آتا جو واقعتاً اور عملاً عوامی رہا ہو۔ اس وی آئی پی گروپ نے عام مسلمانوں خصوصاً پیشہ ور افراد کو تو مسلمان کیا انسانوں کی صف میں بھی شامل نہیں کیا۔ یہ "اعلیٰ نسل" انہیں رذیل اور کمین کہہ کر نوازتے رہے۔

جاہل، اجڈ، گنوار اور وہ کون سی ''گالی'' ہے جو یہ اپنی تحریروں اور نجی محفلوں میں ان غریب عوام کو نہ دیتے رہے جن کی رہنمائی کے یہ دعویدار تھے اور اپنے جلسوں میں انہی کی شرکت سے اپنے مخالفین پر اپنی افرادی قوت کا مظاہرہ کرتے تھے اور انہی کے ووٹوں سے منتخب ہو کر حکومتی بالا خانوں کی زینت بنتے تھے۔ عوام سادہ لوح ہوتے ہیں، یہ چالاک منافقین انہیں بے وقوف بناتے ہیں اور یہ ان کی چکنی چپڑی باتوں میں آجاتے ہیں۔ یاد رہے کہ یہ اس لئے ان اعلیٰ نسل کے نظر میں رذیل و کمین سمجھے جاتے ہیں کہ وہ ان نام نہاد شرفا کی اولاد ہیں جو طوائف کے کوٹھوں پر جا کر تہذیب و شرافت کا درس لیتے رہے ہیں۔ یہی غریب محنت کش جنہیں یہ نواب صاحب، خان صاحب، شاہ صاحب اور وہ جن کی رگوں میں عیاش اور ظالم شہنشاہوں کا خون دوڑ رہا ہے، ان کے کارخانوں اور اداروں میں اپنی ہڈیاں پیس کر ان کی تجوریوں کو بھرتے ہیں، ان ساہوکار اور شائی لاکو کے نزدیک یہ نچلا طبقہ یہی سمجھا گیا۔ ان آقاؤں نے کبھی نہیں سوچا کہ ان کے یہ غلام بھی گوشت پوست کے انسان ہیں، یہ بھی اولاد رکھتے ہیں، یہ بھی اپنی اولاد کو مستقبل میں کچھ اچھا دیکھنا چاہتے ہوں گے۔ ان کے جذبات کو بھی سمجھا جائے، ان کے احساسات کی بھی قدر کی جائے، ان کی زندگیوں کو بھی بدلنے کے لئے کچھ کیا جائے، لیکن نہیں ان کالے انگریزوں نے خود کو گوروں کی طرح سمجھ لیا کہ ہمیں بالا و اعلیٰ رہنا ہے، حکمرانی اور آقائی ہمارا حق ہے، چنانچہ برصغیر کی تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے کہ یہاں کے غریب عوام کی نسلیں ان وڈیروں، جاگیرداروں، نواب اور بادشاہ زادوں کے جانور اور یکے ہانکتے، ان کی چپی کرتے، پاؤں دباتے اور حقہ بھرتے، برتن مانجھتے اور جھڑکیاں اور گالیاں کھاتے گزر گئیں۔

یہی حال اہل مدرسہ کا رہا، سبق دیتے رہے کہ سب انسان برابر ہیں اور مسلمان تو آپس میں اخوت کا رشتہ رکھتے ہیں، اسلام میں اونچ نیچ اور گورے کالے کی کوئی تمیز نہیں (اور جب کہ نہیں ہے) لیکن عملاً یہ بھی عامیوں کے لئے ایسے ہی ''صاحب بہادر'' رہے ہیں جیسا کہ گورے ان کالے مفروروں کو نیچ غلام اور پیر کی جوتی سمجھتے تھے، بلکہ اب بھی سفید نسل کی اس ذہنیت میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ اس کا نمایاں اشتہار ٹرمپ نامی امریکہ کا سربراہ ہے۔

مختصر یہ کہ ہندوستان کے بڑے بڑے نام نہاد مصلح قوم اور دانشوروں کی تصنیفات ان کی

رعونت اور ابلیسی ذہنیت کی گواہ ہیں کہ یہ خدا کے بندوں کو اپنی اعلیٰ اعلیٰ تخلیقات میں کس طرح مخاطب کرتے نظر آتے ہیں۔

ہمارے پاس اس وقت گنجائش نہیں اور نہ ہی یہ اس وقت ہمارا موضوع ہے ورنہ عالی جناب ڈپٹی نذیر سے لے کر دور حاضر کے مصلحین قوم اور انسانیت کے علمبرداروں کی تحریروں میں سے وہ غلاظت آپ کے سامنے پیش کر سکتے تھے جو انسانیت کی سراسر توہین کرتی نظر آتی ہیں اور ان کی روحوں کو آئینہ دکھا سکتے کہ جب یہ کروڑوں لوگ رذیل اور کمین ہیں تو پھر تم کس منہ سے ان کی ترجمانی اور رہنمائی کے دعویدار بنتے آ رہے ہو۔ وہ لوگ جن کی رگوں میں دہشت گرد منگولوں یا ان میں سے چھن کر آنے والے عیسائیوں کا خون دوڑتا ہے یا وہ لوگ جنہوں نے کچھ مقدس و پاکیزہ ہستیوں سے اپنے صلبی و نسبی رشتے جوڑ رکھے ہیں، کیا یہ منافقین اپنے کرتوت کے سبب عزازیل عرف ابلیس کے اس موقف کی تائید کرتے نظر نہیں آتے جو اس نے بارگاہ ایزدی میں خاکی کے مقابل اپنے آپ کو فخریہ طور پر ناری کہہ کر اپنی برتری کا اظہار کیا تھا" واستکبرو کان من الکافرین " اس نے استکبار کیا اور وہ کافروں میں ہو گیا۔ میں اس طولانی تمہید پر نہایت معذرت خواہ ہوں تاہم شاعر اسلام کی اس انفرادیت کو بیان کرنے سے پہلے، یہ منظر نامہ پیش کرنا ضروری تھا۔ کیونکہ اس بت کدۂ ہند میں صرف اقبال ہی ایسا سچا مسلمان بلکہ مرد مومن نظر آتا ہے جس نے رنگ و نسل، فرقہ پرستی، خاندانی برتری کے بتوں پر نہ صرف اپنی شاعری کے گرزوں سے کاری ضربیں لگائیں بلکہ اسلامی مساوات کو ہر موقع و محل پر عملاً برت کے دکھایا۔ ہم ان کی روزمرہ زندگی سے چند جھلکیاں پیش کرتے ہیں:

ایک بار آپ کی ہمشیرہ کے بیٹے نے علی بخش کو کسی گرے ہوئے لفظ سے مخاطب کیا، آپ کو علم ہوا تو آپ نے اس کی خوب خبر لی اور جب تک اس نوجوان نے علی بخش سے معذرت نہ کر لی آپ نے اسے معاف نہیں کیا۔

اسی طرح ایک بار آپ کے ہاں کھانے میں دال بنائی گئی تھی، لیکن آپ کو جب یہ علم ہوا کہ ان کے اپنے لئے دال میں گھی ڈالا گیا تھا، لیکن ملازموں کو سادہ دے دی گئی، تو آپ کو یہ امتیاز سخت ناگوار گزرا اور گھر میں خاصی ناراضی کا اظہار فرمایا۔

اب اس سے بھی ذرا آگے جا کر دیکھئے کہ اقبال اپنے دل و دماغ میں بلا امتیاز قوم و مذہب انسانیت کا کس درجہ درد رکھتے تھے یہ واقعہ آپ کی شخصیت کو عظیم تر بناتا نظر آتا ہے۔

آپ کے گھر میں آنے والی ایک جاروب کش خاتون اپنے ساتھ اپنے بچے کو بھی لے آتی تھی جو اس وقت جاوید کا ہم عمر تھا، جب تک وہ مہترانی کام کرتی رہتی، اس کا یہ بچہ صحن میں ادھر اُدھر کھیلتا پھرتا۔ گرمیوں کے دن تھے، ایک دن آپ کی چارپائی صحن میں پڑی تھی، آپ لیٹے ہوئے تھے، محمد شفیع اس وقت آپ کے پاس موجود تھے۔ یکایک آپ کی نظر صحن میں کھیلتے ہوئے مہترانی کے بچے پر پڑی اور آپ اسے دیکھتے رہ گئے، پھر بچے پر سے نظریں ہٹائے بغیر محمد شفیع سے مخاطب ہوتے: شفیع جی آپ اس بچے کو دیکھ رہے ہیں؟

محمد شفیع نے دیکھا آپ کی نظریں بچے پر گڑی ہوئی ہیں، ڈاکٹر اقبال آپ ہی آپ کہنے لگے: ''میں جب بھی اس بچے کو دیکھتا ہوں میرا دل پارے کی طرح بے قرار ہو جاتا ہے، سوچتا ہوں سماجی ناہمواریوں کے سبب یہ بچہ صرف خاکروب ہی بن سکے گا، حالانکہ اس میں اور جاوید میں جہاں تک انسان ہونے کا تعلق ہے کوئی فرق نہیں، اگر جاوید ذہانت میں اس لڑکے سے کم بھی ہو تو محض اس وجہ سے کہ وہ میرا بیٹا ہے اس پر ترقی کے راستے کھلیں گے۔''

ملاحظہ کیا آپ نے ایک عظیم انسان اور سچے مؤمن کے سچے خیالات!۔

خادم خاص علی بخش جس کی علامہ سے وفاداری ایک عظیم الشان مثال رکھتی ہے، کسی بھی مرحلہ پر خادم نہیں بلکہ ایک ایثار رفیق معاون نظر آتا ہے جو اپنی ملازمت کو جسم و جان کے ساتھ نہیں اپنی روح اور دل کے ساتھ انجام دیتا رہا ہے۔ وہ اپنے اس ''مخدوم'' کی اس طرح دیکھ بھال کرتا ہے، جیسے کوئی ماں اپنے بچے کی نگہداشت کرتی ہے، اقبال اپنے اس ان پڑھ گھریلو منتظم کو ''پرسنل سیکریٹری'' کا سا درجہ دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ مشفقانہ برتاؤ رکھتے ہیں، اپنے گھریلو سودا کا سارا اس پر چھوڑ رکھا ہے، کبھی پیسے ٹکے کا حساب نہیں پوچھتے، وہ سفید کرے یا سیاہ، سب کے لئے آزاد اور مختار ہے۔ یہی رویہ علامہ کا اپنے دفتری منشی طاہر الدین کے ساتھ تھا، اسی لیے عمر بھر اقبال کے گھر کے ایک فرد کی طرح رہے۔ علامہ کے اس کردار اور مزاج کا خصوصی ذکر ہم نے اس لیے کیا ہے کہ جب ہم مردِ مومن کی بات کرتے ہیں تو اس کردار کا جائزہ اس کی نجی زندگی میں لینا ضروری

ہو جاتا ہے۔ مومن خدا کا بندہ اس وقت کہلا سکتا ہے جب وہ خدا کے بندوں سے خود بھی پیار کرتا ہوگا۔ ان کے مسائل اور ضرورتوں کو اسی طرح محسوس کرتا ہوگا، جس طرح وہ اپنے بارے میں سوچتا اور خیال کرتا ہے۔ اسی کردار کے لوگوں کو اقبال پیار کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں اور آپ کے یہ جذبات اس وقت ہیں جب آپ شباب کی منزل پر تھے یہ دور آدمی کو نفس کی گرفت سے نہیں نکلنے دیتا، ذاتی راحت و آرام اور تعیش کے نشہ میں مخمور رہتا ہے، اور یہ سوچ اور فکر اقبال کی اس وقت بھی ہے جب وہ یورپ کی جگمگاتی روشنیوں میں شب و روز گزار رہا تھا، جہاں کا ماحول آدمی کو نام نہاد جمالیات کے سحر اور تعیشات کی فضا سے باہر دیکھنے کی مہلت ہی نہیں دیتا۔ لیکن یہ اقبال ہے، ایک مضبوط دل و دماغ کا انسان، خدا اور خودی کے پیکر میں ڈھلا ہوا، دین و ایمان کی روشنی میں پلا ہوا۔ ایسے صمیم القلب پر یورپ کی مصنوعی تہذیب اور جدیدیت کی جادوگری کیا اثر کرتی، جو خود کہہ رہا تھا:

نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بد آداب سحر خیزی

جو مغرب کی نہ فکر سے مرعوب ہوا اور اس کے فلسفے کے سامنے سپر ڈالی بلکہ سر اٹھا کر لیکن انکسار کے لہجے میں کہا:

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانش فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف

ہم اقبال کی اسی غریب پروری کی بات کر رہے ہیں جس کے لئے اتنی طویل تمہید باندھنی پڑی ہے۔ اقبال لندن کے نگار خانے میں بیٹھ کر یہاں ان کی تہذیب پر جن پر اہل مغرب کو ناز و فخر ہے بے باک تبصرہ کر رہے ہیں:

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو، وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

وہیں وہ اس عیش گاہ میں رہتے ہوئے بھی اپنی اصلیت کو فراموش کیے بغیر اپنے آئندہ کے لائحہ عمل کا اظہار کر رہے ہیں۔ فرماتے ہیں:

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں، بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

اور بلاشبہ اقبال کو خدا کے بندوں سے پیار تھا اور ان کے محبوب بندوں میں اونچ نیچ اور چھوٹے بڑے کی کوئی تمیز نہیں تھی۔ اس لیے کہ وہ اپنی تاریخ، تہذیب اور دور ہمایوں کی برکتوں سے واقف تھے جس نے انسانی معاشرے سے یہ عیب دھوڈالے، آقا وغلام کی تمیز مٹادی، چھوٹے اور بڑے کو ایک دسترخوان پر لا بٹھایا، انسانی مساوات کی وہ روشن مثال قائم کیں کہ اس سے قبل تاریخ انسانی کے ورق سادہ پڑے تھے۔

اس عظمتِ انسانی کی تصویر کو اقبال نے اپنی شاعری کے کینوس پر نقش کردیا:

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

علی بخش کی عزت بخشی:

اس جگہ ہم چاہیں گے کہ علی بخش جو ہمارے اقبال علیہ رحمہ کا خادم خاص بھی ہے اور ہماری اس کتاب کا صاحب انتساب بھی ہے، اس کا ایک سوانحی خاکہ پیش کرتے چلیں۔

علی بخش وطن اٹل گڑھ، ضلع ہوشیار پور کا رہنے والا۔ طبیعت کا سیدھا سادا، بات کا سچا، نیک دل، نیک خو، ناخواندہ، مگر سمجھدار، مؤدب اور محنتی، سرتاپا وفا، دل سے خدمت گزار، تیرہ چودہ سال کی عمر میں شیخ محمد اقبال کی خدمت میں آیا اور تاحیات آپ کے ساتھ رہا، بجز ان چند سالوں کے جب وہ یورپ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ یورپ جاتے ہوئے آپ نے اسے بڑے بھائی عطا محمد کے پاس ہنگو (کوہاٹ) بھیج دیا مگر وہاں اس کا دل نہ لگا۔ واپس لاہور آگیا اور کہیں ملازمت کرنے لگا۔ اس دوران میں علی بخش نے اقبال کے ولایت کے پتے پر خط بھی لکھا۔ محمد اقبال دل سے اس کی قدر کرتے تھے۔ ۱۱، دسمبر ۱۹۰۷ء کو کیمبرج سے جواباً لکھتے ہیں: "بعد سلام واضح ہو،

میرے آنے میں سات ماہ کا عرصہ باقی ہے۔"

علی بخش کے ہاں چوری ہوگئی تھی۔ افسوس سے کہتے ہیں: "اگر میں یہاں نہ ہوتا تو ضرور تمہاری مدد کرتا۔" واپس آئے تو پھر علی بخش کی تلاش شروع ہوگئی۔ محمد اقبال ہائیکورٹ سے نکل رہے تھے، علی بخش کو دیکھ کر بغل گیر ہوگئے۔ علی بخش پھر محمد اقبال کے پاس آ گیا اور ایسا آیا کہ انہیں کا ہو رہا۔ شروع شروع میں تو جیسی صلاحیت تھی ویسے کام کرتا۔ کھانا پکاتا، رفتہ رفتہ سارے گھر کا انتظام و انصرام اسی کے ہاتھ میں آ گیا۔ وہ کہنے کو ملازم تھا حقیقت میں صبح و شام کا حاضر باش، حتیٰ کہ بندہ و آقا کی تمیز اٹھ گئی۔ علی بخش اور ڈاکٹر صاحب، لازم و ملزوم ہوگئے۔ اس اثنا میں علی بخش کی شادی بھی ہوگئی۔ گھر والے مصر تھے کہ وہ گاؤں چلا آئے۔ علی بخش کہاں چاہتا تھا مگر گھر کا دباؤ تھا بالآخر طے پایا کہ وہ کچھ دنوں کی چھٹی لے کر گھر ہو آیا کرے۔ جب تک علی بخش کی بیوی زندہ رہی، یہی معمول رہا۔ مگر چند ہی سال گزرے تھے کہ بیوی کا انتقال ہوگیا۔ علی بخش نے پھر دوسری شادی نہیں کی۔ اب ڈاکٹر صاحب ہی اس کی ساری کائنات تھے۔ ڈاکٹر صاحب، جہاں کہیں رہے علی بخش ساتھ رہا۔ انارکلی میں ساتھ، میکلوڈ روڈ میں ساتھ، جاوید منزل میں ساتھ۔

خدمت کی اعلیٰ مثال:

علی بخش محمد اقبال کا خدمت گزار ہی نہیں، مزاج شناس بھی تھا۔ ان کی صحبت میں آپ ہی آپ اس کی تربیت ہوتی چلی گئی۔ آپ ہی آپ سمجھ گیا، ان کا معمول کیا ہے۔ وہ ہر طرح سے ان کا خیال رکھتا۔ ۱۹۰۵ء تک تو اس کی ملازمت کا ابتدائی دور تھا۔ عمر بھی کچی تھی لیکن ۱۹۰۸ء کے بعد جیسے جیسے دن گزرتے گئے، علی بخش سمجھ گیا، ڈاکٹر صاحب کیا ہیں۔ انہیں دولت کی خواہش ہے نہ نام و نمود کی۔ امیرانہ ٹھاٹھ نہیں ہے۔ پھر بھی بڑے بڑے لوگ ان سے ملنے آتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب، صبح بہت سویرے اٹھتے ہیں۔ نماز سے فارغ ہو کر قرآن مجید پڑھتے ہیں، پھر کوئی کتاب لے کر بیٹھ جاتے۔ عدالت جانا ہوتا ہے تو عدالت جانے کی تیاری میں لگ جاتے ہیں۔ واپس آ کر کھانا کھاتے ہیں۔ تھوڑی دیر آرام کرتے، سہ پہر ہوتی تو ملاقاتیوں کا آنا جانا شروع ہو جاتا۔ علی بخش گھر کی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ سارا وقت ڈاکٹر صاحب ہی کی خدمت میں گزارتا۔ ڈاکٹر

صاحب کو دن بھر حقے کی طلب رہتی۔ تھوڑی دیر کے بعد آواز آتی: علی بخش۔ بخش کو اچھا خاصا طول دیتے: "علی بخش"، تا آنکہ علی بخش، حقہ اور ڈاکٹر صاحب لازم وملزوم ہو گئے۔ معلوم نہیں یہ تثلیث کب قائم ہوئی۔ یقیناً علی بخش کے آنے پر۔

شیخ عبدالقادر لکھتے ہیں: "علی بخش اوپر کی منزل میں چولھا گرم رکھتا تا کہ اپنے مالک کا حقہ ساعت بہ ساعت تیار کرتا رہے۔" (نذرِ اقبال، ص ۱۴۵)

شروع شروع میں تو جیسا لکھا جا چکا ہے علی بخش ہی سب کام کاج کرتا، ۱۹۰۸ء کے بعد جب باقاعدہ گھر بنا تو گھر کے اندر کوئی ماما اور ملازمہ کام کرنے لگی۔ آگے چل کر دو ایک ملازموں کا اضافہ ہو گیا۔ پھر بھی گھر کا انتظام، ملازموں کی نگرانی، گھر سے باہر کے کام یہ سب باتیں علی بخش ہی کے ذمے تھیں۔ علی بخش ہی ان کا معتمد علیہ تھا۔ دن رات خیال رکھتا، کوئی بات ان کے خلاف مزاج نہ ہونے پائے۔ اپنی بساط کے مطابق جان گیا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کیا ہیں۔ بہت بڑے شاعر ہیں، بہت بڑے سیاست دان، اسلام کو سمجھنے اور سمجھانے والے، جب ہی تو لوگ دن رات ان کے پاس آتے ہیں۔ طرح طرح کے سوال پوچھتے ہیں۔ سہ پہر سے رات ہو جاتی ہے۔ علی بخش بڑے سلیقے سے ان کی پیشوائی کے لئے آگے بڑھتا۔ رفتہ رفتہ اس کا شمار بھی ڈاکٹر صاحب کے حلقے میں ہونے لگا۔ ڈاکٹر صاحب کے عقیدت مند بھی اس سے دوستوں کی طرح ملتے، عزت کرتے، اس سے چھیڑ چھاڑ رہتی، محمود شیرانی مرحوم اسے پیر بھائی کہتے۔

علی بخش نے انجمن حمایت اسلام کے جلسے دیکھے۔ ڈاکٹر صاحب کو نظمیں پڑھتے سنا اور پھر وہ پرآشوب زمانہ بھی جو ۱۹۱۱ء میں طرابلس اور اطالوی حملے سے شروع ہو کر ۱۹۱۸ء میں جنگ عظیم میں اتحادیوں کی فتح پر ختم ہوا۔ اس نے ترکوں کی شکست اور سلطنت عثمانیہ کے ساتھ خلافت کے خاتمے، لیگ اور کانگریس، آگے چل کر شدھی، سنگٹھن تبلیغ اور کشمیر کے ہنگاموں کو دیکھا۔ ڈاکٹر صاحب کے شب و روز اس کے سامنے تھے اور اس نے جہاں تک ممکن تھا، ان کے دل و دماغ کی کیفیتوں کو سمجھا۔ وہ دیکھ رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کیا تھے کیا ہو گئے۔ ان کی مصروفیتیں کس قدر بڑھ گئی ہیں۔ ان کے احباب ہی نہیں اور بھی تو کئی طرح کے لوگ ان سے ملنے آتے ہیں۔ ان میں ہندو بھی ہیں، سکھ اور عیسائی، ارباب حکومت، ارباب سیاست، ارباب علم، بزرگان دین، عام و خاص سب۔ اسلام

کی باتیں ہو رہی ہیں، سیاست زیرِ بحث آتی ہے۔ علی بخش کو یہ جاننے میں دیر نہیں لگی کہ کون کس غرض سے آتا ہے۔ دوست کون ہے، دشمن کون، ڈاکٹر صاحب کا خاص حلقہ کیا ہے۔ ان کے عقیدت مند کون ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے ملاقاتی تھوڑی دیر بیٹھیں یا زیادہ، نشستیں طویل ہوں یا مختصر، احباب کا حلقہ ہو یا قومی اور سیاسی معاملات کی گفتگو تخلیہ یا رازداری، علی بخش کی ہر بات پر نظر رہتی۔ خوب جانتا...... ملاقاتیں رہی ہیں۔ کوئی ذاتی یا سیاسی مقصد انہیں ڈاکٹر صاحب کے پاس کھینچ لایا ہے۔ مزاج پرسی ہو رہی ہے یا دنیاداری۔ آنے والے حال پوچھنے آتے ہیں یا کچھ معلوم کرنے۔ علی بخش سب کو جان گیا تھا، سب کو سمجھتا حتیٰ کہ ان پر رائے زنی بھی کرتا۔

شب و روز کا حاضر باش، تیس بتیس برس کا ساتھ، ڈاکٹر صاحب کے ظاہر و باطن سے واقف۔ علی بخش سے زیادہ کس کی بات سند ہو سکتی ہے۔ علی بخش کہتا "میں پڑھا لکھا آدمی نہیں مگر ڈاکٹر صاحب کے شعروں کا مطلب سمجھتا خوب ہوں۔ ان کی باتوں میں ایسی رمزیں ہوتی ہیں کہ اللہ والے ہی جانتے ہیں۔ مجھے شکوے کے کچھ شعر بھی یاد ہیں۔ اپنے دیہاتی لہجے اور ٹوٹی پھوٹی اُردو میں شکوہ کے اشعار سناتا۔ ڈاکٹر صاحب کی شعر گوئی کا حال بیان کرتا: ڈاکٹر صاحب شعر کہتے تو بے چینی اور بے تابی کی سی کیفیت ہوتی۔ بیٹھے بیٹھے لیٹ جاتے۔ میں پلنگ کے پاس کاغذ پنسل رکھ دیتا۔ اکثر ڈھائی تین بجے شعر کہنا شروع کرتے اور پھر کہتے ہی چلے جاتے۔ رک جاتے تو مجھ سے کہتے: علی بخش، قرآن مجید لے آؤ۔ یوں بھی دن میں کئی بار قرآن مجید طلب کرتے۔ بہت سویرے اٹھتے، بہت کم سوتے، فجر کے بعد قرآن مجید کی تلاوت کرتے۔ ایسی پر اثر آواز کہ پتھر بھی پانی ہو جائیں۔ تہجد بھی پڑھتے۔ میں سونے سے پہلے مصلا اور وضو کے لئے پانی رکھتا۔ انہوں نے مہینوں باقاعدگی سے تہجد پڑھی۔ پہلے کالج میں ملازم تھے۔ یورپ سے واپس آئے تو کالج میں پڑھانے لگے۔ پھر دفعتہً نوکری چھوڑ دی۔ دنیادار آدمی نہیں تھے، نوکری میں جی نہیں لگا۔ کہتے: علی بخش، نوکری میں بڑی مشکلیں ہیں۔ میں قوم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں، انگریز کی نوکری کی تو کہہ نہ سکوں گا۔ وکالت شروع کر دی، لیکن مقدمے بہت کم لیتے۔ پانچ سو ماہوار آ جاتے تو کہتے: منشی صاحب اور مقدمہ نہ لیجئے گا۔ شیخ طاہر دین دلروز والے ان کے منشی تھے۔ وہی سارا حساب رکھتے۔ مکان کا کرایہ دیتے۔ گھر کے اخراجات اور جیسی بھی کوئی ضرورت ہو پوری کرتے۔ ڈاکٹر صاحب

کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہوتی۔ سفر میں جو کچھ ہوتا میرے پاس رہتا۔ آمد اور خرچ کا حساب پوری پوری تفصیل اور باقاعدگی سے رکھا جاتا۔ منشی طاہر دین صاحب کے پاس تیس بتیس برس کا رکھا ہوا حساب موجود ہے۔ کہیں پائی کا فرق نہیں۔ وکالت کا سارا کام انہی کے سپرد تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے وکالت چھوڑ دی۔ شیخ صاحب اپنا کام کرنے لگے مگر ڈاکٹر صاحب کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ کاغذات انہیں کے پاس رہتے۔ ڈاکٹر صاحب تنخواہ دینا چاہتے تھے انہوں نے تنخواہ نہیں لی۔ نماز فجر اور تلاوت کے بعد ڈاکٹر صاحب ایک آرام کرسی پر بیٹھ جاتے۔ میں ان کے سامنے حقہ رکھ دیتا۔ عدالت جانا ہوتا تو کاغذات دیکھتے نہیں تو کچھ لکھتے، کچھ پڑھتے، پڑھتے بہت زیادہ۔ مقدمے کی تیاری صرف ایک دن پہلے کرتے۔ دوپہر میں ذرا سا آرام کر لیتے۔ تھوڑی دیر کے لئے سو جاتے۔ سہ پہر میں لوگوں کا آنا جانا شروع ہو جاتا۔ رات کو ایک بجے تک محفل جمتی۔ ڈاکٹر صاحب خوب باتیں کرتے، خوب حقہ پیتے۔ رات کو بہت کم سوتے، یہی تین چار گھنٹے۔ نیند گہری نہیں تھی۔ رات کو کھانا نہیں کھاتے۔ جی چاہتا تو دودھ پی لیتے، یا دلیا استعمال کر لیا۔ یا پھر نمکین چائے پر ہی اکتفا کرتے۔ ناشتہ بھی معمولی تھا۔ یہی لسی کا گلاس یا چائے کی ایک پیالی اور بسکٹ۔ کبھی چائے پیتے ہی نہیں تھے۔ لیکن تھے خوش خوراک، گو کھاتے بہت کم۔ چاہتے تھے سالن عمدہ ہو۔ میں دو ایک سالن تیار کر رکھتا۔ پلاؤ اور شب دیگ بہت مرغوب تھی۔ لباس میں چھوٹا کوٹ، شلوار قمیض، سر پر ترکی ٹوپی، لنگی یا پگڑی، ململ کی سوتیا رنگ کی پگڑی خاص طور سے پسند تھی۔ ولایت جانے سے پہلے سوٹ نہیں پہنا۔ ولایت سے واپس آ کر کوٹ پتلون پہننے لگے مگر کوٹ پتلون سے انہیں بڑی نفرت تھی۔ بس مجبوراً پہنتے، گھر آتے تو فوراً اتارنے کی کوشش کرتے۔ قلعہ گجر سنگھ میں نظام الدین درزی کو ان سے بڑی عقیدت تھی۔ بڑی محنت سے ان کے کپڑے تیار کرتا۔ انار کلی میں تھے تو بگھی میں بیٹھ کر کچہری جاتے۔ میکلوڈ روڈ آئے تو ایک موٹر خرید لی مگر بہت کم اس میں بیٹھتے، بڑے رحم دل تھے۔ ایک مرتبہ چور گھس آیا، پکڑا گیا۔ ہم نے اس کی پٹائی کی تو روک دیا۔ اسے کھانا کھلایا اور چھوڑ دیا۔ شروع شروع میں ان کی نظمیں شیخ عبدالقادر لے جاتے، ''مخزن'' میں شائع ہوتیں۔ پھر فضل الٰہی مرغوب رقم نے ایک ایک نظم کتابی شکل میں چھاپنی شروع کر دی۔ انہیں خود چھاپنے کا خیال ہی نہیں آیا۔ ڈاکٹر صاحب بڑے شفیق اور مہربان تھے۔ مہینے

میں ایک مرتبہ ملازمین کی دعوت کرتے۔ اچھی اچھی چیزیں کھلاتے۔ مجھ سے کبھی خفا نہیں ہوئے۔ ایک آدھ بار غصہ آیا بھی تو یونہی ذرا سی دیر کے لئے۔ ایک مرتبہ ان کے بھانجے نے مجھے گالی دی تو ڈاکٹر صاحب نے اسے پیٹا۔ سختی سے سرزنش کی۔

☆

گرامی قدر:

علامہ اقبال اپنی زندگی میں ہی اس قدر ہر دل عزیز اور پسندیدہ شخصیت بن چکے تھے کہ جو ان کے پرستاروں میں نہ ہوتا لوگ اس پر تعجب کرتے۔ آپ کا حلقۂ احباب بھی وسیع تھا، ہر ایک کی خواہش ہوتی کہ آپ کی قربت اور صحبت اختیار کرنے کی، لیکن خود علامہ کے بھی کچھ پسندیدہ حباب تھے، جن سے آپ خاص خاطر تعلق رکھتے تھے۔ ان میں ایک مولانا غلام قادر گرامی بھی تھے، تو ہم بھی علامہ صاحب کے تمام قریبی اور پسندیدہ رفیقوں کا تعارف تو اس جگہ نہیں کر سکتے البتہ ایک شخصیت ایسی ہے کہ اگر ان کا ذکر نہ کیا جائے تو علامہ کے معیار دوستی اور ذوق پسندیدگی کے ساتھ انصاف نہ ہو سکے گا اور وہ شخصیت ہے مولانا غلام قادر گرامی۔

کہا جاتا ہے غالب کے بعد اقبال سے پہلے متحدہ ہندوستان میں فارسی کے صرف دو بلند یہ شاعر ہوئے ہیں۔ مولانا شبلی اور مولانا غلام قادر گرامی۔ مولانا گرامی کو جہاں شاعری میں ید طولیٰ حاصل تھا وہیں دیگر معاملات میں اتنے ہی وکیع واقع ہوئے تھے۔ ان کی شاعری میں فصاحت، بلاغت، اسلوب اور ندرت خیال کی ایک عجیب شان نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ قبال، گرامی صاحب کی شاعری کے دلدادہ تھے، علامہ نے انہیں یہ کہہ کر خراج تحسین پیش کیا ہے کہ "گرامی جہانگیری باغ کا آخری پھول تھا جو ذرا دیر کے بعد شاخ سے پھوٹا، افسوس آج خان ناں نہ ہوئے کہ ان کو معلوم ہوتا کہ خاک پنجاب شیراز اور نیشاپور سے کسی طرح کم نہیں۔"

علی بخش گرامی مرحوم کی باتیں بڑے مزے سے بیان کرتا۔ گرامی کا لاہور آنا، انارکلی میں م، گھنٹوں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ شعر و شاعری کی نشستیں۔ گرامی کچھ کچھ کھوئے کھوئے سے رہتے۔ دنیا میں محمد اقبال ایسے آقا اور علی بخش جیسے ملازم کی مثالیں بہت کم ملیں گی۔ علی بخش محض علی

بخش نہیں تھا، محمد اقبال کی زندگی کا جزو تھا۔ وہ ابتدا ہی میں اپنے آپ کو ان سے وابستہ کر چکا تھا۔ رفتہ رفتہ ڈاکٹر صاحب کے لئے اس کی دل سوزی بڑھتی گئی۔ بالخصوص ان کی آخری علالت کے ایام میں، جب علی بخش کی ذمہ داریوں میں اضافے پر اضافہ ہوتا چلا گیا۔ حالانکہ علی بخش خود بھی جوانی اور کہولت کی منزلوں سے گزر کر بڑھاپے میں قدم رکھ چکا تھا لیکن اس کے باوجود علی بخش کے دن رات تیمارداری میں گزرے۔ لحظہ بہ لحظہ خبر گیری، ذرا ذرا سے وقفوں پر دوا اور غذا کا اہتمام، حقہ پیا نہیں جاتا لیکن چلم بدلی جا رہی ہے۔ ملاقاتی آ رہے ہیں۔ تیماردار بیٹھے ہیں۔ ان کے لیے چائے لا رہا ہے۔ اسے بچوں کا خیال ہے، منشی طاہر دین سے ملنا ہے۔ حکیم صاحب کے ہاں جانا ہوگا۔ علی بخش ایک ایک کر کے سب کام نبھا رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی مٹھی چاپی بھی ہو رہی ہے۔ کپڑے بدلواتا، بستر ٹھیک کرتا، بستر ذرا ذرا سی دیر کے بعد ٹھیک کیا جاتا۔ تکیے ادھر سے ادھر رکھے جاتے۔ علی بخش کو ایک لمحے کی فرصت نہیں۔ ابھی خواب گاہ میں تھا، ابھی برآمدے، ابھی باورچی خانے، ابھی باہر صحن میں، ہاتھ میں چلم ہے۔ ملاقاتیوں کی اطلاع کر رہا ہے۔ آفرین ہے علی بخش پر۔ نہ ماتھے پر بل، نہ دل پر بوجھ، محفل جمی ہے اور موقع ملا تو علی بخش بھی شریک گفتگو ہے۔ کوئی بات سمجھ میں آئی تو رائے زنی بھی کر دی۔ چاہتا ہے ڈاکٹر صاحب کا دل بہلے۔ احباب بیٹھے ہیں۔ چھیڑ چھاڑ ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب مسکراتے ہیں تو علی بخش خوش ہو جاتا ہے۔ چپکے چپکے دعا کرتا ہے اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کو صحت دے، تا آنکہ وہ رات آ گئی جب صبح ہو رہی تھی۔ علی بخش شانوں کو دبانے لگا ذرا سے وقفے کے بعد اقبال نے پاؤں پھیلا دیے۔ دل پر ہاتھ رکھ کر کہا: یا اللہ، علی بخش میرے یہاں درد ہے۔ پھر اس کے ساتھ ہی سر جھکنے لگا۔ علی بخش نے آگے بڑھ کر سہارا دیا تو انہوں نے قبلہ رو ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔

نذیر نیازی کہتے ہیں: ایک روز کیا دیکھتا ہوں علی بخش برآمدے کی سیڑھیوں میں افسردہ اور پژمردہ بیٹھا ہے۔ میں نے پریشان ہو کر پوچھا: علی بخش، خیر تو ہے۔ خاموش رہا۔ میں تیزی سے خواب گاہ کی طرف بڑھا۔ سلام کے بعد علی بخش کا پوچھا۔ کہنے لگے: بے وقوف ہے، اسے سمجھاؤ۔ اگر کسی نے مجھے برا بھلا کہا ہے تو اس میں خفگی کی کیا بات ہے۔ ہر شخص کا حق ہے جیسے چاہے کسی کے بارے میں رائے قائم کرے لیکن سوچ سمجھ کر۔ سوءِ ظن گناہ ہے۔

علی بخش، محمد اقبال کا خدمت گزار، محمد اقبال کا حاضر باش، محمد اقبال کی زندگی کا جزو، تیس بتیس برس کا ساتھ، محمد اقبال کہتے۔ علی بخش کا خیال رکھا جائے، اس کی دل شکنی نہ ہو۔ علی بخش ڈاکٹر صاحب کی یاد لیے جاوید منزل ہی میں مقیم رہا۔ ڈاکٹر صاحب کے عقیدت منداس کی دل سے قدر کرتے۔ علی بخش نہ رہا۔ بابا علی بخش بن گیا۔ محمود شیرانی کہتے تم میرے پیر بھائی ہو۔ پاکستان قائم ہوا تو سرکار نے اس کی خدمات کے صلے میں اسے ایک قطعہ مربع اراضی عطا کیا۔ یہ گویا قوم کی طرف سے معمولی سا ہدیہ تھا اس کی خدمت گزاری کا۔ علی بخش بڑھاپے کے ہاتھوں بے بس ہو گیا تو جاوید منزل چھوڑ کر گاؤں میں اپنے عزیزوں کے ہاں چلا گیا۔ زندگی کے آخری دن وہیں گزارے۔ حج بھی کیا۔ ۱۹۶۹ء میں وہیں چک نمبر ۱۸ ب میں داعی اجل کو لبیک کہا، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

☆

سفر کی تیاری:

۱۹۳۶ء میں علامہ محمد اقبال کے اردو اشعار کا مجموعہ جو گزشتہ عرصہ سے ترتیب دیا جا رہا تھا، اور جس کا کچھ حصہ بھوپال کے قیام کے دوران کی یادگار تھا، اور پہلے جس کا عنوان ''صور اسرافیل'' تجویز کیا تھا، لیکن پھر ''ضرب کلیم'' تجویز ہوا اور اسی نام سے اس سال یکم اگست کو شائع کر دیا گیا۔

حضرت علامہ نے غالباً محسوس کر لیا تھا کہ ان کے پاس وقت کم رہ گیا ہے، اس لیے نئی تخلیق، تالیف اور تخلیق شدہ مواد کو ترتیب دینے اور شائع کرانے میں عجلت سے کام لے رہے تھے۔ ''ضرب کلیم'' کی اشاعت کے وقت ایک نئی مثنوی'' پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق'' بھی تخلیق کے مرحلہ سے گزر رہی تھی، جو اسی سال ماہ نومبر میں، اور ایک دوسری شعری کتاب بعنوان ''مسافر'' کے نام سے شائع ہوئی۔ اسی سال ایک اور تمثیلی لیکن فکر انگیز نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' تخلیق ہوئی جو آپ کے آخری مجموعہ کلام ''ارمغان حجاز'' میں شامل کی گئی۔

آپ کو یاد ہو گا کہ لندن میں لیکچرز کے لیے آپ کو دعوت دی گئی تھی۔ اس خطاب کا عنوان بھی طے ہو چکا تھا اور علامہ صاحب نے اپنی مصروفیات کے پیش نظر کچھ مزید وقت طلب کیا تھا،

لیکن اہلیہ کے انتقال کے بعد اس ارادے کو بالکل ہی ختم کرنا پڑا۔

جناح درِ اقبال پر:

جہاں تک علامہ اقبال کی سیاسی دلچسپی کا تعلق ہے، ہزار بددلی کے باوجود آپ کے عمل کا حصہ رہی۔ اس لیے بھی کہ مسلم لیگ کی باگ ڈور محمد علی جناح سنبھال چکے تھے۔ ۱۹۳۵ء میں تشکیل پانے والے برطانوی انڈیا ایکٹ یا "نیا قانون" کی چھتری تلے صوبائی انتخابات کا مرحلہ قریب آ گیا تھا، یہ انتخابات مسلمانانِ برصغیر کی سیاسی بقا کے لیے بہت اہمیت کے حامل تھے۔ محمد علی جناح اس سلسلے میں ان دنوں ملک بھر کا طوفانی دورہ کر رہے تھے اور مسلمانوں کو سمجھا رہے تھے کہ وہ آپس کے اختلافات ختم کر کے ان انتخابات میں اپنا بھرپور کردار ادا کریں تا کہ مخالفین کو احساس ہو سکے کہ ہندوستان میں مسلمان بحیثیت قوم زندہ اور متحد ہیں، یہ اٹل اور مضبوط کردار کا مسلم سیاسی رہنما محمد علی جناح جو آگے چل کر قائداعظم کے نام سے برصغیر کے کروڑوں مسلمانوں کے دل کی دھڑکن بننے والا تھا، اس طرف پنجاب میں بھی آیا۔ یہاں لاہور میں جناح صاحب سر فضل حسین سے بھی ملے جس کے بارے میں پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے کہ وہ انگریزوں کے ایما پر اپنی ایک الگ سیاسی جماعت یونینسٹ پارٹی بنا کر بیٹھا ہوا تھا، اس نے مسٹر جناح سے صاف کہہ دیا کہ وہ ان سے کوئی تعاون نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد جناح صاحب جاوید منزل تشریف لے گئے اور حضرت علامہ سے معاونت چاہی۔ اقبال نے دل کا دروازہ کھول دیا، ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا، اور کیوں نہ ایسا کرتے کہ آپ ہی نے تو اس عظیم شخصیت کو مسلمانوں کی دوبارہ رہنمائی کے لیے مجبور کیا تھا۔ تو پھر اس وقت انہیں مایوس کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، آپ نے پنجاب مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے اور اپنے ذاتی اثر و رسوخ اور اپنی فکری صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا جناح صاحب سے پرخلوص عہد کیا اور اس عہد وفاداری کو اپنی عمر کے آخری لمحہ تک نبھایا۔

قائداعظم:

چنانچہ وقت نے دیکھا کہ اقبال اور جناح کے پرخلوص باہمی تعاون نے تاریخ کے اس اہم اور فیصلہ کن مرحلہ پر، مسلمانانِ برصغیر کی آئندہ منزل کے تعین میں اہم اور کلیدی کردار ادا کیا۔ مسٹر

محمد علی جناح نے آگے چل کر اپنی قیادت سے ثابت کر دیا کہ وہ اقبال کے نظریاتی اور فکری وارث ہیں اور قوم نے بھی انہیں ''قائداعظم'' کہنے میں دیر نہیں کی۔

جو کہا وہ کیا:

حضرت اقبال نے مسلم لیگ پنجاب کے صدر کی حیثیت سے، اپنی مسلسل علالت کے باوجود، قائد سے کیا گیا اپنا عہد نبھایا، اہل پنجاب کو آپ نے یقین دلایا کہ مسلم لیگ ہی دراصل مسلمانان ہند کے مسائل حل کرانے میں فعال اور پرخلوص بھی ہے اور وقت کی اہم ضرورت بھی ہے۔'' آپ نے تلقین کی ''تمہیں مسلم لیگ کا ساتھ دے کر اس کے قائد کے ہاتھ مضبوط کرنے ہوں گے جو اس وقت مسلمان قومی رہنماؤں میں سب سے زیادہ اہل، پرخلوص اور بے باک رہنما ہیں۔'' علامہ کی یہ کوششیں کامیاب ہوئیں اور اہل پنجاب نے محمد علی جناح کا بھرپور ساتھ دیا۔

مجھے ہے حکم اذاں:

اس جگہ ایک یادگار منظر کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ یہ ۱۹۳۶ء ہے کہ شاعر اسلام انجمن حمایت الاسلام کے سالانہ جلسے میں شریک ہوتے ہیں، لیکن خود کچھ پڑھنے سے معذور ہیں، دو نوجوان لڑکے آپ کا نغمہ سرمدی، ''خودی کا سر نہاں لا الٰہ الا اللہ'' ترنم سے پیش کرتے ہیں جس نے ایک سماں باندھ دیا ہے۔

☆☆

روداد سیاست:

ہندوستان کے سیاسی حالات میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں آرہی، انگریز حکمران، ہندو مسلم چشمک زنی سے فائدہ اٹھارہے ہیں، ہند کی آزادی کا مطالبہ جس میں ہندو مسلم دونوں فریق شامل ہیں وہ زور نہیں پکڑ رہا جو اس کا تقاضا ہے، اس صورت حال سے انگریز خوش اور اقبال انتہائی ناخوش ہیں۔ دراصل کانگریس کی کوشش ہے کہ انگریز جیسے آیا تھا، ویسے ہی چلا جائے، پھر ہم جانیں اور مسلمان جانیں، ہم مل ملا کر حکومت سازی کرلیں گے، جبکہ مسلم لیگ اور خصوصاً محمد علی جناح کی کوشش اور اسٹریجی یہ ہے کہ بدیسی حکمرانوں کے یہاں سے رخصت ہونے سے پہلے ان کی موجودگی میں ہی بعد کے سارے معاملات طے کرلیے جائیں، یعنی یہ کہ ان کے جانے کے بعد مسلمانوں کی حیثیت کیا ہوگی؟ دونوں طرف سے بھرپور دلائل دیے جارہے ہیں، ہندو لیڈروں کا کہنا ہے کہ ہندوستان میں بسنے والے تمام لوگ بحیثیت قوم ہندوستانی ہیں، جبکہ مسٹر محمد علی جناح (قائداعظم) کا موقف ہے کہ مسلمان ایک الگ قوم ہے۔اس کے دلائل میں ان کا کہنا ہے کہ مسلمانوں کا اپنا ایک عقیدہ ان کی اپنی تہذیب اور اپنی تاریخ ہے، اس طرح ہندوستان میں ایک نہیں دو قومیں آباد ہیں۔'' بعد میں اسی کو دو قومی نظریہ کہا گیا، قارئین اجازت دیں تو یہاں ''دو قومی نظریہ'' کیا ہے اس کو واضح کردیا جائے۔ لیکن ایک افسوسناک بات یہ ہے کہ خود مسلمانوں میں ایک گروہ ایسا ہے جو مسلم لیگ کے قائد جناح صاحب کے دو قومی نظریے سے اتفاق نہیں رکھتا۔ اسی گروہ نے آگے چل کر تحریک پاکستان میں رکاوٹیں پیدا کیں اور قیام پاکستان کی سخت مخالفت

کی، ان میں کانگریسی علما اور علم و دانش کے ایک بہت ہی نمایاں شخص مولانا آزاد بھی ہیں۔ تاہم مسٹر جناح ایک چٹان کی طرح اپنے موقف پر ڈٹے ہوئے ہیں، حالانکہ آپ کو یاد ہوگا کچھ لوگوں کی عاقبت نااندیشانہ سوچ اور منفی عمل سے بددل ہوکر ایک موقع پر مسٹر جناح نے سیاست کو ترک کر کے ہندوستان سے جانے اور مستقل انگلستان میں رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن علامہ اقبال کی کوششوں سے انہیں اپنا ارادہ بدلنا پڑا اور نواب زادہ خان لیاقت علی خان جو مسلم لیگ سیکریٹری جنرل تھے، اقبال کے ایما پر جناح صاحب کو انگلستان سے منا کر لے آنے میں کامیاب ہو گئے۔ دراصل اقبال ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت زار، مسلم رہنماؤں کی غیر مستحکم سیاسی حکمت عملی اور مسلمانوں کے خلاف ہندو انگریز گٹھ جوڑ کو اچھی طرح سمجھ چکے تھے۔ جناح صاحب (قائداعظم) کا مسلمانوں کی قیادت سے دستبرداری کا ارادہ دیکھ کر آپ بے چین ہو گئے تھے، آپ کو معلوم تھا کہ یہ جو مسلمان دشمن حالات پیدا کیے جا رہے ہیں، اور مزید خرابی کے آثار نظر آ رہے ہیں، ان سب کا سدباب اور مقابلہ کرنے کی اگر کسی میں صلاحیت ہے تو وہ محمد علی جناح ہیں جو بعد میں قائداعظم کہلانے کے مستحق ثابت ہوئے۔ اس طرح علامہ اقبال نے محمد علی جناح صاحب کو مسلمانوں کی قیادت ترک نہ کرنے کا مشورہ دے کر مسلمانانِ برصغیر پر ایک اور بڑا احسان کیا کہ اگر آپ ایسا نہ کرتے تو وہ خواب جو آپ نے دیکھا تھا اس کی تعبیر قائداعظم کے سوا کسی اور کے ہاتھوں ممکن ہی نہ تھی۔

پنڈت کا وارِ سیاست:

یہ تو قائداعظم تھے، برصغیر میں مسلم مردِ بیمار کے مرض کا علاج ڈھونڈ رہے تھے، اور اسی لیے اقبال ایسے مسیحا کے پاس حاضر ہوئے تھے، لیکن غیر مسلم نے بھی اقبال پر نظر رکھی ہوئی ہے، انہیں اقبال کی موثر شخصیت کا اچھی طرح علم ہے کہ برصغیر کے مسلمان، اگر اپنے کسی قومی رہنما سے عقیدت کی حد تک محبت کرتے ہیں اور کسی کی بات پر آنکھیں بند کر کے ہاں کرنے کو تیار ہیں تو وہ اقبال ہے، چنانچہ ہندوؤں کے مقبول لیڈر جواہر لعل نہرو نے یہ دیکھ کر مسٹر جناح مسلمانانِ برصغیر کی رائے کو یعنی مسلم لیگ کے موقف کے حق میں ہموار کرنے کی غرض سے اقبال کو وسیلہ بنانے

آپ کے پاس آئے تھے تو فوراً ہی خود بھی اقبال کے حضور حاضر ہونے کا ارادہ کر لیا۔ اور اس کے لیے موقع یہ نکل آیا کہ ۱۹۳۶ء کے موسم گرما میں لاہور میں کانگریس کے جلسہ عام میں شرکت کرنے آئے تو جاوید منزل کی یاترا کرنا ضروری سمجھا و دیگر اہم رہنما بھی ان کے ہمراہ تھے۔

اب دیکھیے، جس وقت یہ امرا کا قافلہ اس فقیر کے آستانے پر پہنچتا ہے، جس کا نام اقبال ہے تو یہ فقیر روزگار بنیان اور دھوتی میں ملبوس بستر پر استراحت پذیر ہے۔

مہمانوں کی آمد پر اخلاقاً بستر سے اٹھ کر بیٹھ جاتے ہیں علیک سلیک ہوتی ہے، نہرو اور ان کے ساتھی آپ کی خیریت خصوصاً صحت کے بارے میں دریافت کرتے ہیں علی بخش، پنڈت نہرو کی کرسی ڈاکٹر صاحب کے بستر سے ملحق کر دیتا ہے اور پنڈت جی وقت ضائع کیے بغیر سلسلہ گفتگو چھیڑ دیتے ہیں، یقیناً پنڈت جواہر لعل نہرو کے ذہن میں یہ بات واضح ہے کہ ان کا اور اقبال کا نسلی رشتہ ہے۔ دونوں کے مابین کشمیری ہونا مشترک ہے۔ غالباً اسی بات کو تمہید کا سرنامہ بنایا گیا ہوگا۔ لیکن ہم اس وقت یہ سوچ رہے ہیں کہ تاریخ بھی اپنے کیسے رنگ دکھاتی ہے، کشمیر کے برہمن گھرانے کا فرزند ابھی کچھ عرصہ قبل ہی ایک دوسرے کشمیری پنڈت کے شہر الہ آباد میں ''مسلم تشخص'' کا رنگ جما کر آیا ہے، اور اسی شہر الہ آباد کا ایک کشمیری پنڈت اقبال کے شہر لاہور میں ''ہندوستانی قومیت'' کا پرچار کرنے آیا ہے۔

اعلیٰ تعلیم یافتہ، سیاسی گھاگ جواہر لعل نہرو سیاسی ساحرانہ تمہید باندھ رہا ہے اور اقبال خاموشی سے سن رہے ہیں، لگتا ہے آپ نے ''سائل'' کو کھل کر بولنے کا موقع دے رکھا ہے۔ پنڈت سے صبر نہیں ہو سکا، ایک دم وہ بات زبان پر لے آئے جو ان کے من مندر میں بڑی دیر سے گھنٹیاں بجا رہی تھی۔

''ڈاکٹر صاحب، کیا اقبال جیسے عظیم انسان کو کانگریس میں شامل ہو کر ہندوستان کی رہنمائی نہیں کرنی چاہیے؟ اگر آپ یہ مہربانی فرمائیں تو آپ ہی کی یہ بات پوری ہو جائے گی، جیسا کہ آپ نے فرمایا ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا''

نہرو جی کہہ رہے ہیں اور اقبال سن رہے ہیں۔

''پھر یہ بھی تو آپ ہی نے فرمایا ہے کہ: ''مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا۔''

"ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا"

نہرو کی گفتگو ثابت کر رہی ہے کہ وہ ایک باکمال سیاستدان ہے۔ ایک شاطر، وکیل کی طرح اقبال کو آپ ہی کے "اقبالی بیان" کے حوالے سے ہی زیر کرنا چاہتا ہے آپ کو اپنے موقف سے ہٹا کر اپنا ہمنوا بنانے کی کوشش میں ہے۔ اقبال بھی قانون دان ہیں گو آپ نے اپنی وکالت کی ڈگری کو کبھی سنجیدگی سے "اون" "نہیں کیا" اور اس وقت بھی آپ نہرو کی اس "جرح اور بحث" کو سنجیدگی سے نہیں لے رہے، البتہ آپ کو یہ علم ہو گیا ہے کہ ہندو نیتا نے ابھی تک مسلمان اور خصوصاً اقبال کے مزاج کو سمجھا ہی نہیں ہے، وہ اس حقیقت سے قطعاً ناواقف ہے کہ مومن کسی موذی کے وار سے دوسری بار نہیں ڈسا جاتا اور اقبال کو سمجھنے میں تو جواہر لال نہرو جیسے زیرک سیاسی دانشور نے نہایت ہی غلطی کی ہے۔ یہ شاہین، کرگسوں کے زیر دام آنے والا کہاں۔ اس وقت آپ عقاب کی طرح جھپٹ کر حملہ کر سکتے ہیں، لیکن مومن کی شان کے خلاف ہے کہ وہ گھر آئے ہوئے مہمان کو "لتاڑے" آپ نے نہایت ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ مختصراً فرمایا۔

اقامتِ موقف:

"پنڈت جی، آپ کا شکریہ کہ آپ میری طبیعت پرسی کے لیے تشریف لائے، لیکن آپ تو جانتے ہی ہیں کہ میں ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں ایک واضح رائے رکھتا ہوں، میں نے آپ ہی کے شہر الہ آباد میں اپنا موقف کھول کر بیان کر دیا ہے، اور برصغیر میں مسلمانوں کے لیے ایک الگ خود مختار علاقے کی جو تجویز پیش کر چکا ہوں، میں آج بھی اسی پر قائم ہوں، کیونکہ برصغیر میں امن و خوشحالی اسی صورت میں ممکن ہو سکتی ہے اور آپ سے بہتر یہ کون جانتا ہے کہ کانگریس میری یہ تجویز کبھی قبول نہیں کرے گی۔"

نہرو جی یہ سن کر جز بز سے ہو گئے، فوراً کوئی جواب نہ دے سکے، البتہ اتنی جلدی بھی ہار ماننے والے نہ تھے، ایک لمحہ کی خاموشی کے بعد دوسرا جال پھینکا۔ بولے:

"علامہ صاحب! اگر برصغیر کے مسلمانوں نے اپنے لیے الگ راستے ہی کا انتخاب کرنا ہے تو اس کے لیے ان کی قیادت آپ کو کرنی چاہیے، کیونکہ آپ سے بہتر کون ہے جو اسلام کے تاریخی

کارناموں اور اس کے زندہ جاوید اصولوں کو بھی سمجھتا ہو اور دورِ حاضر کی ضرورتوں سے بھی واقف ہو۔ سچ بات تو یہ ہے ڈاکٹر صاحب کہ برصغیر کے مسلمانوں کی قیادت کا حق اگر کسی کو حاصل ہے تو صرف آپ کو ہے۔"

کلمۂ بے باک:

بیماری کی نقاہت کے سبب بستر پر لیٹا ہوا اقبال جیسے یکا یک صحت یاب ہو گیا۔ بستر سے اٹھے اور سیاسی گھاگ نہرو کی طرف عقابی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے۔

"پنڈت جی! ہندوستان کے مسلمانوں کا صرف اور صرف ایک لیڈر ہے اور وہ ہے محمد علی جناح۔ رہا میں؟ تو میں محمد علی جناح کا ایک ادنیٰ سپاہی ہوں۔"

مردِ حر کی تکبیر نے ماحول پر ایک سناٹا طاری کر دیا۔ لگتا تھا جیسے، اس زندہ آواز کے بعد اب ہر آواز دم توڑ چکی ہے، نہرو اور ان کے ساتھی پھر کچھ نہ بولے اور اجازت لے کر مردہ قدموں لوٹ گئے۔ تو یہ تھے اقبال، اسے کہتے ہیں اقبال، ایسا ہوتا ہے اقبال!!

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

عارفِ خودی:

ایک فعال کردار علامہ کی قلندری، خودی اور خودداری مسلم تھی، اسے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں، تاہم کچھ باتیں ایسی ہیں کہ انہیں بیان کرنا ضروری ہے تاکہ نئی نسل اپنے اندر اس جذبۂ خودی کو پیدا کر کے موجودہ آئی ایم ایف ایسے بنئے کے پاس رکھی ہوئی اپنی غیرت اور عزت نفس کو واگزار کرا سکے۔

ہم گزشتہ سطور میں سر فضل حسین کا تذکرہ کر آئے ہیں۔ جو پنجاب لیجس لیٹو کونسل کا ممبر تھا اور برطانوی حکومت کے ایجنٹ کے طور پر پہچانا جاتا تھا۔ وہ اپنی سیاسی یونینسٹ پارٹی کے ذریعے فرنگی مفادات کے لیے کرائے کے قاتل کا سا رول ادا کر رہا تھا۔ عالم اسلامی کے اتحاد کے تصور کا مخالف اور ہندوستانیت کا علاقائی پرچارک تھا۔ اقبال اس کی اور اس کی پارٹی کی منافقانہ چالوں

سے بخوبی واقف تھے کہ وہ کس طرح سرکار پرستی اور اشراف پسندی کا کھیل کھیل رہا ہے۔ لہٰذا فرمایا:

تری حریف ہے یارب سیاستِ افرنگ
مگر ہیں اس کے پجاری فقط امیر و رئیس
بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تو نے
بنائے خاک سے اس نے دو صد ہزار ابلیس

جب دو صد ہزار ابلیس میں سے یہ ایک ''آنجہانی'' ہو گیا تو اس کی جگہ اس کے سرپرست نے ایک اور اپنے ایجنٹ سر سکندر حیات کو یونینسٹ پارٹی کے سنگھاسن پر لا بٹھایا انہی دنوں جب یہ وزیراعظم پنجاب کے عہدے پر بھی فائز تھا، کہ اس نے ۱۹۳۷ء کو انٹر کالجیٹ برادر ہڈ کی طرف سے منعقدہ یوم اقبال پر اپنے طویل اور سیاسی سحر انگیز بیان کے ذریعہ اقبال ایسے شاہین کو زیر دام لانے کی ناکام کوشش کی۔ سب سے اول تو اس نے یوم اقبال کو ایک مقدس تقریب قرار دیا۔ پھر علامہ کی عظمت کو سلام پیش کرتے ہوئے ان کی قومی و ملی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا اور پھر بیان کے آخر میں تجویز پیش کی۔

''جس جس شہر میں یوم اقبال منایا جائے وہاں کے باشندوں کو چاہیے کہ وہ شاعرِ اعظم کی خدمت میں ایک تھیلی نذر کریں، اس تجویز پر عمل کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اقبال کمیٹی، امپریل بنک آف انڈیا میں یوم اقبال کے نام سے حساب کھول دے۔ اقبال کے نیازمندوں اور ان کی شاعری کے مداحوں کا فرض ہے کہ وہ جملہ رقوم براہ راست بنک کو ارسال کر دیں جو انجام کار ہمارے محبوب شاعر کی خدمت میں پیش کی جائیں گی۔''

اقبال کی قلندری، سکندری کے سحر میں آنے والی کہاں تھی، انہوں نے اس تجویز کو شانِ استغنا کے ساتھ ٹھکرا دیا۔ فرمایا:

''میں ایک فانی شخص ہوں اور میری ضروریات بھی فانی ہیں، قوم لافانی ہے، اور قوم کی ضروریات اولین اہمیت کی حامل ہیں، وزیراعظم کو چاہیے کہ وہ قوم کی ضرورتوں کا احساس کرتے ہوئے اسلامیہ کالج میں اسلامی علوم پر جدید سائنسی طریق کار کے مطابق تحقیق کے لیے ایک چیئر

قائم کر دیں، تا کہ ہماری نئی نسل اسلام کی حقیقی روح سے آشنا ہو سکے۔"

اور اس وقت قوم کے اس سچے بہی خواہ نے عملاً اس فنڈ کے لیے اپنی جیب خاص سے سو روپے کا عطیہ بھی پیش کر دیا، لیکن پنجاب کا بااختیار وزیر اعظم اقبال کی تجویز کردہ چیئر قائم نہ کر سکا، اس لیے کہ برطانوی سامراج اسلام کی حقیقی روح کی بازیافت کو اپنے لیے سنگین خطرہ سمجھتے تھے۔ اسی خطرے کے پیش نظر تو یونینسٹ پارٹی کی سامریت کو یہ ٹاسک سونپا گیا تھا کہ وہ اسلامیت کے بجائے ہندوستانیت کا پرچار کرے اور امت مرسل کو مقامی بنانے کے لیے جس قدر بھی ہو سکے اپنی توانائیاں خرچ کرے۔

سکندر حیات اور بعد میں سر خضر حیات دونوں ہی برطانوی شطرنج کے ایسے فرزیں تھے جو شاید شاطر کے ارادوں سے بے خبر ہوں، لیکن اقبال ان کی چالوں کو خوب سمجھتے تھے، اپنی نظم "سیاست" میں فرماتے ہیں:

اس کھیل میں تعیینِ مراتب ہے ضروری
شاطر کی عنایت سے تو فرزیں میں پیادہ
بے چارہ پیادہ تو ہے اک مہرۂ ناچیز
فرزیں سے بھی پوشیدہ ہے شاطر کا ارادہ

مردِ قلندر:

اقبال کو انگریز اور انگریزوں کے ایجنٹوں نے اپنا ہم خیال اور ہم نوا بنانے کی کیا کیا کوششیں نہیں کیں کہ وہ عالم اسلامی اجتماعیت کے نظریے کو ترک کر کے خالص مقامی قومیت یعنی ہندوستانیت کی بات کریں تا کہ باغباں بھی خوش رہے، راضی رہے صیاد بھی، اس کے لیے حکومت وقت کی طرف سے انہیں بڑی پرکشش پیشکشیں دی گئیں، سر کا خطاب بھی اسی کوشش کی کڑی تھی جو آپ نے باوجوہ قبول کر لی۔ وہ سر اقبال ضرور کہلائے، لیکن سر فضل حسین، سر سکندر اور سر خضر حیات ہرگز بن کر نہ دکھا سکے، اپنی اسی شان قلندری کو انھوں نے اپنی ایک نظم "ایک خط کے جواب میں"۔ اس طرح پیش کیا ہے:

یہ عقدہ ہائے سیاست تجھے مبارک
کہ فیضِ عشق سے ناخن مرا ہے سینہ خراش

لیکن یہ ٹوڈی بچے کہ (اس وقت کے مسلمان انگریزوں کے لے پالکوں کو اسی نام سے پکارا کرتے تھے) یہ ادراک کہاں رکھتے تھے کہ:

نہ تخت و تاج میں، نے لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے

☆☆

چراغِ سحری:

علامہ صاحب کو معالجین نے سختی سے لکھنے پڑھنے سے منع کر رکھا تھا اور مکمل آرام کا مشورہ دیا تھا، لیکن آپ اپنے ان آخری لمحات کو بھی قومی خدمت میں صرف کرنا چاہتے تھے۔ قوم کے مستقبل کے بارے میں ان کی فکرمندی انہیں بے چین کیے ہوئے تھی۔ اس اضطراب کا اندازہ محمد علی جناح کے نام آپ کے مکتوبات سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ آپ کو قوی احساس ہو چکا تھا کہ وہ چراغِ سحری ہیں، کسی بھی وقت بجھا چاہتے ہیں، لیکن وقت کو آپ کے ترانے یاد تھے۔ آپ نے خود ہی تو اس زندگیٔ مستعار کے لیے فرمایا تھا:

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی

لیکن اقبال کو زندگی نہیں عمر کی فکر تھی، جو پوری ہونے جا رہی تھی، کوچ کی گھڑی آن پہنچی تھی، اور آپ اس سفرِ آخرت سے پہلے اپنے دل میں دیارِ محبوب کی زیارت کی تڑپ شدت سے محسوس کر رہے تھے۔ اسی احساس سے مغلوب ہو کر آپ نے بیرس میں اپنے ایک رفیق ماسٹر عبداللہ چغتائی کو مکتوب لکھا۔

سوئے رسالت پناہ:

''میری صحت بہ نسبت سابق بہتر ہے، لیکن بحیثیت مجموعی ایک دائم المریض کی زندگی بسر کر رہا ہوں، تاہم صابر و شاکر ہوں، ان شاء اللہ جب موت آئے گی مجھے متبسم پائے گی۔ قصد تو یہ

تھا کہ زندگی کے باقی دن جرمنی اور اٹلی میں گزاروں مگر بچوں کی تربیت کس پر چھوڑوں خصوصاً جبکہ میں ان کی مرحوم ماں سے یہ عہد کر چکا ہوں کہ جب تک بالغ نہ ہو جائیں ان کو اپنی نظروں سے اوجھل نہ کروں۔ ان حالات میں یورپ کا سفر اور وہاں کی اقامت ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے۔ اگر توفیق الٰہی شامل حال رہی تو زیادہ سے زیادہ مکہ ہوتا ہوا ممکن ہے مدینہ تک پہنچ سکوں، اب مجھ جیسے گنہ گاروں کے لیے آستانہ رسالت کے سوا اور کہاں جائے پناہ ہے۔"

چنانچہ آپ اسی تڑپ اور اپنے آخری ایام کو یادگار بنا دینا چاہتے تھے۔ "ارمغان حجاز" رقم ہو رہی تھی، اپنی ۶۳ سالہ عرصہ حیات میں دیار رسول پر حاضری نہ دے سکے تھے، لیکن اب یہ خورشید ڈوبا چاہتا تھا کہ عالم تصور میں ناقہ فکر پر سوار ہو کر سوئے مدینہ رخت سفر باندھنے لگے۔ "ارمغان حجاز" کے عنوان کے تحت قافلہ شوق اس طرح روانہ ہوا کہ لفظ لفظ دل بن کر دھڑک اٹھا۔

یوں تو اقبال کی پوری زندگی کو عشق رسول نے اپنی آغوش میں لے رکھا تھا، دیار رسول کے تصور میں ہمہ وقت محو رہتے تھے، جیسا کہ آپ کی ایک مراقبہ انگیز مخصوص تصویر سے عیاں ہے، نبی کریم کا اسم مبارک سنتے ہی رقت طاری ہو جاتی تھی، اس لیے خادم خاص علی بخش نے درست کہا کہ "اگر ڈاکٹر صاحب حجاز جاتے اور روضہ رسول پر حاضری دیتے تو یقین ہے کہ وہ تڑپ کر وہیں جان دے دیتے۔"

آپ اپنی ۶۳ سالہ زندگی میں حاضری رسول کی آرزو پوری نہ کر سکے، اس لیے اب آخری سانس باقی ہیں کہ تصور میں مدینہ کے سفر کو ممکن بنا رہے ہیں۔ عالم خیال میں حرمین شریفین کے لیے روانہ ہو رہے ہیں۔ اس طرح کہ قافلہ شوق کے ہمراہ نرم ریگستانی زمین پر رواں دواں ہیں، ذوق حضوری اور شوق و محبت میں یہ ریت انہیں ریشم سے بھی زیادہ نرم محسوس ہو رہی ہے، بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اس کا ہر ذرہ دل بن کر دھڑک رہا ہے۔ ساربان سے کہتے ہیں۔ "ان دھڑکتے دلوں کا خیال کر اور نرم روی اختیار کر۔" ساربان حدی خوانی کرتا ہے تو ان کی آتش شوق اور شعلہ بار ہونے لگتی ہے۔ پورے وجود میں حرارت اور زندگی کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے اور ساز دل درد و اثر میں ڈوبے ہوئے اشعار گنگنانے لگتا ہے۔

پھر وہ مقام آتا ہے جہاں پہنچ کر عاشق کے لیے سنبھلنا مشکل ہو جاتا ہے لیکن احتیاط و ادب

اسے پابند رہنے پر مجبور رکھتا ہے۔ یعنی اقبال اسی عالم تصور میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مواجہ شریف کے سامنے حاضر ہوتے ہیں اور درود وسلام پیش کرنے کے بعد، محبت وشوق کی زبان دل کی ترجمان بن جاتی ہے اپنا حال بیان کرتے ہیں۔ لیکن اللہ اللہ اقبال کا ایثار ملاحظہ ہو کہ اس مبارک اور قیمتی ساعت میں بھی آپ اپنی قوم کو نہیں بھولتے۔ امت اسلامیہ اور عالم اسلام کے حالات اس کے مسائل اور مشکلات اس کی آزمائشیں اور امتحانات، نیز مغربی تہذیب اور مادی فلسفوں اور تحریکوں کے سامنے اس کا سپر انداز ہو جانا اس کی بے بسی، اپنے ہی وطن میں اس کی غریب الوطنی اور خود اپنی اس قوم میں اپنے پیغام کی ناقدری کا شکوہ کرتے ہیں اور آنسو بہاتے ہیں۔

نظم "ارمغان حجاز" بہت سے اشعار پر مبنی ہے جس میں اقبال نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور اپنی قوم کی زبوں حالی کا نقشہ کھینچا ہے اور اس بہانے اپنی اس آرزو کو تسلی دی ہے جو وہ اپنی زندگی میں پوری نہ کر سکے، اپنی محرومی کو دور کرنے کی غرض سے عالم تصور میں باقاعدہ ناقہ پر سوار تپتے ہوئے ریگزاروں پر سفر کرتے ہوئے شہر رسول تک پہنچے اور پھر مواجہ شریف پر حاضر ہو کر وہ سب کچھ عرض کر دیا جو وہ اپنے دل میں لیے بیٹھے تھے۔ اس طرح آسودگی قلب کے ساتھ اپنے رب کے حضور پہنچنے کے لیے تیار ہو گئے۔ تاہم اس مرد فقیر کو جس نے اپنی ساری عمر اس کے محبوب کی امت کو جگاتے اور اسے اس ڈگر پر ڈالتے گزار دی، جس راہ کو چھوڑ کر وہ ذلت خواری کے مقام پر پہنچ گئی تھی، اقبال کو ان خدمات کے باوجود بارگاہ رب میں حاضری کے وقت شرمندگی وندامت محسوس ہو رہی ہے سر خمیدہ نظر آ رہے ہیں۔ خصوصاً یہ احساس مارے دے رہا ہے کہ وہ اپنے رسول پاک کو کیا منہ دکھائیں گے، کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ان سے وہ کچھ نہ ہو سکا جو کرنا چاہتے تھے جو اس کام کا حق تھا۔

"جانے کتنی کوتاہیاں اور لغزشیں مجھ سے ہوئی ہیں، اس حال میں کس طرح میں خود کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لے جاؤں گا۔" اسی احساس ندامت کے سبب ان سے ایمان کی حرارت وہ الفاظ کہلواتی ہے جنہیں سن کر اللہ اور اس کے رسول کو ان پر یقیناً پیار آ گیا ہو گا۔ عرض کرتے ہیں:

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر
روز محشر عذر ہائے من پذیر
گر تو بینی حسابم ناگزیر
از نگاہ مصطفیٰ پنہاں بگیر

''اے اللہ تو غنی اور میں فقیر ہوں (میرے نامہ اعمال میں کوئی نیکی نہیں لہٰذا) قیامت کے روز مجھے جواب دہی سے معذور رکھنا، اور اگر میرا حساب کتاب لینا ناگزیر ہو تو یہ عمل رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نگاہ سے بچا کر کرنا'' (تا کہ میں آپ ؐ کے سامنے شرمندہ نہ ہو سکوں۔)

☆☆

ایک طرف رہوارِ عمر اپنی منزل کی طرف پہنچنے کو ہے، ادھر بہت سا "سامان" ابھی بغیر باندھے پڑا ہے، اس میں ایک بچوں کی سرپرستی کا مسئلہ ہے، دوسرا ہند کی سیاست آپ کو غیر مطمئن کیے ہوئے ہے۔

انگریزوں کا ہندوستانیوں کے لیے نیا تحفہ "قانونِ ہند" اقبال اور محمد علی جناح دونوں کے لیے باعثِ تشویش تھا، اس لیے کہ اس "نئے قانون" میں وفاق کے مسئلے سے یہ دونوں رہنما مطمئن نہیں تھے۔ لہٰذا علامہ صاحب نے ۲۱ جون ۱۹۳۷ء کو جناح صاحب کے نام اپنے مکتوب میں اپنی تشویش کا اظہار کیا۔

بڑی عجلت ہے جانے کی:

اقبال جانے کے لیے تیار بیٹھے ہیں اور آپ کے چاہنے والے انھیں اپنے دل کی دھڑکنوں میں بسائے ان سے اپنی محبت وعقیدت کے اظہار میں مگن ہیں۔

۹ جنوری ۱۹۳۸ء مسلم برادرہڈ کی طرف سے پنجاب یونیورسٹی کے مینارڈ ہال میں "یومِ اقبال" منایا جاتا ہے۔ یہ دوسرا یومِ اقبال ہے جو ان کی زندگی میں منایا گیا۔ گویا ہر چیز اپنا اپنا کام کر رہی ہے، ادھر یہ ہو رہا ہے اور ادھر یہ کہ علالت اپنا تسلسل جاری رکھے ہوئے ہے۔ لیکن صاحبِ فراش اقبال اپنے معمولات کو ترک کرنے پر تیار نہیں۔ شمعِ فکر کو اس سے غرض نہیں کہ جس طاقِ دل میں وہ فروزاں ہے، وہ عمارت اپنے دن پورے کر چکی ہے۔ دوست واحباب کے

درمیان آپ اپنی بزم شام کو بھی بدستور سجائے ہوئے ہیں۔ مکتوبات کے جواب بھی پابندی سے لکھوائے جارہے ہیں۔ قومی مسائل پر بھی غور وفکر سے غافل نہیں۔ گویا اقبال ایک ایسے زندہ و پائندہ انسان تھے جن کی فکری ارتقاء کا سفر تادم مرگ جاری رہا۔

وقت رحلت، دروازے پر آن کھڑا ہوا ہے۔ دستک کی آوازیں ابھرنے لگی ہیں، لیکن صبر و شکر کا پیکر، اقبال مرض کی شدت کا حوصلہ مندی کے ساتھ مقابلہ کر رہا ہے۔ شدید تکلیف کے باوجود محفل یاراں گرمجوش ہے۔ بستر پر لیٹے لیٹے ہر طرح کے مسائل پر اظہار خیال کیا جارہا ہے۔ ابھی رخت سفر نہیں باندھا ہے، برادر معظم شیخ عطا محمد سیالکوٹ سے عیادت کے لیے آتے ہیں اور دلاسا دینے لگتے ہیں، لیکن زبان اقبال اپنے مخصوص امید افزا لہجے میں بولتی ہے۔

''بھائی صاحب میں موت سے نہیں ڈرتا، ان شاء اللہ مسکراتے ہوئے اس کا استقبال کروں گا۔'' اور پھر یہ شعر پڑھتے ہیں:

نشان مرد حق دیگر چہ گویم
چو مرگ آید تبسم بر لب اوست

۱۹ راپریل کو بھوپال میں اپنے ایک رفیق ممنون حسن خاں کے نام مکتوب لکھوایا۔

''ڈیئر ممنون! آپ کا خط کئی روز ہوئے ملا تھا، افسوس کہ شدید علالت کی وجہ سے میں جواب نہ لکھوا سکا، دمہ کے متواتر دوروں نے مجھے زندگی سے تقریباً مایوس کر دیا تھا۔''

آرزوئے حجاز:

جیسا کہ پہلے کہا، ہر اہل ایمان کی طرح علامہ اقبال بھی حرمین شریفین کی زیارت کی آرزو دل میں لیے ہوئے تھے، کئی بار ارادے کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش بھی کی۔ کئی جہاز راں کمپنیوں سے رابطے بھی کیے، لیکن کوئی نہ کوئی بات ایسی آڑے آتی رہی جس کی بنا پر آپ حج کے سفر اور روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حاضری سے محروم رہے۔ اپنی اس خواہش کا تذکرہ آپ نے ایک مکتوب میں کیا جو حیدر آباد دکن کے صدر اعظم سر اکبر حیدری کے نام لکھا تھا۔ کہتے ہیں:

''عمر کے ان ڈھلتے سایوں میں، جبکہ میری زندگی کا کام عملاً انجام کو پہنچ چکا ہے، ایک ہی

خواہش جو ہنوز میرے جی میں خلش پیدا کرتی ہے، یہ رہ گئی ہے کہ اگر ممکن ہو سکے تو حج کے لیے مکہ جاؤں اور وہاں سے اس ہستی کی تربت پر حاضری دوں، جس کا ذات الٰہی سے بے پایاں شغف میرے لیے وجہ تسکین اور سرچشمہ الہام رہا ہے۔''

یہ مکتوب ۱۹۳۷ء لکھے گئے ہیں۔ جب آپ کی علالت زور پکڑ چکی تھی۔ چنانچہ اس کیفیت نے ان کی آرزو کو اور زیادہ پر جوش کر دیا تھا اور اس وقت آپ کے تخلیقی امور میں ''ارمغان حجاز'' پیش پیش تھی۔ لہٰذا اپنی اس دیرینہ آرزو کو پورا کرنے کی خاطر آپ حجاز کے سفر پر روانہ ہوئے جس کی جھلکیاں ہم ابھی دیکھ چکے ہیں۔ ایسا ہی ایک مکتوب اپنے ایک اور دوست سید راس مسعود کو تحریر کرتے ہیں۔'' ان شاء اللہ امید ہے کہ سال آئندہ حج بھی کروں گا اور دربار رسالت میں حاضری بھی دوں گا، اور وہاں سے ایسا تحفہ لاؤں گا کہ مسلمانان ہند یاد کریں گے۔''

غالباً یہ اپنی آخری تصنیف ''ارمغان حجاز'' کی طرف اشارہ ہے، لیکن صحت کی خرابی آپ کے ارادے میں آڑے آ رہی تھی۔

عشقِ حبیبؐ:

عشق رسول آپ کی زندگی کا حسن اور آپ کی فکر کا حاصل تھا، رسول اللہ کا ذکر پاک سنتے ہی آنکھیں چھلک اٹھتیں، دراصل یہی وہ کیفیت ہے جس سے مسلمان کے ایمان کا پتا چلتا ہے، اقبال کا ایمان تو گویا عشق رسول سے ہی زندہ و پائندہ تھا، اکثر جب بھی تنہائی میسر آتی، تصور میں زمین حجاز کا سفر کرتے اور بند آنکھوں سے رسول اللہ کے دور ہمایوں کی سیر کر کے روح و دل کو لذت آشنائی سے آسودہ کرتے رہتے تھے۔ جیسا کہ ہمیں ایک گذشتہ کا منظر یاد آتا ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ شباب کا عالم ہے، اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان کا رخ کیے ہوئے ہیں۔ لیکن دل ٹھیک ٹھیک کعبہ کی طرف ہے، دوران سفر اپنے ایک دوست انشاء اللہ خان کو مکتوب تحریر کرتے ہیں اور اپنی روح کے اندر بسی ہوئی عشق رسول کی خوشبو کو کس طرح لفظوں میں بکھیرتے ہیں، لکھتے ہیں۔

''اب ساحل قریب آتا جاتا ہے اور چند گھنٹوں میں ہمارا جہاز عدن جا پہنچے گا۔ ساحل عرب کے تصور نے جو ذوق و شوق اس وقت دل میں پیدا کر دیا ہے، اس کی داستان کیا عرض کروں، بس

دل یہی چاہتا ہے کہ زیارت سے اپنی آنکھوں کو منور کروں:

اللہ رے خاک پاک مدینہ کی آبرو
خورشید بھی گیا تو ادھر سر کے بل گیا

اے عرب کی مقدس سرزمین! تجھ کو مبارک ہو۔ تو ایک پتھر تھی، جس کو دنیا کے معماروں نے رد کر دیا تھا، مگر ایک یتیم بچے نے خدا جانے تجھ پر کیا افسوں پڑھ دیا کہ موجودہ دنیا کی تہذیب و تمدن کی بنیاد تجھ پر رکھی گئی۔ تیرے ریگستانوں نے ہزاروں مقدس نقش قدم دیکھے ہیں اور تیرے کھجوروں کے سائے نے ہزاروں ولیوں اور مسلمانوں کو تمازت آفتاب سے محفوظ رکھا۔ کاش! میرے بدکردار جسم کی خاک تیرے بیابانوں میں اڑتی پھرے اور یہی آوارگی میری زندگی کے تاریک دنوں کا کفارہ ہو۔ کاش! میں تیرے صحراؤں میں لٹ جاؤں اور دنیا کے تمام سامانوں سے آزاد ہو کر تیری تیز دھوپ میں جلتا ہوا پاؤں۔"

آخری تحفہ:

یہ تو ماضی کی ایک جھلک تھی اب حال میں ہم دیکھتے ہیں کہ انہی دنوں، حج کا ذکر چلا تو عالم مستی میں فرمایا۔ "میں حج ہی کے راستے میں ہوں، چاہتا ہوں، یہ راستہ جلد طے ہو جائے۔" پھر گلوگیر ہو گئے اور کہنے لگے۔ "یہ راستہ طے تو ہو جاتا ہے لیکن مجھے اپنے آپ پر قابو نہیں رہتا، میں تو اب جو کچھ کہتا ہوں، وہیں کے لیے کہتا ہوں۔"

یہ کہتے کہتے پھر آواز رک گئی۔ شدت جذبات سے مغلوب نظر آنے لگے۔ آخر بمشکل بولے۔ "آشیانہ اقدس پر پہنچ جاؤں تو کچھ اور بھی عرض کروں۔" یہ کہہ کر زار و قطار رونے لگے۔ آپ کا اشارہ دراصل اپنی تصنیف نو "ارمغان حجاز" کی طرف تھا، جو آپ کی طرف سے ایک قوم کے نام آخری تحفہ ثابت ہوا۔

شرط بینائی نہیں:

ایک بار گھر میں آپ کے عزم سفر سے متعلق بات چھڑی تو ہمشیرہ نے مشورہ دیا۔ آپ کی آنکھوں میں موتیا اترا ہوا ہے۔ آپریشن ہو جائے تو پھر چلے جایئے گا۔" آپ نے فرمایا،

"جن کی آنکھیں ہی نہیں وہ بھی تو حج کر لیتے ہیں۔"

آخری سفر سے کوئی دس ماہ قبل آپ کے ایک دوست مخدوم الملک سید غلام میراں شاہ نے آپ کو بذریعہ خط اطلاع دی کہ وہ حج کا ارادہ رکھتے ہیں، آپ بھی ہمراہ ہوں تو کیا خوب ہے۔" آپ نے جواب میں تحریر کیا۔

آخری ٹھکانہ:

"حج بیت اللہ کی آرزو تو گزشتہ دو تین سال سے میرے دل میں بھی ہے، خدا تعالیٰ ہر پہلو سے استطاعت عطا فرمائے تو یہ آرزو پوری ہو، اور اگر آپ رفیقِ راہ ہوں تو مزید برکت کا باعث ہو، آپ ایسے باہمت جوان کے لیے تو یہ سفر قطعاً مشکل نہیں، ہمت تو میری بھی بلند ہے، لیکن بدن عاجز و ناتواں ہے، کیا عجب کہ خدا تعالیٰ توفیق عطا فرمائے اور آپ کی معیت اس سفر میں نصیب کرے۔"

اس احساس کا آپ نے "ارمغانِ حجاز" کی ایک رباعی میں اظہار کیا ہے، جب آپ تصور میں مدینے کی جانب رواں تھے:

بہ ایں پیری رہ یثرب گرفتم، نوا خواں از سرورِ عاشقانہ
چوں آں مرغ کہ در صحرا سرِ شام، کشاید پر بہ فکرِ آشیانہ

اس عام پیری میں، سرورِ عاشقانہ سے مست و بیخود، نوا خوانی کرتا ہوا مدینہ کی جانب رواں ہوں، تو میری مثال اس پرندے کی سی ہے جو شام کے وقت صحرا میں اپنے آشیانے تک پہنچنے کی فکر کی تگ و دو کر رہا ہوتا ہے۔ یعنی وہ طائرِ روح جو میری عمر کو ادھر ادھر اڑائے پھرتی تھی، لیکن اب جبکہ زندگی کی شام ہو رہی ہے، میری وہ آوارہ روح تھک ہار کر اپنے اصلی ٹھکانے پر پہنچنے کے لیے پر پرواز ہے۔"

خرام سوئے حبیبؐ:

آپ کا یہ تصوراتی سفر جاری ہے، سواری جب مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان پہنچتی ہے تو اپنی رفتار تیز کر دیتی ہے۔ تب اس سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔

"خیال کر اے ناقہ! تیرا سوار بیمار و خستہ حال ہے"۔ لیکن ناقہ ان کی بات سنی ان سنی کر کے اپنی رفتار میں مگن رہتی ہے، اس کی چال سے یوں لگتا ہے گویا اس کے پیروں تلے ریگزار نہیں بلکہ کوئی ریشمی فرش بچھا ہوا ہے۔ یہ کاروان ذوق وشوق درود وسلام کے نذرانے لیے اپنی منزل کی طرف سفر طے کر رہا ہے کہ یکا یک کیف وسرور کی فضا میں تمنا سر اٹھانے لگتی ہے۔ جو دل سے نکل کر لبوں پر آ جاتی ہے:

چہ خوش صحرا کہ درد ے کارواں ہا
درودے خواند و محمل براند
بہ ریگ گرم او آور سجودے
جبیں راسوز تا داغے بماند

کاش اس گرم ریت پر انہیں ایک ایسا سجدہ شوق میسر آ جائے جو ان کی پیشانی کے لیے نقش دوام بن جائے۔"

ذوق ذوق بڑھنے لگتا ہے تو عراقی و جامی کے اشعار گنگنانے لگتے ہیں، اہل کارواں حیرت سے دیکھتے ہیں،" کہتے ہیں، یہ عجمی کی زبان میں شعر پڑھ رہا ہے، جو سمجھ میں تو نہیں آ رہے لیکن دل کو درد محبت سے اس طرح بھرے دے رہے ہیں کہ سننے والے کو کھانے پینے کا بھی ہوش نہیں رہتا، بے آب کے بھی اس کی تشنگی دور اور خستگی کافور ہوتی جاتی ہے۔

پھر جیسے جیسے کارواں آگے بڑھتا ہے، راستے کی دشواریاں اور مشقتیں لطف دینے لگتی ہیں۔ کم خوابی، شب بیداری، اور بے آرامی سرور بخشتی ہے اور وہ اس راستے کی طوالت کو بھول جاتے ہیں، اور نہیں چاہتے ہیں کہ وہ جلد پہنچ جائیں بلکہ اپنے ساربان سے کہتے ہیں کہ وہ انہیں اور بھی زیادہ دور دراز راستے سے لے چلے تا کہ اس طرح ذوق وشوق کی گھڑیاں بھی اور طویل ہو جائیں اور انتظار اور بھی لطف اور مزا دکھانے لگے۔"

سرور و مستی کی اسی کیفیت میں راستہ طے ہوتا ہے اور حدود مدینہ میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اپنے ہم سفر سے مخاطب ہوتے ہیں۔

"اے ہم نفس! ہم ایک ہی زلف گرہ گیر کے اسیر ہیں۔ آج ہمارے لیے اپنی دلی مرادیں

برلانے کا یہ مبارک موقع ہے کہ ہم اپنے محبوب آقا و مولا کے قدموں پر اپنی پلکیں بچھادیں۔ اور اپنی آنکھوں پر سے پابندی ہٹادیں تا کہ وہ سیلابِ اشک جو امنڈنے کے لیے بے تاب ہے آزادی کے ساتھ بہہ سکے۔''

اس کے بعد خود پر رشک کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ ''یہ میری خوش بختی اور میرے لیے مقامِ مسرت ہے کہ مجھے یہ سعادت اور نعمت مل رہی ہے اور میرے ایسے کمتر و نا اہل منگتا کو اس دربار شاہی میں نوازا جارہا ہے جہاں بڑے بڑے دانشوروں اور شہ نشینوں کو باریابی کی توفیق میسر نہیں آتی۔''

درِ دوروں بحضورِ سرورِ کائناتؐ:

اب اقبال کا اپنی ملت کی خستہ حالی اور اس کے لیے اپنے دل میں دردمندی کا احساس انتہائی دیدنی ہے۔ اس عالم شوق و مستی میں بھی جب کہ محویت کا یہ عالم ہے کہ وہ ہر ماسوا سے بے نیاز ہو چکے ہیں، لیکن قوم کو نہیں بھولتے۔ پورے سچے دل اور اخلاص کے ساتھ، قوم کی حالت زار کی روداد بیان کر دیتے ہیں۔ عرض کرتے ہیں۔

''آج اس کی حالت یہ ہے کہ یہ بلندی سے گری ہوئی ہے اور جس قدر کوئی بلندی سے گرتا ہے اسی قدر مضروب ہوتا ہے۔ تنگا ہے یا رسول اللہ تنگا ہے۔''

مزید عرض کرتے ہیں، ''زمانے میں اس کی زبوں حالی اور انتشار کی بڑی وجہ یہ ہے کہ جماعت ہے امام ہے اور افراد ہیں لیکن ان کے لیے کوئی نظام نہیں ہے۔ اس کے خون میں وہ گرمی اور اس کے اندر وہ مردم خیزی مفقود ہو چکی ہے جو کبھی اس کی امتیازی شان سمجھی جاتی تھی۔ اب اس کی نیام بے شمشیر اور کشت ویراں لالہ و گل سے خالی ہے۔ اس نے اپنا حقیقی سرمایہ آرزو اور ذوق جستجو گنوا دیا ہے اور محض رنگ و بو کی اسیر ہو کر رہ گئی ہے، اس کی سماعتوں کو دھیمی سروں کے نغمے بھا گئے ہیں اور مردان حر کی آوازیں اسے نامانوس لگتی ہیں۔ اس کی آنکھوں میں نہ نور یقین نظر آ ہے اور عشق تو کا سرور محسوس ہوتا ہے، نہ ہی اس کا دل کسی کی محبت سے مخمور ہے اور نہ اس کا سینہ کسی کی یاد سے معمور ہے۔ وہ حضوری سے دور اور منزل مقصود سے بے خبر اور مجبور ہو کر رہ گئی ہے۔''

شاعرِ اسلام ان معروضات کے بعد اس ملت مرحوم کے ماضی و حال کا موازنہ پیش کرتے ہیں کہ یہی قوم کبھی ایک شاندار اور زندہ ملت کے طور پر پہچانی جاتی تھی، اور آج یہ ایک خراب حال قوم بنی ہوئی ہے۔ عرض کرتے ہیں۔

"یارسول اللہ جس کو آپ نے بڑے پیار اور چاہت کے ساتھ پروان چڑھایا تھا ناز و نعم میں سے رکھا تھا وہ آج تلاش رزق میں صحرا کی خاک چھانتی پھر رہی ہے۔"

اس کے ساتھ ہی اقبال عالم اسلام کی طرف بڑھنے والے لادینیت کے عفریت کا ذکر کرتے ہیں، آپ کو بخوبی اس بات کا ادراک ہے کہ اس لادینیت کا سبب محض مادہ پرست ذہنیت کا پرورش پاتا ہے کہ اس قوم کے اندر اسی مادہ پرستانہ نظریہ ہی اس کی روح کو نگل رہا ہے، چنانچہ آج بھی لادینیت کے سیلاب بلاخیز کا سدباب اگر کسی چیز سے ہوسکتا ہے تو وہ زہد و عبادت اور اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت ہے۔ اگر کوئی چیز اس کو مغلوب کرسکتی ہے تو وہ صدیق اکبرؓ کی زاہدانہ اور شفقانہ طرز حیات ہے۔"

اس جگہ اقبال، مسلمانوں کے لیے ایسی مثالی زندگی کی تمنا کرتے ہیں جو تمام شعبہ ہائے حیات کو متاثر کرسکے۔ آپ کو یقین ہے کہ اگر ان کی آرزو کردہ زندگی عالم وجود میں آجائے تو ساری دنیا اس کے احترام میں اس کے آگے سرنگوں ہونے پر مجبور نظر آئے گی۔ دراصل آپ کے دیکھ مسلمانوں کی کمزوری اور زوال کا سبب افلاس و ناداری اور مادی وسائل کی کمیابی نہیں، بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ شعلہ زندگی جو انہیں پرجوش بنائے ہوئے تھا، بجھ کے رہ گیا ہے، ایک وقت تھا کہ یہی قوم جب فقر و درویشی لیے رب واحد کے آگے سربسجود تھی اور کسی غیر اللہ کے اقتدار اور ختیار کی شدت سے نفی کرتی تھی، اس وقت بڑے سے بڑے شہنشاہ کے گریبان تک ان کا ہاتھ پہنچ تا تھا، لیکن اب ان کے سینے میں وہ شعلہ جو قدر ٹھنڈا پڑ چکا ہے تو اسے پناہ کے لیے خانقاہوں اور درگاہوں کا رخ کرنا پڑ رہا ہے۔"

اقبال اسی وقفۂ حاضری میں مسلمانوں کی تاریخ کا مزید جائزہ لیتے ہیں، اس کی ورق گردانی کرتے ہیں تو ورق ورق ایسی چیزیں پاتے ہیں جنہیں دیکھ کر ایک مسلمان نادم اور شرمندہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، انہیں ایسی چیزیں دیکھنے کو ملتی ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت، آپ کی

تعلیمات اور آپ کی اعلیٰ قدروں سے کوئی مناسبت نہیں رکھتیں۔ غیر اللہ کی پرستش، مشرکانہ اعمال ظالم و جابر حکمرانوں اور بادشاہوں کی خوشامد اور بے جا مدح سرائی کے ایسے ایسے نمونے تاریخ کے صفحوں پر سیاہ داغ بنے نظر آتے ہیں جن کو دیکھ کر غیرت مند اور خوددار آدمی شرم سے ڈوبنے لگتا ہے۔ اقبال ان مکروہات کو ایک ایک کرکے دیکھتے رہتے ہیں اور پھر خاموشی کو توڑتے ہوئے نہایت واضح انداز میں اختصاراً لیکن تلخ لہجے میں اعتراف کرتے ہیں۔

''حق تو یہ ہے یا رسول اللہ، کہ ہم ان پستیوں میں اس قدر گر چکے ہیں کہ آپ کے شایان شان نہیں، آپ کی طرف ہماری نسبت آپ کی شان والا میں سراسر بے ادبی ہے۔''

اقبال کی فریاد ابھی ختم نہیں ہوئی، وہ ایک بار پھر اس جہان اسلام کا جائزہ لیتے ہیں جس کے بارے میں وہ اچھی طرح آگاہی حاصل کر چکے ہیں اور حاصل مشاہدہ یہ بیان کرتے ہیں۔

''ایک طرف خانقاہوں کا سبو خالی ہے، یعنی ان کے اندر سے وہ مئے روحانی رخصت ہو چکی ہے جس کو پی کر مسلمان معرفت الٰہی سے مخمور نظر آتا تھا اور مادہ پرست قومیں اسے دیکھ کر منہ چھپاتی تھیں۔ دوسری طرف مکتب و مدرسے پڑھے پڑھائے اسباق کو دہراتے رہتے ہیں، ان کے اندر اتنی جرأت نہیں کہ اپنے نصاب کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کر سکیں۔ رہی ادب و شاعری، تو وہ نہایت فرسودہ اور مقصدیت کی روح سے خالی اور دلی جذبات سے عاری ہے۔''

اقبال مزید عرض گزار ہیں۔

''میں نے دنیائے اسلام میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک چل پھر کر دیکھ لیا، گوشہ گوشہ چھان مارا، لیکن وہ مسلمان مجھے دستیاب نہ ہو سکا جو موت سے ڈرنے کی بجائے، موت اسے دیکھ کر ڈرتی ہو اور جو موت کے لیے خود پیام موت ہو۔''

اقبال اس بات کی بھی نشاندہی کرتے ہیں کہ وہ اور کیا وجوہات ہوتی ہیں جو کسی قوم کو ابتر اور پست حال کر دیتی ہیں۔ ظاہر ہے اشارہ ملت اسلامیہ کی طرف ہے، کہتے ہیں۔

''کوئی فرد ہو کہ جماعت جو دل رکھتی ہے لیکن دلبر نہیں رکھتی، محبت رکھتی ہے لیکن محبوب سے ناآشنا ہے اسے سکون دل اور اطمینان نصیب نہیں ہوتا، اس کی توانائیاں بے سود اور بے کار ہو کر رہ جاتی ہیں، اس کی سعی و جہد کسی ایک منزل اور ایک مرکز تک نہیں پہنچ پاتی۔''

اقبال اپنی ملت کے حال زار، تنزلی، پریشان نظری اور فکری انتشار پر ملول و رنجیدہ ہیں، تاہم ان مخدوش و حوصلہ شکن حالات کے باوجود وہ مسلمانوں سے بددل اور اللہ کی رحمت سے مایوس ہرگز نہیں، بلکہ ان لوگوں کی سختی سے تردید کرتے ہیں جو مسلمانوں میں مایوسی پھیلاتے ہیں اور انہیں غیروں پر بھروسا کرنے اور ہر چیز میں دوسروں کے نقطۂ نظر کو اپنانے کی تلقین کرتے ہیں۔ آپ اس ذہن وخیال کے لوگوں پر تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں

''افسوس! پاسبان حرم، صنم کدے کے نگہبان بن بیٹھے ہیں۔ ان کا یقین زندگی کھو چکا ہے اور ان کی نظر دوسروں کی رہین بینائی ہو چکی ہے۔''

مسلمانوں کی اصلیت یعنی ان کے خفتہ اوصاف کے بارے میں فخریہ کہتے ہیں۔

''مسلمان اگرچہ بے تیغ و سپاہ ہیں، لیکن اپنے اندر بادشاہوں سے زیادہ عالی ظرف اور ان کی نظر سے زیادہ بلند نگاہ رکھتے ہیں، اگر انہیں کچھ وقت کے لیے ان کا کھویا ہوا مقام مل جائے تو ان کا یہ جمال جہاں تاب جلال عالمگیر بن کر دکھا سکتا ہے۔''

اقبال اپنے عصری تقاضوں سے نبرد آزما ہیں اور قدم قدم پر انہیں ان امتحانات سے گزرنا پڑ رہا ہے۔ اپنے فکری سفر کی ابتدا ہی سے آپ نے عصر جدید کے چیلنج کو قبول کیا، مغربی تہذیب اور اس فلسفہ کی سختی سے تردید کی جو محض مادیت پر مبنی ہے، اپنی ایمانی حرارت، الہامی فکر اور حق بیانی سے مادہ پرستانہ نظریات کے بتوں کو مسمار کر ڈالا، مغرب کی دانش ان کے دلائل کو جھٹلا نہ سکی، بلکہ اس مردِ مومن کے چاک کردہ اپنے خیالات و نظریات کی اہل مغرب بھی تاویلات پیش کرنے سے قاصر رہے۔ اپنے دور میں یہ واحد اقبال ہی نظر آتا ہے جس نے ان نام نہاد فلسفیوں کے مکروہ چہرے بے نقاب کیے۔ تو اس مقام پر آپ اپنی ان کوششوں کا ذکر بھی کیے بغیر نہیں رہتے، نہایت قلندرانہ انداز میں اس حقیقت کا اظہار کرتے ہیں:

''انہوں نے مغربی فکر و فلسفہ اور تہذیب و تمدن کے آتش کدہ نمرود میں گلزار ابراہیمی کی شان کا مظاہرہ کیا اور ان کے علوم کے مغز کو حاصل کر کے، پوست کو پھینک دیا۔ نہایت فخر و انبساط کے ساتھ کہتے ہیں:

''صرف یہی نہیں بلکہ وہ ان کے ساحرانہ سحر سے بصد کامیابی باہر نکل آئے اور اس کے طلسم

ہوشربا کو پاش پاش کر دیا جس نے مشرق و مغرب دونوں ہی کی نظر بندی کی ہوئی تھی۔"

عرضداشت اقبال طویل ہے تاہم اکتا دینے والی نہیں، اور پھر یہ بھی تو دیکھیے وہ کس کی عالی جناب میں بیان سرا ہیں، جہاں اچھے برے، اپنے پرائے سب کی سنی جاتی ہے، اقبال تو پھر آپ کا اپنا ہے، آپ کا نام لیوا، آپ کا عاشق، آپ کا شیدائی آپ کا فدائی اور آپ کے لیے جینے اور آپ کے لیے مرنے والا ہے، جس نے اپنی تمام حیات مستعار آپ کی امت کی فکر اور رہنمائی میں تمام کر دی۔ جو زندگی بھر آپؐ کے تصور میں گم رہا، آج وہی اقبال آپؐ کے در دولت پر حاضر ہے، آپ کے حضور اس نے کتاب دل کھول کر رکھ دی ہے، وہ سب کچھ کہہ رہا ہے جو اب تک اپنے اندر جمع کرتا رہا ہے، آپ کو سنا رہا ہے اور آپ سن رہے ہیں۔

جس عرضداشت سے ہم خود بھی اپنے احساس و جذبات کو آسودہ کرتے آ رہے ہیں، اقبال ذرا دم لے کر اب اپنی روداد زندگی بھی بیان کرتے ہیں، خصوصاً، یورپ کے بڑے بڑے شہروں میں ان کے جو روز و شب گزرے ہیں ان کا تذکرہ کرتے ہیں، جہاں انہیں خشک اور افسردہ کتابوں، دقیق فلسفیانہ مباحث، فتنہ انگیز جمالیات اور دل آویز خوشنما مناظر کے سوا اور کچھ نہ مل سکا، البتہ اگر کوئی چیز ملی تو وہ خود فراموشی تھی جس نے ان کو ان کے وجود سے بھی محروم کر دینا چاہا۔

آج بھی جب وہ اپنے ان ایام کو یاد کرتے ہیں تو وحشت زدہ ہو جاتے ہیں، کہتے ہیں۔

"میخانہ مغرب میں سوائے دردسر کے مجھے کچھ نہ ملا، مجھے یاد نہیں کہ ایسے بے سوز، بے کیف اور بے نور شب و روز مجھے عمر کے کسی حصے میں پیش آئے ہوں جو فرنگی دانشمندوں کے ساتھ دیکھنے کو ملے۔"

اس کے بعد نہایت درد انگیزی کے ساتھ عرض کرتے ہیں۔

"میں تو آپ کی ایک فیض نگاہ کا پروردہ ہوں، میرے لیے ان "دانشوروں اور خردمندوں" کی فلسفیانہ پر پیچ باتیں دردسری اور جان کا وبال ہیں۔ میں تو صرف آپ کے در کا سائل آپ کی گلی کا فقیر ہوں، مجھے کسی کے سنگ آستاں پر سرکوبی اور قسمت آزمائی کی کیا ضرورت ہے۔"

علامہ اقبال کے اس شعر کا مفہوم کیا عجیب امروز بیان ہے۔ دانش فرنگ پر فریفتہ نادان لوگ

"اقبالی بیان" کو بار بار پڑھیں اور مغرب کی مرعوبیت سے خود کو نکالنے کی کوشش کریں۔

اقبال اس حدیث دل کو عرض کرنے کے بعد، اس طبقہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو خود کو علم دین کا نمائندہ کہتا ہے۔ کہتے ہیں۔

"علمائے دین کا یہ طبقہ جمود کا شکار ہے، محبت اور سوز دروں سے محروم ہے، اس کے پاس محض معلومات کی گرم بازاری، اور شرعی اصطلاحات کی بازی کے سوا کچھ نہیں۔ اس کا صحرائے حجاز بیت اللہ اور زم زم کے وجود سے محروم ہو چکا۔" مطلب یہ ہے کہ

اگر یہ نہیں تو ان تپتے ہوئے بیابانوں اور خاموش و ساکت پہاڑوں سے کیا حاصل! بالکل اسی طرح وہ عالم دین جو کثیر علم رکھتا ہے، زبان خطابت کی گہر باری کرتی ہے اور ذہن بھی بڑا نکتہ رس ہے تو گویا وہ ایک مفلس و نادار شخص کی طرح ہے، کیونکہ ان سب چیزوں کے باوجود اس کا دل محبت کے ایک آنسو اور دل کی دردمندانہ ایک تڑپ سے نا آشنا ہے۔ گویا اس نے اس سرزمین مقدس کی سختی اور گرمی کو اپنے زور خطابت میں بسا رکھا ہے اس کی خشکی اور نمی نے اس کا دل محروم ہے۔"

اقبال کی گزارشات ابھی جاری ہیں۔ عرض کرتے ہیں۔

"میں نے ایک بار غیر اللہ پر بھروسا کیا تھا جس کی سزا میں دو سو بار اپنے مقام سے نیچے گرایا گیا اور یہ تقدیر الٰہی اور مشیت کا وہ مقام ہے جہاں زور شمشیر اور حسن تدبیر کام نہیں آتا۔"

مزید کہتے ہیں۔ "یہ عہد جو سوز و اخلاص سے خالی ہے، جس کو مصلحت اور منفعت کے سوا کچھ نہیں آتا، اس کا دل مصنوعی اور حیوانی قسم کا ہے، جو ہر طرح کے لطیف احساسات اور مخلصانہ جذبات سے تہی ہے، تو ایسے دور پر آشوب میں میرے لیے سوز دروں کی آگ میں جلنے اور خون جگر پینے کے سوا اور کیا ہے۔"

اقبال اپنے اندر کی محرومی کا ذکر نہایت ہی حیرت آمیز لہجہ میں کرتے ہیں۔

"مشرق و مغرب کہیں بھی میرا کوئی ہمدم و ہمراز نہیں، سو اپنا غم دل خود اپنے ہی دل سے بیان کر کے اپنے کو بہلاتا ہوں۔"

یہاں اقبال کے لہجے میں اپنی ذات کے حوالے سے ایک اور شکایت پیدا ہو جاتی ہے، وہ یہ

کہ "ان کی مخلصانہ نصیحتوں اور نیک مشوروں پر کسی نے عمل کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی اور نہ ہی ان کے نخلِ علم کا پھل کسی نے کھایا، وہ اپنی شاعری میں جس سروشِ غیب کی ترجمانی کرتے رہے اس پر کسی نے کان نہیں دھرا، سب ان کو ترجمانِ حقیقت کے بجائے محض غزل خواں اور غزل گو سمجھتے رہے۔ تو یا رسولؐ آپ کا حکم اور فرمان تو یہ ہے کہ میں لوگوں کو زندگی اور بقائے دوام کا پیغام پہنچاؤں لیکن یہ ناحق شناس مجھ سے مطالبہ کرتے ہیں کہ میں بھی عام اور پیشہ ور شاعروں کی طرح لوگوں کی تاریخ وفات نکالتا اور قطعہ تاریخ کہتا رہوں۔"

اس افسوسناک صورت حال بیان کرنے کے بعد اقبال کے لہجہ میں اور بھی درد و سوز اور تلخی و حسرت پیدا ہو جاتی ہے، رسول محترم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات کی بھی شکایت کرتے ہیں:

"میرا علم اور پیغام جو میرے اشعار کی روح اور اصل قیمت ہے اس سے لوگوں کو سب سے کم دلچسپی ہے"۔

اس سلسلے میں وہ مزید اپنی خدمات گنواتے ہیں۔

"میں نے اپنی ساری متاع کھول کر بازار میں رکھ دی، لیکن کوئی اس جنس نایاب کا خریدار نہ ہوا، میں نے ارمغانِ دل پیش کیا، لیکن اس کی بھی کسی نے قدر نہ کی۔ تو پھر مجھ سے زیادہ اس دنیا میں تنہا غریب الوطن، بیگانہ کون ہو سکتا ہے۔"

خطاب با ابن سعود:

آخر میں شاعرِ اسلام، درِ اقدس پر حاضر، حجاز کے فرماں روا، سلطان ابن سعود سے مخاطب ہوتے ہیں، لیکن دراصل ان کا روئے سخن تمام عرب سلاطین اور عالم اسلام کے سربراہان کی طرف ہے۔ وہ انہیں ان نتائج سے آگاہ کرتے ہیں جو غیر ملکیوں پر اعتماد کرنے کی وجہ سے پیدا ہو رہے ہیں، انہیں تلقین کرتے ہیں کہ ان غیروں پر بھروسا کرنے کے بجائے خدا پر اور پھر خود پر بھروسا کرنے کی ضرورت ہے۔ کہتے ہیں۔

"اگر طناب تمہاری ہے تو جہاں چاہو اور جس وقت چاہو خیمہ زن ہو سکتے ہو اور ہر جگہ کو اپنی منزل بنا سکتے ہو۔ دوسری صورت میں تم آزادانہ طور پر کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے۔" ......

مزید کہتے ہیں...... ''ذرا خود کو پہچاننے کی کوشش کرو تمہیں وہ مقام حاصل ہے جس کی شام دوسروں کی صبح سے زیادہ آئینہ پوش ہے۔''

حضرت علامہ کی علالت طول پکڑتی جارہی تھی، بغرض علاج بھوپال میں مقیم تھے کہ ۱۳ اپریل ۱۹۳۶ء کو عالم اسلام میں رونما ہونے والے افسوسناک حالات، مسلمانوں کے اندر روحانیت اور بلندی فکر کے فقدان، نئی نسل کے مغربی تہذیب کی طرف رجحان اور اس احساس نے کہ ان کے پیغام سے غفلت برتی جارہی ہے آپ کو تڑپا کر رکھ دیا۔ ظاہر ہے ایسے موقع پر اپنے جذبات کو کسی طرح قابو میں رکھ سکتے تھے، شعری تخلیق اپنا رنگ دکھانے لگی تھی لیکن اپنے دردِ دل کا اظہار کرنے کے لیے ایک ہی ہستی ہے، اپنے ماوا و ملجا حضور نبی کریم کی خدمت اقدس میں عرضداشت پیش کرتے ہیں۔

''حضور! میں آپ سے اس امت کی شکایت کی اجازت چاہتا ہوں جو آج خوف سے لرزہ براندام ہے، یارسول اللہ! آپ نے اپنے زمانے کے بڑے بڑے بت پاش پاش کر کے دنیا کی تعمیرِ نو کی، اور اس کی بوڑھی ہڈیوں میں جوانی کا خون دوڑا دیا۔ یہ آپ کی انہی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج دنیا میں ایمان و یقین ذوق و شوق اور زہد و تقویٰ کا دور دورہ ہے اور آپ کے کلمہ سے یہ جہاں بیداری اور حضوری اور نور و سرور حاصل کر رہا ہے، ہم بھی ایک بت پرست ملک میں پیدا ہوئے، لیکن گائے بیل کی پوجا سے باز رہے، پروہتوں اور نہ سنیاسیوں اور دیوی دیوتاؤں کے آگے سرنگوں ہوئے، اور نہ وزیروں بادشاہوں کی قدم بوسی کی، تو یہ سب آپ کے دین اور آپ کی محنت کا نتیجہ ہے، ہم نے بھی آپ کے اس خوانِ نعمت سے حصہ پایا ہے، جس سے ایک عالم سیر ہو رہا ہے، آپ کی ذات اور تعلیمات صدیوں سے اس امتِ مرحومہ کا سرمایۂ ذوق و شوق رہا ہے، یہ آپ کے ارشادات ہی کا سبب ہے کہ یہ امت فقیری میں خوددار، اور محتاجی میں بھی بے نیاز اور آبرومند ہے۔ لیکن آج...... عالم اسلام اپنی اس قوت و قیمت کا ایک بڑا حصہ گم کر چکا ہے۔''

اقبال حضورِ رسالت مآب میں عرض گزار ہیں۔

''حضور! میں نے عالم اسلام میں چل پھر کر دیکھا، عرب و عجم میں گھوما پھرا لیکن آپ کے پیروکار اور آپ کو یاد رکھنے والے بہت قلیل تعداد میں ملے، ہاں ابولہب کے نام لیوا ہر جگہ ملے۔

نوجوانانِ اسلام کے دماغ روشن ہیں لیکن قلب وضمیر تاریک ہوگئے ہیں، ان کی جوانیوں میں نرمی و نزاکت پیدا ہوگئی ہے، مستقبل سے بے پروا نظر آتے ہیں، غلامی کے ماحول میں آنکھیں کھول رہے ہیں اور نسلوں کی نسلیں اسی طرح پیدا ہو رہی ہیں۔ خوئے غلامی ان میں اس قدر رچ بس گئی ہے کہ آزادی کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ جدید تعلیم نے ان سے دینی احساسات و اسلامی حمیت چھین لی ہے اور یوں وہ اپنی حیثیت گنوا چکے ہیں، مغرب کی تقلید میں دیوانے ہوئے جا رہے ہیں۔ مغرب کے آگے کاسہ گدائی لیے کھڑے ہیں اور بدلے میں روح اور ضمیر ان کے پاس رہن رکھ دیے ہیں۔ اس طرح یہ شاہین بچے ممولے بن کر رہ گئے ہیں۔ تو ایک ممولہ فضا کی وسعتوں کی کیا تاب لا سکتا ہے؟ یہی نہیں بلکہ نئی نسل کے اساتذہ بھی ناقص العمل ہیں، اپنی نااہلیت کی وجہ سے ان مستقبل کے معماروں کو نہ خودی کی تعلیم دے سکے اور نہ ہی انہیں ان کے منصب ومقام سے آگاہ کر سکے، بلکہ دیکھا یہ گیا ہے کہ آتش فرنگ نے نئی نسل کو موم کی طرح پگھلا دیا اور اسے اپنے مطلب کے سانچے میں ڈھال لیا ہے، اور اس طرح یہ مسخ ہو کر رہ گئے ہیں۔ مسلمان آج موت اور شہادت کی لذت سے ناآشنا ہے، اس یقین کو کہ لا غالب الا اللہ (اللہ کے سوا کوئی غالب نہیں) کھو چکا ہے۔ اب اس کو چند روزہ حیات ہی کی فکر لگی رہتی ہے اور ایک روٹی کے لیے انسانوں کی خوشامد اس کا پیشہ بن گیا ہے۔ فرزند ابراہیم آج بت شکنی کے بجائے بت تراشی میں مصروف ہے اور افرنگ سے نئے اقسام درآمد کر رہا ہے۔ یہ نسل نشاۃ ثانیہ کی محتاج ہے، آج اسے "قم باذن اللہ" کہنا ہوگا۔ ہمیں مغرب نے مسحور ہی نہیں کیا بلکہ بغیر لڑے ہی اس نے ہمارا خاتمہ کر دیا۔ یا رسول اللہ! آپ کے اصحاب نے قیصر و کسریٰ کے تخت الٹ دیے تھے، آج پھر اس مردِ مومن کی ضرورت ہے جو ایمان ویقین سے تہذیب جدید کے سحر واثر کا طلسم توڑ سکے۔"

ان تلخ آمیز معروضات کے بعد، اقبال حضور علیہ السلام سے التجا کرتے ہیں۔

"اے شہسوار گردوں رکاب (ستاروں پر سفر کرنے والے، اشارہ سفرِ معراج کی طرف ہے) خدارا ذرا دیر کے لیے رکاب بوسی کا موقع دیجیے کہ اپنے رنج وغم کا بیان کر سکوں، حالانکہ میری زبان گنگ اور ناطقہ سر بگریباں ہے اور شوق وادب میں کشمکش ہے، شوق کہتا ہے کہ دوست قریب ہے، تاب گویائی پیدا کر، اور ادب مانع ہوتا ہے کہ فضول گوئی چھوڑ، لب بند کر اور آنکھیں

کھول، لیکن توسن شوق، ادب کے قابو سے نکلا جاتا ہے۔ حضور میں وہ صید لاغروزبوں (کمزور و بدحال شکار) ہوں جسے کسی صیاد (شکاری) نے نہیں پوچھا، لیکن وہ بھاگ کر آپ کی طرف آ گیا اور ایک امید لے کر آیا ہے، میری آواز ہجوم آرزو سے دب گئی ہے اور دل کا شعلہ زبان تک نہیں آتا، میری آتش نفسی (زور بیانی) اب دل کی آگ سے خالی ہو رہی ہے، اور قرآن فجر کی لذت سے محروم ہوا جاتا ہوں، وہ نفس جس کی گنجائش سینہ میں نہ ہو وہ اس میں اسیر بن کر ہی رہ سکتا ہے، حالانکہ اس کے لیے تو اسے لامحدود فضاؤں کی حاجت اور بے کراں آسمانوں کی ضرورت ہے۔ میری جسمانی اور روحانی بیماریوں کا اس کے سوا کوئی علاج نہیں کہ آپ ایک نظر سے ہمیں نواز دیں۔ طبیبوں کے نسخے میری بیمار روح کے لیے سازگار نہیں، میری لطافت طبع، کڑوی کسیلی دواؤں کی متحمل نہیں، میرے گریہ پیہم پر رحم کیجیے اور کوئی خوشگوار دوا تجویز کیجیے، میں بوصیری (مشہور بردہ شریف کے شاعر) کی طرح عرض پرداز ہوں کہ میری نوائے رفتہ مجھے واپس ملے۔ گنہگار ہی آپ کی شفاعت کے زیادہ مستحق ہوتے ہیں اور شفیق مائیں اپنے کمزور اور بیمار بچوں ہی کو زیادہ چاہتی ہیں۔"

اقبال اپنی عرض والتجا جاری رکھے ہوئے ہیں۔

"پرستاران شب کے ساتھ ہمیشہ جنگ آزما رہا ہوں، میری قندیل کو اور فروزاں کر دیجیے۔ آپ کا وجود دنیا کے لیے فیض بہار تھا اور چمن انسانیت کے لیے موسم خوشگوار، تو کیوں نہ نسیم جاں فزا کا ایک جھونکا میری طرف بھی آ نکلے اور آفتاب عالمتاب کی ایک کرن ذرۂ حقیر کو چمکا دے۔ جسم کی قیمت روح سے ہے اور روح محبوب کے دم سے ہے۔ میری روشنی طبع نے مجھے فقہ اور اسرار دین و شریعت تک پہنچا دیا لیکن میدان عمل میں میری ہمت جواب دے گئی، میری فریاد خارا شکن (پتھر توڑنے والے) سے بھی زیادہ مشکل اور روح فرسا ہے، مجھے اس سے زیادہ قوت و ہمت اور صلاحیت کی ضرورت ہے، کہ میں عصر حاضر میں اپنی صلاحیتوں کا صحیح استعمال کر سکوں، آپ میری شمشیر آبدار کی سان تیز کر دیں کہ یہ کند ہے لیکن جوہر سے خالی نہیں۔ میں نے اگرچہ اپنی زندگی ضائع اور جوانی رائیگاں کی ہے، لیکن ایک شے لطیف جسے دل کہتے ہیں، اسے میں نے محفوظ رکھا ہے، اس کے بارے میں ہمیشہ خوددار اور غیرت مند رہا اس لیے کہ اس پر شروع ہی سے آپ کے

سمند ناز کا نقش کف پا ثبت تھا۔ جو غلام دنیا سے کوئی مطلب نہیں رکھتا وہ اپنے مالک ہی کی رضا اور مہربانی کا جویا رہتا اور اس کے فراق کو موت سمجھتا ہے۔"

اقبال رحمت عالم ﷺ کے حضور مسلسل سراپا التجا بنے ہوئے ہیں۔

"اے وہ برگزیدہ ہستی جس نے ایک کرد (صلاح الدین ایوبی) کو سوز عربی بخشا، تو ایک ہندی کو بھی اجازت مرحمت فرما دیجیے کہ وہ حاضری دے اور کچھ عرض کرے وہ ایک دل خوں گشتہ (زخمی دل) اور جگر تفتہ (سوختہ جگر) لے کر خدمت میں حاضر ہوا ہے۔ اس کے جاننے والے دوست اور عزیز بھی یہ نہیں جانتے کہ اس کے غم والم کا کیا حال ہے، میں دراصل وہ بانسری ہوں جو اپنی اصل سے جدا ہے، لیکن عہد وصال کی یادیں نغمہ ہائے فراق اس کے سینے میں گونج رہی ہیں اور غم جدائی کی شکایت سے اس کا دل لبریز ہے۔ میں وہ چوب خشک صحرا ہوں (صحرا کی سوکھی ہوئی لکڑی) جسے کاروان، آگ لگا کر روانہ ہو گیا اور اسے پیچھے چھوڑ گیا۔ لیکن وہ مسلسل جلتی رہی اور اس کا وجود شعلہ وشرار بن کر بکھرتا رہا، لیکن اس کی نیم سوختگی (ادھ جلی) کو کسی اور کارواں کی تلاش اور اب تک اس کا انتظار ہے کہ وہ اس کے وجود کو سراپا سوز بنا دے۔"

اللہ اللہ! حضرت اقبال کے یہ تمام حوالے ملت اسلامیہ کے لیے ان کے دل میں دردمندی کا ایک طوفان لیے نظر نہیں آتے؟ کہاں اور کونسا موقع اور مقام ایسا ہے جہاں علامہ اپنی اس تڑپ کا اظہار نہیں کرتے حتیٰ کہ ہم نے دیکھا، اقبال جو عشق رسول کو اپنے دل کی دھڑکنوں کا سبب جانتے ہیں، در رسول پر حاضری کی آرزو اپنی روح میں بسائے ہوئے ہیں، تصور کے رہوار پر سوار ہو کر جب بھی در اقدس پر حاضر ہوتے ہیں تو اپنی کوتاہیوں اور غلطیوں کا اعتراف اور بریت کی التجا بعد میں کرتے ہیں، پہلے امت کے حال زار پر آنسو بہاتے ہیں اور رسول اکرم سے نظر کرم کی درخواست کرتے ہیں، تا کہ یہ امت جو کبھی انسانیت کے ماتھے کا جھومر تھی، لیکن اب غیروں کے قدموں میں لوٹ رہی ہے، پھر سے اپنا کھویا ہوا وقار پا سکے۔

☆

طائرِ سحر خیز:

علامہ اقبال کی روح تو بیدار تھی ہی، آنکھیں بھی بیداری کی خوگر ہو چکی تھیں، کم خوابی کی شکایت مستقلاً اختیار کر گئیں۔

لیکن رات دیر سے سونے کے بعد بھی سحر خیز تھے۔ آپ کی برادرزادی وسیمہ کا بیان ہے کہ احباب دس گیارہ بجے تک آپ کے پاس محفل جمائے بیٹھے رہتے، پھر محفل کے برخاست ہونے کے بعد یا تو مطالعہ فرماتے یا حقہ کی نے منہ میں دبائے دیر تک خاموشی اور گہری سوچ میں کھوئے رہتے۔ عشاء کی نماز ادا کر کے سوتے پھر علی الصباح اٹھ جاتے۔ ملازم خاص علی بخش وضو کے لیے پانی اور جائے نماز کا اہتمام رات ہی کو کر دیتا، کیونکہ وہ ڈاکٹر صاحب کی سحر خیزی سے واقف تھا اور جانتا تھا کہ آپ اول وقت میں ہی نماز فجر ادا کر لیتے ہیں۔ معمول تھا کہ کبھی تہجد اور کبھی نماز سے فارغ ہو کر تلاوت قرآن کریم کرتے، اور بڑی خوش الحانی سے تلاوت فرماتے، قرآن کریم کی تلاوت تو شروع عمر سے ہی آپ کی ہم سفر رہی۔ خادم خاص جس کی آپ سے وفا ایک مثالی حیثیت رکھتی ہے جس نے عمر کے پینتیس سال کے شب و روز آپ کی رفاقت میں گزارے، سفر کے دوران میں بھی ہمیشہ آپ کے ساتھ رہتا، بیان کرتا ہے کہ نماز فجر کے بعد قرآن کی تلاوت ہمیشہ آپ کا معمول رہا، قرآن خوانی بلند اور شیریں آواز میں کرتے کہ سننے والوں کے دل موم کی طرح پگھلنے لگتے۔ تو اندازہ لگائیے جب علالت نے طول کھینچا اور کمزوری و نقاہت غالب آ گئی اور اس دوران میں یہ مشغلہ دیرینہ قضا ہونے لگا تو کیسا قلق محسوس کرتے ہوں گے، اسی احساس

محرومی کو کس حسرت سے بیان کیا ہے:

در نفس سوز جگر باقی نماند
لطف قرآن سحر باقی نماند

"نفس سوز جگر سے محروم ہو گیا ہے، اس لیے کہ وقت سحر قرآن خوانی کا عمل چھوٹ گیا ہے۔"

سماعتِ قرآن:

حالت بیماری کے ساتھ ساتھ آنکھ میں موتیا بھی اتر آیا تھا جبکہ ایک آنکھ کی بینائی پہلے ہی کم تھی، اس وجہ سے مطالعہ کرنا مشکل ہو گیا۔ یہاں تک کہ بعض اوقات اپنے پاس آنے والوں کو پہچاننے میں بھی دقت پیش آنے لگی، خطوط کے جواب بھی دوسروں سے املا کراتے۔ اسی طرح تلاوت قرآن کی سماعت کے لیے ان کی خواہش ہوتی کہ کسی خوش الحان قاری کو بلا کر قرآن کی سماعت کریں۔ بچوں کی نگران ڈورس احمد کا بیان ہے:

"ایک بار کوئی صاحب جو عرب تھے علامہ صاحب کی ملاقات کو آئے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا، بچوں کو یہاں میرے پاس لے آیئے۔ ہم اپنے ان عرب مہمان سے تلاوت قرآن سنیں گے۔ ڈورس کے بقول، وہ عرب مہمان واقعی بہت خوش الحان تھے، جب تک وہ قرات کرتے رہے ڈاکٹر صاحب کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے، لگتا تھا جیسے وجد میں ہیں۔ بچے بھی قرات سے مسحور نظر آتے تھے اور خود میں مفہوم نہ سمجھتے ہوئے بھی قاری صاحب کے حسن قرات سے متاثر تھی۔"

خوش آمدیدائے مرگ:

خطوط لکھنے والوں میں آپ کے دیرینہ ساتھی منشی طاہر الدین کے علاوہ کئی اور احباب شامل تھے۔ انگریزی خطوط ڈورس احمد پڑھ کر سناتیں اور انہی سے ان کا جواب بھی لکھواتے۔

علامہ صاحب بلند ہمت انسان تھے، امراض نے شدت اختیار کر لی تھی تاہم جب بھی طبیعت سنبھلتی ان معمولات کو جن کا ذکر ہوا بحال کرنے میں ذرا دیر نہ کرتے۔ موتیا کا آپریشن کرانا چاہتے تھے کہ دمہ کی شکایت نے شدت اختیار کر لی اور آپریشن موخر ہو گیا۔ صحت کے ان تمام مسائل کے باوجود صبر و شکر میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔ بلکہ اس احساس کے ساتھ کہ تیزی سے بگڑتی ہوئی صحت انہیں سفر آخرت کی طرف لے جارہی ہے، ذہنی طور پر باطمینان قلب رخت سفر باندھ

لیا۔ اس دوران برادر معظم شیخ عطا محمد سیالکوٹ سے آپ کی عیادت کو آئے تو نہایت مطمئن لہجے میں فرمایا۔ "بھائی صاحب میں موت سے نہیں ڈرتا، ان شاء اللہ مسکراتے ہوئے اس کا استقبال کروں گا۔"

دوستوں اور احباب کے سامنے بھی جو آپ کے پاس ان دنوں حاضر ہوتے، اکثر اسی عزم کو دہراتے اور یہ شعر پڑھتے:

نشانِ مرد مومن با تو گویم
چو مرگ آید تبسم برلب اوست

"مرد مومن کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ موت کے وقت اس کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل رہی ہوتی ہے"۔

لشکر امراض کی یلغار:

پہاڑ جیسی شخصیت کے حامل اقبال کو بیماریوں کے یاجوج ماجوج نے ایسا گھیرا کہ جسمانی نظام درہم برہم کر کے رکھ دیا، لیکن فکر و خیال کے مضبوط قلعہ کو ذرہ برابر نقصان نہ پہنچا سکے۔ موسم سرما کے اثرات نے دمہ کے مرض میں شدت پیدا کر دی، بلغم کی مقدار بڑھ گئی دوائیں اپنا اثر دکھاتی تھیں مگر اتنا نہیں کہ مزاج فطرت کو بدل دیں، بلغم میں کچھ کمی ہوئی تو دمہ قلب میں اضافہ ہو گیا، چلنے چلنے سے سانس پھولنے لگتا اور اکثر رات کو سانس کی تکلیف بڑھ جاتی۔ تین عشروں سے زیادہ مسلسل تمباکو نوشی اپنا رنگ دکھا رہی تھی، لیکن اس کے باوجود اپنی اس عادت سے وفاداری کا عالم یہ تھا کہ آخری دم تک ساتھ دیا، ایک اور افسوسناک بات یہ تھی کہ آخری ایام میں دمے کے شدید دورے پڑتے، نیم بے ہوش ہو جاتے اور ابھی اس کیفیت سے پوری طرح نکلنے نہ پاتے کہ علی بخش حقہ تازہ کر کے سامنے رکھ دیتا۔

انہی حالات میں آخری سال کا آخری مہینہ آن پہنچا، حالت اور زیادہ مخدوش ہو گئی۔ احباب کو تشویش نے گھیر لیا، ڈاکٹر اور حکیم مسلسل معائنہ کرتے، دوائیں تجویز کرتے، تبدیل کرتے اور طبی مہارت کو بروئے کار لا کر مزید علاج سوچنے میں مصروف رہتے، لیکن افاقہ نہیں ہو پا رہا تھا، صحت یابی کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی، پھیپھڑوں میں پانی بھر گیا، بلغم میں خون آنے لگا۔

حیات مستعار کا یہ آخری مہینہ ہے، ۱۹ اپریل کو ایک دوست ممنون حسن خاں کے نام ایک مکتوب میں اظہار کرتے ہیں "بس چل چلاؤ کا دور ہے، چہرے پر ورم آ گیا جس نے پورے جسم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔"

علالت کی اس وحشت ناک تفصیل بیان کرنے کا ہمارا مقصد یہ ہے کہ اس حالت میں بھی ذہن فعال رہا، ملت کے درد کو فراموش نہیں کر سکے۔ اپنے خاص رفقاء میں سے ایک رفیق نذیر نیازی کے ذریعہ مولانا مودودی کے نام ایک قومی مسئلہ پر گفتگو کے لیے پیغام بھجوایا۔ نذیر نیازی لکھتے ہیں۔

"ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں، جلد لاہور تشریف لائیے تاکہ ملاقات ہو جائے۔"

اس کے ساتھ ہی نیازی صاحب نے اپنی طرف سے مودودی صاحب کو مطلع کیا:

"ڈاکٹر صاحب قبلہ کی حالت نہایت اندیشہ ناک ہے، ایک لمحہ کا بھی بھروسا نہیں۔"

اب وہ لمحہ قریب آ رہا تھا، آپ کے ایک معالج حکیم محمد حسن قرشی کا بیان ہے۔

"میں ایک رات ان کو نہایت اچھی حالت میں چھوڑ کر آیا۔ نبض کی رفتار امید افزا تھی، مگر جب میں نے صبح جا کر نبض دیکھی تو وہ بہت خفیف تھی، میں بہت پریشان ہوا، شفیع صاحب کو الگ میں جا کر پوچھا تو معلوم ہوا کہ رات مسلمانوں کے متعلق سوچتے رہے اور پھر روتے رہے، اس وقت ان پر رقت کی کیفیت طاری رہی اور خطرہ تھا کہ قلب کی حرکت رُک جائے گی۔"

فکرِ ملت:

یہ سارے مناظر ہمیں اس بات کا یقین دلا رہے ہیں کہ ملت کا درد رکھنے والے اقبال کو اپنے بعد دور تک اندھیرا نظر آ رہا ہے۔ قوم کے رہنماؤں کو اچھی طرح آزما چکے ہیں، نہ صرف برصغیر بلکہ عالم اسلام میں کوئی ایسا باشعور، زیرک اور مومن صفات رکھنے والا رہنما ان کے تجربہ میں نہیں جو ملت اسلامیہ کو اس بھنور سے نکالنے میں کامیاب ہو سکے جس میں وہ اس وقت پھنسی ہوئی ہے، بس ایک موہوم سی امید برصغیر میں سیاسی حوالے سے بیرسٹر محمد علی جناح سے رکھتے ہیں، مگر ان کے گرد بھی مفاد پرستوں کے ٹولے کو پہچان چکے ہیں، لیکن حضرت اقبال مسلمانوں میں جس تبدیلی کے خواہاں ہیں وہ ان کے اندر چنگاری کو شعلہ بنانا تھا جو بجھا چاہتی ہے۔ انہیں ڈر ہے کہ اگر ایسا ہو گیا

تو یہ ملت راکھ کا ڈھیر بن کر رہ جائے گی۔ قوم کے مرض کو اور اس کے علاج کو جتنا وہ سمجھتے تھے، کوئی دوسرا اس طرح مردِ بیمار کا نباض اور مرض شناس نہ تھا، اسی لیے آخری دم حسرت آمیز لہجے میں کہہ اُٹھے۔ "دگر دانائے راز آید کہ ناید۔"

جاتے جاتے:

آنکھیں بند ہونے سے ایک روز قبل آپ کے ایک جرمن دوست ملاقات کے لیے آئے، یہ ان دنوں کے رفیق تھے جب اقبال، ہائڈل برگ کے منزل میں مکین تھے، علامہ اپنی بیماری بھول کر، زمانہ طالب علمی کی باتیں کرتے رہے، یقیناً ہائڈل برگ کا فرحت افزا منظر سامنے تصویر بن کر آ گیا ہوگا، یقیناً اس منظر میں ایما ناسٹ کے خد و خال بھی ابھرے ہوں گے۔

یہ نشست جاری تھی کہ اسی دوران کچھ اور احباب بھی آ گئے اور موجودہ سیاسی صورتحال پر گفتگو چھڑ گئی۔

آخری لمحات:

جاوید منزل جس کی تعمیر علامہ صاحب کی اہلیہ سردار بیگم کی خواہش پر ممکن ہو سکی تھی اور وہ خود کُل تین شب و روز گزار کر دوسری دنیا میں جا بسی تھیں، آج ان کے عظیم شوہر کی اس مکان میں آخری شب ہے۔ علامہ صاحب کی اس یادگار اقامت گاہ میں آپ کے معالجین جمع ہیں۔ انہیں بتایا جاتا ہے کہ کل شام سے بلغم میں خون آ رہا ہے، اس علامت نے معالجین کے چہروں پر یاسیت پھیلا دی ہے، غالباً مریض نے بھی اپنے معالجین کے چہروں کو پڑھ لیا ہے اور احباب کی ان سرگوشیوں کو محسوس کر لیا ہے جو وہ اس وقت آپ کے متعلق کر رہے تھے۔ اس صورتحال نے آپ کو یقین دلا دیا کہ بس رخصت ہوا چاہتے ہیں، غالباً اسی یقین اور احساس نے انہیں یکایک جیسے صحت مند بنا دیا، ویسے بھی اپنے سرخ و سفید چہرے مہرے کی وجہ سے کم ہی بیمار نظر آتے تھے، اب اس خوشی نے کہ اپنے رفیق اعلیٰ سے ملاقات کی گھڑی آن پہنچی ہے اور زیادہ ہشاش بشاش ہو گئے۔ ڈاکٹر قیوم ان دنوں جاوید منزل میں ہی رات گزارتے اور علامہ صاحب کی تشویشناک حالت کے سبب "الرٹ" رہتے تھے۔ ادھر علامہ صاحب کے فیملی ڈاکٹر جمعیت سنگھ نے ایک ٹیکہ تجویز کیا

جسے لگانے سے پہلے مریض کو ایمونیم کلورائیڈ پلانا ضروری ہوتا ہے، پلایا گیا تو علامہ صاحب نے بدمزگی اور ناگواریت کا اظہار کیا، فرمایا۔

"تم ڈاکٹروں کی دوائیں نہایت بدمزہ ہوتی ہیں، بلکہ غیر انسانی ہیں یہ دوائیں۔"

لہٰذا آپ کے مزاج اور خاطر طبیعت کو دیکھتے ہوئے، حکیم قرشی نے خمیرہ گاؤ زبان عنبری کی ایک خوراک کھلائی جس سے آپ پُرسکون ہو گئے اور ٹیکہ کل صبح پر اٹھا رکھ دیا گیا۔

ڈاکٹر عبدالقیوم نے رات یہاں جاوید منزل میں ہی ٹھہرنا مناسب سمجھا اور اس طرح یہ چند ساعتیں امید وبیم میں گزر گئیں۔

جاوید منزل کے چمن میں رخصت ہوتی بہار ابھی اپنا سامان رنگ بو پوری طرح نہیں سمیٹ پائی ہے، پھول آخری سانس لے رہے ہیں۔ بھینی بھینی خوشبو عاقبت نااندیشوں کو احساس دلا رہی ہے کہ اس عالم امکان میں آنکھ کھولنے والا کوئی بھیم ذی حیات دائمی نہیں، بہار آتی ہے، پھول کھلتے ہیں اور پھر رنگ و بو اپنی بزم آرائی کر کے دھیرے دھیرے رخصت ہو جاتی ہے، چمن میں بہار کی جگہ خزاں لے لیتی ہے اور یہ سلسلہ یونہی ازل سے جاری ہے اور ابد تک چلتا رہے گا۔ لیکن اس وقت اس عمارت کے لان میں جس کی پیشانی پر جاوید منزل لکھا ہے، ایک ایسی پُر بہار ہستی لیٹی ہوئی ہے جس نے اپنے فکر و فلسفہ کا ایک ایسا گلستاں آباد کیا ہے، جس کی بہاریں جاویدانی ہیں، یہ ایک ایسا موسم ہے جو کبھی رخصت نہیں ہوتا، اس کے پھول کبھی نہیں مرجھاتے، یہ وہ گلشن ہے جس میں کبھی خزاں نہیں آتی۔

کچھ دیر اور:

اقبال، جاوید منزل کے اس چھوٹے سے سبزہ زار میں لیٹے ہوئے ہیں، شام بھیگ چکی ہے، رات اترنے لگی، ماحول خنک ہو گیا، اور آپ کی چارپائی اندر گول کمرے میں لے جائی گئی۔ یکایک منیرہ کسی طرف سے آتی ہے اور باپ سے لپٹ جاتی ہے۔ بچوں کی نگراں ڈورس احمد بھی آپ کے قریب آ کر بیٹھ گئیں اور مزاج پرسی کرنے لگیں، پھر کچھ دیر بعد وہ منیرہ کو اس کے کمرے میں لے جانا چاہتی ہیں کہ بابا کی آغوش سے لگی سات سالہ بچی کے منہ سے نکلتا ہے۔ "کچھ دیر اور"

شبِ آخر:

بیٹی کو اپنے پاس بیٹھنے پر اصرار کرتے دیکھا تو باپ ہلکے سے مسکرا دیئے۔ ڈورس سے فرمایا، "اس کی حس بتا رہی ہے کہ بابا کے پاس یہ اس کی آخری ملاقات ہے۔"

ڈورس نے اس وقت نہیں معلوم کیا سمجھا، لیکن وقت نے علامہ کے الفاظ رقم کر لیے۔ احباب اور ملاقاتی حسب معمول آئے، رات بارہ بجے تک صورت پروانہ اس شمع فروزاں کے گرد جمع رہے اور آہستہ آہستہ واپس ہوتے گئے۔

حضرت علامہ کچھ دیر پرسکون رہنے کے بعد اچانک بے چینی محسوس کرنے لگے، سونے کی کوشش کرتے ہیں لیکن نیند نہیں آ رہی، بے سکونی حد سے بڑھی تو فرمایا۔ "حکیم صاحب (حکیم محمد حسن قرشی) کو بلواؤ!"...... بلوایا گیا، لیکن وہ دستیاب نہ ہو سکے، اِدھر ڈاکٹر عبدالقیوم کمر سیدھی کرنے کی خاطر لان میں جا کر لیٹ گئے تھے۔

اور چراغ بجھ گیا:

رات کا آخری پہر ہے، ستارے آنکھیں جھپک رہے ہیں کہ علی بخش کی الم انگیز پکار نے سکوتِ شب کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔

"ڈاکٹر عبدالقیوم صاحب جلدی آیئے۔"

ڈاکٹر قیوم چونک کر اٹھے اور تیزی سے چل کر اندر کمرے میں گئے، نبض پر ہاتھ رکھا، لگا کہ جیسے خود ان کی اپنی نبض رک گئی ہے۔ یکایک لاہور کی فضا اذانوں سے گونج اٹھی، نورانی آوازوں کے درمیان یہ نغمہ گنگناتی ہوئی روح اپنے مالک حقیقی کی طرف لوٹ گئی۔

"انا للہ وانا الیہ رٰجعون"۔ ڈاکٹر عبدالقیوم بمشکل کہہ سکے اور علی بخش اپنے دیرینہ سرپرست کے قدموں سے لپٹ کر سسکیاں بھرنے لگا، لیکن اس ماحول میں جانے والے کے لب پر اس کا یہ ایمان افروز شعر تبسم کے رنگ میں اپنی شرح بیان کر رہا تھا:

نشان مرد مومن با تو گویم
چو مرگ آید تبسم برلب اوست

☆☆

بحرِ اقبال کے چند گوہر آبدار

عام افراد جنہوں نے اقبال کا نام سن رکھا ہے، اقبال کو ایک شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں اور وہ لوگ جو کسی قدر اقبال کو پڑھ سکتے ہیں، وہ آپ کو صرف اِس طرح پہچانتے ہیں کہ اقبال نے اپنی شاعری سے مسلمانوں میں جذبۂ آزادی بیدار کرنے کی کوشش کی اور اِس اعتبار سے وہ ایک قومی شاعر کہلاتے ہیں اور کچھ حضرات ایسے ہیں جنہوں نے اس سے ذرا آگے بڑھ کر اقبال کا سرسری مطالعہ کیا تو اقبال اُن کے نزدیک ایک شاعر ہی نہیں مفکر بھی ہیں جنہوں نے خودی کا فلسفہ پیش کیا لیکن یہ حضرات بھی نہ آپ کے شاعرانہ کمال اور نہ آپ کے فلسفۂ خودی سے کما حقہٗ واقف ہیں۔ بلکہ دل چسپ بات یہ ہے کہ خودی سے ان کی آشنائی صرف اِس حد تک ہے کہ وہ کبھی کبھی ترنگ میں آ کر آپ کا یہ شعر دہرا دیتے ہیں:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہ "سادہ لوح" شریف لوگ خودی کے مفہوم سے قطعی ناواقف ہوتے ہوئے بھی اقبال کی خودی کا نام لیتے ہوئے خوش ہوتے ہیں، کیوں کہ وہ اقبال کو اپنا یعنی قوم کا شاعر جانتے ہیں، انہیں یہ نہیں معلوم کہ خودی کو کس طرح بلند کیا جاتا ہے کہ خدا اپنے بندے کی تقدیر لکھنے سے قبل خود اس سے اس کی مرضی دریافت کرتا ہے کہ "بتا میں تیری تقدیر میں کیا لکھوں؟ وہ لکھوں جو تیری مرضی کے مطابق ہو؟" تو یہ کیسی حیران کن بات ہے کہ مخلوق جو اپنے

خالق کی مشیت کی پابند ہے، لیکن خودی کی بلندی اسے (انسان کو) اس قدر اعلیٰ مرتبہ بخش دیتی ہے کہ خالق کی مشیت خود مخلوق کے ناز اٹھانے لگتی ہے اور اس کی مرضی کو اپنی آغوش میں لے لیتی ہے، تو اس نازک معاملے اور بلند و بالا فکر کو دو مصرعوں میں ایک شعر کی صورت ڈھالنے والے کو محض ایک شاعر کہہ کر کیونکر نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ شاعر تو ویسے ہی اپنی کوئی قابلِ رشک شناخت نہیں رکھتا، انسانوں کا خالق اپنی کتابِ عظیم میں مکہ کے ان لوگوں کی جاہلانہ سوچ کو سخت لفظوں میں مسترد کر چکا ہے جو اس کے رسولِ صادق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خرد افروز دعوت کو شاعری اور خود آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ حق نما کو شاعر کہہ کر مخالفت کر رہے تھے، فرمایا۔ ''ہرگز ہمارا رسول نہ شاعر ہے اور نہ مجنوں ہے۔''

اگر کوئی مطالعہ کر سکتا ہے تو وہ قرآن کی سورۂ شعراء میں جھانک کر دیکھ لے کہ شاعروں کی کس طرح تعریف کی گئی ہے جو ان کے منفی کردار اور عمل کی ناقابلِ تردید حقیقت بیان کر رہی ہے۔

> ''لوگو! کیا یہ تمہیں بتاؤں کہ شیاطین کس پر اترتے ہیں؟ وہ ہر جعل ساز بدکار پر اترتے ہیں، سنی سنائی باتیں کانوں میں پھونکتے ہیں، اور ان میں سے اکثر جھوٹے ہوتے ہیں، رہے شعراء، تو ان کے پیچھے بہکے ہوئے لوگ چلا کرتے ہیں، کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے ہیں اور ایسی باتیں کہتے ہیں جو کرتے نہیں۔''

تو یہ ہے شاعروں کا وہ عمومی تعارف جو قرآن اپنے انداز میں کراتا ہے، لیکن اسی آیت میں استثنیٰ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے:

> ''بجز ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کئے اور اللہ کو کثرت سے یاد کیا۔''

ہم چاہیں گے کہ اس جگہ ان مذکورہ آیات کے مفہوم کی اختصاراً تشریح کر دی جائے، تاکہ سہل طریقہ پر بات سمجھ میں آسکے تو یہ جو فرمایا گیا کہ شاعروں کے ساتھ بہکے ہوئے لوگ چلا کرتے ہیں، اس سے مراد یہ ہے کہ شاعروں کے ساتھ لگے رہنے والے لوگ یعنی ان کے حواری اور حالی موالی، اپنے اخلاق و کردار، عادات و خصائل اور افتادِ مزاج میں ان لوگوں سے مختلف ہوتے ہیں

جو اللہ کے رسول کی معیت میں نظر آتے ہیں، دونوں گروہوں کے مابین اس قدر واضح فرق ہے کہ دیکھنے والا ایک نظر میں اندازہ لگالیتا ہے کہ یہ کیسے لوگ ہیں اور وہ کیسے۔ ایک طرف انتہائی سنجیدگی، تہذیب، شرافت، راست بازی اور خدا ترسی ہے، سب سے زیادہ یہ کہ ان کے سامنے ایک بلند اور پاکیزہ نصب العین ہے، دوسری طرف حال یہ ہے کہ کہیں عشق بازی اور شراب نوشی کے مضامین بیان ہو رہے ہیں اور حاضرین اچھل اچھل کر ان پر داد کے ڈونگرے برسا رہے ہیں، اور کہیں کسی زن بازاری یا کسی شریف زادی کا حسن موضوعِ سخن بنا ہوا ہے، اور سننے والے مزے اور چٹخارے لے رہے ہیں، کہیں جنسی مواصلت کی حکایت بیان ہو رہی ہے، اور پورے مجمع پر شہوانیت کا بھوت سوار ہے، کہیں ہزل بکا جا رہا ہے یا مسخرہ پن کی باتیں ہو رہی ہیں اور اس مشغول پر مجمع ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوا جا رہا ہے۔ کہیں کسی کی ہجو اڑائی جا رہی ہے اور لوگ اس سے لطف لے رہے ہیں۔ کہیں کسی کی بے جا تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے جا رہے ہیں اور لوگ واہ واہ کرتے نہیں تھک رہے، اور کسی کے خلاف نفرت، عداوت اور منتقمانہ جذبات ابھارے جا رہے ہیں اور سننے والوں کے دلوں میں آگ بھڑک رہی ہے۔ ان مجلسوں میں شاعروں کے ''کلام'' سننے کے لئے جو ہجوم جمع ہوتا ہے اور ان شرابی کبابی ''عظیم شاعروں'' کے پیچھے جو لوگ لگے پھرتے ہیں، ان کو دیکھ کر کون شخص یہ محسوس کئے بغیر رہ سکتا ہے کہ یہ اخلاق کی بندشوں سے آزاد، لطف ولذت کے پرستار، آبرو باختہ اور نیم حیوان قسم کے لوگ نہیں؟ اور یہ کہ ان کے ذہن کو یہ خیال کبھی چھو کر بھی گیا ہے کہ دنیا میں انسان کے لئے زندگی کا کوئی بلند تر مقصد اور نصب العین بھی ہو سکتا ہے؟ ان دونوں گروہوں کا یہ کھلا کھلا فرق اگر کسی کو نظر نہیں آتا تو اس میں روز روشن کو نہیں نور چشمی کا قصور ہے اور اس قبیل کے شعراء کے لئے یہ جو فرمایا گیا،

''کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں اور ایسی باتیں کہتے ہیں جو کرتے نہیں۔''

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی کوئی ایک راہ متعین نہیں جس پر وہ سوچنے اور قوت گویائی صرف کرتے ہوں، بلکہ ان کا توسنِ فکر ایک بے لگام گھوڑے کی طرح وادی وادی بھٹکتا پھرتا ہے اور جذبات یا خواہشات و اعتراض کی ہر نئی رو اس کی زمام، سے ایک نیا مضمون ادا کراتی ہے، جسے

سوچنے اور بیان کرنے میں اس بات کا کوئی لحاظ سرے سے رکھا ہی نہیں جاتا کہ یہ حق اور صدق بھی ہے کہ نہیں؟ اس کی ساری سوچیں اضداد کا مجموعہ اور بے معنی و بے حقیقت ہوتی ہیں، نہ کسی عشق کا جود، نہ کوئی معشوق موجود، شروع تا آخر جتنی اصطلاحات اور دعوے اور احتجاج سب جھوٹ، محض وقت کا زیاں اور کچھ نہیں۔ تو شعراء کی ان معروف خصوصیات سے جو شخص واقف نہیں تو وہ اقبال ایسے شاعر کو محض شاعر سمجھ کر اور کیا سمجھے گا۔ لہٰذا اقبال کو "محض" شاعر سمجھ کر نہیں سمجھا جا سکتا۔ اقبال کی فکر سے آگاہی کے لئے پہلے یہ طے کرنا ہوگا کہ ہم ایک ایسی شخصیت کے آستانۂ عالیہ میں قدم رکھ رہے ہیں جس کے سینے میں دلِ مومن دھڑکتا ہے اور جس کے دماغ میں وہ چراغ روشن ہے جس نے ان ذہنوں سے جلا پائی ہے جو اس مکتبِ عالیہ سے تعلق رکھتے ہیں جہاں اللہ کی کتاب اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے کلام کی روشنی بانٹی جاتی تھی۔ اقبال کی ذہنی تعمیر میں اسی مکتب کی کرامت نے اپنے اثرات مرتب کئے، ان کی فکر کو انہی اہلِ قلم ونظر نے پرواز کرنا سکھایا۔ سچ تو یہ ہے کہ اقبال اللہ کے ان چنیدہ بندوں میں سے تھے جو صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں اور صدیوں متاثر کرتے رہتے ہیں۔ اقبال کی فکر میں اس قدر تنوع ہے کہ آپ کی تخلیقات کا بیان ایک عمر کا تقاضا کرتا ہے۔ بہ قول مولانا ابوالحسن ندوی۔

> "اقبال کی شخصیت میں جو جامعیت، بلندی وفکر خیال، سوز، درد، کشش اور جاذبیت نظر آتی ہے، ان کا تعلق اقبال کی زندگی کے اس رخ سے ہے جسے ہم یقین وایمان کہتے ہیں۔"

دراصل اقبال کے افکار کی ایک ہی جہت اور ایک ہی ماخذ ہے اور وہ ہے قرآن، یہی وہ کتاب ہے جس کے مطالعہ نے اقبال کو ایسا صاحبِ کتاب وقلم بنادیا کہ دور تک بھی کوئی آپ کی مثال نظر نہیں آتا، ایک زمانے کو آپ نے اپنے فکر وفلسفہ سے اپنا گرویدہ بنالیا۔ نثر ہو کہ نظم ہر دو صناف کا آج بھی براہِ راست اثر ان دلوں پر پڑے بغیر نہیں رہتا جو دھڑکنا جانتے ہیں اور جو اس صفتِ حرکتِ قلب سے عاری بھی ہیں، ان کو بھی زندہ اور فعال کرنے میں اقبال کے افکارِ عالیہ "قُم بِاِذْنی" کی سی معجز نمائی اور تاثیر رکھتے ہیں۔ تاہم اقبال کا اوّلین تعارف بہر حال شاعر کے حوالے ہی سے ہوتا ہے بلکہ آپ باایمان اردو شاعری کے سب سے بڑے نمائندہ اور شاعرِ اعظم ہیں۔ گو

آپ نے خود کو کبھی شاعروں کی فہرست میں نہیں رکھا۔ بلکہ آپ کو یہ بالکل پسند نہ تھا کہ انہیں شاعر کہا جائے، اس کی تصحیح انہوں نے اس طرح کی:

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ مے خانہ

آپ نے شاعری کو محض اپنے افکار کے اظہار کا ذریعہ خیال کیا اور اس حوالے سے ہم اقبال کو ان شاعروں سے بالکل الگ اور ممتاز سمجھتے ہیں جنہیں خود کتابِ الٰہی نے مستثنیٰ قرار دیا ہے، یعنی یہ درست ہے کہ شعراء ہر وادی میں بھٹکتے ہیں، لیکن ان کے سوا جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور نیک اعمال کرتے ہیں۔ یعنی ایمان و عمل کی یہ دو صفات جس کے اندر ہیں گو وہ اپنی فکر اور اپنے خیال کا اظہار شعر میں کرے یا نثر میں، تقریر کے ذریعے سے کرے یا تحریر سے، اس کی ہر بات ایمانیات کے دائرے سے باہر نہیں جا سکتی، جس طرح ایک مومن کا مرنا اور جینا، معاملاتِ زندگی، عبادات و ریاضت اس کی قربانی وایثار سب اللہ کے لئے ہوتا ہے تو اس کی فکر وفن کے اظہار میں بھی للٰہیت ہی نظر آتی ہے، اقبال نے بھی اپنی شاعری کی نسبت خدا سے اور شاعرانہ خدمت اس کی مخلوق کے لئے وقف کر دی تھی۔ ان کا ایمان تھا کہ جو کہنا ہے وہی کہنا ہے، جو خدا کو پسند ہے اور خدا کو کیا پسند ہے؟ اقبال کو اس کا ادراک تھا اور آپ کا یہ وجدان آپ کے حرف حرف سے عیاں ہے کہ جب انسان اپنا سب کچھ اپنے رب کے حضور تج دیتا ہے تو رب تعالیٰ بھی اپنے بندے کو وہ سب کچھ عطا فرما دیتا ہے جو بندہ اس سے چاہتا ہے، اس کا اظہار خود اقبال نے اس طرح کیا ہے:

”خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے؟“

تو اس ”بندے“ اقبال کی رضا کیا ہو سکتی ہے؟ اس نے کیا چاہا ہوگا؟ یہی نا کہ جو ان کی دعاؤں میں نمایاں ہے اور جو ان کی دعاؤں میں ہے وہ ان کے اپنے لئے کب ہے، وہ تو ساری عمر ہی اپنی ملت کے لئے گریہ کناں رہے:

یا رب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے
جو قلب کو گرما دے، جو روح کو تڑپا دے

اس مردِ فقیر نے جہاں خود کو اپنی دعاؤں میں شامل کیا ہے تو اس طرح کہ اپنے لئے وہ تاثیر

طالب کرتے ہیں جس کو اپنی آہوں میں بسا کر ان دلوں میں پھونک سکیں جو دھڑکنا بھول گئے ہیں، اقبال اپنے نالوں سے اس کشتِ ویراں کی آبیاری کرنا چاہتے ہیں جو ہماری نااہلی اور بے پروائی کی وجہ سے اپنی بہار کھو چکی ہے:

میں بلبلِ نالاں ہوں اک اجڑے گلستاں کا
تاثیر کا سائل ہوں، محتاج کو داتا دے

گویا اقبال کی شاعری اس باکمال شاعری سے تعلق رکھتی ہے جو کتابِ حق کی طرح رو بہ زوال نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ یہ اپنے اندر محض شاعرانہ وصف و کمال ہی نہیں رکھتی بلکہ وہ جمال بھی رکھتی ہے جو انہی مقدس کتابوں کی ترجمان ہے اور جو ہمیشہ کے لئے ہے تو اس اعتبار سے ہم ایک بار پھر اس بات کو دہراتے ہیں کہ اقبال کی شاعری زندہ جاوید روبا ایمان شاعری ہے، اس لئے کہ یہ اس دینِ حق کی ترجمان و ہم زبان ہے جو اسلام کہلاتا ہے۔ اس حقیقت کا اقبال نے خود نہایت خوب صورت انداز سے اظہار کیا ہے۔

محمدؐ بھی ترا، جبریلؑ بھی، قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا

اور اسی لئے ہم اگر اقبال کے کثیر الجہت افکار اور متنوع اصناف و صفاتِ فن میں سے آپ کے اس حرفِ شیریں کا تذکرہ کریں تو آپ کو شاعرِ اسلام کہہ کر ہی یاد کیا جا سکتا ہے، مشہور ماہرِ تعلیم، ادیب و دانش ور رشید احمد صدیقی کے بہ قول،

"اقبال کا کلام ہمارے لئے اس صدی کا علم الکلام ہے جو ایک نامعلوم اور طویل مدت تک تازہ کار رہے گا۔ اس لئے کہ وہ ایک عظیم شاعری میں ڈھل چکا ہے، اسلامی عقائد، شعائر اور روایات کے جس عالمانہ، عارفانہ اور شاعرانہ انداز سے اپنے بے مثل کلام میں اقبال نے وکالت کی ہے، اس سے مسلم معاشرہ حیرت انگیز طور پر متاثر ہوا ہے۔ ایسی صحت مند اور بامقصد بیداری کا امتیاز شاید ہی کسی اور عہد کے علم کلام کے حصہ میں آیا ہو۔"

آگے چل کر موصوف علامہ کو زبردست انداز میں خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔

''یہ ایک حقیقت ہے کہ مذہبی کتب کے براہ راست مطالعہ سے بعض طبائع اور اذہان اتنے متاثر نہیں ہوتے جتنا انہی حقائق کو اقبالؒ کے کلام میں مطالعہ کر کے ہو گئے ہیں۔''

نیز شاعرِ اسلام اقبال کے بارے میں مشہور عالم دین اور مذہبی اسکالر مولانا ابوالحسن ندوی بیان کر رہے ہیں۔ فرماتے ہیں:

''انہیں (اقبال کو) میں نے اولوالعزمی، محبت اور ایمان کا نوا خواں شاعر پایا، اور اپنے بارے میں میری گواہی یہ ہے کہ جب جب بھی ان کا کلام پڑھا تو دل جوش سے اُمنڈنے لگا، اور لطیف جذبات نے انگڑائیاں لینا شروع کر دیں۔ احساسات و کیفیات کی لہریں بیدار ہونے لگیں اور رگوں میں شجاعتِ اسلامی کی رو دوڑنے لگی، میری نظر میں یہی ان کے شعر کی اصل قدر و قیمت ہے۔''

یاد رہے جب ہم اقبال کو شاعرِ اسلام کہتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم دیگر شعراء کو غیر اسلامی سمجھتے ہیں، نہیں بلکہ جیسا ہم نے سورۂ شعراء کے حوالے سے بات کی، وہ شاعری یقیناً مردود ہے جو اپنے سامع کے اندر منفی اور سفلی جذبات انگیخت کرنے کا سبب بنتی ہو، یا انہیں ابلیسی جمالیات کے خوشنما پردے میں جنسی آسودگی سے ہم آغوش کرتی ہو، سو اس اخلاق باختگی سے دامن کش ہو کر با مقصد خیالات اور فطرت کے کمالات کو جو شخص بھی اپنی شاعری کا موضوع بناتا ہے وہ یقیناً ان اوّل الذکر شعراء سے مستثنیٰ ہے جن کے بارے میں خدا کی کتاب نے دوٹوک فیصلہ دے دیا ہے کہ ''یہ بے مقصد خیالوں کی وادیوں میں ناک ٹوئیاں مارتے پھرتے ہیں۔''

اس کے باوجود کہ اقبال بے باک لہجہ میں کہتے ہیں:

ہند کے شاعر و، صورت گر و، افسانہ نویس
آہ بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

لیکن فنکار کی تخلیق کی قدر سے گریز نہیں کرتے۔ فنونِ لطیفہ میں وہ شعر و ادب کو اوّلیت کا مقام اور دیگر فنون کو ثانوی درجہ قرار دیتے ہیں، اس لئے بہ قول مولانا ندوی کہ ''اقبال کے نزدیک

ان سب فنون کی بنیاد فکر و خیال ہی ہے۔"

اقبال کا یہ موقف ان کے اس نظریے کی ترجمانی کرتا ہے کہ وہ کائنات کی ارتقاء کی حقیقت کے قائل ہیں، ذرّے سے لے کر کہکشاں تک سب عناصر ان کے نزدیک فعالیت کے عمل سے گزر رہے ہیں۔ جب یہ روز و شب کی نقش گری افسانہ گری نہیں ہے تو پھر کائنات میں زندگی کا سانس لینے والا انسان اگر اپنے فن اور ہنر کو محض خیالی اور بے مقصد بنا کر پیش کرتا ہے تو گویا وہ غیر فطری عمل کا مرتکب ہو رہا ہے۔ اس پر متنبہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اے اہلِ نظر! ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے، وہ نظر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا
بے معجزہ دنیا میں اُبھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

اقبال نے شعر کو جو عزت و وقار بخشا وہ شاعری کی تاریخ میں عدیم المثال اور منفرد مقام رکھتا ہے، ان کے ایک ایک شعر میں فلسفہ و فکر کا ایک جہان آباد نظر آتا ہے۔ آپ کے فکر و خیال کی بلندی اور رسائی بجا طور پر آپ کو یہ کہنے پر مجبور کر دیتی ہے:

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا مرے آئینۂ ادراک میں ہے

حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روشنی میں ایک سچے مومن کے اوصاف میں سے ایک وصف یہ بھی ہے کہ وہ جو چیز اپنے لئے پسند کرتا ہے وہی اور کے لئے بھی چاہتا ہے۔

اور اقبال نے شاعری کے حوالے سے جس مزاج کو اپنایا ہے، دوسرے ہم صفیروں سے بھی آپ یہی چاہتے ہیں کہ وہ بھی اسی رنگ کو اپنائیں، روایت کی بے مقصدیت اور فرسودگی کو ترک کر کے، اپنے فن کو زندگی کے لئے بامقصد بنا دیں۔ اس لئے کبھی کبھی آپ کا لہجہ روایت پسند شاعری کے خلاف سخت ہو جاتا ہے۔ فرماتے ہیں:

ہے شعرِ عجم گرچہ طربناک و دل آویز
اس شعر سے ہوتی نہیں شمشیرِ خودی تیز
افسردہ اگر اس کی نوا سے ہو گلستاں
بہتر ہے کہ خاموش رہے مرغِ سحرخیز

گو اقبال اس معاملہ میں بھی ایک منفرد مقام رکھتے ہیں کہ شعر سازی میں بیشتر اصطلاحات اور تراکیب خود آپ کی اپنی اختراع کردہ ہیں، تاہم قدیم استعاروں کو بھی آپ نے یکسر فراموش نہیں کیا لیکن اس طرح کہ ان کے معنی و مفہوم ہی بدل کے رکھ دیئے، اور کہیں کہیں تو ایسا لگتا ہے "کافروں کو مشرف با اسلام بنادیا ہے۔" مثلاً مشہور زمانہ اس ایک لفظ 'حُسن' ہی کو دیکھ لیجیے۔ جس کے گرد طواف کیے بغیر شاعر کا حج قبول ہی نہیں ہوتا۔ حسن کے اس تصور کو جو شاعری میں ایک مخصوص معنی میں استعمال ہوتا آیا ہے لیکن اقبال جو حسنِ ازل کے شیدائی اور اس کی ابدیت کو اپنے ایمان کی روح سمجھتے ہوئے اس حسن کے بارے جو روایتی مذاقِ شاعری میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے اور شاعر اس پر سو سو جان سے فدا اور دل قربان کرتے نظر آتے ہیں، اقبال فرماتے ہیں:

خدا سے حسن نے اک روز یہ سوال کیا
جہاں میں کیوں نہ مجھے تو نے لازوال کیا
ملا جواب کہ تصویر خانہ ہے دنیا
شبِ دراز عدم کا فسانہ ہے دنیا
ہوئی ہے رنگِ تغیر سے جب نمود اس کی
وہی حسیں ہے حقیقت زوال ہے جس کی

حسن کا ذکر ہو اور عشق کی بات نہ کی جائے یہ کیوں کر ممکن ہے، شاعری میں حسن کے بعد دوسرا بڑا عنصر عشق ہے، جس کی فرسودگی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ اس لفظ کی روایتی شاعری میں جس قدر ناقدری کی گئی ہے، شاید ہی کسی اور لفظ کے نصیب کو ایسی بدنامی ملی ہو۔ غالباً اسی بات کو محسوس کرتے ہوئے غالب ایسے روایت شکن شاعر کو بھی یہ کہنا پڑا تھا، ہم دیکھتے ہیں کہ اس "مظلومِ عشق" کی عزت بھی اقبال کے ہاتھوں ہی بحال ہوتی نظر آتی ہے۔ بلکہ آپ نے خانقاہِ عشق میں

رکھے صدیوں پرانے بتوں کو نکال باہر کیا اور اس میں توحید کی اذان بلند کی اور اس کے اصل تقدس کو بحال کر کے شعروادب کی تاریخ میں اپنا نام محمودِ سخن بت شکن کی حیثیت سے رقم کرا دیا۔

دیکھیے اقبال عشق کے درجات کو کس معراج پر لے گئے ہیں، فرماتے ہیں:

عشق دم جبرئیلؑ، عشق دم مصطفیؐ
عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام

لگتا ہے اقبال نے کتاب عشق کو لفظاً لفظاً پڑھ کر اس کی روح کو اپنے اندر اتار لیا ہے، اپنے مرقع دل میں عشق کا پیکر سجا چکے ہیں، اس کے خدوخال اور اس کے ہر رنگ کو پہچان چکے ہیں، اس لئے تو کہتے ہیں۔

شوق مری لے میں ہے، شوق مری نے میں ہے
نغمۂ اللہ ھو، میرے رگ و پے میں ہے

بلاشبہ، عشق اقبال کی رگ رگ میں سمایا ہوا ہے۔ اس کے بغیر آپ حیات و کائنات کو روح سے خالی سمجھتے ہیں:

عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم
عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوز دم بہ دم
آدمی کے ریشے ریشے میں سما جاتا ہے عشق
شاخِ گل میں جس طرح بادِ سحر گاہی کا نم

یعنی جس طرح شاخِ گل پر شبنم کی آبیاری حسین و خوب صورت پھول کھلا دیتی ہے، اسی طرح عشق انسان کے رگ وریشے میں پیوست ہو کر اس کی شخصیت کو گل رنگ بنا دیتا ہے۔ شاید اسی لئے اقبال محسوس کرتے ہیں کہ ان کی پروازِ فکر کم زور پڑنے لگی ہے تو تمنائے دل دعا بن کر ہونٹوں پر مچل جاتی ہے:

مجھے عشق کے پر لگا کر اڑا
مری خاک جگنو بنا کر اڑا

اقبال کے نزدیک زمین و آسماں کی بے کرانیاں بغیر عشق طے نہیں کی جاسکتیں، بلکہ آپ خود

اپنا تجربہ بیان کرتے ہیں کہ اس کائنات کو میں نے ناقابلِ عبور سمجھ رکھا تھا، لیکن جب عشق کو رفیقِ سفر بنایا تو ایک ہی پرواز میں اس نے مجھے کائنات کے دوسرے سرے پر پہنچا دیا:

عشق کی ایک جست نے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں

اقبال کے ہاں عشق کے عنوان سے جو تفصیل پائی جاتی ہے، اس کے بیان کی یہ محدود جگہ کافی نہیں ہو سکتی، تو بس عشق کے ذکر کو ہم اس جگہ موقوف کرتے ہیں کہ اقبال، انسانی آزادی اور اس کے مقامِ حریت کو بھی عشق کا کارنامہ قرار دیتے ہیں، کہتے ہیں عشق کی معجز نمائیاں چشمِ عالم سے پوشیدہ نہیں، یہ جذبۂ عشق ہی ہے جس نے محکوموں کو حاکم اور غلاموں کو امامِ عالم بنا دیا:

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی

یہ ایک فطری امر ہے کہ جس شخص کے ذہن و خیال میں کسی چیز کا اصل اور حقیقی تصور موجود ہو، وہ اس کی غلط اور بگڑی ہوئی تصویر کو دیکھ کر اپنی ناخوشی کا اظہار کیے بغیر نہیں رہتا، صاحبِ بصیرت اقبال کے ذہن و دل میں نہ صرف اسلام کے اصل خدوخال نقش ہیں بلکہ ان کے خیالوں اور شعور میں اسلام کے پیروکار کی بھی ایک اصل تصویر آویزاں ہے، آپ جانتے ہیں کہ مسلمان کی اصل تعریف کیا ہے، تو کبھی اس کے اجزائے ترکیبی بیان کرتے ہیں:

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

کبھی اس کے کردار و گفتار کی جھلک پیش کرتے ہیں:

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی آن، نئی شان
کردار میں گفتار میں اللہ کی برہان

کبھی اس کی تقدس مآب شخصیت کی جلوہ گری کرتے ہیں۔

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

اور کبھی اس کے قوتِ بازو کی بات کرتے ہیں:

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

نیز اپنے سامعین و ناظرین کے سامنے اس کی تصویر واضح کرنے کی غرض سے اس کی ضد کو مثال بنا کر تقابلی شکل میں پیش کرتے ہیں:

کافر ہو تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسا
مومن ہو تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی
کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

کبھی اس کی فعالیت کا تقابل زمینی نوادرات سے کرتے ہیں:

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات
مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

اقبال مومن کی تصویریں پیش کرتے تھکتے نہیں: کہتے ہیں، انسانی مخلوق میں مسلمان کوئی بے زور، بے وقعت اور بے توقیر مخلوق نہیں،

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

☆

کشتیِ حق کا زمانے میں سہارا تو ہے
عصرِ نو رات ہے، دھندلا سا ستارا تو ہے

لہٰذا اے قومِ رسولِ ہاشمی اُٹھ اور اپنے اندر وہ ایمان تازہ کر جو رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معرفت تجھے عطا ہوا تھا اور وہ عشق اپنے اندر پیدا کر جو رسولِ حق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شیدائیوں کے دل میں اپنے آقا و مولا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے جاں گزیں تھا، اقبال اس مشعلِ توحید اور قوتِ عشق کا حوالہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں عشقِ محمدؐ سے اجالا کر دے

اقبال اپنی اس معرکۃ الآرا نظم "جوابِ شکوہ" کے آخری بند میں وہ حکیمانہ نکات پیش کرتے ہیں جو اس قوم کے جسدِ مردہ میں دوبارہ جان ڈال سکتے ہیں۔ علامہ خدا تعالیٰ کی بات اپنی زبان سے کہتے ہیں:

عقل ہے تیری سپر، عشق ہے شمشیر تری
مرے درویش! خلافت ہے جہانگیر تری
ماسوا اللہ کے لیے آگ ہے تکبیر تری
تو مسلماں ہو تو تقدیر ہے تدبیر تری
کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

کہا جا رہا ہے اے مسلمان تجھے اپنے احیا اور اپنے کھوئے ہوئے وقار کو حاصل کرنے اور اپنی غصب شدہ شہریاری کو حاصل کرنے کے لئے جن چیزوں کو اپنے اندر زندہ کرنا ہے، وہ یہ ہیں کہ جہادِ زندگانی میں عقل کو ڈھال بنا، اور عشق کی شمشیر سے حالات کا مقابلہ کر، اس معرکہ آرائی میں اس خیال کو پیشِ نظر رکھ کہ تیری ذوقِ خدائی کا مقصد جہانگیری و کشور کشائی نہیں بلکہ اس فریضۂ خلافت کو دنیا میں قائم کرنا ہے جس کے لئے تجھے منتخب کر کے اس دنیا میں بھیجا گیا ہے اور یہ بھی یاد رکھ کر ربِ اکبر کی ذاتِ واحد کے سوا جتنی طاقتیں ہیں، ان کے لئے تیرا نعرۂ تکبیر آگ کی حیثیت رکھتا ہے جو انہیں جلا کر خاکستر کر دے گا اور یہ نکتہ بھی تجھے یاد رکھنے کا ہے کہ اگر تو مسلمان ہے، جب کہ تجھے مسلمان ہونا چاہئے تو تیری تدبیر ہی تیری تقدیر بن سکتی ہے اور اب آخری اور حاصلِ کلام بات بھی سن لے کہ اگر تو نے ہمارے نبی سے وابستگی رکھی، ہمارے محبوب سے وفا نبھائی یعنی اس شہادت کی لاج رکھی جو تو کہتا ہے کہ اشھد ان محمد الرسول اللہ اور رسول کے طریقہ پر چلا، اور اپنے اس محسن کے مشن کو جاری رکھا تو پھر یہ ایک جہاں کیا، ہم لوح و قلم تیرے سامنے رکھ دیں گے کہ تو جو کچھ چاہتا ہے سب اپنے ہاتھ سے اپنے نام لکھ لے۔

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اقبال کی نظر میں یہ بات یوں ہے، یا اقبال کے نزدیک یہ ایسا ہے تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ ہم ایک عام سے شاعر کے حوالے سے بات کر رہے ہیں جو اپنے ذہن سے سوچتا اور اپنے خیال اور اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے، نہیں بلکہ یہ حوالہ دیتے وقت ہمارے ذہن میں ایک ایسا دانش ور اور فلسفی ہوتا ہے جس کے افکار کا ماخذ قرآن حکیم اور صاحب قرآن رسول آخر الاعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اُسوہ اور آپ کی تعلیمات ہیں، ظاہر ہے خدا کی کتاب سے ہٹ کر ایک شخص کی رائے کیا اہمیت رکھ سکتی ہے، عقل کی بساط ہی کیا ہے! ایک حد تک اس کی طاقت اور رسائی ہے اور یہ فلسفہ، بغیر کتاب الٰہی اس کے فکر و خیال کی محض شوخی ہے، اس کے سوا کچھ نہیں، چنانچہ اقبال کا فکری اور قلبی تعلق کیوں کہ شروع سے ہی قرآن رہا ہے، اس لیے ہم ان کی فکر انگیز باتوں کو نہ صرف قابلِ سماعت سمجھتے ہیں بلکہ قابلِ قبول اور قابلِ عمل خیال کرتے ہیں۔

قرآن کا موضوع انسان ہے اور انسان ہی وہ تمام مخلوقات میں اعلیٰ اور افضل مخلوق ہے جس کو خالقِ اکبر نے زمین پر اپنی نیابت کے لیے منتخب فرمایا ہے، تو یقیناً اسے وہ اختیار بھی اپنے نائب اور خلیفہ کو ودیعت کیے ہوں گے، جن کے ذریعہ سے ہی تو وہ خلافت کے فرائض انجام دے سکتا ہے، لیکن انسان اس معاملے میں اپنا کردار پوری طرح ادا نہ کر سکے اور اپنے منصب کے خلاف عمل کرے تو وہ محض مٹی کا ایک ڈھیر بن جاتا ہے جیسا کہ اقبال کہتے ہیں:

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں خاک کا ڈھیر ہے

اور ایسے ہی نااہل اور منصب فراموش سے اقبال پر زور لہجہ میں مخاطب ہوتے ہیں کہ خدا نے اپنے لئے خصوصی اختیارات میں سے کچھ اختیارات تجھے ودیعت کئے تھے، جیسا کہ حدیثِ مبارکہ میں ہے۔ تخلقوا باخلاق اللہ۔ تم اپنے اندر اللہ کے اخلاق پیدا کرو، یعنی وہ صفات اور طاقتیں جو اللہ نے تمہیں عطا کی ہیں ان کو بروئے کار لاؤ تا کہ دنیا میں باطل کے طاغوتی اثرات ختم ہو سکیں اور حق، باطل قوتوں پر غلبہ آ سکے۔ لیکن تیری ذات کا دریا اپنی موجوں کی اس روانی ہی کو بھول بیٹھا ہے جو تیری خودی کو طوفان میں بدل دیتی تھی، تو اب اس محرومی کو تقدیر کی ناکامی قرار دے کر کاتبِ تقدیر سے شکوہ کرنے سے کیا حاصل، بلکہ میں تجھ سے پوچھتا ہوں کہ تو اپنی خودی کو

پہچان کر خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں بن جاتا۔ جیسا کہ اس قول میں یہ حقیقت پوشیدہ ہے کہ:

عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں
تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے
ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے
خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے

اقبال کے مخاطبین خصوصی طور پر ملت کے نوجوان ہیں۔ آپ کو جہاں اور جیسا بھی موقع ملتا ہے، نوجوانوں سے خطاب کرتے رہتے ہیں۔ ان کا حوصلہ بڑھاتے ہیں کہتے ہیں:

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

ایسے نوجوان جو زندگی کے مختلف میدانوں میں آگے بڑھنے اور ترقی کے ستاروں کو چھونے کا جذبہ رکھتے ہیں، اقبال انہیں اپنی آنکھ کا تارا سمجھتے ہیں۔ کبھی انہیں حوصلہ مندی کا درس مختلف امثال کے ذریعہ دیتے ہیں:

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں

اور کبھی انہیں عیش پسندی اور سہل انگاری سے بالاتر رہنے اور ایک جفاکش مردِ مومن بننے کا سبق دیتے ہیں:

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

اور کہیں ان سے اس بات کا شکوہ کرتے ہیں کہ وہ اپنی زندگیوں میں مومنانہ فقر و درویشی کی بجائے تعیشات کی مصنوعی زندگی کی طرف مائل ہو رہے ہیں جس نے انہیں اس اصل ترقی سے روک دیا ہے جس کو اقبال روحانی ارتقاء کہتے ہیں، کیوں کہ اس طرح کی مغربی تہذیب کو تو آپ تہذیب بے روح قرار دے چکے ہیں اور پیشین گوئی کر چکے ہیں کہ مغربی تہذیب جس کو دیکھ کر اہلِ مشرق اپنی آنکھوں میں چکا چوند محسوس کرتے ہیں دراصل وہ شاخِ نازک پہ بنے ہوئے آشیانہ کی

طرح ہے جو کسی بھی وقت اپنی ناپائیداری کے سبب زمیں بوس ہوسکتا ہے۔ لہٰذا اقبال جب اپنے نوجوانوں کو اس فرنگی لائف آف اسٹائل (طرزِ زندگی) کو اپناتے دیکھتے ہیں تو افسردہ ہوجاتے ہیں اور شکایت آمیز لہجے میں اسے مخاطب کرتے ہیں:

ترے صوفے ہیں افرنگی، ترے قالیں ہیں ایرانی
لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی

اپنی نظم: "خطاب بہ جوانانِ اسلام" میں انہیں حکیمانہ نصیحت کرتے ہیں،

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے!!
وہ کیا گردوں تھا، تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا

علامہ فرماتے ہیں: "اے نوجوان کبھی تو نے اس بات پر بھی غور کیا ہے کہ تو کس آسمان کا ٹوٹا ہوا تارا ہے؟ آگے خود ہی اسے بتاتے ہیں تو اس قوم کا پروردہ ہے جس کے غازیوں نے دنیا کی ایک مغرور سپر پاور کے تاج وتخت کو اپنے پیروں سے کچل ڈالا تھا یہ مجاہدانہ کارنامے انجام دینے والے، صحرائے عرب کے وہ شتربان تھے جو پوری دنیا کے فاتح ہوکر بھی قولِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم "الفقر وفخری" پر عمل پیرا رہتے تھے۔ ان صحرانشینوں کی ایک خوبی نہیں جو گنوائی جائے لیکن افسوس۔

تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار، وہ کردار، تو ثابت، وہ سیارا

یعنی تو صرف باتیں کرتا ہے، جب کہ وہ جو کہتے کرکے دکھادیتے تھے، تو ایک جگہ ٹھہر کر رہ گیا ہے جب کہ وہ ہر لمحہ حرکت میں رہنے والے، آگے بڑھنے والے تھے۔ لیکن وائے قسمت کہ آج نہ وہ باکمال لوگ موجود ہیں اور نہ ہی ان کی حکومت باقی رہی ہے، چلئے حکومت تو بہرحال ایک عارضی چیز ہوتی ہے، نظامِ قدرت کا دستور ہے کہ ہر کمالے را زوال، یہ دستور ازل سے چلا رہا ہے، اور یہاں آدمی مجبور ہے۔

وہ لیکن علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا

لیکن اپنے اسلاف کا وہ علمی خزانہ جسے ہمارے پاس ہونا چاہئے تھا، جس کی ہم حفاظت کرتے اور اس سے مستفید ہوتے، آج وہ اہلِ یورپ کی تحویل میں ہے جس سے وہ فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔''

علامہ صاحب کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ نوجوانوں کو چاہئے وہ علمِ قدیم وجدید دونوں کی طرف مائل ہوں اور علم وہنر کے میدان میں اتنا آگے بڑھیں کہ ان کی رسائی یورپ کی الماریوں میں سجی ہوئی کتابوں تک ہو جو مسلم حکماء اور دانش وروں کی ذہنی وفکری کاوشوں کا نتیجہ ہے جس سے یورپ نے فائدہ اُٹھا کر ترقی کی دوڑ میں ان سے معاونت حاصل کی ہے۔

''علی گڑھ کالج کے طلباء کے نام'' میں حضرت اقبال بالکل نئے انداز اور منفرد لہجہ میں انہیں آگے بڑھنے اور فعال بنانے کا درس دیتے نظر آتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

اوروں کا ہے پیام اور ، میرا پیام اور ہے
عشق کے درد مند کا طرزِ کلام اور ہے

ایک بہت ہی اہم اور لطیف اشارہ بیان کر رہے ہیں:

طائرِ زیرِ دام کے نالے تو سن چکے ہو تم
یہ بھی سنو کہ نالۂ طائرِ بام اور ہے

یعنی ''طائرِ زیرِ دام'' وہ دانش ور اور راہ نما جو غلام ملک میں رہ کر غلامی کو قبول کئے ہوئے اپنی غلامانہ ذہنیت کا اظہار کرتے رہتے ہیں، دوسرے لفظوں میں مجبوریوں اور مصلحتوں کا رونا روتے رہتے ہیں، لیکن میں ''طائرِ زیرِ دام'' نہیں، ''طائرِ بام'' ہوں، ہر مصلحت سے بالاتر ہو کر بات کرنے والا ہوں، اور میں جو آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کا پیغام دے رہا ہوں تو وہ خارجی ترقی بھی ہے اور داخلی بھی، ہر دو عالم میں متحرک ہونا از حد ضروری ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ:

آتی تھی کوہ سے صدا رازِ حیات ہے سکوں
کہتا تھا مورِ ناتواں لطفِ خرام اور ہے

یعنی پہاڑ جو اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتا تھا اس بات کا اعلان کر رہا تھا کہ پرسکون زندگی کا راز یہ ہے کہ میں ایک جگہ ساکن ہوں، پُرسکون ہوں۔'' لیکن ایک چھوٹی سی چیونٹی اس کے دعوے

کو مسترد کرتے ہوئے اس حقیقت کا اظہار کر رہی تھی کہ "جو لطف چلنے پھرنے، حرکت کرنے اور پیش قدمی کرنے میں ہے، وہ ایک جگہ پڑے رہنے میں نہیں۔"

"لطفِ خرام" کا درس دینے کے بعد اقبال نوجوان طلباء کو اپنے اصل نظریہ اور موقف کی طرف متوجہ کرتے ہیں:

جذبِ حرم سے ہے فروغ انجمنِ حجاز کا
اس کا مقام اور ہے، اس کا نظام اور ہے

"انجمنِ حجاز" یعنی ملتِ اسلامیہ کی ترقی کا راز، حرم، یعنی اللہ اور اس کے دینِ برحق اسلام سے تعلق میں ہے، کسی اور طرف دیکھنے اور جانے میں نہیں، اس لیے کہ جو اعلیٰ مقام اس کا ہے کسی اور کا نہیں اور جو نظام اس کا ہے کسی اور نظریے اور تہذیب کا نہیں ہو سکتا۔

اقبال جو کچھ پیغام اپنی قوم اور بالخصوص اپنے نوجوانوں کو دے رہے ہیں، اس سے زیادہ وہ خود اپنے اندر رکھتے تھے جس کے لئے عمر، وقت اور ماحول بہت کچھ درکار تھا اور یہ آرزو بھی انہیں تڑپاتی تھی کہ مسلم نوجوان ان کی طرف متوجہ ہوں، ان کی بات سنیں، غور کریں اور اس پر عمل کر کے نہ صرف قوم کے اندھیرے دور کر دیں بلکہ خود کو ملت کا ستارا بنا دیں۔ لیکن اقبال اپنی زندگی کے قیمتی شب و روز قوم کے نام کر کے، وہ نتائج حاصل نہیں کر پا رہے تھے جو وہ چاہتے تھے، بہرحال مایوس تو نہیں ہوئے تاہم اپنے نوجوانوں سے شکایت ضرور کی اور ان میں وہی تڑپ جو وہ اپنے اندر رکھتے ہیں، پیدا کرنے کے لئے خدائے بزرگ و برتر کے آگے سراپا التجا بن گئے:

جوانوں کو مری آہِ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے
مرا نورِ بصیرت عام کر دے

کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ......

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں

مومن اللہ کا نائب ہے، دنیا کی ہر طاقت پر غالب ہے، کائنات کی ہر چیز اس کے لئے مسخر کردی گئی ہے۔ حضرت اقبال اسی خفیہ قوتوں پر یقین رکھتے ہیں۔ جانتے ہیں کہ مومن ظلِ الٰہ ہے، اس پر اللہ کا ہاتھ ہے، جیسا کہ خود کتابِ اقدس میں اللہ کے قول کا مفہوم ہے کہ وہ اپنے عارف کے ہاتھ، منہ، کان اور آنکھیں بن جاتا ہے، مومن کی اس طاقتِ بے پناہ، عام انسانوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتی ہے، علامہ اقبال اس بات کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کار کشا، کار ساز
خاکی و نوری ہنا بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز

اقبال مومن کی فعالیت کے قائل ہیں، وہ تن بہ تقدیر ہو کر بیٹھنے والے کو مومنانہ صفات سے خارج سمجھتے ہیں۔ آپ کے نزدیک یہ ایک متحرک اور زندہ انسان کا عمل نہیں جو مومن بھی ہو، یہ تو نباتات و جمادات کی خاصیت ہے، مومن کا کام اپنے خالق کے احکام کی پابندی کرنا ہے۔ فرمایا:

تقدیر کے پابند جمادات و نباتات
مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

علامہ اقبال اپنے خانۂ دل میں ہر اس مردِ مومن کی تصویر آویزاں کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں جو اسلامی غیرت اور غازیانہ جذبے سے سرشار نظر آتا ہے، تاریخ کے اوراق اقبال کے سامنے کھلے پڑے ہیں، جہاں بھی کوئی ایسا منظر دیکھتے ہیں جس میں مردِ مومن جلوہ گر ہے، اسے اپنی شاعرانہ فکر میں ڈھال لیتے ہیں۔ فاتح اندلس طارق بن زیاد نے یہ دیکھ کر کہ دشمن کی فوج اس کی سپاہ سے کئی ہزار گنا زیادہ ہے، ان کشتیوں کو ہی جن کے ذریعے وہ اس کے علاقہ میں پہنچ کر لنگر انداز ہوئے تھے، جلا دینے کا حکم دے دیا، تاکہ واپسی کا سہارا ہی ختم کردیا جائے، اپنے مجاہدوں کو ایک ولولہ انگیز خطبہ دیا، کہا:

"آگے دشمن ہے اور پیچھے سمندر ہے، دونوں طرف موت ہے، چاہے فرار ہو کر بزدلوں کی طرح مرجاؤ یا آگے بڑھ کر دشمن کا مقابلہ کرو اور اللہ کی راہ میں لڑ کر شہادت کی موت اختیار کرو۔"

طارق کی اس مجاہدانہ تقریر نے غازیوں کو اللہ کی تلوار بنا دیا، وہ سرفروشی دکھائی کہ مٹھی بھر سپاہ لاکھوں کی فوج پر غالب آ گئی، یہ مجاہدین، اقبال کے مردِ مومن کے پیکرِ تابناک ہیں۔ آپ انہیں شاباش دینے میں سراپا عقیدت بن جاتے ہیں:

یہ غازی یہ تیرے پُراسرار بندے جنہیں، تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا، سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

اقبال کا ایسے مردانِ مومن سے عقیدت کا اظہار کوئی ایک جگہ نہیں، اپنی شاعرانہ اقلیم میں جگہ جگہ ان کی قصیدہ گوئی کے اشتہار چسپاں کرتے نظر آتے ہیں:

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

مختصر یہ کہ مومن کی تعریف میں یہاں تک کہہ دیتے ہیں:

مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے
مومن کا مقام ہر کہیں ہے

حضرت علامہ نے نثر میں اسلام کی عظمت و رفعت کا کس کس طرح دفاع کیا اور اسلامی فکر کی تشکیلِ نو پر جو فکر انگیز مقالات قلم بند کیے اس کا حجم شعری مواد سے بھی کہیں زیادہ ہے، لیکن یہ الگ موضوع ہے، ہم یہاں صرف اقبال کی اسلامی شاعری سے متعلق محوِ گفتگو ہیں اور صرف اُردو کلام سے خوشہ چینی کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، وہ بھی نہایت مختصر انداز میں، یاد رہے اقبال کے پندرہ ہزار اشعار میں صرف نو ہزار اشعار پر مبنی کلام اُردو میں ہے۔ زیادہ تر فارسی میں ہے اور تمام کا تمام کلام اسلامی فکر و فلسفہ سے معمور ہے، ان میں کئی مثنویاں ہیں جو اپنے موضوع اور فکر کے اعتبار سے قرآن حکیم کی تفسیر نظر آتی ہیں۔ اقبال مومن کو پورا کا پورا دین میں داخل دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ مسلمان کی تعریف ہی یہ ہے کہ اس کا ظاہر و باطن یکساں ہوتا ہے، اس کی ایک ایک ادا اور ایک ایک عمل سے اسلام کی تشریح ہوتی ہے۔ اقبال اس تصور کو اس طرح پیش کرتے ہیں:

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

مومن کی تعریف میں شاعرِ اسلام رطب اللسان ہیں:

دنیا کی عشا ہو جس سے اشراق
مومن کی اذاں ندائے آفاق

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ دنیا میں انسانی فلاح کے ضامن انقلاب مردِ مومن کے ہاتھوں ہی برپا ہوئے ہیں۔ دنیا پر چھائی ہوئی تاریکیاں ہمیشہ کسی مردِ مومن کی ہی جرأت مندانہ اور مجاہدانہ کوششوں سے دور ہوتی ہیں۔ اس نے دنیا کی عشا کو اشراق میں تبدیل کیا ہے، بالکل اس طرح جیسے موذن کی اذان اس بات کا اعلان کر رہی ہوتی ہے کہ سحر نمودار ہونے والی ہے اور یہ منظر ایک مردِ مومن کی اذان سے ہی بدلتا ہے کہ جب اللہ اکبر کی صدا بلند ہوتی ہے تو سویا ہوا عالم آنکھیں کھول دیتا ہے اور ایک نئی صبح اور تازہ عمل کے نئے عزائم لے کر اُٹھ کھڑا ہوتا ہے، علامہ فرماتے ہیں:

یہ سحر جو کبھی فردا ہے کبھی امروز
نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا
وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

اقبال کی بلند نگاہی ہمیں مردانِ خدا کے ان بلند مقام سے آگاہ کرتی ہے جو خدا کے ان پُر اسرار بندوں کی پہچان اور صفتِ حقیقی ہے، فرماتے ہیں:

وہی ہے بندہ جس کی ضرب ہے کاری
نہ وہ کہ ضرب ہے جس کی تمام عیاری

یعنی بندۂ آزاد وہ مردِ حق ہے جو باطل پر ضرب کاری لگاتا ہے نہ کہ وہ جو کہتا یہ ہے کہ وہ باطل قوتوں سے نبرد آزما ہے، جب کہ محض عیاری اور مکاری کے ذریعہ خود کو جنگِ آزادی کا ہیرو ظاہر کر رہا ہوتا ہے۔

اقبال ''مردانِ خدا'' کے عنوان سے ان کا مزید تفصیلی تعارف کراتے ہیں کہ احرار، یعنی وہ آزاد طبع جو غلامی کو کسی طور پر قبول نہیں کرتے، ان کے ضمیر میں قدرت نے روزِ اول ہی میں یہ صفاتِ عالیہ رکھ دی ہیں کہ قلندری، قباپوشی اور کُلہ داری ان کے ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ یعنی صاحب

تخت و تاج ہو کر بھی ان کی بے نیازانہ طبیعت انہیں ہر مادی لالچ سے دور رکھتی ہے۔ان مردانِ حر کی خاک میں وہ چنگاری پوشیدہ ہوتی ہے جس کو وقت ایک دن مثلِ آفتاب روشن کر دیتا ہے۔یعنی جو غیر کی غلامی کو قبول نہیں کرتے، آزادی کی تڑپ دل میں رکھتے ہیں۔ وہی ایک روز آفتاب بن کر دنیا پر چھا جاتے ہیں۔اقبال مزید ان کے تعارف میں فرماتے ہیں:

وجود انہی کا طوافِ بتاں سے ہے آزاد
یہ تیرے مومن و کافر تمام زناری

یہی مردانِ حر وہ ہیں جو ہر مصلحت سے آزاد و بے نیاز رہتے ہیں۔جو دنیا میں رنگ و نسل، قوم و وطنیت، مال و زر، استعمار و اقتدار، جھوٹے نظریات اور نفسانی خواہشات کے بتوں پر فریفتہ نہیں ہوتے ورنہ جس میں یہ بے نیازی و بے باکی نہیں، وہ خواہ مسلمان ہونے کا دعوے دار ہو یا کافر، دونوں ہی کا عمل زناری ہے، یعنی ان کا ظاہر و باطن یکساں نہیں، نہ مسلمان اپنے ایمان سے اور نہ کافر اپنے کفر سے مخلص ہے۔

حضرت اقبال، مومن کی تصویر اور اس کے سراپا کو مختلف پہلو اور رخوں سے دیکھتے اور دکھاتے ہیں:

مسلماں کے لہو میں ہے سلیقہ دل نوازی کا
مروّت حسنِ عالمگیر ہے مردانِ غازی کا

مسلمان کے لہو میں یہ چیز رچی بسی ہے کہ اس کا عمل دیکھنے والوں کو اپنی جانب رجوع کرا لیتا ہے، یہ وہ مردِ غازی ہے جو اپنے حسنِ عمل سے دلوں کو فتح کر لیتا ہے:

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

مومن کا جہادی عمل بھی، دنیا کی جنگ جُو قوموں کی طرح نہیں جو انسانوں کو خاک و خون میں نہلا کر ملکوں اور حکومتوں پر قبضہ جماتے اور ڈاکوؤں کی طرح ان کا مال و دولت دونوں ہاتھوں سے لوٹتے ہیں بلکہ مومن وہاں اپنی جان کی بازی لگا دیتا ہے، جہاں ظلم کا دور دورہ اور جبر کی حکمرانی ہے، جہاں انسانوں کو طاقت کے ذریعہ اپنا غلام بنا رکھا ہے، جہاں انسان کے بنیادی حقوق غصب

کر رکھے ہیں، جہاں خدائے واحد کے بجائے غیر خداؤں کی پرستش کی جاتی ہے، اور اس پرستش کے حق دار شجر و حجر کے ساتھ ساتھ خود وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جو زبردستی لوگوں کے حاکم بنے ہوئے ہیں اور خود کو دیوتا کے طور پر منواتے اور اپنے آپ کو اعلیٰ و ارفع اور ناقابلِ تسخیر سمجھتے ہیں، مجاہدِ اسلام نے ہمیشہ انہی فرعونوں کو للکارا اور ان بتوں کو مسمار کیا۔ لیکن آج اس کا حال یہ ہے کہ:

بیچتا ہے ہاشمی ناموسِ دینِ مصطفیؐ
ہو گیا مانندِ آب ارزاں مسلماں کا لہو
لے اُڑے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل
خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز

افسوس مسلمان نے دینِ مصطفیؐ کو غیروں کے ہاتھوں فروخت کر دیا ہے، یعنی وہ مومنانہ اوصاف جو قومِ رسولِ ہاشمی کی شناخت تھے، جو لہو اس کی رگوں میں دوڑ کر اسے گرم جوش رکھتا تھا، اس میراثِ خلیل یعنی اسلامی روایات و اقدار کو تثلیث پرستوں نے اغوا کر لیا اور خاکِ حجاز یعنی روحِ اسلام کو کلیسا کی بنیاد بنا لیا ہے۔"

کسی زندہ شے کو اس لیے ذی حس کہا جاتا ہے کہ اس کے اندر وہ روح کارفرما ہوتی ہے جو اس کے احساس کو زندہ رکھتی ہے، اگر وہ روح مفقود ہو تو پھر وہ پتھر کی طرح ایک بے حس، بے جان اور کسی جسدِ مردہ کی مانند ہوتی ہے۔ انسان ایک ذی حس مخلوق ہے، لیکن ایسی نہیں جیسی دوسری بہت سی مخلوقات ہیں جو اس کی طرح کان، آنکھ، ناک اور دیگر ایسے اعضاء بھی رکھتی ہیں جو انسانوں میں مشترک ہیں۔ لیکن انسان اس لیے ان میں ممتاز اور اشرف ہے کہ اسے اعلیٰ عقل و شعور بخشا گیا ہے اور یہ اس لیے کہ اسے اس کے خالق نے زمین پر اپنا خلیفہ (نائب) بنا کر بھیجا ہے۔ تو اگر یہ بھی حیوانوں کی طرح اس دنیا کو بس دیکھے اور اس سے کچھ اثر نہ لے، اپنی زندگی کو بھی بے شعوروں کی طرح گزارے جس میں انسانی ادب و آداب نہ ہوں تو اس میں اور حیوان میں کوئی نمایاں فرق نہیں رہتا، پھر اس سے بھی بڑھ کر قدرت نے انسان کے اندر ایک اعلیٰ جوہر رکھا ہے۔ وہ ہے مادیت سے ماورا، روحانی احساس، جو ایمان سے مشروط ہے، انسان اپنے خالق کو اپنا معبود مانتا اور اس کے احکام کو تسلیم کر کے اس پر عمل کر کے ہی اس جوہرِ خاص کو محفوظ رکھ سکتا اور صحیح معنی

میں زندہ کہلا سکتا ہے، یہی حال فرد کا ہے اور یہی کیفیت قوم کے ساتھ مخصوص ہے۔ قومِ رسولِ ہاشمیؐ کے اندر یہی جوہر خاص روح رواں تھا جس کی بنا پر وہ اقوامِ عالم میں نمایاں، ممتاز اور سید الاقوام کہلائی جاتی تھی، لیکن بعد میں اس نے اس کی قدر نہ کی، اسی گوہرِ آب دار کو مٹی میں ملا دیا تو یہ خود بھی خاک آلود ہوگئی۔ ان کی ٹھوکروں میں آ گئی جو خود اپنے خالق کے ٹھکرائے ہوئے تھے۔ اقبال کے ہم عصر مسلمانوں کی حالت ایسی ہی تھی، اقبال اس کی خرابی کی وجہ کا بہ خوبی ادراک رکھتے ہیں، آپ کے آئینۂ دل میں اُمت کی بگڑتی ہوئی تصویر آپ کو واضح طور پر بتا رہی ہے کہ میری یہ حالت کس وجہ سے ہے، یہی سبب ہے کہ قوم کو آگاہ کر رہے ہیں۔

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے
مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے
صفیں کج ، دل پریشاں، سجدہ بے ذوق
کہ جذب اندروں باقی نہیں ہے

اور بھی وضاحت سے فرماتے ہیں:

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے
وہ دل، وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہے تو باقی نہیں ہے

یہ سب چیزیں محض رسم اور رواج بن کر رہ گئی ہیں، انہی صفات کی وجہ سے یہ "اُمت وسط" دنیا میں بھی اپنی شناخت رکھتی تھی، لیکن اب وہ بے روح جسم کی طرح ہے، اقبال کی آنکھ سے اس اُمتِ مرحوم کا کون سا نقصان ہے جو پوشیدہ ہے۔ جدھر نظر اُٹھا کر دیکھتے ہیں، خرابی دکھائی دیتی ہے:

نہ مومن ہے، نہ مومن کی امیری
رہا صوفی، گئی روشن ضمیری
خدا سے پھر وہی قلب و نظر مانگ
نہیں ممکن امیری بے فقیری

اگر اے مسلمان پھر سے سرخ رو ہونا چاہتے ہو، اپنا وقار بحال کرنا چاہتے ہو تو خدائے لم یزل سے وہی قلب ونظر طلب کرو جس نے تمہیں شہر یارِ زمانہ بنادیا تھا۔"

حضرت اقبال اس کے ساتھ ہی ایک اور نکتہ بیان کرتے ہیں اور وہ ہے "فقیری" یعنی مادیت کی ہوس سے بے نیاز ہونا، دنیا کی طلب میں ہوش وایمان گم نہ کرنا، ضمیر کے اعلیٰ قدر سکہ کے بدلے دنیا ایسی ادنیٰ چیز نہ لینا، خود کو نفس کے حوالے نہ کرنا، بلکہ نفس کو اپنا غلام بنا کر رکھنا کہ اصل میں یہی امیری ہے، دنیا خود بہ خود ایسے فقیروں کی تابع ہوجاتی ہے۔

اقبال تاریخ کے ارتقائی عمل کے قائل ہوتے ہوئے بھی ایامِ گزشتہ کو یکسر فراموش نہیں کرتے، مسلمانوں کے اقتدار اور پھر ان کی زوال پذیری کا شدت سے غم اور افسوس محسوس کرتے ہیں، مختلف حوالوں سے ان ایام کو یاد کرتے رہتے ہیں جب وہ دنیا کے بیش تر علاقوں پر حکومت کررہے تھے، آپ یوں تو روما سے لے کر بغداد کے دریائے دجلہ تک مسلمانوں کی شہر یاری کو یاد کرتے اور دورِ مرحوم کی یاد میں نوحہ کناں، اور آہ بھرتے رہتے ہیں، جیسا کہ اپنے ملی ترانہ میں بھی اس یاد سے غافل نہیں رہے:

اے گلستانِ اندلس وہ دن ہیں یاد تجھ کو
تھا تیری ڈالیوں میں جب آشیاں ہمارا
اے موجِ دجلہ تو بھی پہچانتی ہے ہم کو
اب تک ہے تیرا دریا افسانہ خواں ہمارا

لیکن جس خطہ میں اقبال نے آنکھ کھولی، یہاں کئی صدیاں تک ایک شاندار دورِ حکومت گزارنے کے بعد مسلم اقتدار زمیں بوس ہوگیا، اور عبرت ناک منظر یہ دیکھا گیا کہ باہر کے غاصبوں نے شب خون مار کر اس ملک پر قبضہ جمالیا اور اسی ملک کے حکمران کو ان لٹیروں نے پابندِ سلاسل کرکے اُلٹا اس پر بغاوت کا مقدمہ چلایا، تو اقبال اس سانحہ کو کیوں کر بھول سکتے ہیں۔ فطری طور پر انہیں اپنے "وطن" کی اس پامالی کا قلق ستاتا رہتا ہے۔ گو زمانہ گزر گیا، وقت ان حادثات کو اپنے ساتھ بہا کر لے گیا، لیکن ان زخموں کے نشان اور عظمتِ رفتہ کے آثار اب بھی باقی ہیں، اقبال کی نظر جب ان شہروں پر پڑتی ہے، جہاں مسلم اقتدار اپنی ایک منفرد شان وشوکت کے ساتھ

جلوہ گر تھا تو اس کو یاد کر کے تڑپ اُٹھتے ہیں، اپنی اسی تڑپ اور دلی کسک کو نظم کی صورت میں ڈھال دیتے ہیں۔ دیکھیے "بلادِ اسلامیہ" کے عنوان سے اس نظم میں مرحوم اقتدارِ مسلم کی کس طرح مرثیہ گوئی کی گئی ہے:

سرزمیں دلی کی مسجودِ دلِ غم دیدہ ہے
ذرّے ذرّے میں لہو اسلاف کا خوابیدہ ہے
پاک اس اجڑے گلستاں کی نہ ہو کیوں کر زمیں
خانقاہِ عظمتِ اسلام ہے یہ سرزمیں
سوتے ہیں اس خاک میں خیرالامم کے تاجدار
نظمِ عالم کا رہا جن کی حکومت پر مدار
دل کو تڑپاتی ہے اب تک گرمیِ محفل کی یاد
جل چکا حاصل، مگر محفوظ ہے حاصل کی یاد
ہے زیارت گاہِ مسلم گو جہان آباد بھی
اس کرامت کا مگر حق دار ہے بغداد بھی
یہ چمن وہ ہے کہ تھا جس کے لئے سامانِ ناز
لالۂ صحرا جسے کہتے ہیں تہذیبِ حجاز
خاک اس بستی کی ہو کیوں کر نہ ہم دوشِ ارم
جس نے دیکھے جانشینانِ پیمبر کے قدم
جس کے غنچے تھے چمن ساماں، وہ گلشن ہے یہی
کانپتا تھا جن سے روما، ان کا مدفن ہے یہی
ہے زمینِ قرطبہ بھی دیدۂ مسلم کا نور
ظلمتِ مغرب میں جو روشن تھی مثلِ شمعِ نور
بجھ کے بزمِ ملتِ بیضا پریشاں کر گئی
اور دیا تہذیبِ حاضر کا فروزاں کر گئی

قبر اس تہذیب کی یہ سرزمینِ پاک ہے
جس سے تاکِ گلشنِ یورپ کی رگ نمناک ہے
خطۂ قسطنطنیہ ، یعنی قیصر کا دیار
مہدیِ اُمت کی سطوت کا نشانِ پائیدار
صورتِ خاکِ حرم یہ سرزمیں بھی پاک ہے
آستانِ مسند آرائے شہِ لولاکؐ ہے
نکہتِ گل کی طرح پاکیزہ ہے اس کی ہوا
تربتِ ایوبؓ انصاری سے آتی ہے صدا
"اے مسلماں ملتِ اسلام کا دل ہے یہ شہر
سیکڑوں صدیوں کی کشت و خوں کا حاصل ہے یہ شہر"
وہ زمیں ہے تو مگر اے خوابگاہِ مصطفیؐ
دید ہے کعبہ کو تیری حجِ اکبر سے سوا
خاتمِ ہستی میں تو تاباں ہے مانندِ نگیں
اپنی عظمت کی ولادت گاہ تھی تیری زمیں
تجھ میں راحت اس شہنشاہِ معظم کو ملی
جس کے دامن میں اماں اقوامِ عالم کو ملی
نام لیوا جس کے شہنشاہِ عالم کے ہوئے
جانشیں قیصر کے، وارث مسندِ جم کے ہوئے

حضرت اقبال بلادِ اسلامیہ کا مرثیہ پڑھتے پڑھتے یکا یک گریز کرتے ہوئے اپنے نظریہ وطن کا اظہار کرتے ہیں، یعنی بہ حیثیت مسلمان خود کو ایک کسی خطہ اور ملک تک محدود رکھنے کے قائل نہیں، بلکہ جیسا کہ آپ فرما چکے ہیں:

چین و عرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

''بلادِ اسلامیہ'' نظم کے آخری مرحلہ پر فرماتے ہیں:

ہے اگر قومیتِ اسلام پابندِ مقام
ہند ہی بنیاد ہے اس کی نہ فارس ہے نہ شام
آہ یثرب! دیس ہے مسلم کا تو ماویٰ ہے تو
نقطۂ جاذب تاثر کی شعاعوں کا ہے تو
جب تلک باقی ہے تو دنیا میں باقی ہم بھی ہیں
صبح ہے تو اس چمن میں گوہرِ شبنم بھی ہیں

مذکورہ نظم میں شاعرِ اسلام نے ان تمام ممالک کے صدر مقام یعنی دارالحکومتوں کے نام گنوا کر اور ان کی اہمیت اور صفات بیان کر کے کہ آج وہاں مسلم اقتدار کے آثار تو ہیں لیکن اقتدار وہاں سے رخصت ہو چکا ہے، تاہم چوں کہ مسلماں کسی ایک دیس اور وطن تک محدود نہیں بلکہ مسلمان ظلِ الٰہی ہے، زمین پر جس کو خلیفۃ اللہ نامزد کیا گیا ہے، مسلمان ہی اس کا وارث ہے، لہٰذا اللہ نے انسان کو کسی ایک خطے میں نہیں پوری زمین پر اپنا خلیفہ بنا کر بھیجا ہے، جیسا کہ فرمایا۔ ''انی جاعل فی الارض خلیفہ''، چناں چہ اقبال اس تاثر کو زائل کرنا چاہتے ہیں کہ مسلم انہی خطوں اور شہروں کی وطنیت سے منسوب و منسلک ہے، جہاں آج مسلمانوں کی جگہ دوسرے لوگ برسرِ اقتدار ہیں، کیوں کہ اگر اسلام میں مسلمان کے لئے وطنیت کے لئے علاقائی پابندی ہوتی تو ہند، فارس اور شام سب اس کے ہاتھ سے نکل چکے، پھر اب یہ غریب الوطن کہاں جائے؟ کس کو اپنا وطن کہے؟ اقبال اس احساسِ محرومی کی شدت سے مغلوب ہو کر سوئے مدینہ دیکھتے ہیں اور آہ بھرتے ہوئے کہتے ہیں۔ ''اے زمینِ طیبہ اگر مسلم کا کوئی ٹھکانا اور جائے پناہ ہے تو وہ تو ہے، کیوں کہ تو ہی ہماری شناخت اور ہماری بقا کا ضامن ہے۔'' جیسا کہ ایک دوسری جگہ مسلمان سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں:

بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام تیرا دیس ہے تو مصطفوی ہے

تو یہ ہے مفکرِ اسلام کی شاعرانہ فضا کہ ملتِ اسلامیہ کا درد ان کے لفظ لفظ سے عیاں

ہے۔ آپ نے دانشِ فرنگ اور مغرب کے فلسفہ پر جس طرح عالمانہ اور فکر انگیز تنقید و تبصرے کیے اور ان کے جواب میں اپنے فکر و خیال کو پیش کیا، اس سے دیارِ مغرب متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ آپ کی شعری اور نثری تحریروں نے مغرب کے دانش وروں کو چونکا دیا۔ مستشرقین اور دوسرے اہلِ علم و فکر آپ کے خیالات کو سراہنے پر مجبور ہو گئے اور خواہش کرنے لگے کہ آپ کو اپنے ہاں خطاب کے لئے مدعو کریں، بلکہ آپ کی تصانیف کے یورپی زبانوں میں ترجمے پہلے ہی شروع کر دیے گئے تھے، لیکن اقبال اس سے بھی قبل مسلمانانِ ہند کے خواص میں ایک قومی شاعر کے طور پر شناخت کیے جانے لگے تھے۔ تاہم عوامی سطح پر آپ کو جن نظموں کی وجہ سے شہرت ملی، ان میں "شکوہ" سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ یہ نظم آپ نے انجمن حمایت الاسلام کے سالانہ اجلاس میں پڑھی تھی، جس پر اس وقت بھی اور اس کی اشاعت کے بعد تو اور زیادہ اعتراض کی ایک یلغار کر دی گئی، مذہبی حلقوں کی طرف سے آپ پر کفر و شرک کے فتوے تک عائد کر دیے گئے۔ کیوں کہ ان کے نزدیک نظم میں کچھ الفاظ اللہ تعالیٰ کی شان میں ایسے استعمال کیے گئے جو "نازیبا" تھے اور گستاخی کے زمرے میں آتے تھے۔ گو اقبال نے کافی وضاحت کی اور طوفان میں کمی بھی آئی لیکن ختم نہ ہو سکا، چناں چہ کچھ عرصہ بعد آپ نے اس کے جواب میں ایک دوسری نظم "جوابِ شکوہ" کے عنوان سے لکھی جس نے بہر حال معترضین کے ابال کو جھاگ کی طرح بٹھا دیا۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ اقبال کو مسلمانوں کی حالتِ زار نے اس قدر دکھ اور درد میں مبتلا کر دیا تھا کہ وہ خدائے بزرگ و برتر سے شکوہ کر بیٹھے، جس میں ان کا لہجہ تند و تیز ہوتا چلا گیا۔ شکوہ، شکایت میں اور شکایت احتجاج میں تبدیل ہو گئی۔ اقبال گویا اُمتِ مرسل کا مقدمہ لے کر اللہ رب العزت کی عدالت میں پہنچ گئے۔ ابتدا میں بہت محتاط اور دھیما لہجہ اختیار کیا اس احساس کے ساتھ کہ ایک بندے کا اپنے خالق سے شکوہ کرنا، خلافِ ادب ہے، بولے:

جرأت آموز مری تابِ سخن ہے مجھ کو
شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو

لیکن آہستہ آہستہ آواز بلند ہوتی چلی گئی۔ تاہم ظاہر یہ کیا کہ مسلمانوں کی حالتِ زار نے انہیں مجبور کر دیا ہے کہ وہ رب تعالیٰ سے اس بات کی شکایت کریں کہ "ٹھیک ہے مسلمان پہلے جیسے

نہیں۔ دین و مذہب سے دور ہو گئے ہیں، ان کے اعمال قابلِ رشک نہیں رہے۔ لیکن یہ ہیں تو مسلمان، کلمہ گو، اللہ کی توحید پر یقین رکھنے والے، اللہ کے رسولؐ کے نام لیوا۔ تو کیا صرف اس بات پر کہ ان میں وہ پہلی سی ایمانیات نہیں رہیں، یہ بے عملی کا شکار ہو گئے ہیں، تو اس کمزوری کی یہ اتنی بڑی سزا کے مستحق ہیں کہ انہیں ساری اقوامِ عالم میں ذلیل و رسوا کر دیا گیا ہے؟''

یہی بات ہے جس نے انہیں شکوہ پر مجبور کر دیا۔ کہتے ہیں:

ہے بجا شیوۂ تسلیم میں مشہور ہیں ہم
قصۂ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم
ساز خاموش ہیں، فریاد سے معمور ہیں ہم
نالہ آتا ہے اگر لب پہ تو معذور ہیں ہم
اے خدا شکوۂ اربابِ وفا بھی سن لے
خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے

اس کے بعد آپ نے اپنے اسلاف کے زہد و عبادات کے حوالے، ان کے مجاہدانہ کارنامے اور دین کی سربلندی کے لئے دنیا کے دور دراز علاقوں میں جانا، اپنی جانوں کو جوکھوں میں ڈال کر خشک و تر سے گزر کر اللہ کے باغیوں کا مقابلہ کرنا بیان کیا ہے اور تاریخی حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ مسلمانوں نے انتہائی جاں سوزی اور سرفروشی کے مظاہرے کرتے ہوئے اسلام کا پرچم ساری دنیا میں پھیلا دیا۔ ان کارناموں کی تفصیل بیان کرتے ہوئے اقبال کا لہجہ غیر محتاط ہوتا چلا گیا۔ جذبات کی رو میں بہہ گئے:

پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں
ہم وفادار نہیں تو بھی تو دلدار نہیں

اور اس کے بعد سے احتیاط کا دامن بالکل ہی چھوٹ گیا، جذباتیت سے مغلوب ہو کر کہہ بیٹھے:

کبھی ہم سے، کبھی غیروں سے شناسائی ہے
بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ''ہرجائی'' ہے

پس یہی ہے وہ نامناسب لفظ ہے۔ جس نے اس نظم کو متنازعہ بنا دیا اور آگے چل کر اس مستِ قلندر نے یہ بھی کہہ دیا کہ ایسے صاحبِ ایمان جو تیرے وفادار تھے، تجھ سے ڈرنے اور تیرا نام لینے والے وہ گزر چکے، اب ایسے عاشق باللہ اس جہاں سے رخصت ہو چکے،

آئے عشاق ، گئے وعدۂ فردا لے کر
اب انہیں ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر

آخر میں اقبال محویت سے باہر آتے ہیں تو نہایت اخلاص اور دردمندی کے ساتھ نظم کا تتمہ اس طرح کرتے ہیں، گویا کہہ رہے ہوں، "اے خدا یہ جو شکوہ میری زبان پر آ گیا تھا تو میں تجھے اپنا سمجھ کر ہی ایسا کر بیٹھا، یہ گویا شکوہ نہیں ایک فریاد تھی۔ جو تیرے حضور پیش کی ہے:

عجمی خم ہے تو کیا، مے تو حجازی ہے مری
نغمہ ہندی ہے تو کیا لے تو حجازی ہے مری

اس کے بعد نہ معلوم اس وجہ سے کہ نظم "شکوہ" میں استعمال ہونے والے ایک لفظ پر مختلف حلقوں کی طرف سے اعتراض بلند کرنے والوں کو مطمئن کرنے اور انہیں جواب دینے کی غرض سے یا پہلے ہی آپ نے اپنے ذہن میں "شکوہ" کا جواب لکھنے کا سوچا ہوا تھا، بہر حال کچھ ہی عرصہ بعد نظم "جوابِ شکوہ" لکھی جو ہمارے نزدیک مسلمانوں کے لئے کل بھی اور آج بھی یہ نظم ایک ایسا آئینہ ہے کہ اگر علامہ صاحب کے دیگر افکار اور پیغامات سے صرفِ نظر بھی کر دیا جائے تو صرف آپ کی یہی ایک نظم کافی ہے۔ جس میں مسلمان اپنا چہرہ دیکھ کر شرما سکتے ہیں اور اس سے عبرت پذیری کے بعد اپنے اعمال بھی درست کر کے اپنی ناگفتہ بہ حالتِ زار سے نکل سکتے ہیں۔

شکوہ کیوں کہ بندے نے اپنے خدا سے کیا ہے، لہٰذا "جوابِ شکوہ" خداوند تعالیٰ کی طرف سے ہے جو اپنے شاکی بندے کو دیا گیا ہے۔ نظم میں ہر اس بات کا جواب شامل ہے جو شکوے کے طور پر خدا سے روا رکھی گئی ہے۔ جواب میں اقبال نظم کے شروع میں ہی پہلے اعتراف کرتے ہیں کہ "میرا شکوہ حقیقت میں "نالۂ بے باک" تھا جس نے آسمان کو چیر دیا، لیکن دراصل یہ میرا عشقِ فتنہ گر و سرکش تھا جس نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں بارگاہِ ربّ العزت میں شکوہ سنجی کی جرأتِ گستاخانہ کر بیٹھا۔"

عشق تھا فتنہ گر و سرکش و چالاک مرا
آسماں چیر گیا نالۂ بے باک مرا

پھر اپنے شکوے کی بازگشت کا ذکر کرتے ہیں جو افلاک تک پہنچی اور فرشتوں کو حیرت ہونے لگی کہ یہ کون گستاخ ہے جو بارگاہ ایزدی میں اس قدر شوخ و گستاخ لہجہ اختیار کئے ہوئے ہے۔ دریدہ دہنی کا مرتکب ہو رہا ہے۔ تب عرشی بیک آواز کہتے ہیں:

غافل آداب سے سکان زمیں کیسے ہیں
شوخ و گستاخ یہ پستی کے مکیں کیسے ہیں

افسوس یہ وہی آدم ہے جو کل مسجود ملائک تھا، جس کو اللہ نے ہم نوریوں سے بھی سجدۂ احترام کرایا تھا، لیکن یہ آج اپنے اسی رب اکبر سے برہم نظر آ رہا ہے:

اس قدر شوخ کہ اللہ سے بھی برہم ہے!
تھا جو مسجودِ ملائک یہ وہی آدم ہے؟!

فرشتے مزید اظہار تاسف کرتے ہیں:

ناز ہے طاقتِ گفتار پہ انسانوں کو
بات کرنے کا سلیقہ نہیں نادانوں کو

اس کے بعد جناب باری کی طرف سے شکوہ کے اصل متن کا جواب شروع ہوتا ہے:

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے رہرو منزل ہی نہیں
تربیت عام تو ہے جوہر قابل ہی نہیں
جس سے تعمیر ہو آدم کی یہ وہ گِل ہی نہیں
کوئی قابل ہو تو ہم شان کئی دیتے ہیں
ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

''جس اُمت کی زبوں حالی کا اے شاعر تو ہم سے شکوہ کر رہا ہے کہ ہم نے اس سے آنکھیں پھیر لی ہیں، تو ذرا یہ بھی سوچ کہ خود اس کا عمل کیا ہے؟ اس نے اپنے دل سے روح مذہب نکال کر

الحاد کو سینے سے لگالیا ہے، جس کی وجہ سے یہ اُمت باعثِ رسوائی پیغمبر بنی ہوئی ہے۔ وہ بت شکن جن کا تو تذکرہ کر رہا ہے، کب کے دنیا سے جا چکے، اب تو مسلمانوں کے روپ میں وہ لوگ رہ گئے ہیں جو بُت گری کر رہے ہیں، بس یوں جانو کہ تاریخ اُلٹ گئی ہے، کبھی باپ آزر بت ساز اور بیٹا ابراہیم بت شکن تھا، آج وہ آبا جن کی تم اولاد ہو، وہ بت شکن تھے، مگر تم ان کی اولاد، کارِ بُت سازی انجام دے رہے ہو۔''

اس کے بعد اقبال نے اپنے شاعرانہ کمالِ فن کے ذریعہ اس لفظ ''ہرجائی'' کو جو وجہ تنازعہ بنا تھا، خود خدائے بزرگ و برتر کی زبان کی طرف لوٹا دیا ہے۔ فرمایا گیا:

جو مسلمان تھا، اللہ کا سودائی تھا
کبھی محبوب تمہارا یہی ''ہرجائی'' تھا

''اب خود اپنا جائزہ لو کہ ہرجائی ہم ہیں کہ تم ہو اور اگر تمہیں احساس ہو جائے کہ خود تم ہی ہماری وحدت کی پناہ سے نکل کر ادھر ادھر جگہ جگہ مارے مارے پھر رہے ہو تو تمہارے لیے وقت اور مہلت ہے کہ:

کسی یک جائی سے اب عہدِ غلامی کر لو
ملتِ احمدِ مرسلؐ کو مقامی کر لو

مزید جواب دیا جارہا ہے کہ ''اے شاعرِ ترجمانِ ملتِ اسلامیہ!'' تو یہ جو ہمیں جتارہا ہے کہ:

تیرے کعبہ کو جبینوں سے سجایا ہم نے
تیرے قرآن کو سینوں سے لگایا ہم نے

اور تو اپنی قوم کی جس بدحالی کا ہم سے شکوہ کر رہا ہے اور ہمیں بے وفائی کا طعنہ دے رہا ہے، لیکن آج ذرا اپنا جائزہ تو لو اور دیکھو کہ وہ جبینیں جن سے تم ہمارے کعبہ کی آرائش کا احسان جتارہے ہو، آج دوسروں کے در پر تو خم ہو رہی ہیں لیکن ہمارے حضور جھکنے میں انہیں تکلف ہے:

کس قدر تم پہ گراں صبح کی بیداری ہے
ہم سے کب پیار ہے، ہاں نیند تمہیں پیاری ہے
طبعِ آزاد پہ قیدِ رمضاں بھاری ہے

تمہیں کہہ دو یہی آئینِ وفاداری ہے؟
قوم مذہب سے ہے، مذہب جو نہیں تم بھی نہیں
جذبِ باہم جو نہیں، محفلِ انجم بھی نہیں

"اور یہ جو تُو کہتا ہے کہ:

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا کس نے؟
نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا کس نے؟
میرے کعبہ کو جبینوں سے بسایا کس نے؟
میرے قرآن کو سینوں سے لگایا کس نے؟

تو جنہوں نے یہ عمل کیا، ہم نے انہیں ان کے اعمال کا وہ صلہ دیا جو وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے، شتر بانوں کو ہم نے عالمِ انسانیت کا استاد بنادیا۔ ساری زمین ان کے زیرِ تسلط کردی، وہ ہمارے بن گئے تھے، تو ہم بھی ان کے ہو گئے، وہ ہمارے وفادار تھے، ہم نے ان سے وفاداری برتی۔ لہٰذا ان کا حوالہ دے کر خود کو بری الذمہ کیوں ٹھہراتے ہو:

تھے تو آبا وہ تمہارے ہی مگر تم کیا ہو؟
ہاتھ پہ ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہو

اے شکوہ سنج ہم سے شکوہ کرنے کی بجائے خود اپنے ہم عصر مسلمانوں کی حالت پر غور کر ان کے طرزِ عمل کا جائزہ لے، لازم تو یہ تھا تیرے لئے کہ جس اُمت کے کارنامے تو ہمارے سامنے گنا رہا ہے، تو اس کو یہ بتاتا اور ہوش دلاتا کہ:

منفعت ایک ہے اس قوم کی، نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی، دین بھی، ایمان بھی ایک
حرمِ پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی، ہوتے جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟

"اے شاعرِ شکوہ سنج! ہم اور کیا کہیں، تیری قوم تارکِ آئینِ رسول ہو کر مصلحتِ وقت کا شکار ہو چکی ہے، اغیار کی تہذیب و تمدن کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی ہے اور اپنے بزرگوں کے کارناموں، ان کے عمل اور ان کی چھوڑی ہوئی قدروں سے بے زار ہو چکی ہے، تو نتیجہ یہ ہے کہ:

قلب میں سوز نہیں، روح میں احساس نہیں
کچھ بھی پیغامِ محمدؐ کا تمہیں پاس نہیں

تو کیا تو اس بات سے انکار کر سکتا ہے کہ:

باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو
پھر پسر قابلِ میراثِ پدر کیوں کر ہو

"تمہاری بے عملی اور دین سے دوری کا یہ عالم ہے:

مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے
یعنی وہ صاحبِ اوصافِ حجازی نہ رہے

دشمن خوشی سے بغلیں بجا رہے ہیں کہ مسلمان دنیا سے نابود ہو چکے ہیں اور جن مسلمانوں کی بات تو کر رہا ہے، کیا وہ مسلمان ہیں؟ انہیں مسلمان کہہ سکتے ہیں؟ جب کہ حال یہ ہے:

وضع میں تم ہو نصاریٰ، تو تمدن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود
یوں تو سید بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو، بتاؤ تو مسلمان بھی ہو؟

"اے شاعر تو اپنی قوم کا مقدمہ ہمارے حضور لے کر حاضر ہوا ہے۔ وہ انتہائی کمزور ہے، تو نے وکالت کرتے ہوئے صرف ایک رخ کو دیکھا اور اسی کو پیش کر دیا، دوسرا رخ بھی دیکھ لیتا تو ہرگز ہم سے شکایت کرنے کی بجائے، خود اپنی قوم سے کہتا کہ سارا قصور تمہارا اپنا ہے۔ تم سراسر مجرم ہو، یہ حالتِ زار تمہاری اپنی پیدا کردہ ہے۔ اے شاعرِ خوش نوا! تجھے اپنے آباو اجداد کے کارناموں پر بڑا ناز ہے، لیکن کبھی یہ بھی غور کیا ہوتا کہ:

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر

اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

اے شاعرِ شکوہ سنج! اب بھی وقت ہے، اگر تیری قوم ہوش میں آ جائے، اپنے موجودہ طرزِ عمل کو ترک کر کے پھر ہماری طرف پلٹ آئے۔ ہم سے رجوع کرلے تو اب بھی اس کو حیاتِ نو مل سکتی ہے، اس لئے کہ دینِ حق ابدی ہے، اسلام ہمیشہ رہنے والا ہے، قرآن قیامت تک کے لئے ہے، محمد عربیؐ کی نبوت و تعلیمات لازوال اور نوعِ انسانی کا آخری سہارا ہیں اور اس کی امت کو بھی ہم نے امت وسط کا درجہ دے کر دائمی حیثیت بخش دی ہے، دنیا میں اقتدار کے کمال و زوال کار فطرت ہے، مسلمان کو زوال، نہ بے زری سے ہے اور نہ اقتدار کی زوال پذیری سے ہے بلکہ مسلمان کی موت اس روح کے فقدان سے ہے جو دینِ حق اور عشقِ رسول سے سرگرم و پُر جوش ہے۔ لہٰذا:

تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے
نشۂ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے
ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے
کشتیِ حق کا زمانے میں سہارا تو ہے
عصرِ نو رات ہے، دُھندلا سا ستارا تو ہے

"ہم اپنے دین اور رسولِ آخر و اعظم کی ترویج و تنفید کے لئے ایک گروہ کی جگہ دوسرے گروہ کو لاتے رہے ہیں۔ جس طرح تاتاریوں کے حالات سے عیاں ہے کہ انہی میں سے تھے وہ چنگیز اور ہلاکو جنہوں نے اسلامی حکومت کو زیر و زبر کر کے بلادِ اسلامیہ کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دی تھی ان کے علمی خزانوں کو نذرِ آتش اور دریا برد کر دیا تھا۔ عروس البلاد بغداد کو مسلمانوں کے خون سے سیلاب زدہ بنا دیا تھا۔ لیکن پھر ایک وقت آیا کہ انہی میں سے وہ لوگ ہوئے جنہوں نے دینِ حق قبول کر کے پرچمِ اسلام کو افریقہ سے دیارِ ہند تک لہرا دیا۔ لہٰذا مایوس نہ ہو، اُٹھ اور:

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں عشقِ محمدؐ سے اجالا کر دے

لیکن شرطِ اوّل وفاداری ہے:

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

☆

اقبال کی فکر آفاقی ہے، آپ زمیں کی تنگنائیوں میں سانس لینا اپنی خودی کے گراف کو نیچے لانے کے مترادف سمجھتے ہیں، اس لئے جب بھی شرق و مغرب کی قید سے نکل کر عالمی افق پر پیدا ہونے والے عصری، سیاسی و سماجی تغیرات پر بات کرتے ہیں تو اپنی اسلامی شناخت اور اسلام کی لامحدودیت کا حوالہ دینا ضروری خیال کرتے ہیں۔ یورپ کی اسلام سے مخاصمت کو اقبال سے زیادہ کون جانتا ہے، یورپ کی عصبیت کے جواب میں غیرتِ اسلامی کا نعرہ بلند کرتے ہوئے کہتے ہیں:

لفظ اسلام سے یورپ کو اگر کد ہے تو خیر
دوسرا نام اسی دین کا ہے فقرِ غیور

''یعنی اسلام بھی ان کی عصبیت اور تنگ نظری کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اسے اپنی خودی اور خودداری پر ناز ہے۔''

اقبال کی شاعری میں اسلام کی بازگشت پوری توانائی کے ساتھ سنائی دیتی ہے، اور جہاں آپ نظریہ اسلام کو برنگِ فلسفہ دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں، وہیں اسلام کے پیروکاروں کے خدوخال بھی بیان کرتے رہتے ہیں:

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی آن، نئی شان
کردار میں، گفتار میں اللہ کی برہان

جس طرح قدرت ایک حال اور ایک صورت میں مقید و محدود نہیں، وہ نئے نئے انداز میں جلوہ گر ہوتی رہتی ہے روز و شب کی تبدیلی موسموں کے تغیرات اور خود انسان کے اندر شیر خواری سے کہنہ سالی تک کے ادوار سب خالقِ اکبر کی نشانیوں میں سے ہیں۔ اس طرح مومن کی شخصیت مختلف انداز میں جلوہ گری کرتی ہے۔ کبھی وہ منبر پر زورِ خطابت دکھاتا نظر آتا ہے کبھی میدان

کارزار میں تلوار بکف دکھائی دیتا ہے، کبھی میزانِ عدل کا حامل اور کبھی میر کارواں بن کر جادہ پیمائی کررہا ہوتا ہے، مختصر یہ کہ مومن کی شخصیت دھنک رنگ ہے۔

اقبال کی ساری زندگی غوروفکر میں گزری، وہ جس قدر دین میں تدبر کرتے، اتنا ہی دنیا کو بھی عمیق نظروں سے دیکھتے، دنیا کو دیکھنے کا مطلب اپنے عصری حالات و واقعات کے خیروشر اور ان قوموں کے طرزِ عمل پر نظر رکھنا تھا جس کے اربابِ حل وعقد دنیا کے سیاسی ناخدا بنے ہوئے تھے، جنہوں نے ان خطوں کے عوام پر اپنا تسلط قائم رکھا ہوا تھا جو سیاسی، سماجی اور معاشی و اقتصادی لحاظ سے کمزور اور پسماندہ تھے، خصوصاً اقبال کے غوروفکر کی زیادہ تر مصروفیت خود اپنی قوم کی حالت زار کے لئے وقف تھی۔ آپ اچھی طرح سمجھ چکے تھے کہ ان کی پسماندگی اور اس ناگفتہ بہ حالت کے اسباب کیا ہیں۔ آپ مسلسل ان وجوہ سے انہیں اپنی شاعری اور خطبات کے ذریعہ خبردار کرتے رہتے تھے۔ قوم کو ہوش دلانے اور ان کے اندر بیداری پیدا کرنے کے لئے آپ جن باتوں پر زور دیتے ہیں، ان بنیادی نکات میں سب سے اوّل اتحاد بین المسلمین ہے۔ آپ جانتے اور سمجھتے تھے کہ اس ملت کا شیرازہ بکھیرنے میں جس برائی نے سب سے زیادہ بھیانک کردار ادا کیا ہے، وہ ہے آپس کا نفاق، چناں چہ آپ کا پیغام قوم کے لوگوں کے نام یہ ہے کہ وہ اپنے باہمی اختلافات کو فراموش کرکے ایک بن جائیں، کیوں کہ متحد ہو کر ہی وہ اپنی مشکلات پر قابو پاسکتے ہیں۔ دوسرا نکتہ علامہ صاحب کی فکری کوششوں کا یہ ہے کہ آپ قوم اور بالخصوص قوم کے نوجوانوں کو اپنے اندر دینی حمیت پیدا کرنے کا درس دے رہے ہیں، انہیں بتارہے ہیں کہ وہ ایک اعلیٰ اور ارفع نظریۂ حیات کے حامل دین کے وارث ہیں۔ اُنھیں اور اپنے دین اور تاریخ سے رشتہ جوڑیں، حوصلہ نہ ہاریں، ہمت سے کام لیں، علم و عمل کے ذریعہ خود کو بدلنے کی کوشش کریں، نقشِ کہن پر نہ اَڑے رہیں، تیزی سے بدلتے ہوئے دنیا کے حالات اور نئے تقاضوں کو سمجھیں، تاہم جدیدیت کے نام پر مغرب کی اس تہذیب کو نہ اپنائیں جو خود مغرب کے لئے تباہی کا سبب بن رہی ہے، مغربی اقوام کے پاس جسم رہ گئے ہیں، روح مفقود ہوچکی ہے، اسی طرح مسلمانوں کے دل بھی اس روح سے خالی ہوچکے ہیں جس نے انہیں شہریارِ عالم بنادیا تھا۔ تاہم آج بھی اگر وہی روحانی طاقت، وہی جوش اور جذبہ اپنے اندر بیدار کرلیں تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ قومِ رسولِ ہاشمی دوبارہ اپنا کھویا ہوا وقار

حاصل نہ کر سکے۔

اقبال اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے ایک ایسے دردمند اور خیر خواہ شخصیت کے حامل اور ملتِ اسلامیہ کے لئے اپنے دل میں وہ تڑپ اور وہ سوز و گداز مئے نظر آتے ہیں کہ ادبیاتِ اسلامی میں اس کی دوسری کوئی مثال ڈھونڈے نہیں ملتی وہ خود کو فراموش کر کے قوم کے ہو چکے ہیں۔ بحرِ اسلام کے شناور ہیں، اسلام کے اخلاقی گوہر آب دار کو تقدس مآب خیال کرتے ہیں۔ اسلام کی عالمگیریت اور انسان دوستی کو فخر و انبساط کے ساتھ اپنے کلام کا حصہ بناتے ہیں، خود کو صرف اپنی ملت کے درمیان ہی محدود نہیں رکھتے، بلکہ تمام انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے اپنے دل میں درد رکھتے ہیں، سب انسانوں کو خدا کا بندہ سمجھتے ہیں، اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ قرآن کا پیغام پوری نوعِ انسانی کے لئے ہے، خدائے واحد صرف مسلمانوں کا نہیں تمام انسانوں کا خالق و مالک ہے، وہ رحمٰن ہے، انسانوں پر بلا سبب رحم کرتا ہے، نہیں چاہتا کہ اس کا ایک بندہ بھی اس کے زیرِ عتاب آئے، وہ اپنے باغیوں کے لئے عام معافی کا اعلان کرتا ہے، صرف مرتے وقت کی اسے توبہ قبول نہیں۔ اس رحمانہ صفات کے مالک خدا کا ماننے والا اقبال کس طرح عام انسانوں کی فلاح و بہبود کی نہ سوچے گا۔ لیکن جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ اسلام کے برخلاف، دوسری طاقتیں انسانوں کے درمیان عقیدے کی وجہ سے نہیں بلکہ ملک و نسل کی بنیاد پر تفریق پیدا کر رہی ہیں تو پوری توانا آواز میں انہیں للکارنے اور ان کی غلط سوچ کے مقابل اسلام کی حقانیت کو پیش کرنے میں تاخیر نہیں کرتے۔ خاص طور پر مغرب کے نظریۂ قومیت کے رد میں اسلام کے عالمگیر پیغام اور وحدتِ آدم کے نظریۂ اسلام کو نہایت مضبوط لہجہ میں پیش کرتے ہیں:

تفریقِ ملل حکمتِ افرنگ کا مقصود
اسلام کا مقصود فقط ملتِ آدم
مکہ نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام
جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم

یہ جو دنیا کی خود ساختہ بڑی قوتیں جنیوا میں ''امنِ عالم'' کا نعرہ لگا کر جمع ہوگئی ہیں اور ''جمعیتِ اقوام'' کے نام سے ایک تنظیم کی تشکیل کر رہی ہیں، دراصل ان کے ذہنوں میں قوم کی

تعریف ہی واضح نہیں ہے، وہ اقوام کی متحدہ انجمن تشکیل دے کر کیوں کر انسانوں کے بنیادی حقوق کا تحفظ کر سکیں گی۔

لیکن حکیم الامت اقبال کو اپنی ملت کی بھی فکر ہے کہ اس نے بھی تو خود اپنی اپنی خواہشات پر مبنی مسالک اور قوم و قبیلے کے بت بنا کر رکھے ہیں، اور اسی لیے اس کے اندر وحدت الٰہ اور وحدت آدم کا تصور ماند پڑ چکا ہے۔ لہٰذا اقبال اپنی قوم کے ایک ایک مرض اور ان کا علاج تجویز کر رہے ہیں، فرماتے ہیں:

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

مسلمان اگر آج بھی تجدید ایمان کر لیں، اس یقین کو تازہ کر لیں جو، ان کے اندر مرجھا کر رہ گیا ہے تو اسلام کی خشک کھیتی پھر سے ہری ہو سکتی ہے۔

علامہ جد الانبیا حضرت ابراہیمؑ کی مثال پیش کرتے ہیں کہ جب حق و باطل کا معاملہ درپیش ہو تو پھر سوچنا کیا، کسی تذبذب کی ضرورت نہیں، یقین کامل ہونا چاہئے کہ اگر طاغوتی طاقتیں، وقت کے نمرود اہلِ حق کی راہ میں آتش بے پناہ بھی بھڑکا دیں تو جس طرح ابراہیمؑ اللہ پر توکل کر کے آنکھیں بند کئے، بے خطر آتشِ نمرود میں کود گئے، تو قدرت نے ان کے یقین کو مایوس نہیں کیا۔ انگاروں کو گلوں میں بدل دیا، شعلہ زار کو گلستاں بنا دیا:

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

اقبال عشق اور ایمان کو ایک ہی چیز سمجھتے ہیں اور ڈر خوف اور بے یقینی کو عقل کی پیداوار قرار دیتے ہیں، آپ اپنی قوم سے تقاضا کرتے ہیں کہ وہ اگر آج بھی بے یقینی، مایوسی اور بے حسی کے اندھیروں سے نکل کر ایمان و یقین اور توکلت علی اللہ کی روشنی میں آ جائیں تو یہ دور جو، ان کے لئے آتشِ نمرود بنا ہوا ہے، گلزار براہیم بن سکتا ہے۔ اقبال کے نزدیک یہ عمل مسلمان کے لئے دور حاضر میں اور بھی ضروری ہے کہ جدت کے نام پر اس دور میں گم راہی کا جو یہ زہریلا اندھیرا پھیلا ہوا ہے، اس کو دور کرنا کسی اور کے لئے ممکن نہیں، یہ فریضہ صرف اور صرف مومن جاں باز ہی کر سکتا ہے۔

یہاں ایک سوال ذہن میں اُبھرتا ہے کہ مسلمانوں کی بے عملی اور بگڑی ہوئی حالت پر دوسرے لوگ خصوصاً مذہبی حلقوں کی طرف سے بھی افسوس اور تنقید کا اظہار کیا جاتا رہتا ہے، پھر ایک شاعر کو ہی کیوں یہ کریڈٹ دیا جائے کہ وہ مسلمانوں کی حالتِ زار پر آنسو بہا رہا ہے، اقبال مسلمانوں سے مخاطب ہیں کہ تمہارے اندر وہ پہلی سی ایمانیات نہیں رہی ہے، نہ وہ گفتار رہی ہے، نہ وہ کردار رہا ہے، نہ وہ جذبۂ قلندرانہ ہے، نہ وہ جذبۂ مجاہدانہ ہے، فقط نام کے مسلمان رہ گئے ہیں:

وضع میں تم ہو نصاریٰ، تو تمدن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اقبال فقط اس مریضِ بیمار کے امراض کی تشخیص ونشان دہی پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ اس کا علاج بھی بتاتے ہیں ۔ اپنی شاعری میں جگہ جگہ وہ نکتہ ہائے کیمیا تجویز کرتے ہیں جنہیں اپنانے سے آج بھی مسلمانوں کے سارے دلدر دور ہو سکتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی توجہ پھر سے اپنے محبوب کی اس اُمت پر مرکوز ہو سکتی ہے۔ علامہ اقبال سب سے اوّل مسلمان کو بے ہمتی اور یاس وحرماں نصیبی کے احساس سے باہر آنے کی تاکید کرتے ہیں کہ فتح وشکست، کمال و زوال یہ انسانی زندگی کا حصہ ہیں، کارگہِ شیشہ گراں میں تغیر وتبدل ہوتا رہتا ہے، انسان اپنی غلطیوں سے سیکھتا ہے، سب سے بڑی شکست اور پسپائی دلوں سے احساس زیاں کا جانا ہے، چناں چہ اس کو بچا کر رکھو، اپنی حالت پر غور کرو اور اس بات کو یاد رکھو کہ:

جہاں میں اہلِ ایمان صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے، اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے، اِدھر نکلے

لیکن یہ تب ہی ہو سکے گا کہ سب سے اوّل اپنا رشتہ توحید سے مستحکم کر کے اس سے کیے گئے اپنے عہد کو تازہ کرو، اپنے عمل کو اس کے احکام کا پابند بناؤ، اور اپنے ارادوں کو اس کی مرضی کے حوالے کر دو، پھر دیکھو زندگی کیا معجزے دکھاتی ہے کیوں کہ:

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دین حق چند رسومات کی کارروائی کا نام نہیں، یہ ایک مکمل آئین حیات ہے، جو انسانی زندگی کو اپنے اصولوں کے ذریعہ پاکیزگی کے مضبوط و مربوط رشتہ میں استوار رکھتا ہے، اقبال اس حقیقت کے اظہار میں کوئی ایسا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے جب وہ دیکھتے ہیں کہ اسلام کے پیروکار اسلام کے عملی تقاضوں کو فراموش کر کے محض رسما کارروائی میں مصروف نظر آتے ہیں۔ حجاج کرام جو بصد شوق حرمین شریفین کی زیارت کے لئے جاتے ہیں، وہاں حج اور عمرہ کی ادائی کے بعد واپس ہوتے ہیں تو جیسا عموماً دیکھا گیا ہے، یہ حضرات اپنے ساتھ وہاں کے کچھ تحائف، خصوصاً زم زم وغیرہ لاتے ہیں۔ اقبال کہتے ہیں۔

''بجا ہے، وہاں کی تو خاک بھی آنکھوں کے لئے سرمہ کی حیثیت رکھتی ہے لیکن وہاں کی حاضری کا اصل مقصد تجدید ایمان اور اپنے اعمال کا تجزیہ کرنا ہے۔ وہ عہد جو یوم ایثاق پر ''قالو بلیٰ'' کہہ کر اپنے رب سے باندھا تھا اور اب ''لبیک لبیک'' کہتے ہوئے خدا کے حضور ہوتے ہیں اور خود کو اس پر نثار کرتے ہیں تو پھر وہاں سے یکسر بدل کر لوٹنا چاہیے اور یہاں آ کر اپنے دیگر کلمہ گو برادران کو بھی توجہ دلانی چاہیے کہ اپنی زندگیوں کو اسلام کی روشنی میں ڈھال دو، خود کو دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی رنگ میں رنگ دو، بلکہ ایسا ہو کہ زائرین کے اندر نمایاں تبدیلی دیکھ کر دوسرے لوگ خود ہی متاثر ہوں، لیکن نظر یہ آ رہا ہے کہ زائرین کرام کا سب سے زیادہ زور محض زم زم تقسیم کرنے پر ہے:

زائرین کعبہ سے اقبال یہ پوچھے کوئی
کیا حرم کا تحفہ زم زم کے سوا کچھ بھی نہیں؟

ایک اور مکروہ ترین برائی مسلمانوں میں کینسر کے مرض کی طرح پھیل گئی ہے اور وہ ہے مسلم معاشرے میں ذات پات اور خاندانی برتری اور دوسروں کو کم تر جاننا، جس نے عصبیت کو اور عصبیت نے نفرت کو جنم دیا ہے۔ اقبال اپنی قوم سے مخاطب ہیں:

غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغ حرم اُڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

یعنی اے قوم مسلم تیری ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ذات پات کا نظام ہے جو ظاہر

ہے غیروں کی غیر فطری تہذیب سے مسلم معاشرے میں در آیا ہے لہٰذا۔ اگر اپنی اس موجودہ ذلت آمیز حالت سے نکلنا چاہتے ہو تو آگے قدم اٹھانے سے پہلے اس مرض کو اپنے اندر سے دور کر دو اور یوں بھی اس مصنوعی بڑائی اور جھوٹے اشتہاروں سے کچھ نہیں ہوتا کہ ہم یوں تھے، ہم ایسے تھے، ہماری رگوں میں فلاں کا فلاں کا خون دوڑ رہا ہے۔

فرنگیوں کی چال اور مکر یہ ہے کہ وہ علاقوں کے نام پر قوموں کے درمیان نفاق و تفریق پیدا کرنے کا منصوبہ رکھتے اور سازشیں کرتے ہیں۔ خصوصاً مسلمان جو صرف کلمہ کی بنیاد پر ایک امت اور ایک قوم کہلاتے ہیں، انہیں علاقوں اور خطوں کی نسبت سے الگ الگ قومیت میں تقسیم کر دینا چاہتے ہیں، تا کہ یہ ایک طاقت اور ایک آواز ہو کر ان کی چالاکیوں اور عیاریوں کو ناکام بنانے کی بجائے آپس میں ہی عرب و عجم کے چکروں میں پڑے رہیں۔ علامہ اقبال ان فرنگی چالوں کو بے نقاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

تفریقِ ملل حکمت افرنگ کا مقصود

اور اس کے برعکس اسلام کا نظریۂ قومیت کیسا عظیم فلسفہ اپنے اندر رکھتا ہے کہ:

اسلام کا مقصود فقط ملتِ آدم

یعنی اسلام کے پیغام کی روشنی میں، اخوت و محبت ہی تمام عالم انسانی کو ایک ملت بنا سکتی ہیں۔ ان کے سوا انسان کا انسان سے کوئی رشتہ نہیں۔ اگر ایک طبقہ ملک یا قوم کے لوگ دوسرے طبقہ ملک یا قوم سے نفرت کریں تو وہ انسانی برادری کے فرد نہیں ہو سکتے۔ کیوں کہ انسانیت کا مذہب محبت اور اخوت ہے۔ جب انسان، انسان سے ملتا ہے تو بندہ و آقا کا فرق مٹ جاتا ہے۔ محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اگر ایک انسان دوسرے انسان کو اپنے سامنے جھکنے پر مجبور کر دے تو وہ انسانیت کی توہین کرتا ہے۔ علامہ فرماتے ہیں:

تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے
حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

قائداعظم نے اقبال کو فکری رہنما تسلیم کیا اس کا بین ثبوت یہ ہے کہ قائداعظم نے اپنے نام اقبال کے مکتوبات کو ۱۹۴۳ء میں اپنے اس پیش لفظ کے ساتھ شائع کیا:

''میرے نزدیک یہ مکاتیب بے حد تاریخی اہمیت کے حامل ہیں
، بالخصوص وہ خطوط جن میں مسلم ہند کے سیاسی مستقبل کے
بارے میں ان خیالات کا واضح اور غیر مبہم اظہار ہے، ان کے
خیالات پورے پورے طور پر میرے خیالات سے مطابقت
رکھتے ہیں اور بالآخر میں ہند کے دستوری مسائل کے مطالعہ اور
تجزیہ کے بعد انہی نتائج پر پہنچا ہوں اور کچھ عرصہ بعد یہی
خیالات ہند کے مسلمانوں کی اسی متحدہ خواہش کی صورت میں
جلوہ گر ہوئے جس کا اظہار آل انڈیا مسلم لیگ کی ۲۳ مارچ
۱۹۴۰ کی منظور کردہ قرارداد لاہور ہے جو عام طور پر قرارداد
پاکستان کے نام سے موسوم ہے۔''

یاد رہے بیگم جناح کو بھی آپ سے ملاقات کا بہت اشتیاق تھا جو انگریزی ادب میں فضیلت رکھتی تھیں۔

☆☆

اعترافِ اقبال

یوں تو اقبال کا ایک زمانہ معترف ہے لیکن ہم یہاں چند اقبال پسندوں کا حوالہ دے رہے ہیں۔ دراصل وقت کا تقاضا بھی یہی ہے۔

ایران کے ایک عالی مرتبت دانشور، افسانہ نویس، ناول اور ڈرامہ نگار، شاعر اور نقاد علامہ اقبال کے کلام کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد اپنے مقالات میں ان کے افکار و نظریات سے متعلق اپنی رائے کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

> ''پاکستان کے اس ذہین اور طباع شاعر نے یہ جرأت کی اور اپنا کام بخوبی انجام دیا۔ اس کی تصنیفات برہان قاطع اور قاطع برہان کی طرح ہمارے سامنے موجود ہیں۔''

موصوف مزید لکھتے ہیں:

> میں اقبال کا مقام ایک پیشوا اور رہنما کا مقام سمجھتا ہوں۔ شاعر عظیم کہلانے کا حق وہ رکھتا ہے جو زمانے اوضاع کو تبدیل کر دے۔ حوادث عالم میں انقلاب پیدا کر دے۔ میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں جس آخری شخص نے وہ کام انجام دیا ہے، محمد اقبال ہے۔

ایران کے سابق صدر اور جلیل القدر دانشور آیت اللہ خامنہ ای، علامہ اقبال پر ایک سیر حاصل مقالہ پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''اقبال تاریخ اسلام کی ان نمایاں، عمیق اور اعلیٰ شخصیتوں میں سے ہیں کہ

ان کی خصوصیات اور زندگی کے صرف ایک پہلو کو مدنظر نہیں رکھا جا سکتا اور ان کی صرف اس پہلو اور اس خصوصیت کے لحاظ سے تعریف نہیں کی جا سکتی۔ اگر ہم صرف اسی پر اکتفا کریں اور کہیں کہ اقبال ایک فلسفی ہیں اور ایک عالم ہیں تو ہم نے حق ادا نہیں کیا۔ اقبال بلا شک ایک عظیم شاعر ہیں اور ان کا بڑے شعراء میں شمار ہوتا ہے۔ اقبال کے اردو کلام کے بارے میں اردو زبان و ادب کے ماہرین کہتے ہیں، بہترین ہے، شاید یہ تعریف اقبال کی بڑی تعریف نہ ہو، کیونکہ اردو زبان کی ثقافت اور نظم کا سابقہ زیادہ نہیں ہے۔ لیکن اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اقبال کے اردو کلام نے بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں برصغیر کے افراد پر (خواہ ہندو ہوں یا مسلمان) گہرا اثر ڈالا ہے، اور ان کو اس جدوجہد میں جو اس وقت تدریجی طور پر بڑھ رہی تھی، زیادہ سے زیادہ جوش دلایا ہے۔ خود اقبال مثنوی آلہ خودی میں کہتے ہیں:

باغباں زور کلام آزمود
سوئی کاید و شمشیری درود

باغباں میرے زور کلام کو آزما رہا ہے، اور میرا ایک ایک مصرع شمشیر کا کام انجام دے رہا ہے۔

جناب خامنہ ای فرماتے ہیں "میرا استنباط یہ ہے کہ یہ انہوں نے اپنے اردو کلام کے بارے میں کہا ہے، جو اس وقت برصغیر کے لوگوں کے لئے جانا پہچانا تھا، لیکن اقبال کا فارسی کلام بھی میرے نزدیک شعری معجزات میں سے ہے۔ ہمارے ادب کی تاریخ میں فارسی میں شعر کہنے والے غیر ایرانی بہت زیادہ لیکن کسی کی بھی نشاندہی نہیں کی جا سکتی، جو فارسی میں شعر کہنے میں اقبال کی خصوصیت کا حامل ہو۔"

ایران کے ملک الشعراء بہار جنہوں نے قدیم ایران کی عظمت کے احیا کا خواب دیکھا تھا اور وہ اس زمانے کی یاد کو ایران کے جدید قومی شعور کی بنیاد بنانا چاہتے تھے وہ بھی یہ کہنے سے نہ رہ سکے:

"میں اقبال کو مسلمان غازیوں، عالموں اور دانشوروں کی نو سو سال کی

کوششوں اور کاوشوں کا جوہر اور شاہکار سمجھتا ہوں۔"

ایران کے معروف ادیب سید غلام رضا سعیدی ملت ایران کی طرف سے شاعر اسلام کو یوں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں:

"اگر اینگلوسکسین قوموں کو شیکسپیئر، فرانس کو وکٹر ہیوگو اور جرمنی کو گوئٹے پر ناز ہے تو اقبال کی ذات ملت اسلامی کے لئے بالعموم اور ایران و پاکستان کے لئے بالخصوص باعث افتخار ہے۔

دیگر اسلامی ممالک کی طرح ایران میں بھی علامہ اقبال کے ولولہ انگیز پیغام کو دلوں کی گہرائی میں محسوس کیا اور اقبال کے ان ایرانی شیدائیوں کے دلوں میں یہ ولولہ تازہ برسوں پرورش اسلامی انقلاب ایران کے ہراول دستے کے اہم رکن علی شریعتی کے افکار میں ظاہر ہوا۔

حکیم الامت کے اس فدائی نے اپنے رہبر و ممدوح پر دو کتابیں تحریر کیں، ایک "اقبال معمار تجدید بنائے تفکر اسلامی" دوسری "ماو اقبال" یعنی میں اور اقبال۔ دونوں کتابوں میں موجودہ اسلامی اور خصوصاً ایرانی معاشرے کے تناظر میں پیغام اقبال کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ جناب شریعتی کی نظر میں اسلامی تہذیب نے انسانی معاشرے کو آج تک علم و حکمت کی جن درخشاں شخصیتوں سے مالا مال کیا ہے اقبال ان میں سے ایک ہیں۔ اقبال شناس علی شریعتی نے علامہ اقبال کو "مصلح مفکر انقلابی اسلامی" قرار دیا ہے۔

ایران کے مشہور شاعر بہار، شاعر اسلام علامہ محمد اقبال کو ان لفظوں میں خراج تحسین پیش کرتے ہیں:

عصر حاضر خاصۂ ایران گشت
واحدی کز صد ہزاراں سرگذشت

میں اقبال کو مسلمان غازیوں، عالموں اور دانشوروں کی نو سو سالہ کوششوں اور کاوشوں کا جوہر اور شاہکار سمجھتا ہوں۔"

ممتاز برطانوی نقاد سر ہربرٹ ایڈ نے ۱۹۲۱ء میں کہا:

"آج جبکہ ہمارے مقامی شاعری اپنے بے تکلف احباب کے حلقہ میں کیٹس کے تتبع میں کتے بلیوں اور ایسے ہی گھریلو موضوعات پر طبع آزمائی کر رہے ہیں تو ایسے میں، لاہور میں ایک ایسی نظم تخلیق کی گئی ہے جس کے بارے میں ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ اس نے مسلمان نوجوان نسل میں طوفان برپا کر دیا ہے۔"

محمد علی جوہر کو اقبال کے سیاسی فکر و عمل سے کسی قدر اختلاف رہا۔ لیکن اقبال کی شاعرانہ عظمت کے سامنے سر تسلیم خم کیا۔ اپنے اخبار کامریڈ میں لکھا اقبال کی شاعری کی جب میں نے جھلک ہی دیکھی تھی کہ اس سے سالہا سال پہلے دوسروں کو اقبال کے نابغۂ عصر ہونے کا احساس ہو چلا تھا۔ لیکن اتنا دعویٰ تو میں بھی کر سکتا ہوں کہ اس کے افسوں کے زیر اثر آنے کے بعد میں تلافی مافات میں دل و جان کے ساتھ لگ گیا۔ اقبال بیسویں صدی کے ہندوستان میں بیداریٔ اسلام کا شاعر ہے۔ اسلامی ہنر کسی اور انسان کا اس قدر رہین منت نہیں جس قدر وہ مرہون احسان ہے لاہور کے منکسر المزاج شرمیلے اور عزت گزیں بیرسٹر کا۔"

☆

ایک موقع پر ڈاکٹر غلام جیلانی برق نے آپ سے سوال کیا۔" آپ کے نزدیک عقل کی انتہا کیا ہے؟"

آپ نے فرمایا:" حیرت"

برق صاحب نے پھر پوچھا:" اور یہ بھی فرمائیے عشق کی انتہا کیا ہے؟"

آپ نے فرمایا:" عشق کی کوئی انتہا نہیں۔"

ڈاکٹر جیلانی بولے۔" تو پھر آپ نے یہ کیا فرمایا ہے کہ:" تیرے عشق کی انتہا چاہتا ہوں"۔

آپ مسکرائے اور فرمایا:" دوسرا مصرعہ بھی تو پڑھیے۔ میری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں۔"

" کیا اس میں اپنی حماقت کا اظہار نہیں؟"

ڈاکٹر جیلانی نے قائل ہو کر چہرہ جھکا لیا۔

یاد رہے بیگم جناح کو بھی آپ سے ملاقات کا بہت اشتیاق تھا جو انگریزی ادب میں فضیلت رکھتی تھیں۔

☆

maablib.org

تحریک ہجرت (۱۹۲۰ء)

ایک تاریخ - ایک تجزیہ

راجا رشید محمود

maablib.org

تحریک ختم نبوت 1974ء

(قومی اخبارات و رسائل سے دستاویزی شہادات)

تحقیق و تالیف

محمد ثاقب رضا قادری

دار النعمان پبلشرز
[illegible]

مطبوعات دار النعمان، لاہور

۱۔ تنزهة المقال فی لحیة الرجال (داڑھی کی شرعی حیثیت) مصنف رئیس المحققین علامہ سید سلیمان اشرف بہاری، قیمت: ۱۰۰ روپے

۲۔ چلتی ٹرین میں نماز کا حکم، تالیف: مفتی محمد نظام الدین رضوی برکاتی، قیمت ۱۳۰ روپے

۳۔ حاشیہ تقریب و تهذیب از امام احمد رضا خان قادری، قیمت: ۸۰۰

۴۔ مجلس شرعی کے فیصلے، ترتیب: مفتی نظام الدین رضوی برکاتی، قیمت ۷۰۰ روپے

۵۔ حسن التقاضی فی سیرة امام ابی یوسف القاضی (حیات امام ابو یوسف)، تالیف شیخ زاہد کوثری، ترجمہ: منظر الاسلام الازہری، قیمت: ۲۵۰

۶۔ فقہ اسلامی کے سات بنیادی اُصول، از مفتی محمد نظام الدین رضوی، قیمت: ۴۰۰

۷۔ اختر و اقبال، از سیدہ اختر حیدر آبادی، تقدیم: ڈاکٹر معین الدین عقیل، قیمت: ۴۰۰

۸۔ سچے مرید کے اوصاف، تصنیف: امام عبد الوہاب شعرانی، مترجم: پروفیسر اعجاز جنجوعہ، قیمت: ۲۵۰

۹۔ الزلال الانقی از اعلیٰ حضرت، تحقیق و ترتیب: ڈاکٹر محمد اشفاق جلالی، قیمت: ۴۰۰ روپے

۱۰۔ تحریک جہاد اور برٹش گورنمنٹ، تحقیق: خوشتر نورانی، قیمت ۳۰۰ روپے

۱۱۔ فقہ اسلامی میں عرف کی اہمیت، از مفتی محمد وسیم اختر المدنی، قیمت ۱۴۰ روپے

۱۲۔ لسان الفردوس (دو حصے)، علامہ ارشد القادری/ڈاکٹر غلام زرقانی، قیمت: ۲۶۰

۱۳۔ اردو صحافت آزادی کے بعد، تحقیق: ڈاکٹر محمد افضل مصباحی، قیمت ۶۰۰ روپے

۱۴۔ تحریک ختم نبوت اور نوائے وقت، تحقیق: محمد ثاقب رضا قادری، قیمت: ۱۰۰۰ روپے

۱۵۔ مقاصد احادیث، تالیف: مولانا منظر الاسلام الازہری، قیمت: ۲۵۰

۱۶۔ انوار مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم (سندھی)، مصنف: سید زین العابدین راشدی،

۱۷۔ تحریک ختم نبوت 1974ء، تحقیق: محمد ثاقب رضا قادری، قیمت: ۵۰۰ روپے

۱۸۔ تحریک ہجرت۔ ایک تاریخ، ایک تجزیہ، تحقیق: راجا رشید محمود

۱۹۔ قائد اعظم۔ افکار و کردار، راجا رشید محمود

MAAB 1431
maablib.org

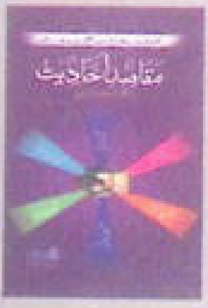

کتاب ملنے کا پتہ: دکان نمبر ۳، حلیمہ وادیہ پلازہ، فاروقی اسٹریٹ، اردو بازار، لاہور

042-37228075, 0322-8272526, 0333-1206301, 0333-1206309

/salamfoundation.pk /salamfoundation

Salam Foundation